تاریخ ادب اردو

مرتبہ

عبد القیوّم
لکچرار شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی

مصنّفین

★ ڈاکٹر سید معین الحق
★ محمد سخاوت مرزا
★ حبیب اللہ خاں غضنفر
★ یونس حسن فروغ علوی
★ عبد القیوم

پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز لمیٹڈ
۱۱ میری روڈ۔ کراچی ۳

فہرست مضامین تاریخ ادب اردو جلد اول

باب اول۔ پس منظر مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان کی حالت

یونس حسن فروغ علوی ایم اے لیکچرار عثمانیہ کالج کراچی صفحات

باب دوم: مسلمانوں کی آمد کے وقت برصغیر کے سیاسی و سماجی حالات

ڈاکٹر سید معین الحق ایم اے پی ایچ ڈی جنرل سکریٹری و ڈائرکٹر آف ریسرچ
پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔

باب ششم: اردو دکن میں (نظم) محمد سخاوت مرزا بی اے ایل ایل بی حیدرآباد دکن۔

بہمنی دور (بریدشاہی و عادل شاہی)

عہد سلاطین بریدیہ بیدر

گجرات میں اردو

عادل شاہی دور ۸۹۲ھ تا ۱۰۹۷ھ

باب ہفتم: اردو نظم (قطب شاہی) محمد سخاوت مرزا بی اے ایل ایل بی۔

باب ہشتم: قدیم اردو نثر (دکن میں)

محمد سخاوت مرزا بی اے ایل ایل بی حیدرآباد دکن

باب نہم: اردو نظم شمالی ہند میں

عبدالقیوم ایم اے لکچرار شعبہ اردو کراچی یونیورسٹی۔

باب دہم: اردو نثر شمالی ہند میں

عبدالقیوم، صدر شعبہ اردو کراچی یونیورسٹی۔

پیش لفظ

اردو میں تذکرہ نویسی کی ابتدا شعرائے اردو کے ان تذکروں سے ہوتی ہے جو فارسی زبان میں لکھے گئے یہ تذکرے حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیئے جاتے تھے ان میں حالات زندگی نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام سرسری اور مختصر ہوتا تھا ان تذکروں میں کسی تنقیدی شعور کا سراغ لگنا مشکل ہے۔ زبان کی ابتدائی نشو و نما شاعر کے ذہنی ارتقاء اور عہد بعہد کی تبدیلیوں اور ترقیوں کے متعلق بھی یہ تذکرے خاموش ہیں آب حیات اردو میں پہلا تذکرہ ہے جس میں تاریخی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ہر دور کی خصوصیات پر تبصرہ کیا گیا ہے لیکن اس کی انشاپردازی اور افسانہ طرازی نے اسے افسانۂ یاران کہن بنا دیا آبحیات سے اردو زبان میں تذکرہ نویسی کا ایک نیا انداز ضرور سامنے آیا اور اس کے بعد ادبی تاریخوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ تاریخ نویسی کی یہ کوشش اب تک نامکمل اور تشنہ ہے کیونکہ جو تاریخیں لکھی گئیں وہ ادب کے صرف ایک رخ کو پیش کرتی ہیں بعض شاعری تک محدود ہیں اور کچھ محض نثر کے ارتقاء پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان تاریخوں میں کاشف الحق۔ گل رعنا۔ سیر المصنفین۔ ارباب نثر اردو تاریخ نظم و نثر اردو۔ نمونہ منثورات۔ شعر الہند۔ مختصر تاریخ ادب اردو (اعجاز حسین) تاریخ ادب اردو سکسینہ اور داستان تاریخ اردو کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں

ان کے علاوہ اور بھی تصانیف ہیں جو تاریخ ادب کے نقطہ نظر سے نہیں لکھی گئیں لیکن ان سے تھوڑی بہت تاریخ ادب کی ضرورت پوری ہوتی ہے یہ کسی صنف دبستان یا تحریک کے کارناموں کی تفصیلات سے متعلق ہیں ان میں نمایاں نام اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ دہلی کا دبستان شاعری۔ اردوئے قدیم۔ دکن میں اردو۔ جدید اردو شاعری۔ ترقی پسند ادب۔ اردو تنقید کا ارتقاء وغیرہ ان میں سے بعض محض تجزیہ اور تشریح تک محدود ہیں حالات زندگی اور شخصیتوں کے ارتقاء سے انہیں بحث نہیں لیکن ان کا تحقیقی و تنقیدی مواد قابل قدر ہے۔ کسی ادبی تاریخ کی تکمیل میں ان سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

بیسویں صدی میں ادب کا مطالعہ اقدار کا مطالعہ ہو گیا ہے اس لئے تاریخ ادب کو محض معلومات کا ذخیرہ نہیں ہونا چاہئے اور شعرا کے حالات زندگی پر اب تک جس قدر زور دیا جاتا رہا ہے وہ کافی نہیں بلکہ شخصیت کا ارتقاء اور اس کے ماحول کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے آج کے مورخ ادب کو یہ دیکھنا ہے کہ ایک فن کار اپنی تخلیقات کن حالات میں پیش کرتا ہے اس کے زمانہ میں تصنیف و تالیف کا کیا رجحان تھا اپنے پیشروؤں اور ہم عصروں سے اس نے کس حد تک اثرات قبول کئے اور کہاں تک اپنی قوت نقد سے کام لے کر ادبی اجتہاد کے لئے راستہ ہموار کیا وہ کس حد تک اپنے دور کی نمائندگی کرتا ہے اور کہاں تک اس سے مختلف ہے کن اسباب کی بنا پر اس نے اختلاف کیا اور اس میں وہ کہاں تک کامیاب رہا آج ہم اس سے کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اب مورخ ادب کو محض شعر و ادب کے ظاہری پہلوؤں کو نہیں دیکھنا ہے بلکہ ان کے باطن

تک پہنچتا ہے۔

اردو میں ادب کی ترقی تقریباً دو سو سال سے شروع ہوئی ہے اس سے قبل جو کچھ ہے وہ محض تاریخی حیثیت رکھتا ہے اس دور میں اردو کا سرمایہ صوفیائے کرام کے اقوال اور قصوں کہانیوں تک محدود تھا یہ زبان کے ابتدائی نمونے ہیں جو ہمارے لئے بالکل اجنبی ہیں لیکن یہی چراغ تھے جو آگے چل کر زیادہ روشن ہوئے اس دور میں فارسی اثرات اس قدر تھے کہ اردو کے دور اول کے شعراء شعرائے فارسی کی لے سے لے ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنی جدت و اختراع کے باوجود ان کے اثرات سے باہر نہیں نکل پاتے ایک عرصہ تک گویا اردو فارسی کے پروں سے اڑتی رہی شاعری سے قطع نظر تذکرہ نویسی کی روایت فارسی میں بھی زیادہ ترقی یافتہ نہ تھی کم و بیش ہندوستان تک جو روایت منتقل ہوئی وہ لباب الالباب (عوفی)، تذکرہ دولت شاہ سمرقندی اور تذکرہ مجمع الفصحا سے آگے نہیں بڑھتی شعرائے اردو کے تذکرے دراصل انہیں کی نقل ہیں عربی زبان میں تاریخ و تذکرہ کا میدان فارسی سے زیادہ وسیع تھا۔ طبقات الشعراء جو اس کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں میں بھی زمانہ مرتبہ اور اصناف سخن کا تصور ملتا ہے اور بعد میں شعر کی ماہیت پر بھی بحث ملتی ہے جیسے ابن قتیبہ کا الشعر والشعراء انیسویں صدی میں مغربی اثرات کی وجہ سے عربی میں ادبی تاریخ کو سیاسی اعتبار سے مرتب کیا جانے لگا مغرب کا یہ رجحان نکلسن کی عربوں کی ادبی تاریخ اور جرجی زیدان کی ادب اللغۃ العربیہ میں ملتا ہے اصناف سخن پر علیحدہ علیحدہ تبصرے بھی کئے گئے جیسے بنو امیہ کے دور کی غزل اور بنو عباس کے زمانہ کی غزل۔ اس طرح ایک عہد سے دوسرے زمانہ تک

کی تمام ترقیوں اور تبدیلیوں کا علم ہو جاتا ہے فارسی میں جہاں تک ہندو پاکستان کا تعلق ہے پروفیسر براؤن کی ایرن کی ادبی تاریخ کو قبولیت حاصل ہوئی دراصل براؤن کی تاریخ تمدنی اعتبار سے مرتب کی گئی یہ علمی و ادبی تاریخ ہے لیکن ادبی تاریخ کا بنیادی اصول یہ ہونا چاہئے کہ وہ ادبی زیادہ ہو تاریخی کم۔ اردو میں مولانا شبلی کی شعر العجم بھی بہت مقبول ہے اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ یہ محض حالات وواقعات اور انتخاب کلام کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ مذاق شعری اور لطافت خیال کا شاہکار ہے۔ یہاں واقعات زندگی کی مدد سے شاعر کی شخصیت اور اس کی ذہنی کیفیت کو واضح کیا گیا ہے جس سے ہمارے مذاق شعر کو سنورنے میں مدد ملتی ہے۔

انیسویں صدی میں اردو کی ادبی حیثیت زیادہ نمایاں ہونا شروع ہوئی اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد اس میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ مغربی اثرات زیادہ تیزی سے پھیلنے شروع ہوئے اور علی گڑھ تحریک نے اسے بعض نئے رجحانات سے روشناس کرایا ادب اور زندگی کا مسئلہ خاص طور پر زیر بحث آیا مقصدیت افادیت حقیقت اور واقعیت کے مفہوم واضح طور سے سامنے آئے اور ادب و زندگی کے رشتے کی تلاش شروع ہوئی شعر و شاعری کے ساتھ فن تنقید نے بھی قدم آگے بڑھایا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کو اس سلسلہ میں بڑی اہمیت حاصل ہے ان کے یہاں پہلی مرتبہ چند مغربی فن کاروں کا تذکرہ کیا گیا۔ سرسید نے بھی تہذیب الاخلاق میں ملٹن اور شکسپیر کا ذکر کیا لیکن حالی نے بعض مغربی رجحانات کو واضح کرنے کی کوشش کی اگرچہ

یہ کوشش ناکمل اور ناقص تھی تاہم مغربی ادبیات سے استفادہ کرنے کی ایک شعوری کوشش یہیں سے شروع ہوئی اس کا اثر یہ ہوا کہ ادبی ترقی کے لئے ایک نیا راستہ کھل گیا لیکن جہاں تک تاریخ ادب کا تعلق ہے اس میں مغربی اثرات زیادہ داخل نہ ہو سکے فرانسیسی مورخ ادب ٹین کا ذکر دو ایک جگہ ملتا ہے (دیکھئے ادبی تاریخ کے اصول از ظفر الاحسن لاری رسالہ ہندوستانی الہ آباد اپریل ۱۹۳۳ء تاریخ ادب کا مطالعہ مظفر علی سید صحیفہ لاہور ۳) جس نے یہ واضح لیا کہ انگریزی ادب پر ماحول کے اثرات نمایاں ہیں یعنی ادب کی تخلیق کا سراغ تاریخی اور معاشرتی حالات میں لگانا چاہئے۔ ٹین نسل ماحول اور لمحہ کو بنیادی حیثیت دیتا ہے اس کے خیال میں کسی فنکار کے کلام کا جائزہ لیتے وقت خاندانی خصوصیات اور اس کے ابتدائی خیالات کا جاننا ضروری ہے پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ خارجی ماحول نے فن کار پر کیا کیا اثرات ڈالے وہ اپنے دور میں کن اشخاص سے متاثر ہوا اور دو اشخاص ایک ہی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود متضاد راستوں پر کیوں گامزن ہوئے۔ ٹین کا یہ نظریہ انیسویں صدی میں مقبول ہوا۔ لیکن اس نظریہ کی رو سے معاشرتی حالات کا جاننا جس قدر ضروری سمجھا گیا ہے وہ بحث طلب ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی زمانہ میں دو فنکار اپنے ماحول اور عہد حاضر کی تحریکات سے علحدہ رہ کر اپنا الگ راستہ اختیار کرتے ہیں اور پھر بھی انہیں قبول عام حاصل ہوتا ہے اردو میں اس کی واضح مثال محمد حسین آزاد اور فصیح الملک داغ کی ہے اگرچہ بعض نقاد آزاد کو سرسید کے اثرات قبول کرنے والوں کی صف اول میں شامل کرتے

ہیں لیکن آزاد کو شہرت عام آب حیات اور نیرنگ خیال کی وجہ سے حاصل ہے اور یہ کتابیں سرسید کے اثرات سے آزاد ہیں۔ حالی جب تک دم میں دم رہا قوم کے اقبال کا ماتم کرتے رہے لیکن اسی زمانہ میں مرزا داغ ایک آہ سرد بھر کر ہمیشہ کے لئے حسن و عشق کی دنیا میں کھو گئے فردوسی، عرفی اور غالب کے کلام کا مطالعہ کیجئے تو شاہی دربار سے ان کی راہ و رسم محض رسمی نظر آتی ہے اس کے باوجود ماحول سے کوئی بے نیاز نہیں رہ سکتا لیکن اچھے فن کار کی انفرادیت اپنے گرد و پیش سے کچھ دیر کے لئے بے نیاز ہو کر ہمیشہ الگ راستہ نکالتی رہی ہے فن کار ماحول سے جو کچھ حاصل کرتا ہے اس سے زیادہ وہ معاشرہ کو واپس کر دیتا ہے۔ یہی اس کی انفرادیت ہے۔ جدید دور کے مورخ ادب کا یہ فرض ہے کہ اس اختلاف کا سراغ لگائے اور شاعر کی انفرادیت کا مطالعہ نفسیات کی روشنی میں کرے اور اس فرق کو واضح کرے جو دو فن کاروں میں ہوتا ہے اور ادبی تاریخ کو ایسے سانچے میں ڈھالے کہ تاریخ کے سارے اجزاء ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوں دراصل تاریخ ادب کا مطالعہ ذہنی، ادبی، تمدنی اور لسانی مطالعہ ہے اور اسی طرح ادب کا مطالعہ مفید ثابت ہو سکتا ہے اور اس کا وسیع تصور اور تہذیبی حیثیت سامنے آسکتی ہے۔

اس تاریخ کو چار جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلی جلد سنہ ۶۱۳ تا سنہ ۱۷۰۶ء اورنگ زیب کی وفات تک)

دوسری جلد سنہ ۱۷۰۷ء تا سنہ ۱۸۵۷ء (قبل غدر تک)

تیسری جلد سنہ ۱۸۵۷ء تا سنہ ۱۹۱۴ء جنگ عظیم اول کے شروع ہونے تک

چوتھی جلد ۱۹۱۴ء سے موجودہ دور تک۔

زیر نظر تالیف اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اسے دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے باب میں زبان کی ماہیت اور انسانی تمدن میں اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے اس کے بعد مسلمانوں کی آمد سے قبل جو ثقافتی اور لسانی کیفیت ہے اسے پیش کیا گیا ہے دوسرے اور تیسرے باب میں مسلمانوں کی سیاسی سماجی اور ادبی تاریخ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ چوتھے باب میں مسلم تمدن کا اثر ہندوستانی طرز زندگی پر دکھایا گیا ہے تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ مسلمانوں نے دیسی زبانوں کی ترقی میں کیا حصہ لیا ہے۔ پانچویں باب میں اردو زبان کے آغاز ارتقاء اور پیدائش کے مختلف نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے لقیہ ابواب جنوبی ہندوستان اور شمالی ہند کی نظم و نثر سے متعلق ہیں ادبی تخلیق کے اعتبار سے یہ دور اہم نہیں ہے لیکن کسی زبان کے سفر کی منزلوں میں ان اولین نمونوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اس حصہ کو قدرے تفصیل سے پیش کیا گیا ہے تاکہ زبان کے ارتقاء اور عہد بہ عہد کی ترقیاں سامنے آ سکیں ان کی تہذیبی حیثیت واضح کرنے کے لئے ہمارے پاس اس سے زیادہ معلومات نہیں اور ان صفحات میں اس سے زیادہ گنجائش بھی نہیں ہے اسے ایک طرح سے اردوئے قدیم کہنا چاہئے ابتدا سے اورنگ زیب کی وفات تک اس داستان کو ختم کر دیا گیا ہے لیکن ان شعراء اور نثر نگاروں کو شامل کر لیا گیا ہے جو ۱۷۰۷ء تک نمایاں حیثیت حاصل کر چکے تھے اگرچہ وہ اس کے بعد عرصہ تک زندہ رہے۔

ہمیں دعویٰ نہیں کہ یہ تالیف ہر اعتبار سے مکمل ہے کسی تصنیف کو جامع بنانے کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمارے پاس نہیں ہیں اس لئے اس تالیف کو حرف آخر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ ادب کا وسیع نظریہ برقرار رہے اس کے بعد بھی ایک تفصیلی تاریخ ادب کی ضرورت باقی رہتی ہے ہم نے ایک قدم آگے بڑھایا ہے اور نئے انداز سے تاریخ ادب کے مطالعہ کی بنیاد رکھی ہے۔ تحقیق میں بھی حتی الامکان ہم نے دست طلب دور دور تک پھیلایا ہے پھر بھی اسے غلطیوں سے پاک نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ تقریباً آٹھ سو سال کی تاریخ کو مرتب کرنا کافی محنت طلب ہے امید ہے کہ ارباب نظر اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے مطلع فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے انشاءاللہ اشاعت ثانی میں ان تبصروں سے مدد لی جائے گی اس مسودہ کی طباعت کے دوران ہمیں بعض ایسی معلومات حاصل ہوئیں جنہیں اس کتاب میں شامل کرنا مفید ہوتا لیکن انشاءاللہ کسی اور موقع پر اس مواد سے کام لیا جائے گا۔ اس کتاب کی تکمیل میں سب سے زیادہ شکریہ کے مستحق جناب فضل الرحمٰن صاحب سابق وزیر تعلیم اور ڈاکٹر سید معین الحق صاحب سکریٹری آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ہیں جن کی تحریک پر اس کام کا آغاز ہوا۔ تمام معاونین بھی شکریہ کے مستحق ہیں جن کی قیمتی کاوشوں نے اس کتاب کی تیاری ممکن بنائی

پیدا کیے۔ مالک و مہتمم پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز قابل مبارک باد ہیں کہ جنہوں نے اندیشہ سود و زیاں سے بلند ہو کر ایک علمی و ادبی کتاب کی طباعت کی ذمہ داریاں اٹھائیں اور قومی فرض ادا کرنے میں سبقت کی۔ آخر میں مجھے اپنے عزیز شاگرد جمیل اختر خاں اور محمد ایوب قادری کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب میں میرا ہاتھ بٹایا ہے۔

عبدالقیوم

۲۶۹ بہادر آباد کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

زبان، الفاظ کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو اظہارِ مطلب کا ذریعہ بن سکے اور جس کے ذریعہ سے ایک انسان اپنا مافی الضمیر دوسرے کو بتا سکے۔ یہ وہ امتیازی صلاحیت ہے جو قدرت نے حضرت انسان کو عطا فرمائی ہے اور جس سے دیگر مخلوقات ارضی محروم ہیں۔ اس کے وجود میں آنے کے متعلق علمائے تاریخ و ماہرینِ لسانیات کی یہ رائے ہے کہ پہلے انسان نے اشارات کے ذریعہ سے اپنے مطالب کا اظہار کرنا سیکھا۔ پھر اشارات کی جگہ مفرد آوازیں استعمال ہونے لگیں اور بالآخر آوازیں مرکب ہونا شروع ہوئیں اور الفاظ وجود میں آئے۔ پھر الفاظ نے ایک دوسرے سے مل کر فقرے اور جملے بنائے۔ انسان کا شعور جیسے جیسے ترقی کرتا گیا اس نے آوازوں کے ملانے، الفاظ بنانے اور جملوں کو ترتیب دینے کے اصول اور قاعدے وضع کئے جس کی تکمیل رفتہ رفتہ سینکڑوں ہزاروں سال میں ہوئی۔

زبان اُن جذبات، محسوسات اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے جو انسان کے دل و دماغ میں ہر وقت پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انسان خوش ہوتا ہے تو خوشی کے جذبات کا اظہار کرتا ہے، رنجیدہ ہوتا ہے تو رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ کبھی خشمگیں ہو کر ایسی باتیں کرتا ہے جس سے غصہ اور جلال کا اظہار ہوتا ہے۔ کبھی وہ تمسخر بھی کرتا ہے۔ طنزیہ کلمے بولتا۔ مذاق اڑاتا۔ اور گالیاں دیتا ہے اور یہ طریقے بھی اظہارِ ناگواری کا وسیلہ ہیں جن سے انسان حسبِ موقع کام لیتا ہے۔ وہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھتا ہے، کانوں سے سنتا ہے اُسے اُن سب باتوں کو بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور انھیں جذبات، مشاہدات اور محسوسات کی مدد سے طرح طرح کے خیالات اُس کے دماغ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا اظہار وہ زبان کے ذریعہ سے کرتا ہے، اس لئے انسان کی زبان سب سے پہلے تو ایسے الفاظ و محاورات کی تخلیق کرتی ہے جن کی مدد سے انسان کے مذکورۂ بالا جملہ اقسام کے جذبات کی ترجمانی ہو سکے اُس کے بعد انسانی افعال و حرکات کا نمبر ہے یعنی انسان اپنے ظاہری و باطنی حواس کے ذریعہ سے اپنے گرد و پیش کی جن چیزوں اور باتوں کو محسوس کرتا ہے اُنھیں بیان کرنے کی بھی اُسے ضرورت ہوتی ہے اور اس بیان کے لئے ہر چیز اور ہر بات کا وہ ایک نام رکھتا ہے اور اُن کے اظہار کے خاص طریقے وضع کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اُس کا ماحول اُس کا معین ہوتا ہے۔ ماحول میں سب ہی کچھ شامل ہے۔ آب و ہوا کی مختلف کیفیتیں۔ گرمی کا پڑنا۔ سردی کا ہونا۔ پانی کا برسنا۔ آندھی کا چلنا، ہوا کا رُک جانا اور اُن سے متعلق مختلف کیفیتیں سب شامل ہیں۔ سرزمین

کی مختلف حالتیں - دریا - پہاڑ - جنگل - بیابان - طرح طرح کی جمادات و نباتات -
مختلف قسم کے جانور اور پرندے جو کچھ اُس کے گرد و پیش موجود ہے اُن سب
کے وہ نام رکھتا ہے اور اُن سے متعلق جزئیات تک کے متعین کرنے اور بیان
کرنے کے لئے وہ الفاظ اور محاورے وضع کرتا چلا جاتا ہے - خود انسانوں کی
نسل و رنگ - اُن کی عادات و اطوار ، اُن کے رسم و روایات اُن کے
عقائد و مذاہب ، اُن کے مشاغل و مسائل ، اُن کی ثقافتی و سیاسی سرگرمیاں
غرض کہ سب ہی باتوں کے متعلق وہ اظہار خیال اور آپس میں تبادلہ خیالات
کرتا ہے اور اس ضرورت کے لئے اُسے انواع و اقسام کے الفاظ و محاورات
وضع کرنا پڑتے ہیں اور یہی مجموعہ ایک زبان کا سرمایہ ہوتا ہے -

جس طرح کچھ جغرافیائی عوامل شکل و وقوع - ارضی حالت - سمندر
سے قربت وغیرہ وغیرہ ایک خطہ کی آب و ہوا پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح
آب و ہوا اور اُس کی مختلف کیفیات اُس خطہ ارضی کی پیداوار کو متعین کرتی
ہے اور پیداوار انسان کے مشاغل و وسائل معاش کو تشکیل دیتے ہیں اور مشاغل
و وسائل معاش اُس خطے کے انسانوں کی ثقافت و معاشرت کو معرض وجود میں لاتے
ہیں - زمانہ قدیم میں انسان کے معتقدات و مذاہب بھی بڑی حد تک پیداوار
و وسائل معاش وغیرہ سے متاثر ہوتے تھے - آگ - دریا - پہاڑ - سورج اور بادل
وغیرہ کی پرستش انہی وجوہ پر مبنی تھی کہ ان سے انسان کی اغراض ہمیشہ وابستہ رہی ہیں مگر
الہامی مذاہب نے انسان کو ایک بلند تصور عطا کیا جس کی وجہ سے عقیدہ و مذہب
دل کے اثر سے آزاد ہو گئے اور انھوں نے خود ایسی اہمیت حاصل کر لی کہ

زبان کی تدوین و تعمیر میں مذہب و اعتقاد کو بھی بڑا دخل حاصل ہو گیا چنانچہ ہر قوم یا ملک کی
زبان اُس ملک کی آب و ہوا، پیداوار، مشاغل و وسائل معاش اور تہذیب و
ثقافت سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں کے باشندوں کے عقائد و مذاہب
سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ ایک خطہ کی زبان کے الفاظ و محاورات اُسی
سرزمین اور وہاں کے رہنے والوں ہی سے تعلق رکھنے والی چیزوں اور باتوں
سے متعلق جذبات، خیالات و محسوسات کی ترجمانی کر سکتے ہیں، غیر جگہ یا دوسری
سرزمین کی وہ چیزیں اور باتیں جو یہاں موجود نہیں اُن کے متعلق جذبات، خیالات
اور محسوسات کی ترجمانی بھی یہاں کی زبان میں نہیں کی جا سکتی حتیٰ کہ وہ پھل جو
انگلستان یا امریکہ میں پیدا ہوتے ہیں اور یہاں نہیں پائے جاتے ہماری زبان میں
اُن کے نام تک موجود نہیں۔

دنیا کی تمام زبانیں اپنی ابتدائی حالت میں اسی طرح وجود میں آئیں اور
اُسی سرزمین کی خصوصیات کی ترجمانی تک محدود رہیں مگر آبادیاں رفتہ رفتہ بڑھتی
اور وسیع ہوتی گئیں اور ایک خطہ کے وسائل وہاں کی آبادی کے لئے ناکافی
ثابت ہوئے تو دوسری جگہ بہتر وسائل معاش کا علم ہونے پر اُن سے
فائدہ اُٹھانے، اُن پر قبضہ کرنے یا وہاں جا کر آباد ہو جانے کی
خواہش پیدا ہوئی جس کا نتیجہ انتقال آبادی کی صورت میں رو
اور انتقال آبادی سے مختلف خطوں کے باشندوں میں تصادم
اور ٹکراؤ ہونا شروع ہوئے جن کا سلسلہ آج تک جاری ہے مگر ابتدائی
دور میں جس چیز نے زبانوں کو فطری حدود سے نکالا اور مختلف زبانوں میں

پیدا کیا اُس کا سبب یہی ہوا کہ ایک قوم نے قدرت کے بخشے ہوئے وسائل
معاش پر اکتفا نہ کرکے دوسروں کے وسائل کو زبردستی چھین لینے کی کوشش
شروع کی اور اس طرح دنیا کی تمام اقوام اُٹھ کھڑی ہوئیں اور ایک دوسرے
سے برسرِ پیکار ہو گئیں۔ دوسروں کی سرزمین میں زبردستی گھس پڑیں وہاں
کے وسائلِ معاش پر قابض ہو گئیں حتیٰ کہ اپنا وطن عزیز چھوڑ کر غیر ملک میں
آباد ہو گئیں اور اُسی کو اپنا وطن بنا لیا۔

اس عمل کا نتیجہ انسانی مصائب اور اتلافِ جان و مال کی صورت میں
جس حد تک رونما ہوا اُس سے یہاں بحث نہیں یہاں تو صرف اس پہلو پر توجہ دلانا مقصود
ہے کہ اس طرح مختلف زبانیں بولنے والے ایک جگہ مجتمع ہو گئے اور ان مختلف زبانوں
میں امتزاج ہونا ناگزیر ہو گیا۔ اس قسم کے انتقالِ آبادی کا ایک سلسلہ ہے جو ہزاروں
سال قبل مسیح سے شروع ہوا ہے اور کم و بیش اب تک جاری ہے۔ دنیا کا کوئی
خطہ ایسا نہیں ہے جو اس انتقال و امتزاجِ آبادی سے محفوظ رہا ہو۔ اسی بنا پر [illegible]
کی کوئی زبان خالص نہیں رہ گئی ہر زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ شامل ہیں
اور اب تو وسائلِ آمد و رفت کی آسانی و فراوانی کی وجہ سے دنیا کی وسعتیں سکڑ گئی
ہیں۔ جنگ و جدل اور قرونِ اولیٰ کی طرح کثیر تعداد میں انتقالِ آبادی نہ سہی۔
معاشی و تجارتی مقاصد کی غرض سے ہر ملک کے لوگ دوسرے ممالک کے
باشندوں سے ملنے اور تعلقات پیدا کرنے پر مجبور ہیں جس کا اثر بڑی تیزی سے دنیا
کی تمام زبانوں پر پڑ رہا ہے اور غیر محسوس طریقے سے ان میں یکرنگی پیدا کر کے ہر
ایک کو دوسرے سے قریب تر لاتا جاتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی ابتدائی تاریخ اور اس کا ثقافتی و لسانی ردِ عمل

قوم آریا کے ورود سے بہت قبل ہندوستان میں نوحجری، نیولیتھک[1] (NEOLITHIC) یا نیگریٹو[2] اور آسٹرک و نیز تبتی قبائل و اقوام آباد تھیں جن کی نسل سے گورکھا، بھوٹانی اور کھاسی قومیں اب بھی موجود ہیں جو ہندوستان کے بعض حصوں میں آباد ہیں گویا ان نوحجری اقوام کو ان قوموں کا مورث اعلیٰ سمجھنا چاہئے جن کی آبادی نیپال و بھوٹان اور مشرقی بنگال و آسام میں پائی جاتی ہے یا انھیں کی ایسی قومیں تھیں، بہرحال ان کو ہندوستان کا اصل باشندہ سمجھنا چاہئے اور ان کی زبانوں یعنی نیپالی، بھوٹانی اور آسامی کو ہندوستان کی اصل قدیم زبانیں تسلیم کرنا چاہئے۔ کوٹ ڈیجی کی تہذیب غالباً انھیں قدیم باشندوں کی تہذیب تھی جو وادی سندھ کی تہذیب سے زیادہ پرانی اور اس کی مورث سمجھی جاتی ہے جس سے موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے باشندوں نے ہر قسم کی ثقافتی اور فنی تصورات حاصل کئے جن میں شہر کی منصوبہ بندی، قلعہ سازی و قلعہ بندی، مذہبی عقائد و شعائر سب ہی کچھ شامل ہیں۔ حجری انقلاب کے فوراً بعد یہاں کے تمدن نے جنم لیا۔ کوٹ ڈیجی میں اوپر تلے گیارہ آبادیوں کی تہیں ملتی ہیں جن کی مدت کا اندازہ پانچ چھ سو سال کرنا چاہئے۔ کوٹ ڈیجی کے اصل باشندے تقریباً تین ہزار

---

[1] ہندوستان کی ایڈوانسڈ ہسٹری مؤلفہ ڈاکٹر مجمدار ص ۱۳

[2] تاریخ زبان اردو مؤلفہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ فٹ نوٹ ص ۲

سال قبل مسیح یہاں آئے اور چار پانچ سو سال تک یہاں آباد رہے حتیٰ کہ وادی سندھ کے لوگوں نے ان کی جگہ لے لی۔

مارشل میکے، کرنل سیول اور مسٹر گوہا نے تحقیقات کے بعد جو رپورٹ شایع کی ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ موہنجو دارو میں آسٹریلوی، بحر رومی، الپائنی اور منگولی چار مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے۔ یہاں کی سب سے زیریں تہوں سے جو کھوپڑیاں برآمد ہوئی ہیں وہ انہیں نسلوں کی ہیں۔ جن میں نصف سے زیادہ تعداد ایسی کھوپڑیوں کی ہے جو بحر رومی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ پروفیسر اسٹوارٹ پگٹ (STUART PIGGOT) نے اپنی تاریخ (PRE HISTORIC INDIA PP. 145-146) میں لکھا ہے کہ بحر رومی نسل کے لوگ آئبیریا سے ہند تک بڑی تعداد میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس جنس کے خاص نمونے فلسطین کے اندر نطوفی دور میں ملتے ہیں، یہ گروہ شمالی افریقہ کے جنوبی ڈھلواں میں اور ایشیا کے اندر ایک دوسرے سے ممتاز ہونے اور آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ زمانۂ ماقبل فراعنہ کے لوگ اسی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس گروہ کے خالص ترین نمائندے عرب کے جزیرہ نما میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے اندر شمال کی آبادیوں نیز دوسرے مقامات کی اعلیٰ جاتیوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ میانہ قد بھی ہوتے تھے۔ بلند بالا بھی۔ رنگ سانولا بھی۔ زیتونی قسم کا بادامی بھی۔ کھوپڑی اور چہرہ لمبوترا۔ تیکھے ہوئے بانسے کی ستواں ناک۔ بال کالے۔ آنکھیں بڑی بڑی کشادہ، کالی بھی اور بادامی

بھی۔ بدن کی ساخت نحیف۔ مختلف باقیاتی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ یہ
لمبوتری کھوپڑی والے بحر رومی لوگ ممالک سیالک، اناد، العبید اور
علی شہر وغیرہ مغربی ایشیا کی قدیم ترین کاشتکار آبادیوں میں ہر جگہ موجود
تھے۔ العبید کی کھوپڑیاں موہنجوداڑو کی کھوپڑیوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔
وادی سندھ کے باشندوں کی نسل کے بارے میں محققین نے کچھ اور
نظریے بھی قائم کئے ہیں چنانچہ ان کو دراوڑ، بروہی، سمیری، پانی، آشور،
رواتی، داسیکے، داس ناگے اور آریے وغیرہ بھی کہا گیا ہے۔ مگر اکثریت ایسے
محققین کی ہے جو انھیں دراوڑ سمجھتے ہیں لیکن دراوڑ کا لفظ برصغیر ہند و پاکستان
میں غیر آریائی زبان بولنے والی تمام قوموں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جس سے
یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ دراوڑ نسلی گروپ سے زیادہ لسانی گروپ
کا نام ہے چنانچہ یہاں کے وہ باشندے بھی جن کو پراچین ہندوستان کا باسی
کہا جاتا ہے اور جو آج بھی وسط اور جنوبی ہندوستان میں نیم وحشی زندگی بسر
کرتے ہیں اور پروٹو آسٹرلائڈ یا آسٹریلوی نسل سے تعلق رکھتے ہیں دراوڑ
کہلاتے ہیں۔ نیز وہ باشندے بھی دراوڑ کہلاتے ہیں جن کو بحر روم کی
نسل سے سمجھا جاتا ہے اور جن کے بارے میں یہ قیاس کیا گیا ہے کہ وہ
ہندوستان میں آریوں کی آمد سے کئی ہزار سال پہلے داخل ہو چکے تھے بروہی

لہ VEDIE AGE P.193

سہ وادی سندھ کی تہذیب

جو دراوڑی زبان بولتے ہیں ترکی ایرانی نسل کے ہیں اور نسلی اعتبار سے
وسطی اور جنوبی ہندوستان کی دراوڑی زبان بولنے والی دوسری نسلوں سے
قطعی طور پر جداگانہ اور اس برصغیر کی دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہیں
چنانچہ یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ وادی سندھ کے باشندے بروہی نہ تھے
سمیری لوگوں کی نسلی کیفیت کے بارے میں ابھی کوئی قطعی بات نہیں کہی
جاسکتی۔ البتہ موہنجوداڑو کے لوگوں سے اُن کے بہت قریبی
تعلقات تھے اور یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ وادی سندھ میں کافی سمیری
آباد تھے۔ پانی اور دوسری قوموں کے بارے میں اب تک ایسی کوئی ٹھوس
دلیل پیش نہیں کی گئی ہے کہ ہم ان کو کسی معلوم شدہ نسل سے منسوب
کرسکیں۔ مگر اس بات پر بھی تقریباً تمام محققین متفق ہیں کہ وادی
سندھ کی تہذیب آریوں کے برصغیر پاک و ہند میں داخل ہونے سے
پہلے کی تہذیب ہے۔ اس لئے اُن کا آریہ ہونا یکسر غلط اور نسلی
عصبیت کی ایک بھونڈی مثال ہے۔

اُن آثار قدیمہ میں جو کوٹ ڈیجی، موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی زیریں
تہوں سے برآمد ہوئے ہیں کچھ سکے، کثیر تعداد میں مہریں اور چند کتبے بھی
دستیاب ہوئے ہیں جن پر کچھ نشانات بنے ہوئے ہیں۔ مگر اوّل تو دو تین ہزار سال
قبل مسیح کا زمانہ ہی ایسا زمانہ ہے کہ جب دنیا میں لکھنے کا فن ایجاد نہیں ہوا
تھا یا ہوا تھا تو اپنی ابتدائی شکل میں تھا جس کی حیثیت نشانات، اشارات
اور تصویری خاکوں سے زیادہ نہ تھی اس لئے یہ تعین کرنا کہ اُن کی زبان کیا تھی

یا دنیا کی زبانوں کے کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی بہت مشکل ہے مگر نسلی تعلق کے متحقق ہو جانے کے بعد یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان بحیرہ روی اقوام کی زبانیں جو ہندوستان میں آئیں سامی زبانوں یعنی عبرانی و عربی وغیرہ سے تعلق رکھتی تھیں اور داہنے سے بائیں کو لکھی جاتی تھیں۔ جو مہریں کثیر تعداد میں یہاں برآمد ہوئی ہیں اُن کے متعلق مولانا ابو جلال ندوی کی تحقیق یہ ہے کہ رسم الخط عربی رسم الخط سے مشتق ہے۔ اُنھوں نے یہاں کی مہروں پر قدیم عربی حروف دریافت کئے ہیں بلکہ اُن کے خیال کے مطابق ان مہروں پر نہ صرف عربی رسم الخط میں حروف کندہ ہیں بلکہ جو نقش و نگار بنے ہیں اُن کو بھی وہ عربی ہی بتاتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ صانعین مہر کا منشاء تصویروں کے ذریعہ سے عربی زبان لکھنے پڑھنے کی تعلیم دینا تھا۔ گویا مہریں تعلیمی تاش کی قسم کی چیزیں ہیں اور درسی لوحوں کی حیثیت رکھتی ہیں (رسالہ تاریخ و سیاست، انجمن ترقی اُردو، پاکستان۔ نومبر ۱۹۵۳ء) ان لوحوں کے متعلق بھی بعض علامات سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ تحریر بھی داہنے سے بائیں کو لکھی گئی ہوگی۔ اسی طرح ڈاکٹر مجمدار نے اپنی تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اشوک کی لاٹوں کے کتبے بھی کسی ایسی زبان سے تعلق رکھتے ہیں جن کی اصل سامی ہے۔

بہر حال اوپر کی بحث سے یہ امر متعین ہو گیا کہ وادی سندھ کی تہذیب آریا تہذیب سے قدیم ہے اور موہنجو دارو اور ہڑپہ کی زیرین ترین تہوں سے جو کھوپڑیاں برآمد ہوئی ہیں اُن میں نصف سے زیادہ بحیرہ رومی نسل سے تعلق

رکھتی ہیں یہ امر اس بات کا ثبوت ہے کہ وادی سندھ میں اکثریت بحر رومی نسل کے لوگوں کی تھی نیز دراوڑی اقوام کے متعلق اکثر محققین کی دریافت یہ ہے کہ یہ لوگ مغرب سے ہندوستان میں وارد ہوئے اور عرب یا بحر روم کی ساحلی اقوام میں سے تھے۔ یقیناً دراوڑ سے مراد اُن کی اسی بحر رومی نسل کے لوگوں سے ہوگی اور انہیں کو خصوصیت کے ساتھ یہ لقب دیا گیا تھا مگر بعد میں اس لفظ کا اطلاق تمام غیر آریائی اقوام پر ہونے لگا پس وادی سندھ کی تہذیب کے بانی یہی بحر رومی تھے جو دراوڑ کہلاتے تھے اسی وجہ سے محققین کا اجماع بھی اس امر پہ ہے کہ دراوڑ وادی سندھ کے اصلی باشندے اور یہاں کی تہذیب کے اصل بانی تھے۔

دراوڑ نام کے بحر رومی اقوام کی آبادی صرف سندھ ہی تک محدود نہ تھی بلکہ تقریباً تمام شمالی ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی چنانچہ مسٹر لیٹے گھوش نے ۱۹۵۱ء میں جب دریائے گھاگھر کی خشک گزرگاہ کا جائزہ لیا تو جیسلمیر اور بیکانیر میں وادی سندھ کے عہد کی تقریباً پچیس نئی بستیاں دریافت کیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب کا صحیح زمانہ کیا ہو سکتا ہے اس سلسلہ میں بھی مذکورہ بالا مہروں کی دریافت سے کافی مدد ملتی ہے اور ماہرین حفریات کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جن تہوں سے یہ مہریں حاصل ہوئی ہیں اُن کی تاریخ تقریباً ۲۵۰۰ سال قبل مسیح سے ۱۵۰۰ سال قبل مسیح ہے لیکن ان کا یقینی عہد ۲۳۵۰ سال قبل مسیح سے ۱۷۰۰ سال قبل مسیح مانا جاتا ہے اور اسی

زمانہ کو وادی سندھ کی تہذیب کا زمانہ سمجھنا چاہئے۔ مگر اس سے بھی قدیم کلی گل محمد سے برآمد کی ہوئی باقیات ہیں اور وہاں کا کلچر چار ہزار سال قبل مسیح کا کلچر کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر موہنجو دارو سے ۸۵ میل جنوب اور چنہو دارو سے ۲۵ میل مغرب میں آمری گاؤں کے قریب دو ٹیلے ہیں۔ یہاں ماہرین نے دو خندقیں کھدوائی تھیں جن میں پتھر کی چند دیواروں اور کمروں کے آثار برآمد ہوئے یہاں دو تہذیبوں کے نشانات ملتے ہیں۔ بالائی تہ میں وادی سندھ کے عہد کی باقیات اور اس کے نیچے بلوچستان کی دیہی ثقافت کے آثار پائے گئے ہیں نیز علی مراد اور دابر کوٹ میں بھی جو کھدائیاں ہوئی ہیں ان سے بلوچستان کی دیہی ثقافت اور اوپر کی تہوں سے وادی سندھ کی تہذیب کے نشانات ملتے ہیں۔

ترقی یافتہ کاشتکاری اور مستقل آبادی مشرق قریب میں تقریباً پانچ ہزار سال قبل مسیح میں شروع ہوئی۔ پاکستان میں اس قسم کی بستیاں بلوچستان اور جنوبی سندھ میں تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح سے موجود ہیں لیکن بلوچستانی تہذیب جو وادی سندھ کی تہذیب سے قدیم ترتھی اُسے دیہی تہذیب کہنا چاہئے۔ برعکس اس کے وادی سندھ کی تہذیب قصباتی یا شہری تہذیب تھی اور بلوچستانی تہذیب سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ وادی سندھ کی تہذیب کا سندھ کے مغربی جانب بسنے والے علاقوں اور خصوصاً مغربی پاکستان کی مغربی سرحدوں کے اس پار کے ممالک کی تہذیب سے رابطہ بڑی اہمیت

رکھتا ہے کیوں کہ سمیر اور بابلی تہذیبوں کے عہد متعین ہو چکے ہیں اور اُن کی مدد سے ہم یہاں کی تہذیب کی تاریخیں بھی متعین کر سکتے ہیں۔ بلوچستان ان دونوں تہذیبوں کے علاقوں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے کم و بیش ایک سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔

موہنجوداڑو کی شاہراہوں گلیوں۔ مکانوں گندی نالیوں کنوؤں اور غسلخانوں سے یہاں کی قصباتی منصوبہ بندی بلدیاتی نظام اور صحت عامہ کے اصولوں کا بڑی حد تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور انہی تہوں سے جو اینٹیں برآمد ہوئی ہیں اُن کے متعلق بعض ماہرین تعمیرات کا یہ خیال ہے کہ یہ اپنے تناسب اور سڈول ہونے کے اعتبار سے بہترین اینٹیں ہیں اور سمیر اور مصر کی رومی عہد سے قبل کی اینٹوں و نیز دیگر ممالک میں برآمدہ شدہ اینٹوں سے کہیں بہتر ہیں۔

مندرجہ بالا شواہد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وادی سندھ کے لوگوں نے قصباتی منصوبہ بندی اور فن تعمیر میں کافی ترقی کی تھی کیونکہ اس تہذیب کی بربادی کے بعد تقریباً ایک یا ڈیڑھ ہزار سال تک برصغیر ہند و پاکستان میں نہ تو ایسی شاندار عمارات ہی بنائی گئیں اور نہ ایسی باسلیقہ بلدیاتی منصوبہ بندی ہی کی گئی۔ چنانچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قصباتی منصوبہ بندی اور فن تعمیر کی یہ معراج وادی سندھ کے ان قدیم فرزندوں کے صدیوں کے تجربوں اور پیہم سعی و عمل کا نتیجہ تھی۔

ان زیریں تہوں سے جو مٹی کے ظروف برآمد ہوئے ہیں وہ بھی بہت

عمدہ ہیں۔ مگر ان کے متعلق مسٹر میکائی کا خیال ہے کہ ایسے ظروف وادی سندھ کی تہذیب سے قبل بنائے جاتے تھے اور وادی سندھ کی تہذیب کے عروج میں ان کا استعمال موقوف ہو چکا تھا اس قسم کے برتن سمیر میں بھی برآمد ہوتے ہیں۔ مگر اُن کا عہد بھی وادی سندھ کی "تہذیب سے قبل کا عہد متعین کیا گیا ہے۔ چند ایسے ظروف بھی ملے ہیں جن کی بیرونی سطح پر گول دانے یا گھنڈیاں اُبھاری گئی ہیں۔ اس قسم کے برتن بالائی عراق اور تل الاسمر نامیں بھی پائے گئے ہیں اور ان دونوں ممالک ... وادی سندھ کی تہذیبوں کے رابطے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مٹی کے ظروف جو نچلی تہوں سے برآمد ہوئے ہیں وہ زیادہ پُرانے اور زیادہ عمدہ ہیں چنانچہ مسٹر میکائی لکھتے ہیں :-

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک یہ فن اور اس کی تکنیک کم و بیش جاری رہی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ صنعت رو بہ انحطاط رہی ہے تو زیادہ مناسب ہوگا غالباً اس فن کی ترقی اور عظمت کا زمانہ بہت پہلے گذر چکا ہوگا اور ہم جس عہد کی تہذیب کے انکشاف سے اچانک روشناس ہو گئے ہیں اُس سے قبل بھی کوئی عہد اس سرزمین (ہڑپہ اور موہنجو دارو) پر ترقی اور عروج کا گذر چکا ہوگا۔

وادی سندھ کے مکین سونا، چاندی، رانگا، تانبا اور کانسے کے استعمال سے واقف تھے۔ موہنجو دارو اور ہڑپہ کے زیریں حصوں سے جو اس تہذیب کے قدیم ترین دور کے مظہر ہیں تانبے اور کانسے کی بنی ہوئی لاتعداد چیزیں ملی ہیں۔ نیز تلو، اریدو اور ال عبید سے دریافت شدہ باقیات سے بھی اندازہ ہوتا ہے

کہ وہ لوگ بھی تین ہزار سال قبل مسیح میں کانسے کے استعمال سے واقف تھے اور تقریباً اسی عہد میں تانبا اور کانسا وادی سندھ میں بھی مستعمل تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ وادی سندھ سے دریافت شدہ چاقو اور خنجر سوسا اور اناؤ سے برآمد شدہ چند چاقوؤں اور خنجروں سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں۔ اس بنا پر مذکورہ بالا مقامات کی اس زمانہ کی تہذیب کو کانسے کا عہد کہنا چاہئے۔ جانوروں کے مجسموں اور دوسری مورتیوں کے بنانے میں بھی وادی سندھ والوں نے تانبہ اور کانسہ کو بڑی چابک دستی اور مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے جو اس امر کی قطعی شہادت ہے کہ یہ لوگ معدنیات کے بہترین کاریگر تھے۔

جنوب مغربی ایشیا کے دریاؤں کے کناروں کی تمام قدیم بستیاں جو کھود کر برآمد کی گئی ہیں اُن میں ایسی مشترک خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب سمیر کی قدیم تہذیب اور ایلام اور میسوپوٹامیہ کے طوفانِ نوح سے قبل کے دور کی تہذیب کے ہم عصر تھی۔ اس کا اندازہ اُن باقیات کی تحقیق سے ہوتا ہے جو اس زمانہ میں سفر و تجارت کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لائی اور لے جائی گئی تھیں اور جو وادی سندھ اور میسوپوٹامیہ سے قبل مسیح کے تین ہزار سالہ دور کی آخری نصف صدیوں اور دو ہزار سالہ دور کی ابتدائی نصف صدیوں کی باقیات میں ملی ہیں۔ موہنجو دڑو اور ہڑپہ کی ایسی بعض مہریں کش، سوس، لاگاش، اما، اور تل اسمبر اور موصل کے قریب سے بھی حاصل کی گئی تھیں۔

"تل اسمر کی عکادی دور کی تہوں میں جہاں سے اوپر بیان کی ہوئی مہروں میں سے دو مہریں ملی تھیں وادی سندھ کی پچی کاری کے سنکھ کے بنے ہوئے گردے کی شکل کے ٹکڑے اور ان کے ہمراہ وہ گھنڈی دار ظروف بھی ملے ہیں جو موہنجو دارو اور ہڑپہ دونوں جگہ پائے گئے ہیں۔ ایسے ظروف کسی دوسرے مقام سے متعلق نہیں کہے جا سکتے اور بلاشبہ وادی سندھ سے اسی دور میں وہاں پہنچے ہوں گے۔

اسی طرح سبزی مائل بھورے پتھروں کے برتنوں کے ایسے ٹکڑے جن پر چٹائی کی پٹیوں کا ایسا ڈیزائن بنا ہوا ہے۔ موہنجو دارو کی ابتدائی تہوں میں دریافت ہوئے تھے۔ اسی قسم کے ٹکڑے آرکش اور لاگاش میں ابتدائی دور فراعنہ میں دریافت ہوئے ہیں۔ پروفیسر پگٹ کے قول کے مطابق وہ مکران اور سیستان میں بنائے جاتے تھے اور وہیں سے مشرقی اور مغربی ممالک میں برآمد کیے جاتے تھے۔ مختلف شکل کے نقوش والے نیم قیمتی پتھروں کے بنے ہوئے منکے وادی سندھ اور تل اسمار کے عکادی دور کے لوگ ایک ہی وقت میں استعمال کرتے تھے۔ سونے کی گول چپٹی ٹکلیاں جو ہاروں میں پروئی جاتی تھیں اور جن میں دھاگا گزارنے کی نلیاں بھی بنی ہوئی تھیں موہنجو دارو اور میسوپٹامیہ کے عکادی دور اور ٹرائے کی تہ IIج (جس کی تاریخ ۲۳۰۰ ق۔م۔ ہے) میں دریافت ہوئے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب کی وہ خصوصیات جو ہمیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں مغربی ایشیا کی قدیم تہذیبوں میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں چنانچہ وادی نیل کا علاقہ ہو یا دجلہ و فرات کا۔ دریائے قارون کی سرزمین ہو یا ہلمند اور دریائے سندھ کے وسیع میدان یہ سارے علاقے کسی تہذیب کی پیدائش اور ترقی

کے لیے بہت مناسب ہیں۔ وران کی قدیم تہذیبوں میں ایک گونہ مشابہت
پائی جاتی ہے بلکہ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو ان تمام تہذیبوں کی
مشترکہ خصوصیات کی ایک لمبی فہرست تیار کی جا سکتی ہے۔

ان تمام تہذیبوں میں اولیت کا شرف سمیری تہذیب کو حاصل ہے
دجلہ فرات کی یہ تہذیب دریائے سندھ کی تہذیب پر سبقت رکھتی ہے۔ مثلاً
برتن بنانے کے لیے کمہار کا چاک اور گاڑیوں کے گول پہیے سمیر میں تقریباً
۳۰۰۰ سال قبل مسیح میں دریافت ہوئے تھے اور ہو سکتا ہے کہ یہ فن وہاں سے
ایران اور ایران سے وادی سندھ میں آیا ہو۔ اسی طرح دھات کا کام سب سے
پہلے سمیر میں شروع ہوا تھا اور ہو سکتا ہے کہ وہاں سے دوسری جگہوں پر
پھیلا ہو لیکن وادی سندھ کے صناعوں نے بھی قدیم انسانی تہذیب کی
ترقی میں گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں اور مغربی ایشیا کی کسی تہذیب
میں خواہ وہ میسوپوٹامیہ کی تہذیب ہو یا مصری، ہمیں اتنی خوبصورت
اور عالی کندہ کاری کے نمونے نہیں ملتے جتنے کہ وادی سندھ کی مہروں میں
نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کسی دوسری تہذیب میں غسل خانے، حمام، پختہ
کنویں اور لوگوں کے رہنے سہنے کے مکانات اتنی عمدہ منصوبہ بندی، نفاست
اور ذوقی حیثیت سے نہیں بنائے گئے۔ حال میں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی
ہے کہ ریاست بڑودہ (راجستھانہ بھارت) میں لوتھل کے مقام پر تحقیقاتی
غرض سے جو کھدائی کی گئی تو وادی سندھ کی تہذیب کے آثار کے ساتھ ایسے قدیم
آلات برآمد ہوئے جو علم سائنس سے تعلق رکھتے ہیں اور تقریباً ۲۵۰۰ سال قبل مسیح

کے یعنی ساڑھے چار ہزار سال پرانے بتائے جاتے ہیں۔ اس خبر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وادی سندھ کے یہ قدیم باشندے کس قدر ترقی یافتہ تھے اور ان کے مقابلہ میں بعد کی آنے والی اقوام علمی و ثقافتی اعتبار سے کس قدر پست تھیں۔ وادی سندھ کی تہذیب ایک ہزار میل سے زیادہ رقبہ میں پھیلی ہوئی تھی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جتنی جتنی باقیاتی تفتیش آگے بڑھتی ہے اس کا دامن اتنا ہی وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ بہر حال اس وسیع تہذیب کی دو راجدھانیاں تھیں۔ ہڑپہ اور موہنجو دارو۔

اوپر کی دس تمام تفصیل سے یہ اندازہ ہوا کہ قوم آریا کے ورود سے بہت قبل سے یہ برصغیر ایک ترقی یافتہ ملک تھا جو ایشیا کے دیگر ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش آگے بڑھ رہا تھا اور اس سرزمین کے باشندوں کے تعلقات مغربی ایشیا سے بہت گہرے تھے جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ ان کو وہاں کے باشندوں سے نسلی تعلق بھی حاصل تھا۔ مگر اس تمام تفصیل میں ان قدیم باشندوں کی زبان یا علمی مشاغل پر چنداں روشنی نہیں پڑتی سوائے اس کے کہ یہ جو زبان بولتے تھے وہ سامی قبیلہ کی زبانوں سے تعلق رکھتی تھی اور چونکہ یہ لوگ ثقافتی اعتبار سے اپنے زمانہ میں بہت ترقی یافتہ تھے اس لئے ان کی زبان بھی اس زمانہ کی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں کافی ترقی یافتہ زبان ہو گی اور امتداد زمانہ کے ساتھ اس میں جو تغیرات رونما ہوئے ہونگے ان کے باوجود اس زبان نے ایک بڑا سرمایہ الفاظ و محاورات کا ورثہ میں چھوڑا ہو گا جس کو بعد میں آنے والی قومیں نظر انداز نہ کرسکی ہونگی اور قطعی طور پر وہ ان کی زبانوں میں شریک ہو کر اور ان کا جزو بن کر کسی نہ کسی

شکل میں اب تک باقی رہا ہوگا۔

ہندوستان کی اکثر زبانوں میں ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جو ایران و عرب کی زبانوں کے الفاظ سے مشابہت و مماثلت رکھتے ہیں اور ماہرین لسانیات اُن کی توجیہ کے سلسلہ میں قوم آریا ہی کا جائزہ لے کر بیٹھ رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ابھی تک یہ امر متفقہ طور پر طے نہیں ہو سکا کہ آریا شمال سے آئے یا مغرب سے۔ وہ درۂ خیبر کی راہ ہندوستان میں داخل ہوئے یا ایران کی طرف سے۔ وہ وسط ایشیا کے باشندے تھے۔ یا دریائے والگا کے قرب و جوار کے جو درۂ دانیال اور ایشیائے کوچک سے ہوتے ہوئے ایران و ہندوستان پہنچے۔ وادی سندھ کے قدیم باشندوں کی تہذیب کی سامی تہذیب سے مذکورہ بالا مماثلت اور بالآخر یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ بحر روم کے سواحل کے باشندوں کی ایک شاخ تھے۔ یہ گتھی حل ہو جاتی ہے اور یہ امر بلا شک و شبہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی و پاکستانی زبانوں کی مغربی ایشیا کی زبانوں سے یہ مماثلت اِن قدیمی تعلق کی بنا پر ہے اور چونکہ ثقافتی اعتبار سے وادی سندھ کے قدیم باشندے قوم آریا سے زیادہ ترقی یافتہ تھے اس لئے اُن کی زبان نے آریائی زبانوں پر بے حد اثر ڈالا اور اُن کے صدہا و ہزارہا الفاظ آریا قوم کی زبانوں کا جزو بن گئے اس بنا پر ایرانی اور سامی نسل کی زبانوں سے اُن کو مشابہت ہے ورنہ قوم آریا جو ایک زراعت پیشہ اور گلہ بان قوم تھی۔ دیہاتوں میں رہتی تھی اور ثقافتی اعتبار سے بہت پس ماندہ تھی اُس نے اپنی جفاکشی اور جسمانی طاقت کے زور پر یہاں کی متمدن اور ترقی یافتہ

اقوام پر فتح حاصل کر لی مگر وہ ان قدیم باشندوں کی تہذیب و تمدن سے ایسے مرعوب تھے کہ انھوں نے قصبات اور شہروں کو چھوڑ کر دیہات بسائے اور بہت عرصے کے بعد قصبات اور شہروں کی طرف رُخ کیا۔

محقق مورخین کی ایک اکثریت اس امر پر متفق ہے کہ آریا وسط ایشیاء کے باشندے تھے جو ایک سرد ملک ہے، اس لئے وہ زیادہ طاقت ور اور جفاکش تھے اور یہی سبب اُن کی فتح اور کامیابی کا ہوا۔ مگر وادی سندھ کے باشندے جن سے سب سے پہلے مقابلہ ہوا، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے ان سے بدرجہا برتر تھے[1] اس لئے اُنھیں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ خود اُن کی تہذیب و ثقافت اور خود اُن کی زبان برباد نہ ہو جائے اس لئے اُنھوں نے پہلے تو قصبات و شہر چھوڑ کر دیہات بسائے تاکہ اُن کے قدیم باشندوں سے الگ تھلگ رہیں مگر اُن کی برتر تہذیب اور اعلیٰ زبان نے اُن کی تہذیب اور زبان کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ اس لئے اُنھوں نے اپنی زبانوں خصوصاً مذہبی منتروں وغیرہ کو جو اُن کی زبان میں تھے محفوظ رکھنے کی غرض سے اپنی زبان کا سیکھنا یا جاننا یہاں کی قدیم آبادی کے لئے ممنوع قرار دیا اور اسی غرض کے لئے اُنھوں نے ان قدیم باشندوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اس تمام خطہ ہی کو چھوڑ کر جنوب اور مشرق کی طرف منتقل ہو جائیں۔ تاہم پورے ملک کو ان قدیم باشندوں سے خالی کرا لینا خود اپنے مصالح اور ضروریات

---

[1] تاریخ زبان اردو ص ۲۰، ۲۱ و نیز پاکستان کے پانچ ہزار سال مؤلفہ زہیر ص ۳۱

کی بنا پر ممکن نہ تھا۔ اقتدار کے ساتھ خدمت لینے کی خواہش بھی ضرور پیدا ہوتی ہے اور ادنےٰ قسم کے کام کرنا آدمی کو بالطبع اچھا نہیں لگتا۔ کچھ نہیں تو غلاموں، خدمت گاروں اہتر طبقے پیشوں اور ایسے ہی ذلیل کاموں کے لئے اُن کو اُن پرانے باشندوں کی ضرورت تھی، اس لئے مکمل طور پر انہیں دیش نکالا نہیں دیا جا سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود کوشش اور احتیاط کے اپنی معاشرت، زبان بلکہ جیسا تاریخ سے ثابت ہے اپنے معتقدات[1] کو اُن کے اثر سے محفوظ نہ رکھا جا سکا۔ کہا جاتا ہے کہ آریا ابتدا میں بُت پرست نہ تھے۔ غالباً بُت پرستی ہند میں اُنھوں نے یہیں کے دراوڑوں سے سیکھی جو مذہبی جذبات کے طور پر بت پرستوں کے مورتوں سے نسلی تعلق رکھتے تھے۔ اور رفتہ رفتہ اُن کے صدہا و ہزارہا[2] الفاظ و محاورات بھی آریوں کی زبانوں میں داخل ہو گئے۔ بلکہ کچھ عرصے کے بعد خود آریوں کو اپنی خاص دیوبانی ویدک زبان کے علاوہ مقامی زبانیں[3] سیکھنا، اختیار کرنا اور بولنا پڑیں اور یہی زبانیں ہیں جو پراکرتوں اور اپ بھرنشوں کے نام سے موسوم ہوئیں۔[4]

دراوڑی اقوام کے بعد وسط ایشیا[5] سے ایک بہت بڑی تعداد میں

---

[1] تاریخ زبان اُردو صفحہ ۲

[2] تاریخ زبان اردو مؤلفہ ڈاکٹر مسعود حسین خان صفحہ ۲۷

[3] آب حیات صفحہ ۵ و نقوش سلیمان صفحہ ۱۲۵

[4] انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۲ صفحہ ۵۵

[5] تاریخ زبان اردو صفحہ ۱۸

آریا یا ایرین قومیں آتی رہیں جن کا سلسلہ غالباً عرصہ تک جاری رہا۔ یہ سرد ملک کے رہنے والے تھے اس لئے جسم کے بہت مضبوط، طاقت ور اور جفاکش تھے اور یہی سبب ان کی فتح اور کامیابی کا ہوا، ورنہ جیسا اوپر بتایا گیا۔ یہ ایک جاہل اور پس ماندہ قوم تھی جو[1] تہذیب و ثقافت، علم و عقل میں اس برصغیر کے پرانے باشندوں کی قطعاً ہمسر نہ تھی اور در حقیقت یہی سبب تھا جس کی بناء پر اُن کو اپنی دیوبانی زبان یا مذہب اور ثقافت کی غیر معمولی حفاظت کی ضرورت پڑی اور اُنہوں نے اپنی ہر چیز کو اُن سے چھپانے اور بچانے کی کوشش کی اور چھوت چھات کے اس قدر شدید اور احمقانہ قاعدے وضع کیے۔

ان کی آمد کا سلسلہ عرصہ تک بلکہ کئی صدی تک جاری رہا اور جسمانی طاقت اور جفاکشی کی خصوصیت کی بنا پر یہاں کی مہذب اقوام پر اُن کو فتح حاصل ہوئی اور چونکہ یہ لوگ کاشتکار اور گلہ بان تھے اس لئے آتے ہی دیہاتوں میں پھیل گئے اور اُس ابتدائی زمانہ میں وسائل معاش تمام تر کاشتکاری اور جانوروں کی دولت اکٹھا کرنے تک محدود تھے سارے معاشی نظام کا انحصار انھیں دونوں کلیدی پیشوں پر تھا اس لئے آریوں نے آکر دیہاتی وسائل یعنی کاشتکاری اور گلہ بانی پر قبضہ کر لیا۔ اُنھوں نے جن شہروں کو فتح کیا اُن پر قبضہ حاصل کرنے کی مدتوں کوشش نہیں کی۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹینکا ۱۹۵۵ء اڈیشن جلد ۱۲ صفحہ ۱۵۲۔

وہ دراوڑی اقوام ہی کے قبضہ میں رہے مگر وسائل معاش کے لئے وہ آریوں کے دست نگر تھے نتیجہ یہ ہوا کہ قصبات اور شہر عرصہ تک تنزل پذیر ہوتے گئے اور خود آریا صدیوں کے بعد تہذیب اور شائستگی کے اُس معیار پہ پہنچے کہ قصبات اور شہروں کو ترقی دے سکے۔

ابتداء میں یہ لوگ پنجاب میں آکر آباد ہوئے۔ رگ وید کا کچھ حصّہ[1] اُس وقت کا ہے جب یہ ہندوستان میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ بقیہ حصّہ پنجاب کے قیام میں تکمیل کو پہنچا۔ اس آخری حصہ میں پنجاب کے حوالے موجود ہیں۔ اس کے بعد مشرق میں دریائے سرسوتی کی نواح میں یہ لوگ مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ اس لئے یہی علاقہ برہمنوں کی پاک سرزمین کہلایا اور جمنا کے کنارے ان میں اور غیر آریا اقوام میں جنگیں ہوئیں جن میں اُنھیں فتح حاصل ہوئی اور یہی فتح شمالی ہندوستان میں ان کے قدم جمنے اور استقلال حاصل ہونے کا اصل سبب ہوئی۔ اس کے بعد پنجاب کی اہمیت ختم ہو گئی۔ اس لئے دوسرے ویدوں میں پنجاب کا ذکر موجود نہیں بلکہ اب کورو کا ملک جس کا صدر مقام ہستناپور تھا۔ اُن کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ یہیں برہمن مذہب کی تدوین ہوئی اور یہیں قدیم سنسکرت جس کو تقریباً ایک ہزار سال تک شمالی ہندوستان میں اہمیت حاصل رہی وجود

---

[1] تاریخ زبان اُردو ص۲۰ وایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا مولفہ ڈاکٹر مجمدار وغیرہ ص۲۳

میں آئی۔ کورو کی سیاسی طاقت نے بھی یہیں جنم لیا جس کا ذکر مہابھارت کتاب میں موجود ہے۔

کوشلہ اور مگدھ: چھٹی صدی قبل مسیح کے آخر میں گوتم بدھ (۵۶۳ تا ۴۸۳ ق۔م) نے بدھ مت اور وردھمانا مہاویر (۵۴۰ تا ۴۶۸ ق۔م) نے جین مت کی بنیاد رکھی۔ مہاتما بدھ اور مہاویر جی کو اپنے دھرم بدھ مت اور جین مت کے پرچار کرنے میں اس عہد کے چھتری راجاؤں سے بڑی مدد ملی جو تورانی نسل سے تھے[1] ویشیوں اور شودروں نے بھی اس کو خوشی خوشی قبول کر لیا۔ کیونکہ ویدک دھرم کے برخلاف اس میں مساوات بھی تھی[2] اور اس میں ان کے لئے نجات کے دروازے کھلے ہوئے تھے ان مذہب کی تعلیمات چونکہ عوام کی زبانوں میں تھیں اس لئے برہمن مت کی تعلیمات کے مقابلہ میں جو سنسکرت میں تھیں زیادہ عام فہم تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ مذاہب خصوصاً بدھ مت تمام ہندوستان میں پھیل گئے اور انھوں نے نہ صرف ذات پات کے بندھنوں کو شکست کر دیا بلکہ سنسکرت کو بھی بہت نقصان پہنچایا اور اس کے بجائے پالی زبان کو تمام ہندوستان میں خاص مقبولیت حاصل ہو گئی۔ کوشلا اور مگدھ اس دور کی سب سے اہم ریاستیں تھیں۔ یہ صرف سیاسی مرکز نہ تھیں

---

[1] تمدن ہند۔ مؤلفہ ڈاکٹر سید علی بلگرامی ص۶۶

[2] قدیم ہندوستان کی تہذیب۔ مؤلفہ آر۔ بی۔ دت ص۵۱

بلکہ مذہب، ثقافت اور علم و ادب کے مراکز کی حیثیت بھی رکھتی تھیں۔ جنوب مغرب میں اودایا نہ خاندان حکمران تھا اور ریاست اونتی میں پردیوتا کی حکومت تھی جو ایک زبردست راجہ تھا۔ شمال مغرب میں کورو اور پنچالا کی ریاستیں تھیں اور ہند آریائی علاقہ کے شمال مغرب بعید میں گندھارا کی ریاست تھی جو جلد ہی سندھ کے ساتھ ایران کی سلطنت میں ضم ہو گئی۔ کوشلا میں راجہ پرسناجیت کی حکومت تھی جو مہاتما بدھ کا تقریباً ہم عصر تھا۔ اس نے کاشی کی بہت بڑی ریاست کو فتح کر کے اپنی ریاست میں شامل کر لیا تھا اور شمال میں جو قبائلی جمہوریتیں تھیں اُن کو بھی اپنے ماتحت کر لیا تھا۔

اس سے ملی ہوئی ریاست مگدھ کی تھی جو بڑی اہم اور وسیع ریاست تھی۔ یہاں تقریباً ۶۰۰ سال قبل مسیح میں سیسوناگا کے ہاتھوں ایک نیا خاندان برسرِ اقتدار آیا۔ بمبسارا (۵۵۰ تا ۴۹۰ ق م) جو مہاتما بدھ کا ہمعصر تھا اسی کی نسل سے تھا، اس کا وارث اجاتشاترو ہوا۔ ان دونوں نے اپنے زمانہ میں ریاست کو وسیع کیا اور انگا، ندیہا کی ریاستیں اور ملحقہ شمالی علاقے فتح کر لئے اور موجودہ پٹنہ میں شہر پٹالی پتر آباد کر کے اُس کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس کے بعد اس ریاست کے سو سال کے حالات معرض خفا میں ہیں۔ البتہ چوتھی صدی قبل مسیح کے نصف تک مگدھ کی ریاست قائم تھی اور پورے عروج پر تھی مگر قدیم خاندان کو ہٹا کر نندا نے تخت حاصل کر لیا تھا۔ سکندر کے حملہ

(۳۲۷ تا ۳۲۵ ق م) کے وقت وادی گنگا کا زیادہ حصہ نندا کے قبضہ میں تھا بلکہ جنوب میں بھی کافی دور تک اس کی ریاست پھیلی ہوئی تھی۔

نندا کا خاندان زیادہ دنوں حکومت نہ کر سکا۔ ۳۲۲ ق م میں چندرگپت موریا، جس کو چناکا بھی کہتے تھے، نے شمالی مغربی راجاؤں کی مدد سے نندا کے بیٹوں کو شکست دے دی اور خود پٹالی پتر کا راجہ بن گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی ریاست کو کافی وسعت دی۔ شمالی مغربی علاقہ جس کو سکندر نے فتح کر لیا تھا اسی کا تھا۔ مگر ۳۰۵ ق م میں سلوکس نکیٹر نے چندرگپت سے صلح کر لی اور افغانستان تک کل ہندوستانی مقبوضات اس کے حوالے کر دئے۔ چندرگپت ۲۵۸ ق م میں مر گیا اور اس کا بیٹا بندوسارا جانشین ہوا۔ اسی کا بیٹا اشوک (۲۷۴ تا ۲۳۲ ق م) ہندوستان کا سب سے بڑا راجہ تھا۔ اس کے قبضہ میں تامل کا جنوبی علاقہ چھوڑ کر کل ہندوستان تھا۔ یہ بدھ مذہب کا سچا پیرو تھا اور ظلم و خوں ریزی سے نفرت کرتا تھا۔ اشوک کے بعد موریا سلطنت کو سخت زوال آ گیا۔ آخری موریہ راجہ کے سپہ سالار پشیا متر نے راجہ کو قتل کر کے خود راج حاصل کیا اور خاندان سنگا کی حکومت قائم کی (۱۸۲ تا ۷۲ ق م) یہ بدھ مت کا دشمن تھا۔ اس لئے اس کے دور میں برہمنی مذہب کو پھر عروج حاصل ہوا۔ اس کے بعد کنوا خاندان برسرِ اقتدار آیا مگر جلد ختم ہو گیا۔ اس نے ۲۸ ق م تک حکومت کی۔ اس کے بعد گپتا خاندان

کے برسر اقتدار آنے تک کوئی زبردست طاقت شمالی ہندوستان میں رونما نہیں ہوئی۔

خارجی حملے (۱۸۰ ق م سے ۲۰۰ عیسوی تک):-

موریا خاندان کے زوال کے بعد دکن میں ایک نئی طاقت نے اپندھرا میں اپنا اقتدار قائم کیا۔ اس خاندان کا نام ستاکارنی یا ستاواہنہ تھا اور شمال میں ایک سلسلہ خارجی حملوں کا شروع ہوا۔ یہ حملہ آور قومیں یونانی، ساکا، پارتھین اور کشن کہلاتی ہیں۔ بعد کی تین سو صدیوں کی تاریخ انھیں حملہ آوروں کی ترک تاز کی داستان ہے۔

اپندھرا کی ریاست دکن کے زیادہ حصہ پر ایک شخصی حکومت کی حیثیت سے تین صدی تک قائم رہی۔ ان کے ابتدائی حکمرانوں نے سنگا اور کنوا خاندانوں سے عرصہ تک جنگ کرکے انھیں ختم کر دیا۔ دوسری صدی عیسوی میں اس خاندان کے دو راجہ گوتم پتر ستاکارنی (۱۰۶ء تا ۱۳۰ء) اور وششٹ پتر پلمائی (۱۳۰ء تا ۱۵۵ء) اس قدر طاقت ور تھے کہ انھوں نے دکن کو خارجی حملوں کے سیلاب سے محفوظ رکھا۔ تیسری صدی میں ان کی ریاست اکشور کس اور سلنکایانہ خاندانوں میں بٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

یہ اپندھرا کے راجگان پراکرت زبان و ادب کے بڑے مربی تھے اور انھیں کے زمانہ میں مہاراشٹری پراکرت ایک علمی اور ادبی

زبان بن گئی۔ ایندھرا کے راجہ ہالا کا مرتب کیا ہوا ایک مجموعہ نظم یادگار کے طور پر اب بھی باقی ہے۔ گونا دھیا کی برہٹ کتھا بھی جو پیساکی پراکرت میں ہے۔ ایندھرا عہد ہی کی یادگار ہے۔ ان کے زمانہ میں بدھ مت کو عروج حاصل ہوا اور ناگرجن جو مہایانا بدھ مت کا ایک بڑا مبلغ گزرا ہے، اُسے راجگان ایندھرا کی سرپرستی حاصل تھی۔

اسی دور میں کچھ عرصہ کے لئے ریاست کلنگا کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ راجہ کراویلا اس خاندان کا ممتاز راجہ تھا جس نے اپنا مفصل حال ایک لوح سنگ پر کندہ کرا کر بطور یادگار چھوڑا ہے۔ اس خاندان کے راجگان اس قدر طاقت ور تھے کہ ایندھرا کا مقابلہ کرتے رہے اور شمالی ہند کی بعض کمزور ریاستوں کو اُنھوں نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مگر راجہ کراویلا کے بعد یہ قائم نہ رہ سکے اور ایندھرا کی بڑھتی ہوئی طاقت نے اُنھیں ختم کر دیا۔ یہ خاندان جین مذہب کا بڑا مربی تھا۔

شمالی ہند میں موریا خاندان کے زوال کے بعد باہر کے حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اشایمدس کے حملے سے گندھارا اور سندھ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اُس کے بعد ہی سکندر نے ایران کی عظیم سلطنت کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد ہندوستان کے اُن صوبوں پر حملہ کیا جو ایران کے ماتحت تھے مگر اس کا حملہ ہندوستان کے شمال مغربی کونے تک محدود رہا۔ مگر بعد کے خارجی حملے جب تک جاری رہے اُنھوں نے

ملک کے اندر کسی بڑی طاقت کو اُبھرنے نہ دیا کیونکہ یہ حملہ آور اندرون ملک تک گھس کر جاتے اور تاخت و تاراج کرتے رہے۔

ان میں سب سے پہلے وہ یونانی تھے جنھوں نے سکندر کی وسیع سلطنت کے شرقی حصہ پر قبضہ کر کے بیکٹریا میں حکومت قائم کی تھی۔ ان کے بادشاہ ڈمیٹرس نے ۱۸۳ء ق م میں ہندوستان پر حملہ کیا شمالی پٹنہ تک فتح کرتا چلا گیا۔ مگر اُس کی عدم موجودگی میں خود اُس کے دارالسلطنت میں بدنظمی اور اُس کے ملک میں بغاوت کے آثار پیدا ہوئے، اس لئے اُسے مجبوراً واپس جانا پڑا۔ ادھر پشیامتر نے شمالی اور وسطی ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی اور پنجاب کے مشہور یونانی حاکم میندر کو شرق کی طرف پیش قدمی کا موقع نہ دیا۔ ۱۴۵ء ق م میں وہ مر گیا اور گو تقریباً نصف صدی بعد تک پنجاب پر یونانیوں کا قبضہ رہا۔ مگر ساکا اور سیتھین اقوام کے حملوں نے اُن کی حکومت کو بہت کمزور کر دیا۔ یونانیوں نے ہندوستانی ثقافت پر دیرپا اثر ڈالا۔ اُن کی وجہ سے ہندوستان میں سنگ تراشی کا کام خالص مغربی طرز پر شروع ہو گیا۔ ہندوستانی علم نجوم بھی یونانیوں کا رہین منت ہے اور یونانی اصطلاحات ہندی علم نجوم میں اب تک موجود ہیں۔ مگر یہ اثرات زیادہ دیرپا نہ تھے۔

ساکا قوم وسط ایشیا سے اُٹھی اور پہلے اس نے بیکٹریا کی یونانی سلطنت کا خاتمہ کیا اُس کے بعد ہندوستان پر حملہ آور ہوئی۔ ۸۰ء ق م

میں اپنے سردار مالس یا موگا کے زیر قیادت اُنھوں نے پنجاب فتح کیا اور کچھ عرصہ بعد متھرا پر مضبوطی سے قابض ہو گئے۔ اس کے بعد ہی پارتھئیں جو قوم ساکا سے قریبی تعلق رکھتے تھے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے۔ اُنھوں نے قوم ساکا کو شکست دی اور اُن کی ریاست پر قابض ہو گئے۔ گونڈوفرس ان کا سب سے طاقتور حکمران تھا۔

ساکا قوم کا ایک جتھا بعد میں ہندوستان میں داخل ہوا اور اُجین پر قابض ہو گیا۔ یشوموٹکا اور کیشتانا اس کے ابتدائی بادشاہ تھے۔ یہ خاندان آخر چوتھی صدی عیسوی تک حکمران رہا اور گپتا خاندان نے اس کے اقتدار کو ختم کیا۔ ساکا سنہ ان کی فتح اجین سے شروع ہوتا ہے۔ باہر کے حملہ آوروں میں سب سے زیادہ ذی اقتدار کشن قوم کے لوگ تھے۔ جن کو تُخارا یا تُخارین بھی کہتے ہیں۔ ابتداء میں اس قوم کے وسط ایشیا میں چکر لگانے کا حال چینی مورخین نے لکھا ہے۔ یہ قوم ہندوستان میں اُس وقت وارد ہوئی جب پہلا کشن خاندان کجولا کادفیسس (KUJULA KADPHISES) یا کوزولو کادفیسس (KOZULOKADPHISES) اور ویما کادفیسس (VIMA KADPHISES) نے ہندوستان کی سرحدوں پر اپنے قدم جما لئے تھے۔ پہلی صدی عیسوی کے آخری سالوں میں اس قوم کا سب سے بڑا بادشاہ کنشکا یا کنشک تھا جو دوسرے کشن حکمران خاندان کا بانی تھا۔ کنشک کے قبضہ میں نہ صرف کل شمالی ہندوستان بنارس تک تھا بلکہ وسط ایشیا کا بھی ایک بہت بڑا حصہ اُس کے زیر اقتدار تھا۔

وہ بدھ مذہب کا بڑا مربی تھا۔ اُس کے وسیع اقتدار کے اثر سے بدھ مذہب کو بڑی ترقی ہوئی اور وہ تقریباً تمام ایشیاء میں پھیل گیا۔ کنشک کے وارث ہوشک اور واس دیو ہوئے۔ جن کے بعد تیسری صدی عیسوی میں ان کا اقتدار ختم ہوگیا۔

گپتا خاندان اور ہندوستانی ثقافت و ادب کا عروج :-

تیسری صدی عیسوی ہندوستانی تہذیب کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں ہندوستانی آرٹ اور ہندوستانی ادب، سائنس اور فلسفہ نے وہ صورت اختیار کی جو بعد کی صدیوں میں قائم رہی، باہر سے جو حکمران آئے اُنھوں نے نہ صرف اپنی زبان اور ثقافت سے ہندوستانی زبانوں اور ثقافت کو متاثر کیا۔ بلکہ دیسی زبانوں اور ہندوستانی ثقافت کو اپنایا، اُن کی سرپرستی کی اور اُن کو ترقی دی۔ اس زمانہ میں تقریباً ایک صدی سے زیادہ یہاں کوئی سیاسی طاقت نہیں اُبھری۔ البتہ۔ چوتھی صدی عیسوی میں گپتا خاندان نے اُسی حصہ ملک میں اپنا اقتدار جمایا جہاں موریا خاندان حکمراں تھا۔ چندر گپت اول (۳۲۰ء) ہی کے وقت سے یہ عروج شروع ہوا اور اُسی وقت سے گپتا سنہ بھی شروع ہوتا ہے۔ چندر گپت کا بیٹا سمدر گپت (۳۲۰ء تا ۳۸۰ء) بڑا زبردست فاتح گذرا ہے۔ اسی کو گپتا خاندان کی حکومت کا اصل بانی سمجھنا چاہیے۔ اُس نے شمالی ہند کے بہت بڑے حصے کو جلد فتح کر لیا۔ اس کے بیٹے

چندر گپت دوم نے جو وکرمادیا یا وکرماجیت کہلاتا تھا سلطنت کو اور بھی وسعت دی۔ اس نے اجینی کی ساکا ریاست اور ملاوا اور راپارتنا کو فتح کرلیا۔ اس کے دورِ حکومت میں گپتا خاندان کی عظمت اپنے پورے عروج کو پہنچ گئی۔ یہ زمانہ سنسکرت ادب کا سنہرا زمانہ تھا۔ اسی کے دربار کے نورتن مشہور ہیں جن میں شاعر کالی داس کے ساتھ آٹھ اور چوٹی کے ماہرینِ علم و ادب شامل تھے۔ اس خاندان نے دکن کو فتح کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ اس زمانہ میں وکاٹاکا کی ریاست دکن کی خاص طاقت تھی جس سے گپتا خاندان کے دوستانہ تعلقات تھے۔

کمار گپتا اول (۴۱۴ء تا ۴۵۵ء) کے دور کے ختم ہوتے ہی شمال مغرب میں سخت بدنظمی شروع ہوگئی اور قوم افتھیلائٹ (EPHTHALITE) جن کو گورے ہُن (WHITE HUNS) بھی کہتے ہیں۔ سب سے پہلی بار ہندوستانی منظر پر رونما ہوئے مگر سکند گپتا (۴۵۵ء تا ۴۶۷ء) نے اپنی سلطنت کی حفاظت اس خارجی دشمن کے مقابلہ میں بہت کامیابی سے کی اور قوم ہُن کو ایسی سخت شکست دی کہ تقریباً پچاس سال انھوں نے ہندوستان کا رخ نہیں کیا۔ مگر سکند گپتا کے بعد اس خاندان کا اقتدار ختم ہوگیا۔ حالانکہ اس کے بعد بھی یہ خاندان کئی صدی بعد تک حکمراں رہا۔ پہلے اس کے دو حصے ہوگئے۔ مغربی حصہ کا پایہ تخت اجیانی تھا اور مشرقی حصہ کا پاٹلی پتر مگر زوال شروع ہوگیا اور نئے حکمران خاندان پیدا ہونے لگے۔ مغرب میں گپتا خاندان کے ہی ایک سپہ سالار نے ولابھی کے مقام پر اپنے خاندان میترا کی

حکومت قائم کی جس نے کئی صدی بڑی شان کے ساتھ اپنا اقتدار قائم رکھا شمال میں قنوج کے مقام پر ماکھاری خاندان نے ایک بڑی طاقت کی حیثیت پیدا کرلی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم افتیلائیٹ یا گورے ہنوں کو موقع مل گیا اور انہوں نے ایک زبردست حملہ کرکے شمالی ہندوستان کے ایک بڑے حصہ کو فتح کرلیا۔ ان کا ایک مشہور سردار تورمان تھا جس نے سنہ ۵۰۰ء میں شمالی ہند کے ایک وسیع علاقہ پر قبضہ حاصل کرلیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے مہرگل (سنہ ۵۱۳ء تا سنہ ۵۲۸ء) نے بھی بہت دنوں اپنی بالادستی قائم رکھی مگر اس کے آخر زمانہ میں گپتا بالادتیا نے گورے ہنوں کے مقابلہ میں ایک زبردست محاذ قائم کیا اور بالآخر ان کو مشرقی ہندوستان سے نکال دیا۔ اس کے بعد ہی سنہ ۵۳۳ء میں ایک غیر معروف خاندان کے آدمی یشودھرمن نے مغربی ہندوستان میں بھی گورے ہنوں کو شکست فاش دیکر ہندو اقتدار دوبارہ قائم کردیا۔

اس کے بعد کی صدی میں تھانیسور کے ہرش وردھن (سنہ ۶۰۶ء تا سنہ ۶۴۷ء) نے یکے بعد دیگرے بہت سی مہمیں سرکرکے اپنی دھاک بٹھادی اور اپنے کو شمالی ہندوستان کا ایک زبردست سورما ثابت کردیا مگر جنوبی ہند کی چولا کیا حکومت کی زبردست طاقت کے مقابلہ میں اسے ذرا بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ہرش وردھن علم و ادب کا بڑا مربی تھا وہ کئی سنسکرت ڈراما کا مصنف تھا اور بانا سنسکرت کا مشہور مصنف اسی کے دربار میں تھا جس نے اس کے دور حکومت کے حالات پر کتاب لکھی ہے۔ ہرش وردھن بدھ مت کا مربی تھا اور چینی سیاح ہیوئن سانگ اسی کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا۔

ہرش وردھن کے مرنے کے بعد شمالی ہندوستان کے حصے بخرے ہوگئے۔ قنوج یشودھرمن نے کوشش کی تھی کہ وہ شمالی ہندوستان میں ایک بڑی ریاست قائم کرے۔ کشمیر کے راجہ للتادت کے مقابلہ میں سنہ ۷۴۰ء میں اس کو ایسی شکست فاش ہوئی

کہ اس کے سارے حوصلے پست ہوگئے۔ رفتہ رفتہ شمالی ہند میں پھر دو طاقتوں کو عروج
حاصل ہوا۔ آٹھویں صدی کے وسط میں پالا خاندان نے بنگال میں اقتدار حاصل کیا۔
اور بارھویں صدی تک حکومت کی۔ یہ بدھ مت کا پیرو اور مربی تھا۔ اسی زمانہ میں مغربی
ہندوستان میں راجپوت قوم نے خروج کیا جن کی اصل و نسل کے متعلق مختلف رائیں ہیں مگر
خیال غالب[1] یہ ہے کہ یہ لوگ آریا نہ تھے بلکہ شک، سیتھین اور ہن وغیرہ اقوام سے
ان کا لگاؤ تھا۔ جو مغل اور تاتاری نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی چار مخصوص
قومیں تھیں (۱) پارامار یا پرمر (۲) چاہمان یا چوہان (۳) پراتی ہاریا پرہار (۴)
چالوکیہ یا سولنکی اور ویسے تو متعدد آریا اور دراوڑی خاندان بھی راجپوت بن بیٹھے
تھے اور انہوں نے شمالی ہندوستان میں مغرب سے مشرق تک چھوٹی بڑی بہت سی
ریاستیں قائم کرلی تھیں۔ پراتی ہارا قوم کے گرجارا خاندان کو آٹھویں صدی عیسوی میں بڑا
عروج ہو۔ ناگ بھات کی زیر قیادت ان کو ایسا اقتدار حاصل ہوا کہ دو سو سال تک شمالی
ہندوستان میں ان کی بالادستی قائم رہی مگر یہ بنگال کے پالا خاندان اور دکن کے
راشٹرکٹ خاندان سے مسلسل برسرپیکار رہے جس نے ان کو کمزور کردیا اور دسویں
صدی کے آخر میں ان کا اقتدار بالکل ختم ہوگیا۔ اس کے بعد شمالی ہندوستان میں
لاتعداد چھوٹے چھوٹے راجہ پیدا ہوگئے جو عرصہ تک آپس میں برسرپیکار رہے۔
یہ دور بحث طوائف الملوکی کا دور ہے۔
جنوب میں (۱) چندیل (۲) گڈھ دیر اور (۳) راٹھور بھی جنوبی راجپوت

---

[1] تاریخ ہندی قرون وسطیٰ جلد دوم مرتبہ قاری محمد بشیر الدین پنڈت بدایونی صفحہ ۱۱

کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ دراصل ہندوستان کے قدیم باشندوں کی اولاد میں سے ہیں
مگر ملک میں بدنظمی کا مسلسل دور دورہ رہنے کی وجہ سے ان کو اقتدار حاصل ہو گیا
اور اب یہ بھی اپنے کو راجپوت کہنے لگے مگر شمالی راجپوتوں سے اور ان سے کبھی خوش
گوار تعلقات پیدا نہ ہو سکے اور مسلسل جنگ آزمائی ہوتی رہی۔

بدھ مت[۱] اور جین مت نے آریوں کی قدیم جاتی یعنی چھتریوں کو ویدک
عہد کے صرف آریہ چھتریوں کی اولاد ہی تک محدود رہنے نہیں دیا تھا بلکہ گونڈ
بھار، ابھیر وغیرہ نیچ ذاتوں کے وہ لوگ جو ہندو سوسائٹی میں شامل ہو گئے
اور اپنی سپہ گری اور بہادرانہ کارناموں کی مدد سے حکومت واقتدار کے
مل تھے نیز (۲) شک، یوچی، منگول، ہن اور گرجر وغیرہ غیر ملکی قومیں جو
اور بہادر تھیں اور کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد ہندو جاتی میں داخل ہو گئی تھیں
برہمنوں کی بالادستی اور اقتدار سے تنگ اور عاجز تھیں بدھوں اور جینیوں نے ان سب کو چھتری تسلیم
یا بلکہ شودر اور اچھوت اقوام کو بھی برابر کا مرتبہ دیدیا اور آریہ نسل کی برتری ک
میں ملا دیا تھا۔ اب برہمنوں کی باری تھی انہوں نے بعد کی آنے والی غیر ملکی
اور کول و دراوڑ کے سربرآوردہ خاندانوں کو راجپوت تسلیم کرکے برہمنی
ب کو تقویت پہنچائی اور ان کی مدد سے بدھ مت کا مکمل استیصال کر
پنے مذہب کے اقتدار کو دوبارہ ہندوستان میں قائم کیا۔ برہمنوں کی حوصلہ
کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سارے راجپوت نہ صرف برہمنی مذہب میں داخل ہو گئے

---

(۲) قرون وسطیٰ جلد دوم صفحہ ۱۲۱ و ۱۲۳ و ۱۲۵ و ۱۲۶

بلکہ ان کے اقتدار و حکومت کے اٹھنے سے سارے ملک میں ہندو مذہب کا دور دورہ ہو گیا۔ راجپوت اقوام خصوصاً شمالی راجپوت اپنے کو "اگنی کل" کی اولاد بتاتے ہیں اور ان سب کا سلسلہ نسب آگ پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ ان میں تقریباً تمام پرانی اور نئی اقوام حتیٰ کہ اس وقت کے شودر ذی حوصلہ اور بہادر خاندان بھی شامل ہو گئے۔ انہوں نے ہندوستان میں ایک مدت تک طوائف الملوکی اور ہنگامہ کارزار برپا رکھا مگر علم و ادب کی خدمت بھی کی۔ پلّوؤں اور مشرقی چالوکیوں کے زیر اثر تامل اور تیلگو ادب کو بڑی ترقی ہوئی اور دیشنو آچاریوں نے جنوبی ہند میں بہت سی عمدہ تصنیفات کیں جن کی عزت ویدوں کے برابر سمجھی جاتی تھی۔

مسلمانوں میں پہلا ہندی شاعر جو پانچویں صدی ہجری میں اسی (ہندوستان) کی خاک پاک سے اٹھا مسعود سعد سلیمان تھا۔ اس کے تین دیوان تھے ایک عربی میں۔ دوسرا فارسی میں اور تیسرا ہندوی میں **عوفی** لکھتا ہے:۔

"اورا سہ دیوان است، یکے بتازی، یکے بپارسی و یکے بہ ہندوی"

یعنی اس نے عربی و فارسی کے ساتھ ہندی زبان میں بھی ایک مستقل دیوان اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا تھا اس کا ذکر ملا عبدالقادر بدایونی نے کیا ہے۔

ہندی[1] ادب میں یہ عہد "دیر گاتھا کال" (عہد نظم) کے نام سے مشہور ہے اس زمانہ کے مشہور ہندی کوی تین ہیں۔ ان میں سے پہلے کا نام معلوم نہ ہو سکا اس نے[1] کھمان راسو سمت ۸۱۰ سے لے کر سمت ۱۰۰۰ تک کسی زمانہ میں تصنیف کیا۔

---

[1] تاریخ ہندی قرون وسطیٰ جلد دوم صفحہ ۱۵۵

دوسرا ہندی شاعر نرپت نالہہ ہے اس نے اجمیر کے راجہ بیلدیو کے نام پر سمت ۱۲۱۲ میں بیلدیو راسو" تصنیف کیا۔ اسی طرح تیسرے ہندی شاعر چند کوی نے جو چند بردائی کے نام سے مشہور ہے پرتھوی راج یا رائے پتھورا کے نام پر "پرتھوی راج راسو" ترتیب دیا ہے چند والی قنوج اور پرمال والی کالنجر و مہوبہ کے کارناموں کو ان کے درباری شعراء بھٹ کیدار (سمت ۱۲۲۴ تا ۱۲۴۳) اور جگنک (سمت ۱۲۳۰) نے بیان کیا ہے۔ بھٹ کیدار نے "جے چند پرکاش" اور غالباً "جے مینک جس چندر کا" نامی کتابیں لکھیں جو کہ آج کہیں نہیں ملتیں لیکن ان دونوں کتابوں سے دیال داس نے فائدہ اٹھایا ہے اور ان ہی کتابوں کو سامنے رکھ کر اپنی مشہور کتاب "راٹھوڑاں ری کمیات" لکھی ہے۔ یہ کتاب بیکانیر کے ریاستی کتب خانہ میں اب بھی محفوظ ہے۔ جگنک کا "آلہ کھنڈ" بھی گو آج اپنی اصلی حالت میں دستیاب نہیں لیکن شمالی ہند کے ہر ایک گاؤں میں وہ جس شکل میں لوگوں کو زبانی یاد ہے اور ان کی محفلوں میں جس ذوق سے پڑھا اور سنا جاتا ہے اس سے اس کی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

شمالی ہند کی مشہور راجپوت ریاستیں:۔

(۱) قنوج۔ راجہ ہرش وردھن کی ریاست تھی (۲) کالنجر۔ جہاں چندیلوں نے گونڈ اور آریوں کی مخلوط نسل سے ہیں اپنے سردار ننیز دھرن کی ماتحتی میں حکومت بنا ڈرکھی (۳) دہل۔ جبل پور کے نزدیک ترپوری کا مقام "دہل" چیدی کے رئیسوں کا صدر مقام تھا (۴) گجرات کے چاؤلوک یا سولنکی (۵) گوجر یا پرتہار بھرت۔ یہ اصلاً غیر ملکی تھے مگر برہمنوں نے انہیں بمقابلہ بدھ مت اپنے دھرم کا

طرفدار بن لیا تھا۔ یہ لوگ گوجر کہلاتے ہیں۔ اب سب کے سب مسلمان ہیں مگر سرحدی
پٹھانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ پنجاب میں گجرات کا ضلع ان ہی کے نام سے موسوم ہے
اور بمبئی سے قریب پٹن اور احمد آباد کا علاقہ بھی گجرات کہلاتا ہے اور ان ہی کے نام
سے موسوم ہے۔ (٦) مالوہ (دھار) کے پرمار:۔ ان میں کئی بڑے اولوالعزم اور علم
دوست راجہ گذرے ہیں (٧) اجمیر:۔ ہندوستان کی راجپوت ریاستوں میں چوہانوں کی
ریاست سانبھر کو جس کا اجمیر ایک حصہ تھا بڑی اہمیت حاصل تھی۔ پرتھوی راج اسی
خاندان کا آخری راجہ تھا جو محمد غوری سے جنگ کرتے ہوئے مارا گیا اور اجمیر و دہلی
مسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔ (٨) دہلی:۔ یہاں تومر خاندان حکمراں تھا جو اپنے کو
پانڈو کی نسل سے بتاتا تھا اور چندر بنسی کہتا تھا (٩) گوالیار کے کچھب گھٹ (١٠)
گاندھار یا ویہند کے ہندو شاہی۔ گاندھار پشاور سے جنوب مشرق میں دریائے
کابل اور سندھ کے سنگم پر واقع تھا۔ یہ افغانستان کا موجودہ قندھار نہیں تھا (١١)
کشمیر۔ شمالی ہند کی پہاڑی ریاستوں میں کشمیر، نیپال اور آسام ممتاز ریاستیں تھیں (١٢)
دہار اور تھارو ریاستیں:۔ گنگا اور گھاگرا کا دوآبہ گیارہویں صدی عیسوی کے
شروع تک راجگان پٹنہ اور قنوج کا متنازعہ فیہ علاقہ رہا ہے لیکن ۱۰۵۰ء کے
قریب یہیں کے ایک غیر آریائی قوم دہار یا بہار نامی حکومت قنوج سے بغاوت
کرکے آزاد ہوگئی۔ اس قوم کی آبادی اب بھی ضلع فیض آباد اور سلطان پور میں پائی
جاتی ہے۔ ان کا حلقہ اثر جنوب میں مالوہ کو اور شمال میں ضلع بدایوں کو گھیرے ہوئے تھا
(١٣) گھاگرا کے شمال میں اضلاع بہرائچ اور گونڈہ وغیرہ میں آٹھویں نویں صدی عیسوی
کے درمیان منگولین نسل کی ایک پہاڑی قوم نے جس کو تھارو کہتے تھے عروج

حاصل کیا تھا۔ انہوں نے گندھرب بن کو جگہ جگہ پر صاف کر کے آباد کیا تھا اور بدھوں کے مشہور مگر اُجڑے ہوئے شہر سہیت مہیت (سراونتی) کو اپنا مستقر بنا کر ایک عرصہ تک حکومت کی۔ یہ لوگ بدھ مت کے پیرو تھے۔ (۱۴) بنگال کے پال :۔ مشرقی مگدھ[1] میں گپت خاندان کی ایک شاخ حکومت کرتی تھی۔ ان سے پال خاندان نے گدی چھین لی تھی۔ اس راج کی بنیاد گوپال (۸۳۰ء تا ۸۷۵ء) نے ڈالی تھی۔ اس خاندان نے بعد کو قنوج فتح کرلیا اور عرصہ تک وہاں حکومت کی پھر گوجیلہ کے راجہ بھوج نے انہیں قنوج سے نکال دیا اور پرتھاروں کی حکومت قائم کی۔ یہ خاندان بہار میں اب بھی موجود ہے۔ (۱۵) سین خاندان۔ اس کی بنیاد بجے سین نے ڈالی تھی جو دکن سے نوکری کی تلاش میں مگدھ آیا تھا اور ملازم سے راجہ بن گیا۔ برہمن مذہب کو چار سو سال دبے رہنے کے بعد اس خاندان کے زمانہ میں پھر عروج حاصل ہوا تھا۔

جنوبی[2] ہند کی ریاستیں :۔

(۱) بادامی کے چالوکیہ :۔ یہ اپنے کو چندر بنسی بتاتے تھے مگر ان کی رعایا تمام تر دراوڑی نسل کی تھی اور دراوڑی علوم و فنون یہاں بہت ترقی پر تھے۔ آریوں کا کوئی اثر ان پر نہ تھا۔ تامل۔ تلگو۔ کنڑی۔ ملیالم وغیرہ ان کی زبانیں ادبی شان رکھتی تھیں۔ یہ بارھویں صدی عیسوی کے شروع زمانہ تک حکمراں رہے۔ ہوان سانگ نے بھی بادامی ریاست کا تذکرہ کیا ہے (۲) مانیہ کھیت کے راشٹر کوٹ :۔ یہ علاقہ ریاست حیدرآباد دکن کے حدود میں تھا (۳) دیوگری کے یادو :۔ یہ لوگ اپنے کو شمالی

---

[1] تاریخ ہندی قرون وسطی جلد دوم و نیز انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۱۱ صفحہ
[2] ضلع بیجاپور

ہندوستان کا راجپوت کہتے تھے اور متھرا اور دوارکا کو اپنا اصل وطن بتاتے تھے۔ ناسک سے دیوگری تک ان کی ریاست تھی۔ (۴) کلیانی کے چالوکیہ:۔ اس خاندان نے دوسو سال مغلوب رہنے کے بعد راجہ تیلپ کی سرکردگی میں راشٹر کوٹوں سے ریاست چھین لی اور حکومت حاصل کرلی (۵) دوار سمدر کے ہوئسل:۔ یہ ابتدا میں چالوکیوں کے باج گذار تھے مگر آخر میں خودمختار ہو گئے۔ مدار سمدر واقع میسور ان کا پایہ تخت تھا۔ (۶) وارنگل کے کاکانی یا کاکتی:۔ یہ بھی پہلے چالوکیوں کے ماتحت تھے بعد میں خودمختار ہو گئے (۷) اڑلیسہ کا گنگا خاندان:۔ اس کا عروج گیارھویں صدی کے شروع میں ہوا۔ انہوں نے کلنگ نگر کو جو گنجام میں ہے اپنا صدر مقام بنایا اور ۱۳۸۴ء تک کسی نہ کسی طرح حکومت کرتے رہے (۸) پلّو یا پلّوی خاندان:۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ پہلوی یا پارتھین قبائل میں سے تھے جو نسلاً سیتھین تھے اور ایران سے ہندوستان آئے تھے اور دکن میں مشرقی ساحل پر انہوں نے اقتدار حاصل کیا ان کے عروج کا زمانہ پانچویں چھٹی صدی عیسوی ہے پایہ تخت کنجی ورم (کانچی) یا ونگی اور پال کھیڑ میں تھا۔ اس ریاست میں بدھوں اور جینیوں کی کثرت تھی اور رقبہ ایک ہزار میل کے قریب تھا۔ گیارھویں صدی عیسوی تک ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم رہیں۔ (۹) چول خاندان:۔ انتہائے جنوب میں دراوڑوں کی دو نہایت قدیم ریاستیں تھیں۔ چولا اور پانڈیا۔ خیال ہے کہ زمانہ قبل از مسیح سے یہ باوقعت ریاستیں قائم تھیں اس خاندان کے راجاؤں کا قدیم پایہ تخت اُرے یور (پرانی ترچنا پلی) تھا۔ بعد میں تنجور ہو گیا ان کی ریاست پینار سے ولار ندی تک اور مغرب میں کورگ تک پھیلی ہوئی تھی آخری چول راجہ "ویرشیوا" لنگایت فرقہ سے

تعلق رکھتا تھا۔ (۱۰) پانڈیہ خاندان:۔ مدورا، تناولی اور کچھ حصہ ٹراونکور کا اس ریاست میں شامل تھا۔ صدر مقام۔ مدورا اور سب سے بڑا بندرگاہ کائیل تھا۔ ملک میں جا بجا عربوں کی نو آبادیاں قائم تھیں۔ مسلمانوں کی تجارت سے اس ریاست کو بہت فائدہ ہوا۔ عرب اسے کاردمنڈل اور معبر کہتے تھے یہ ریاست تجارتی اعتبار سے بہت ترقی یافتہ تھی اور عرب اور چین و ماچین سے تجارتی جہاز آتے رہتے تھے (۱۱) چیرا خاندان:۔ یہ بھی دراوڑی نسل سے تھا۔ ٹراونکور اور مالابار میں ان کی حکومت تھی جسے کیرالا بھی کہتے ہیں۔ یہاں بھی تجارت کو بہت ترقی تھی اور عرب یہاں کی تجارت پر حاوی تھے۔ یہاں کا راجہ زیمورد (سامری) دوسری صدی ہجری میں مسلمان ہو گیا تھا۔

یہ تمام ریاستیں برابر ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی تھیں۔ ہوس ملک گیری، مذہبی تعصب اور ہمسرانہ چشمک کی بنا پر شمال اور جنوب کی تمام ریاستوں میں مسلسل جنگ ہوتی رہتی تھی۔ سارے ملک میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ جو راجہ آپس میں ہم مذہب تھے وہ بھی ذرا ذرا سی بات میں لڑ بیٹھتے تھے اور کچھ نہیں تو ایک دوسرے کے عمدہ اور خوبصورت بنے ہوئے بتوں کو چھین لینے کی غرض سے ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ انسانی جان و مال، بہو بیٹی کوئی چیز محفوظ نہ تھی اور ذی حیثیت لوگ تو اپنی حفاظت کے لئے گڑھ بناتے، اسلحہ جمع کرتے اور سپاہی نوکر رکھتے تھے مگر بیچارے معمولی حیثیت کے لوگ اپنی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی غرض سے محفوظ مقامات کی تلاش میں رہتے اور برابر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے۔ حملوں کے وقت خصوصیت کے ساتھ

گاؤں کے گاؤں اور بڑے بڑے قصبے ویران ہو جاتے تھے اور وہاں کے رہنے والے اپنا گھر بار چھوڑ کر جہاں سینگ سماتا تھا بھاگ جاتے تھے۔

برصغیر پاک و ہند کی یہ قدیم تاریخ ہے جو پچھلے صفحات میں مختصر طور پر بیان کی گئی۔ اگر اس پر غائر نظر ڈالی جائے تو مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں جن کا ایک تنقیدی جائزہ لئے بغیر اس دور کی ثقافتی، لسانی اور ادبی حالت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا:۔

(۱) سب سے پہلے یہاں دراوڑی اقوام آئیں جن کا اصل وطن بحیرہ روم کا ساحلی علاقہ تھا جہاں سامی نسل آباد تھی اس لئے اس قوم کا تعلق بھی سامی نسل سے تھا۔ ان کی ثقافت اور زبان بھی سامی اور عربی سے ملتی جلتی تھی۔ یہ لوگ آریا قوم سے جو ان کے بعد آئی بہت زیادہ تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ تھے اس لئے ان کی تہذیب، زبان و ادب نے آریائی تہذیب، زبان و ادب کو بہت زیادہ متاثر کیا مگر چونکہ آریا فاتح اور حاکم کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے ان کی زبان اور مذہب کو تفوق حاصل ہوا۔ وہ ابتدا میں انہوں نے دراوڑوں سے الگ رہنا اور اپنی ثقافت، زبان اور مذہب کو ان کے اثرات سے محفوظ رکھنا چاہا مگر بعد کی دوسری اقوام کے اس برصغیر میں وارد ہونے اور آریائی اقتدار کے کمزور ہونے کے بعد وہ مجبور ہوئے کہ دراوڑوں سے رابطۂ اتحاد مستحکم کریں اور سب مل کر خارجی دشمنوں کا مقابلہ کریں۔ اس ضرورت کے ماتحت ان کو اپنا متعصبانہ طرز عمل بدلنا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے ذی حیثیت دراوڑ تھے اب کسی نہ کسی طرح آریا بن گئے۔ بدھ مت اور جین مت نے آریائی طبقاتی امتیازات پر ضرب کاری لگائی اور اس برصغیر کی غیر آریائی اقوام

کو ہمسری حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آیا اور ان میں کا جتنا مقتدر طبقہ تھا سب ہی بدھ مت اور جین مت اختیار کر کے چھتری اور دیگر اعلیٰ ذاتوں میں شامل ہو گیا اس طرح آریوں کی ثقافت، زبان اور ادب سب ہی ان کے اثرات سے بے انتہا متاثر ہوئے۔ ان کی دیوبانی زبان جسے ویدک یا قدیم سنسکرت کہنا چاہیئے بالکل متروک ہو گئی۔ تب آریوں نے اس کی نئے سرے سے تدوین کی اور جدید سنسکرت کی بنیاد رکھی جو اصول و قواعد زبان کے اعتبار سے زیادہ باقاعدہ زبان تھی مگر وہ بھی آریائی اقتدار کے زوال پذیر ہونے کے ساتھ ساتھ زوال پذیر ہوتی گئی اور اس کی جگہ علاقائی زبانیں اور پراکرتیں لیتی گئیں۔

(۲) قوم دراوڑ کی زبان سامی قبیلہ کی عربی سے ملتی جلتی زبان تھی جس کے الفاظ کثیر تعداد میں یہاں کی علاقائی زبانوں اور پراکرتوں میں شامل ہو گئے اور گو علاقائی، اثر لب و لہجہ کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتا ہے، نیز مختلف رسم الخطوں میں لکھے جانے کی وجہ سے ان الفاظ کی شکلیں اس قدر بدل گئی ہیں کہ پہچانی نہیں جاتیں تاہم ان تمام پراکرتوں کے ہم معنی الفاظ میں کم و بیش جو یکسانیت اور قربت پائی جاتی ہے وہ اسی بنا پر ہے جیسے ام، ماں، مام۔ مادر۔ ماتر۔ ماتا۔ مانے۔ ماں یہ علی الترتیب عربی۔ فارسی۔ سنسکرت۔ پراکرت اور اردو کے الفاظ جو ماں کے لئے مخصوص ہیں آپس میں ایک غیر معمولی مشابہت رکھتے ہیں۔

(۳) برصغیر پاک و ہند کی مندرجہ بالا قدیم تاریخ پر ایک سرسری نظر بھی ڈالنے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زرخیز و دولت بار سرزمین ہزاروں سال قبل مسیح سے خارجی و بیرونی اقوام کا آماجگاہ رہی ہے۔ تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح میں دراوڑانے

اس کے بعد آریا قوموں کا ورود شروع ہوا اور تقریباً ڈیڑھ دو سو سال قبل ولادت مسیح تک وہ آتے رہے۔ اس کے بعد یونانی۔ پھر ساکا۔ پارتھین۔ سیتھین۔ کشن اور گورے رنگ والے ہن سب ہی یکے بعد دیگرے آئے۔ یہ سب فاتح اور حکمراں کی حیثیت سے آئے۔ ان سب نے اپنے سے پہلے آنے والوں کو مغلوب کیا اور محکوم بنایا۔ یہ سب اپنے ساتھ اپنی ثقافت، اپنا مذہب اور اپنی زبان لے کر آئے جن کو ان کے زمانۂ اقتدار و علاقۂ اقتدار میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ ان سب نے پہلے تو فاتح ہونے کی بنا پر یہاں کی اقوام اور ان کی ثقافت مذہب اور زبان کو حقیر سمجھا اور نظرانداز کیا مگر جب کسی نئی خارجی قوم نے آکر ان کو بھی غلام بنایا تب یہ لوگ یہاں کے قدیم باشندوں اور اپنے سے قبل آنے والی قوموں میں گھل مل جانے پر مجبور ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف ان کی نسلیں خالص نہ رہ سکیں بلکہ ان کی ثقافت۔ معتقدات اور زبان سب ہی چیزوں میں غیر معمولی امتزاج واقع ہوا۔ یہ انجام ہر باہر سے آنے والی قوم کا اس وقت ہوا جب کسی نئی غیر ملکی قوم نے آکر اس کا اقتدار چھین لیا اور خود اسے محکوم اور غلام بنایا تو ناچار وہ بھی دوسری محکوم اور غلام اقوام میں شامل ہو کر فاتح قوم کے مقابلہ میں ایک متحدہ محاذ قائم کرنے پر مجبور ہو گئی اور اس کی سابقہ محکوم قومیں جو ابھی تک اسے اپنے سے برتر سمجھتی تھیں وہ بھی اس کو اپنے میں بخوشی شامل کر لینے پر تیار ہو گئیں۔

(۴) باہر سے مذکورہ بالا جتنی اقوام ہندوستان میں آئیں سب شمال مغربی درّوں سے گذر کر یہاں داخل ہوئیں اور رفتہ رفتہ انہوں نے مشرق اور جنوب مشرق کی طرف آگے بڑھنا شروع کیا اور یہاں کی پرانی آبادی کو مشرق و جنوب مشرق کی

طرف پسپا کرنا شروع کیا۔ پہلے تو اپنا حلقہ اقتدار وسیع کرنے کی غرض سے اس کے بعد باہر کی نئی قوموں کے آنے پر اُن سے شکست کھا کر جائے امن کی تلاش میں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس برصغیر میں مسلسل ایک ہنگامہ کارزار بر پا رہا جیسا اوپر کے صفحات کے مطالعہ سے اندازہ ہوا ہوگا۔ اس مسلسل جنگ آزمائی کا نتیجہ مستقل بدامنی اور ایک ایسی غیر سکونی حالت تھی جس کی وجہ سے کسی فرد و جماعت کی جان و مال، عزت و آبرو محفوظ نہ تھی۔ آخر کار انجام یہ ہوا کہ اس تمام زمانہ میں جس کی مدت کئی ہزار سال ہے مسلسل انتقال آبادی ہوتا رہا یعنی یوں تو امن و امان کی حالت میں بھی معاشی ضروریات کی بنا پر لوگ عارضی اور مستقل طور پر اپنی سکونت بدلتے ہی رہتے ہیں اور مراکز اقتدار اور تجارتی و صنعتی معاملات پر ہر طرف کے لوگوں کا اجتماع ہوتا رہتا ہے مگر بدامنی اور انتشار کی حالت میں جو سراسیمگی عوام میں پیدا ہوتی ہے اس کا نتیجہ تو یہ ہوتا ہے لوگ بھاگنا شروع کرتے ہیں اور جہاں امن و حفاظت کی امید ہوتی ہے وہاں قیام پذیر ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد معاشی ضروریات کی فراہمی اور وسائل کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے وہیں رہ پڑتے ہیں اور رفتہ رفتہ اصل وطن سے تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ یہ صورت حال اس تمام تاریخی دور میں قائم رہی جس کا اثر نہ صرف یہ ہوا کہ ابتدا میں ایک خاندان یا ایک قوم نے جس خطہ کو اپنا وطن بنایا تھا وہاں اس کے کل افراد نہ رہ سکے اور وہ جہاں جہاں گئے اپنے ساتھ اپنی تہذیب اپنے عقائد اور اپنی زبان بھی لے گئے اور جس خطہ میں جا کر آباد ہوئے وہاں کے سابق رہنے والوں کی تہذیب، عقائد و زبان سے متاثر ہوئے بغیر اور خود ان کی تہذیب، عقاید اور زبان کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس برصغیر میں کوئی خطہ ایسا باقی نہ رہا جہاں کے رہنے والوں کی نسلیں، ثقافتیں، مذاہب اور زبانیں خالص رہ سکی ہوں اور دوسروں سے متاثر نہ ہوئی ہوں، بلکہ ہزاروں سال کی مسلسل بدامنی، انتشار اور پیہم[۱] انتقال آبادی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اختلاط و امتزاج کا عمل بہت سریع اور شدید ہوا جس کے اثرات بہت گہرے اور دور رس تھے۔ جہاں تک زبان و ادب کا تعلق ہے اس کے دو اہم نتائج ہوئے:-

(۱) کوئی زبان خالص نہ رہی اور برصغیر پاک و ہند میں اس وقت جتنی زبانیں بولی جاتی تھیں سب ایک دوسرے سے متاثر ہوئیں اسی بنا پر اس زمانے کی جتنی پراکرتیں ہیں ان کے اکثر مرادف اور ہم معنی الفاظ مخارج، اصوات اور حروف میں بھی بڑی قربت اور یکسانیت رکھتے ہیں مثلاً پھلا (پھل) بیجا (بیج) میورا (مور) راتری (رات) رو پا (روپ) لاجا (راجہ) کھیر (کھیل) وغیرہ۔

(۲) ایک عام اور مخلوط زبان یعنی ایک مہا بھاشا یا راشٹر بھاشا ایسی وجود میں آئی جو برصغیر پاک و ہند کے ہر خطہ میں خفیف فرق کے ساتھ بولی اور سمجھی جاتی تھی اور رفتہ رفتہ صرف ایسے الفاظ کو ٹکسالی مانا جاتا تھا جو سب جگہ رائج ہوں اس طرح یہ زبان صوبائی کے بجائے راشٹری یا ملکی بن گئی اس طرح پراکرت۔

اس ابتدائی دور میں جتنی اقوام اس برصغیر میں آئیں اور شمال مشرق کے دروں سے یہاں داخل ہوئیں، سب سے پہلے ان کو صوبہ سرحد کی آبادی سے معاملت

---

[۱] تاریخ زبان اردو مولفہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صفحہ ۲۵ و ۲۹

پڑی جن کی زبان سے وہ واقف نہ تھے اور خود ان کی زبان بھی یہاں والوں کے لئے نئی تھی مگر اشاروں کنایوں کی مدد سے رفتہ رفتہ دونوں قوموں نے ایک دوسرے کی بات سمجھ اور پھر ایک دوسرے کے کچھ الفاظ سیکھ کر استعمال کرنا شروع کئے۔ جس سے ان دو زبانوں کے میل سے ایک مخلوط زبان وجود میں آئی۔ کچھ دنوں یہاں قیام کرنے کے بعد وہ فاتح قوم آگے بڑھی اور پنجاب میں داخل ہوئی جہاں کی زبان بھی سرحدی زبان سے قربت رکھتی تھی نیز جہاں کے لوگ سرحدی علاقہ کی زبان بھی تھوڑی بہت سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان سے اس مخلوط زبان میں بات کی گئی تو انہوں نے سمجھ لیا اور اسی کھچڑی زبان میں جواب بھی دیدیا۔ اب یہ قوم پنجاب کے علاقہ پر قابض، حکمران اور وہاں قیام پذیر ہوئی۔ اس نے وہاں کی زبان کے الفاظ بھی حسب ضرورت سیکھ لئے اور اس کھچڑی زبان میں جس کے بولنے کی اب ان کو مشق اور عادت ہوتی جاتی تھی اُن الفاظ کو بھی شامل کر لیا۔ لیجئے اب تین زبانیں اس مخلوط زبان میں شامل ہو گئیں۔ یہی صورت آئندہ بھی ہوتی چلی گئی اور یہ فاتح قوم جس نئے علاقہ میں پہنچی وہاں کے ضروری الفاظ سیکھتی اور اس مخلوط زبان میں شامل کرتی چلی گئی اور ہر خطہ کے لوگ بھی ان فاتحین سے اسی زبان میں گفتگو کرنے پر مجبور ہوئے جس کا سیکھ لینا اور بولنا خود ان کے لئے بمقابلہ ان فاتحین کی اپنی زبان کے جو یہاں والوں کے لئے بالکل غیر اور اجنبی تھی زیادہ آسان تھا اس طرح ایک ایسی مخلوط زبان وجود میں آئی جس میں تقریباً تمام پراکرتوں کے الفاظ شامل تھے معہ ہر فاتح قوم کی زبان کے الفاظ کے اور چونکہ فاتح اور حکمراں قوم اس کو سمجھتی اور بولتی تھی اس لئے محکوموں کی نظر میں بھی اس زبان کو اہمیت حاصل ہوئی۔ معاشرتی و تجارتی ضروریات کی بنا پر بھی اس مخلوط زبان کو لوگوں نے بخوشی اپنا لیا ورنہ

دو علاقوں کے رہنے والوں میں بات چیت کرنے کا کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔ بعد میں جو خارجی اقوام آتی گئیں انہوں نے بھی اس مخلوط زبان کی سرپرستی کی جو عام طور پر تمام برصغیر کی بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس طرح ہر نئی آنے والی خارجی قوم کی زبان کے الفاظ بھی اس میں شامل ہوتے گئے۔ اور یہ برابر ترقی کرتی۔ وسیع ہوتی اور تمام ملک میں اشاعت و رواج حاصل کرتی گئی۔ البتہ ہر حصہ ملک میں اور ہر زمانہ میں اس کا نام بدلتا رہا اور ہر خطے کے لوگ آپس میں تو اپنی مقامی زبان بولتے تھے مگر جب فاتح اور حاکم قوم کے افراد سے بات چیت کرنا ہوتی تھی یا یہیں کی دوسری قوم یا دوسرے خطہ کے رہنے والے سے بات چیت کرنے کی ضرورت پڑتی تھی تب اس مخلوط زبان سے کام لیا جاتا تھا۔

درحقیقت یہی زبان تھی جس کو مختلف مقامات پر پالی، ماگدھی، مہاراشٹری، شورسینی، پوربی، اپ بھرنش، برج بھاشا، کھڑی، ہندی اور دکھنی کے ناموں سے مختلف زمانوں میں یاد کیا گیا جس کا اصل سبب یہ تھا کہ علاقائی اثرات سے امتداد زمانہ کے ساتھ لہجہ، تلفظ اور محاورے میں جس طرح فرق پیدا ہوتا گیا اسی طرح ہر علاقہ کے لوگ اپنی اپنی جگہ پر اسے جس نام سے چاہتے تھے یاد کرتے گئے۔

ماہرین لسانیات نے برصغیر پاک و ہند کی قدیم زبانوں کی اصل و نسل کے سلسلے میں عجیب و غریب نظریات پیش کئے ہیں اور بعض اوقات بڑی دور از کار بحثیں کی ہیں۔ مغربی مستشرق ہارنلی کی رائے ہے کہ ہندوستان میں آریا قبائل دو

۱؎ انڈو ایرین اور ہندی مولفہ چیٹرجی ص ۴۲۸

۲؎ تاریخ زبان اردو مولفہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ص ۴۲ و نیز انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا ایڈیشن ۱۹۵۵ء جلد ۱۵ ص ۲۴۵ و ۲۴۶

مختلف گروہوں میں داخل ہوئے۔ دونوں کی زبانوں میں قدرے اختلاف تھا۔ پہلے گروہ کو دوسرے گروہ نے آکر پنجاب اور گنگا جمنا کی ترائی سے نکال باہر کیا اور وہ جنوب مغرب، جنوب اور مشرق و نیز جنوب مشرق کے علاقوں میں منتقل ہوگئے۔ اسی وجہ سے مشرقی پنجاب یو۔پی اور بہار کی قدیم آریائی زبانیں ایک خاندان کی معلوم ہوتی ہیں اور مغربی پنجاب، سندھ، گجرات، میواڑ، مہاراشٹر، اڑیسہ اور بنگال و آسام کی زبانیں دوسرے خاندان سے معلوم ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے مستشرق گریرسن[1] کا یہ خیال ہے کہ آریا یقیناً دو گروہوں میں آئے۔ پہلا گروہ آکر پنجاب اور گنگا جمنا کی ترائی پر قابض ہوگیا۔ دوسرا گروہ جو بعد میں آیا اس نے اپنا راستہ ایک قوس کی صورت میں اختیار کیا اور وہ قبائل مغربی پنجاب، سندھ، گجرات، مارواڑ، مہاراشٹر، اڑیسہ، بنگال اور آسام تک پھیلتے چلے گئے۔ جہاں تک لسانی گروہ بندی کا تعلق ہے یہ دونوں نیز دیگر مستشرقین[2] اس امر پر متفق ہیں کہ پہلا گروہ مذکورہ بالا جن علاقوں میں آباد ہوا وہاں کی زبانیں ایک خاندان کی ہیں اور دوسرا گروہ جن علاقوں میں آباد ہوا وہاں کی زبانیں دوسرے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان دونوں کو اندرونی اور بیرونی شاخیں قرار دیا گیا ہے مگر گریرسن ہی نے گجراتی زبان کو مدھ دیش (متھرا وغیرہ) کی زبان سے متاثر بتایا ہے اور اسے اندرونی شاخ کی زبانوں میں شامل کیا ہے۔ اس کے خیال میں دونوں گروہوں کی زبانوں میں تلفظ کا نمایاں فرق ہے "س" کا "ہ" سے بدل جانا جیسے "سندھ" "ہند" ہوگیا اور "کس" کا "کوہ" ہوجاتا یا "میں نے مارا" کا بنگالی میں "ماری لام" ہوجانا مگر

---

[1] لسانیاتی جائزہ ہند۔ جلد اول حصہ اول

[2] انسائیکلوپیڈیا برٹینکا ایڈیشن ۱۹۵۵ء جلد ۱۰ ص ۴۱۶

مذکورہ بالا مثالیں خود اس امر کی شہادت ہیں کہ یہ خفیف سا فرق جو مقامی قدیم زبانوں کے اثر سے پیدا ہوا وہ الفاظ کی اصل کو جدا نہیں کر سکتا "سندھ" کا "ہند" ہو جانا خود بتاتا ہے کہ دونوں الفاظ کی اصل ایک ہے صرف ایک حرف کے بدل جانے سے اعراب بقیہ حروف اور تعداد حروف و نیز تلفظ پر کوئی اثر نہیں پڑا جس کی وجہ سے ان الفاظ کی واحد اصل ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بالکل یہی صورت "کوس" اور "کوہ" میں ہے کہ صرف "س" "ہ" سے بدل گیا ہے ورنہ پورا لفظ اپنے حروف، زیر و زبر اور سکون کے ساتھ دونوں جگہ برقرار ہے۔ اسی طرح "میں نے مارا" اور "ماری لام" میں اصل فعل "مارنا" بجنسہ موجود ہے اور 'میں' کا 'م' بھی ضمیر متکلم کی علامت کے طور پر موجود ہے جو دونوں جملوں کے واحد الاصل ہونے کی قوی دلیل ہے۔

ان ہی وجوہ کی بنا پر ماہرین لسانیات کی رائیں اس سلسلہ میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں چنانچہ ڈاکٹر چٹرجی مہاراشٹری پراکرت کو جو دوسرے گروہ لسانی کی زبان ہے شورسینی پراکرت کی جو پہلے گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور متھرا کے گرد و نواح کی زبان تھی ایک ترقی یافتہ شکل بتلاتے ہیں۔ اسی طرح شورسینی اور سنسکرت کے ملتی جلتی زبانیں ہونے پر ماہرین لسانیات کا اتفاق ہے۔ پالی اور ماگدھی تو اس قدر ملتی جلتی زبانیں ہیں کہ لوگ پالی کو ماگدھی ہی کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ نیز یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے جسے سب ماہرین لسانیات تسلیم کرتے ہیں کہ پوربی، پراچیہ، پالی، ماگدھی اور اردھ ماگدھی تقریباً ایک زبان یا ملتی جلتی زبانوں کے نام ہیں جن کو گوتم بدھ اور مہابیر جین نے اپنے اپنے دھرم کے پرچار کا وسیلہ بنایا اور ان مذاہب کی مقبولیت اور وسعت کے ساتھ

یہ زبانیں بھی تمام برصغیر پاک و ہند بلکہ باہر جہاں تک یہ مذاہب پھیلے اور مقبول ہوئے وہاں تک یہ زبانیں بھی پھیلیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان زبانوں کا اثر ان تمام علاقوں کی زبانوں پر پڑا اور خصوصاً بدھ مت کی مقبولیت نے ماگدھی یا اردھ ماگدھی کو بدھ مت کے وسیع حلقہ اثر میں جس میں سارا برصغیر، وسط ایشیا، تبت، برما اور انڈوچین وغیرہ سب شامل ہیں لنگوا فرنیکا کا درجہ عطا کر دیا تھا۔

درحقیقت یہ بات بالکل صحیح ہے کہ یہاں کی کل زبانیں اور پراکرتیں آپس میں ایسی مخلوط ہوئی ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا اور الگ زبان نہیں کہا جا سکتا۔ ان میں جو خفیف فرق ہیں وہ علاقائی اثرات سے ہیں یا ان علاقوں کی قدیم زبانوں کے اثر سے جو کسی زمانہ میں وہاں بولی جاتی تھیں اور اب مسخ ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اگر کوئی شخص اردو جانتا ہے تو وہ برصغیر پاک و ہند کی ہر زبان کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہے اور تھوڑے دنوں کی کوشش سے اچھی طرح سمجھنے اور بولنے لگتا ہے، خواہ وہ پاکستان کی کوئی زبان پشتو، پنجابی، بلوچی سندھی، گجراتی یا بنگالی ہو یا بھارت کی زبانوں مثل بہاری۔ اڑیا، مرہٹی، کنڑی یا تامل، تلگو اور ملیالم کیوں نہ ہو۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں اپنی کتاب "تاریخ زبان اردو" میں صفحہ ۴۴ پر لکھتے ہیں:۔

"ہر پراکرت کا نام اس دیس کے کسی نہ کسی علاقہ سے منسوب کیا گیا ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ پراکرت اس علاقہ کی بولیوں کی نمائندگی کرتی ہے

یہ درحقیقت ایک بہت بڑا لسانی مغالطہ تھا جسے جدید تحقیق نے رفع کر دیا ہے مثلاً پالی جیسے ماگدھی بھاشا کے نام سے بھی پکارا گیا ہے، مگدھ دیس (جنوبی بہار) سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی۔ یہ بہار کی قدیم بولی کی بہ نسبت مدھ دیش کی قدیم بولی سے زیادہ قریب دکھائی دیتی ہے۔ جس کے نمونے بلنے شورسینی پراکرت سے گھتے نظر آتے ہیں۔

یہی حال مہاراشٹری پراکرت کا تھا جو بقول چیٹرجی[1] شورسینی پراکرت کی ایک جدید اور ترقی یافتہ شکل تھی۔

پھر بڑا اہم سوال ہے کہ ایک زبان کا نام کسی علاقہ کے نام پہ رکھا جائے اور اس کا تعلق اس علاقہ کی زبانوں سے نہ ہو بلکہ ایک دوسرے علاقہ کی زبان سے ہو اس کا سبب کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا سبب اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا کہ ہمارا یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ یہ دونوں الگ الگ زبانیں ہیں۔ دراصل پالی اور شورسینی دو الگ الگ زبانیں نہ تھیں بلکہ دونوں ایک ہی زبان کے علاقائی نام تھے، تھی وہی ایک مخلوط زبان جو تمام اقوام کے امتزاج سے وجود میں آئی تھی۔ اس میں جگہ جگہ جو فرق پیدا ہوا وہ علاقائی اثر تھا اور ہر علاقہ کے رہنے والوں نے اس کا نام بھی اپنے علاقہ کے نام پر رکھ لیا۔ ماہرین لسانیات نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ پہلے انہوں نے ہر علاقائی زبان کو الگ زبان فرض کر لیا اس کے بعد اس کی امتیازی خصوصیات متعین کیں۔ بنیاد جب غلط قائم کی جائیگی تو ساری عمارت ناقص ہو گی۔

اگر انہوں نے مذکورہ بالا تاریخی حقائق کے پس منظر کے ساتھ لسانی تحقیق کی ہوتی

---

[1] انڈو آرین اور ہندی ص ۴۷

اور تاریخ سے بے نیاز نہ ہو گئے ہوتے تو شاید یہ فاش غلطی واقع نہ ہوتی۔

لسانی تحقیق اس طور پہ ہونا چاہیئے تھی کہ پہلے اس امر کو پیش نظر رکھا جاتا کہ ایک ملک جس میں تین ہزار سال قبل مسیح سے خارجی اقوام کا ورود شروع ہوا اور یہ سلسلہ تقریباً انگریزوں کی آمد گویا اب تک جاری رہا اور اس مسلسل ورود کے نتیجہ میں سخت انتشار قائم اور انتقال آبادی جاری رہا وہاں نہ تو نسلی حدود باقی رہ سکتے تھے اور نہ ثقافتی و لسانی اس لیے یہاں کی تمام زبانوں میں جو خصوصیات قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں پہلے ان کو متعین کر لیا جائے اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ دو زبانیں کس حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اگر اس طور پہ تحقیق ہوتی تو یہ امر سب سے پہلے منکشف ہو جاتا کہ دراصل یہ سب زبانیں مخلوط ہو کر ایک ہو گئی ہیں اور ان کی انفرادیت کا انحصار صرف جزوی فرق پر ہے جو علاقائی اثرات کا نتیجہ ہے اور ان کے رسم الخط بھی اسی علاقائی اثر کی بنا پہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں جن کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ ہر زبان ایک الگ زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس غلط فہمی اور غلط طریقہ تحقیق اختیار کرنے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ ایک مخلوط زبان جو اس اختلاط و امتزاج اقوام سے پیدا ہوئی تھی، اس اختلاط و امتزاج کی نشانی بلکہ اہم ترین یادگار تھی اور تمام برصغیر میں ہر جگہ سمجھی اور بولی جاتی تھی اس نے مسلمانوں کے ہزار سالہ دور حکومت میں ان کی غیر معمولی اعتنا اور سرپرستی اور ان کی زبانوں سے قابل قدر استفادہ کر کے اس قدر زیادہ ترقی کر لی کہ دنیا کی معیاری زبانوں میں اس کا شمار ہونے

لگا۔ اس نے ایک جداگانہ رسم الخط بھی اختیار کرلیا جو اس برعظم کی جملہ دیگر زبانوں سے مختلف تھا اور انگریزی دور میں "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی نے جو اختلافات مسلم اور غیر مسلم میں پیدا کیے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام غیر مسلم اقوام کو مسلمانوں کے ساتھ اس زبان کے خلاف بھی غیر معمولی تعصب پیدا ہو گیا۔ مغربی مستشرقین و ماہرین لسانیات تو رسم الخط کی وجہ سے اسے فارسی و عربی کے گروہ کی زبان سمجھے اور ہندوستانی غیر مسلم ماہرین لسانیات نے تعصب اور غیریت کی بنا پر ادھر توجہ نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں صحیح راہ سے بھٹک گئے اور ان کی تمام تحقیق و تلاش بیکار ہو گئی۔ انہوں نے جو نتائج برآمد کیے سب غلط ہو گئے ورنہ یہ علاقائی زبانیں جو دیوناگری یا اپنے مخصوص رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں، علاقائی خصوصیات اور وہاں کی قدیم بھاشاؤں کے اثرات رکھتی ہیں اور ان میں گو دیگر تمام زبانوں کے الفاظ کثرت سے شامل ہو گئے تاہم چونکہ وہ بولی جانے والی زبانیں تھیں اس لئے ان میں امتداد زمانہ کے ساتھ ترقی اور تغیر دونوں باتیں عمل میں آئیں اور بعض میں ادب بھی پیدا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ وہ دوسری پراکرتوں سے بظاہر مختلف معلوم ہونے لگیں ورنہ ابتدا میں اختلاف کے بجائے اتحاد کی علامتیں زیادہ نمایاں تھیں اور درحقیقت یہی اتحاد و اشتراکِ لسانی جو تاریخی حالات کے پیدا کیے ہوئے نسلی مذہبی اور ثقافتی امتزاج و اشتراک کا نتیجہ تھا اس ملک گیر مخلوط زبان کے وجود میں لانے کا اصل سبب تھا جو ہر خطہ اور علاقہ میں سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ اور جس کو اب اردو کے مبارک نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

باب دوم

مسلمانوں کی آمد کے وقت برصغیر کے سیاسی و سماجی حالات

رسالت کے آخری دس سال اور رسول اللہ کی وفات کے بعد خلافت راشدہ کے تیس سالہ دور میں اسلام نے جس تیز رفتاری سے ترقی کی وہ تہذیب و تمدن کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ فتوحات اور تبلیغ کا سلسلہ خجامیہ کے عہد اقتدار . . . . میں بھی جاری رہا اور پہلی صدی ہجری کے ختم ہونے تک عالم اسلام کی حدود مشرق میں دریائے سندھ اور مغرب میں اسپین سے آگے بڑھ چکی تھیں۔ ہند پاکستان میں مسلمان فاتحین کی آمد ہجرت کے پندرھویں سال یعنی ۶۳۶ء میں شروع ہوئی۔ سب سے پہلے بمبئی کے قریب تھانہ کی بندرگاہ پر اور اس کے بعد بھروچ (بروص) اور سندھ کے علاقہ پر فوج کشی کی۔ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں ایک بحری دستہ دیبل کی غرض سے یہاں آیا۔ اور بالآخر حضرت علیؓ

کے دورِ خلافت میں ان اطراف کی باقاعدہ نگرانی کی جانے لگی۔ امیر معاویہؓ نے مہلب کو سرحد سندھ کی نگرانی کا کام سپرد کیا، اس طرح اسلامی حکومت میں سندھ کے نگران کا ایک مستقل عہدہ قائم ہوگیا۔ عرب اور ایرانی جہازرانوں نے ہند پاکستان سے تعلقات بہت زیادہ بڑھالئے تھے۔ برصغیر کے مشرقی ساحل اور لنکا کی بندرگاہوں میں ان کی نوآبادیاں قائم ہوگئی تھیں۔ سندھ کے راجہ داہر کی سلطنت میں ایک باغی عرب سردار نے بھی پناہ لی تھی اور راجہ کی فوجی خدمت انجام دے کر اپنا کافی اثر قائم کرلیا تھا۔

آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اموی خلافت کی طرف سے مشرقی علاقہ پر جو مکران تک پہنچا تھا، حجاج بن یوسف کو حکمراں بناکر بھیجا گیا۔ اسی زمانہ میں لنکا میں ایک مسلمان تاجر کا انتقال ہوگیا۔ وہاں کے راجہ نے مرحوم تاجر کے بچوں کو کچھ تحائف دے کر بغداد روانہ کیا۔ سندھ کے ساحل پر دیبل کے قریب بحری قزاقوں نے اس جہاز کو لوٹ لیا۔ حجاج نے سندھ کے راجہ داہر کے پاس پیغام بھیجا کہ مسلمان قیدیوں کو واپس کیا جائے اور نقصان کی تلافی کی جائے داہر نے کہا کہ جن قزاقوں نے جہاز لوٹا تھا ان پر اس کو اختیار نہیں۔ حجاج کو یہ جواب مطمئن نہیں کرسکتا تھا، اس نے راجہ کو سزا دینے کے لئے دو سردار یکے بعد دیگرے بھیجے لیکن ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ تیسری مرتبہ حجاج نے اپنے عزیز نوجوان سردار محمد بن قاسم کی سرکردگی میں ایک فوج روانہ کی۔ یہ فوج خشکی کے راستہ سے مکران ہوتی ہوئی سندھ پہنچی۔ بھاری سامان اور اسلحہ بحری بیڑے کے ساتھ دیبل آیا۔ محمد بن قاسم نے دیبل کا باقاعدہ محاصرہ کرکے اس کو فتح کیا۔ اس کے بعد مسلمان دریائے سندھ کو عبور کرکے آگے بڑھے اور حیدرآباد جو اس زمانہ

میں نیرون کہلاتا تھا، قبضہ کر کے شمال کی طرف روانہ ہوئے۔ سیوہان کے لوگوں نے مقابلہ کیا لیکن جلد ہی ان پر قابو پا لیا گیا۔ اپنی فوج کے ایک حصہ سیوہان کی حفاظت کے لئے چھوڑ کر محمد بن قاسم سہیم یعنی سیسی کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں جاٹوں نے اس کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ [1]

وہاں سے محمد بن قاسم برہمن آباد پہنچا اور وہاں پہنچ کر اس نے مفتوحہ علاقے کی حکومت کے لئے ضروری انتظامات کئے۔ یہاں سے مسلمانوں کی فاتح افواج شمال کی طرف روانہ ہوئیں اور راستہ میں جو مقامات ملے ان کو ختم کرتی ہوئی ملتان تک پہنچ گئیں، شہر کے ہندوؤں نے باہر آ کر میدان میں مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی اور شہر میں پناہ لی۔ مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ ملتان کی فتح کے بعد سندھ کا سارا علاقہ محمد بن قاسم کے زیر نگیں آ گیا۔ لیکن یہ اس کی آخری فتح تھی۔ یہاں سے اس کو واپس جانا پڑا کیونکہ اس عرصہ میں حجاج کا انتقال ہو چکا تھا، ۷۱۵ء میں خلیفہ ولید نے وفات پائی۔ اور اس کا بھائی سلیمان تخت خلافت پر بیٹھا، سلیمان نے حجاج کے ساتھیوں اور رشتہ داروں کو سخت سزائیں دینا شروع کیں ـــــــ محمد بن قاسم بھی اس پالیسی کا شکار

---

[1] دیبل کے سب سے بڑے مندر پر ایک جھنڈا نصب تھا۔ شہر کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ جب تک یہ جھنڈا ہمارے سروں پر قائم ہے کوئی حملہ آور دیبل فتح نہیں کر سکتا کہا جاتا ہے کہ محمد بن قاسم نے اپنی بڑی منجنیق "عروس" کے ذریعہ اس جھنڈے پر سنگباری کی اور بالآخر اس کو گرا دیا۔ سندھی اب ناامید ہو گئے اور قلعہ سے باہر آ گئے۔ طرفین میں باہم جنگ ہوئی انجام کار مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور دیبل پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

ہوا۔ بغداد کے نئے گورنر کے حکم سے اس کو واسط میں قید کر دیا گیا، اپنی گرفتاری کے وقت محمد بن قاسم نے یہ شعر پڑھا۔[1]

اضاعونی وای فتی اضاعوا

لیوم کریھة وسداد ثغر

(ترجمہ۔ لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کس جوان کو ضائع کیا جو مصیبت کے وقت کام آئے اور سرحدوں کی مضبوطی کے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہو)

قید خانہ میں اس کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں، آخرکار تکالیف اور مصائب کے صدموں سے وہ قید خانہ ہی میں وفات پا گیا۔

باوجود کم سنی کے محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقوں پر اپنی بہادری اور ہمت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ انتظامی معاملات میں اس نے بڑی دور اندیشی اور رواداری سے کام لیا۔ اس کی رواداری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں کے غیر مسلموں کے لئے اس نے علماء دمشق سے فتویٰ حاصل کیا کہ ان کے ساتھ وہی مراعات برتی جائیں جو دوسرے علاقوں میں اہل کتاب یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کو حاصل تھیں۔ اسلامی حکومت میں بہت سے عہدوں پر غیر مسلم ہی فائز رہے چنانچہ راجہ داہر کے وزیر سیاسیات کو بھی اس کے عہدہ پر برقرار رکھا گیا۔[2] محمد بن قاسم کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کا

---

[1] بلاذری بحوالہ تاریخ سندھ از مولینا سید ابوظفر ندوی ص۱۲۱

[2] مفتوحہ علاقوں کے رہنے والوں کو محمد بن قاسم کی موت سے سخت رنج ہوا۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ کیرج یعنی بھوج کے لوگوں نے یادگار کے طور پر اس کی مورتی بنائی۔

سلسلہ تو جاری نہ رہ سکا لیکن جو علاقہ فتح ہو چکا تھا اس کا اکثر حصہ اسلامی مملکت کا مستقل حصہ بن گیا۔

محمد بن قاسم کی فتوحات ہند پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں۔ پہلی مرتبہ برصغیر کا اسلامی دنیا سے براہ راست تعلق پیدا ہوا، اس کے علاوہ تبلیغی کوششوں کے نتائج میں یہاں کی آبادی کے بڑے حصہ نے مذہب اسلام قبول کیا۔ بعض مسلمان سردار جو فوج کے ساتھ آئے تھے یہیں بس گئے، گویا کہ اسلام کے ذریعہ ایک نئی تہذیب اس خطۂ ارض میں داخل ہوئی اور یہاں کے تمدن کو اس نے بڑی حد تک بدل دیا۔

سب سے زیادہ نمایاں تبدیلی زبان میں ہوئی۔ سندھی زبان اور رسم الخط میں عربی و فارسی زبان کا اثر آج بھی نمایاں ہے۔

اسلامی فتوحات کا دوسرا دور سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے شروع ہوتا ہے، لیکن ان حملوں سے پہلے اسلامی معاشرہ اور سیاسی نظام میں بنیادی تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں، جن کی طرف مختصراً اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ اموی حکمرانوں نے بہت جلد اسلامی خلافت کو مملکت میں تبدیل کر دیا، اس کے بعد سے جہاں تک حکمرانوں کا تعلق تھا، وہ اسلامی تبلیغ اور مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح و تربیت کی طرف سے کسی حد تک بے پرواہ ہو گئے ان کی فتوحات میں اسلامی عنصر زمانہ کے ساتھ کم ہوتا گیا، اگرچہ اسلامی حکومت کا نظم و نسق شریعت کی بنیادوں پر قائم رہا، مگر پھر بھی حکمران اور نظم و نسق چلانے والے طبقوں میں دنیوی مقاصد کے مقابلہ میں دینی جذبہ روز بروز کم ہو گیا، اگرچہ اس کمی کو علماء اور صوفیا کرام کے گروہ نے اپنی کوششوں سے پورا کیا، اور دنیوی اور نفسانی خواہشات سے پیدا ہونے والے جھگڑوں کو

ختم کرنے کی غرض سے خدا کی محبت پر زیادہ زور دیا، صوفیاء کے مختلف سلسلے آنحضرت کے عہد مبارک ہی سے شروع ہوتے ہیں، لیکن امام حسن بصری ۶۴۳-۷۲۸ء کے زمانہ میں ان سلسلوں کی اشاعت تیزی کے ساتھ ہوئی اور ہند پاکستان میں اسلام کی تاریخ اور یہاں کے تمدن کی تعمیر میں صوفیاء نے نمایاں خدمات انجام دیں اس خطہ ارض میں حکمرانوں کی پالیسی نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ اگر مختلف سلسلوں کے بزرگ اپنی تبلیغی مساعی جاری نہ رکھتے تو شاید مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل رہتی۔ کس سلسلہ میں کون بزرگ سب سے پہلے یہاں تشریف لائے اس کا فیصلہ مشکل ہے۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں ابو حفص ربیع بن صبیح السعدی البصری کا تذکرہ کیا ہے، موصوف نے ۱۶۰ھ میں سندھ میں وفات پائی۔ دسویں صدی عیسوی میں منصور الحلاج بھی بذریعہ جہاز ہند پاکستان آئے اور خشکی کے راستہ سے واپس گئے۔

اسلامی فتوحات کا دوسرا دور دسویں صدی عیسوی کے آخری سالوں میں شروع ہوا۔ اس صدی میں عالم اسلام میں ایک انقلاب آچکا تھا۔ خلفاء کا اقتدار تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ گو ابھی تمام اسلامی دنیا پر عباسی خلیفہ کی حکومت تھی لیکن حقیقی اختیارات صوبائی حکمران خاندان کے ہاتھ میں تھے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر خاندانوں کے بانی ترک تھے، ان ہی میں ایک سامانیہ خاندان تھا جن کا دارالحکومت بخارا تھا۔ سامانیوں کے ایک غلام الپ تگین نے غزنین میں اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی تھی۔ الپ تگین کا غلام سبکتگین اپنے مالک کے بعد تخت نشین ہوا

ریاست غزنین کی حد شرقی جانب ہند پاکستان کے راجہ جے پال کے علاقہ سے ملتی تھی جیپال نے سبکتگین کو کمزور تصور کر کے اس کے علاقہ پر حملہ کیا۔ دونوں میں جنگ ہوئی، جے پال نے شکست کھائی اور کچھ علاقہ سے دست برداری لکھ کر صلح کر لی سبکتگین کے بعد اس کا لڑکا محمود ۹۹۹ء میں تخت پر بیٹھا۔

سلطان محمود نے غزنین کی مختصر سی ریاست کو اپنی فتوحات اور قابلیت سے ایک عظیم الشان سلطنت بنا دیا۔ ہند پاکستان پر اس نے سترہ حملے کئے اور شمال مغرب کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ محمود کا سب سے بڑا حملہ سومنات پر ۱۰۲۵ء میں ہوا۔ ہندوؤں نے اس موقع پر زبردست تیاریاں کی تھیں اور ان کی تعداد اور سروسامان بہت زیادہ تھا۔ اس موقع پر بعض روایتوں کے مطابق چشت کے مشہور صوفی بزرگ خواجہ محمد بن ابی احمد چشتیؒ بہ نفس نفیس باوجود سن رسیدہ ہونے کے محمود کی مدد کیلئے آئے تھے۔[1] اس واقعہ کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس سے محمود کے ہند پاکستان حملوں کی نوعیت میں نمایاں تبدیلی ہو گئی۔ اور ان حملوں اور تمام جدوجہد سے واحد غرض بجز جہاد کے اور کچھ نہ تھی۔

دور غزنوی کی علمی اور تبلیغی کوششیں

سلطان محمود کے بعد غزنوی حکومت کا زوال شروع ہو گیا، لیکن پھر بھی تقریباً پونے دو سو سال تک وہ مغربی پاکستان کے شمالی علاقوں پر حکومت کرتے رہے۔ اس زمانہ میں برصغیر کا یہ حصہ اسلامی تہذیب و تمدن

---

[1] نفحات الانس از جامیؒ

کا مرکز بن گیا۔ غزنوی حکومت کے قیام کے بعد علماء و مشائخ نے درس و تدریس اور دینی تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ غزنوی دور کے علماء اور محققین میں سب سے زیادہ شہرت البیرونی نے پائی۔

البیرونی ۹۷۳ء میں مضافات خوارزم کے ایک قصبہ میں پیدا ہوا۔ ۱۰۱۷ء میں اس علاقہ کو سلطان محمود نے فتح کیا اور وہاں کے علماء اور دیگر مشاہیر کو اپنے ساتھ لے آیا۔ ان ہی میں ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی بھی تھا۔ محمود کے زمانہ میں البیرونی کو بہت زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں ملا، لیکن اس کے بیٹے کے عہد میں اس نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اس کی سب سے وقیع کتاب قانون مسعودی ہے، جو محمود کے بیٹے مسعود کے نام پر قانون مسعودی کے نام سے مشہور ہوئی۔ لیکن ہمارے لیے اس کی کتاب الہند بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ہندی علوم و فنون سے مسلمانوں کی دلچسپی کا آغاز خلیفہ منصور ہی کے زمانہ سے ہو گیا تھا۔ لیکن البیرونی سب سے پہلا مسلمان محقق ہے جس نے ہندی علوم کا مطالعہ خود اس برصغیر میں آ کر کیا اور ہندی علوم کی مشہور کتابیں یہاں کے پنڈتوں کی مدد سے پڑھیں۔ ان علوم کے مطالعہ میں اس نے بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کیا۔ اس کا کچھ اندازہ کتاب 'الہند' کے جرمن مترجم پروفیسر سخاؤ کے مقدمہ سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ امر غور کرنے کے قابل ہے کہ البیرونی نے کتاب الہند لکھ کر اپنے ہم مذہبوں میں ہندی علوم اور یہاں کی زبان سے دلچسپی پیدا کر دی۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عالم اسلام اور برصغیر پاکستان کے علمی اور ثقافتی روابط کے ابتدائی دور میں البیرونی نے نمایاں حصہ لیا۔ البیرونی کے علاوہ اس دور کے دوسرے ادباء اور شعراء کے یہاں بھی ہند پاکستانی الفاظ

نظر آتے ہیں۔ مثلاً سلطان مسعود کے درباری شاعر مسعود بن سعد سلمان نے لنگھن (بمعنی روزہ) کا لفظ استعمال کیا ہے[1]۔

الا تا مومنا دارند روزہ الا تا ہندواں گیرند لنگن

حضرت داتا گنج بخشؒ علماء و شعراء سے کہیں زیادہ اہم کردار صوفیاء کرام کا رہا ہے، ان اکابر نے اسلام کی اشاعت کی اور سینکڑوں نے ان کے مبارک ہاتھوں پر اسلام قبول کیا، جہاں یہ بزرگ غیروں کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کی خدمت انجام دیتے تھے، وہاں اپنوں میں بھی ان کی اخلاقی و روحانی تعلیم و اصلاح کا سلسلہ جاری تھا۔ غزنوی فتوحات کے ساتھ جو بزرگ یہاں آئے ان میں شیخ اسماعیل بخاریؒ کو اولیت و تقدم کا شرف حاصل ہے۔ یہ بزرگ گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں تشریف لائے اور پچاس سال سے زیادہ طویل عرصہ تک اسلام کی دعوت و تبلیغ کی خدمت انجام دی[2]۔ ان کے آخر زمانہ میں خواجہ حسین زنجانی لاہور میں ان کے ہمعصر تھے۔ یہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے پیر بھائی تھے۔ میر حسن سنجری نے فوائد الفواد میں ان دونوں بزرگوں کے متعلق اپنے پیر طریقت شیخ نظام الدین دہلیا کی روایت نقل کی ہے۔ "شیخ حسن زنجانی اور شیخ علی ہجویری دونوں

---

[1] ایم اے غنی۔ اے ہسٹری آف پرشین لنگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ حصہ اول ص ۵۲

[2] دیکھو آرنلڈ۔ دی پریچنگ آف اسلام

ایک ہی پیر کے مرید تھے اور ان کے پیر اپنے زمانے کے قطب تھے۔ حسین زنجانیؒ عرصہ سے لاہور (قدیم لہاور) میں سکونت پذیر تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کے پیر نے خواجہ علی ہجویری کو حکم دیا کہ لاہور میں جاکر قیام کرو۔ خواجہ علی ہجویریؒ نے عرض کیا کہ وہاں شیخ زنجانی موجود ہیں، لیکن پھر فرمایا کہ تم جاؤ۔ جب علی ہجویری تعمیل ارشاد میں لاہور آئے تو رات ہو چکی تھی، صبح کو شیخ کا جنازہ باہر لایا گیا۔[1]

خواجہ ابو الحسن علی بن عثمان بن علی الغزنوی الجلابی الہجویری کا وطن غزنین تھا، وہ ابو الحسن محمد بن الحسن الختلی کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کے علاوہ اور چند بزرگوں سے بھی کسب فیض کیا تھا۔ بعض لوگوں نے ان کا سنہ ولادت ۴۰۰ھ لکھا ہے، لیکن اس کو یقینی نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال سلطان محمود غزنوی کی وفات کے وقت ان کی عمر کافی ہو گی، کیونکہ جان نکلسن نے رسالہ ابدالیہ[2] کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ سلطان مذکور کے سامنے خواجہ علی ہجویری نے ایک ہندو فلسفی سے بحث کی اور اس کو قائل کر دیا تھا۔ خواجہ علی ہجویری کے سنہ وفات کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ آزاد بلگرامی نے سنہ وفات ۴۶۵ھ ہجری لکھی ہے لیکن نکلسن کا خیال ہے ۴۶۵ سے ۴۶۹ء تک کوئی بھی سال ہو سکتا ہے۔[3] لاہور آنے سے قبل خواجہ علی ہجویری نے عالم اسلام

---

[1] فوائد الفواد ص۹

[2] رسالہ ابدالیہ کے لئے دیکھو انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ نمبر ۱۷۷۴ (۲)

[3] نکلسن۔ کشف المحجوب (انگریزی ترجمہ) ص۹ (دیباچہ)

میں بہت سے مقامات کا سفر کیا تھا۔ اور طویل سیاحی کے بعد لاہور تشریف لائے تھے۔ آپ کی زندگی کے حالات بہت کم قلمبند ہوئے ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کی تعلیم وارشاد سے بہت جلد اور بڑی کثرت سے لوگ مستفیض ہونے لگے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس وقت سے آپ کا شمار ہند وپاکستان کے عظیم ترین بزرگوں میں کیا جاتا رہا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ جب یہاں تشریف لائے تو آپ نے شیخ ہجویری کے مزار پر چلّہ کیا۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت یہ شعر پڑھا:۔

گنج بخش ہر دو عالم مظہر نور خدا
کاملاں را پیر کامل ناقصاں را رہنما

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اثر اور بزرگی کے لحاظ سے شیخ کا مقام کس قدر بلند تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ دوسرے بزرگ صوفی جن کی تبلیغی واصلاحی کوششوں نے ہند پاکستان کی تاریخ پر دیرپا اثرات چھوڑے، وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہیں۔ سجستان میں ولادت ہوئی، اسی مناسبت سے آپ کے نام کے ساتھ سجزی لکھتے ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی نے اپنی تمام زندگی اسلام کی تبلیغ وتلقین میں گذاری، اپنی اس مذہبی در اسلامی تبلیغ کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کے لئے آپ نے مقامی زبان سیکھی، تاکہ مقامی لوگوں سے خود ان کی اپنی زبان میں افہام وتفہیم میں سہولت ہو، آپ ان لوگوں سے انہیں کی زبان میں گفتگو فرماتے، اس طرح آپ کی تعلیم وتبلیغ

کا اثر زیادہ ہوا اور ان کے دلوں میں اسلام اور اس کے مبلغین کی رواداری ثابت ہو گئی۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں نے سنسکرت زبان کو تقدیس اور خصوصیت کے پھندوں میں ایسا مقید کر دیا تھا کہ خود ہندو مذہب کے پیرو، برہمنوں کے علاوہ، اس کو استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ برخلاف اس کے مسلمان صوفیا نے یہ ضروری سمجھا کہ خود ان ہی کی زبان سیکھیں۔ علمی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے بھی اس اقدام سے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نئی زبان کی بنیاد جو اسلامی ہند پاکستانی تہذیب کے عظیم ترین کارناموں میں سے ایک ہے، اسی طریقہ سے رکھی گئی۔ مشائخ نے اس کو تبلیغی ضرورتوں کے ماتحت شروع کیا، لیکن ان کے اتباع میں دوسرے طبقوں نے جن کو مقامی لوگوں سے کسی نہ کسی حیثیت سے قریبی روابط پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی گئی، یہی طریقہ اختیار کیا۔ تبلیغی کوششوں کے نتیجہ میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ زبان، ادب اور ثقافتی زندگی بھی نکھرتی گئی۔

سلطان محمود غزنوی نے جن علاقوں کو فتح کر کے سلطنت غزنویہ میں شامل کیا تھا ان میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ریاست غور کی بھی تھی۔ یہاں کے حکمراں خاندان کا نام شنسبانیہ تھا اور بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں اسی خاندان کا ایک فرد غیاث الدین غزنین کا حکمراں تھا۔ غیاث الدین کے چھوٹے بھائی کا نام شہاب الدین تھا، یہی شہزادہ بعد میں سلطان ہوا اور اس نے معزالدین کا لقب اختیار کیا۔ معزالدین نے سلطان محمود کی

طرح ہند پاکستان میں متعدد فتوحات حاصل کیں، لیکن اس کا مقصد اور طریقہ کار غزنوی سلطان سے قدرے مختلف تھا۔ محمود نے مفتوحہ علاقہ کا بہت تھوڑا حصہ اپنی سلطنت میں شامل کیا اور باقی علاقوں سے کچھ دولت بطور تاوان جنگ لے کر ان کو آزادی دیدی۔ معزالدین نے برخلاف اس کے جو علاقے فتح کئے ان پر اپنی حکومت قائم کی اور نظم و نسق کے لئے اپنے حکام مقرر کئے اس نے اپنی فتوحات کا سلسلہ ۱۱۷۵ء میں شروع کیا۔ ابتدا میں اس کو کچھ مسلمان حکمرانوں اور سرداروں کے خلاف ہی لڑنا پڑا۔

سلطان معزالدین نے اپنے ایک غلام قطب الدین کو، جو اس کی فوج میں بڑا سردار تھا۔ مفتوحہ علاقہ کا حاکم مقرر کیا، اور خود غزنین واپس چلا گیا۔ قطب الدین نے دہلی، میرٹھ، کوئل (علی گڑھ) اور قرب و جوار کے علاقوں پر قبضہ کر کے باقاعدہ انتظام کیا۔

سلطنت دہلی کا قیام و استحکام

سلطان معزالدین کے بعد ہند پاکستانی علاقوں کا غزنین سے تعلق ختم ہو گیا۔ چونکہ قطب الدین نے دہلی کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا اس لئے تاریخ میں یہ مملکت سلطنت دہلی کے نام سے یاد کی جاتی ہے، قطب الدین کے مختصر دور حکومت (۱۲۰۶ء-۱۲۱۰ء) میں کچھ نئی فتوحات بھی ہوئیں لیکن ان سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ نظام حکومت کا بنیادی خاکہ تیار ہو گیا۔ قطب الدین نے اس کی بنیاد شرعی قوانین پر رکھی۔ تاج المآثر میں اس کی طرف مندرجہ ذیل الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:-

"شعار شعائر بہ غایت ظہور انجامید، و منابع و شعائر مسلمانی بکمال وضوح پیوست" اس کے بعد اس خاندان میں کئی بادشاہ ہوئے جن میں سلطان التمش اور غیاث الدین بلبن کو بڑی اہمیت حاصل ہے فتوحات اور سیاسی قوت کے اعتبار سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہے خاص کر بلبن نے مغلوں کے حملوں کا استیصال بڑی قابلیت سے کیا۔

بلبن کی وفات کے بعد اس کا پوتہ کیقباد تخت حکومت پر بیٹھا لیکن وہ ابھی نوعمر ہونے کی وجہ سے نا تجربہ کار تھا، اس لئے حکومت کے انتظام کو پورے طور پر نہ سنبھال سکا، اور ۱۲۹۰ء میں اس کے ایک امیر جلال الدین خلجی نے دہلی پر آمرانہ قبضہ کر لیا اور اس طرح خلجی خاندان کی حکومت کا آغاز ہو گیا۔ جلال الدین خلجی صرف چھ سال حکومت کر سکا کہ ۱۲۹۶ء میں اس کے بھتیجے علاء الدین نے، جو کڑہ کا حاکم تھا، اپنے چچا جلال الدین کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔

سلطان علاء الدین کی حکومت کے بیس سال سلطنت دہلی کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں، علاء الدین کے کارناموں کو تفصیل سے بیان کرنے کا یہ موقعہ نہیں، لیکن مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پہلا حکمران تھا، جس نے دکن کو فتح کر کے سارے ہند پاکستان کو ایک مرکز کے تحت کیا۔ علاء الدین کی فتوحات کا سلسلہ اس کی تخت نشینی سے چند سال بعد ہی شروع ہو گیا تھا سب سے پہلے اس نے گجرات فتح کیا، پھر راجپوتانہ اور وسط ہندوستان کے راجاؤں کی ریاستوں کو سلطنت دہلی میں شامل کیا۔ راجپوتانہ کی لڑائیوں میں رنتھمبور

اور چتوڑ کی فتوحات میں سلطانی افواج نے بڑی بہادری دکھلائی۔ راجپوت مجبور ہو گئے کہ سلطان کی اطاعت قبول کر کے اپنی خود مختاری سے دستبردار ہو جائیں۔

دکن کی فتوحات اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہیں۔ علاءالدین نے اپنی شہزادگی کے زمانہ میں شمالی دکن میں دیوگیر کے راجہ پر حملہ کر کے اس کو شکست دی تھی۔ یہاں کے راجہ رام دیو نے سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس نے اپنے وعدہ کو ایفا نہیں کیا۔ چنانچہ علاؤالدین نے اپنے ایک سردار ملک کافور کی سرکردگی میں دیوگیر کے خلاف فوج روانہ کی۔ رام دیو نے کافور کے سامنے معذرت کرتے ہوئے درخواست کی کہ اس کو ماتحت راجہ تسلیم کر لیا جائے۔ علاؤالدین نے اس کی یہ درخواست قبول کر لی اس طرح دیوگیر سلطنت دہلی میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۲ء میں سلطان نے ملک کافور کو دوبارہ دکن روانہ کیا۔ وہ دیوگیر سے گزرتا ہوا ورنگل پہنچا، اور پانچ چھ سال کی مختصر مدت میں سلطان علاءالدین کی فوجوں نے دکن اور جنوبی ہند کے سارے علاقے کو فتح کر کے سلطنت دہلی کی حدود ہندپاکستان کے جغرافیائی حدود تک پہنچا دیں۔ برصغیر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جبکہ تمام ہندپاکستان پر ایک حکمراں کی حکومت قائم ہوئی۔ اور شمالی ہند کا دکن سے باقاعدہ رابطہ قائم ہوا۔ فتوحات علائی کی تفصیلات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاءالدین نے دکن میں وہی کام انجام دیا جو سلطان محمود اور معزالدین نے شمال میں انجام دیا تھا۔

سلطان محمد بن تغلق ۱۳۲۵ء — ۱۳۵۱ء

کی وفات کے بعد خلجی خاندان کا زوال شروع ہو گیا اس کے بیٹے قطب الدین مبارک شاہ کو ایک نو مسلم غلام خسرو خاں نے جس پر اس کو بے حد اعتماد تھا، قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ ان حالات کو مسلمان امرار برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ تک وہ بے بس اور مجبور رہے۔ آخر کار ایک ترکی سردار ملک تغلق نے ہمت کر کے دہلی پر حملہ کر دیا۔ خسرو خاں کو شکست ہوئی اور امرار نے بالاتفاق تغلق کو اپنا سلطان منتخب کیا۔

امیر تیمور کا حملہ ۱۳۹۸ء

سلطان فیروز شاہ کے بعد تغلق کا زوال شروع ہو گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے جانشین کمزور اور نا قابل تھے اسی دور انحطاط میں امیر تیمور نے برصغیر پر حملہ کیا۔ تیمور ایک ترکی سردار کا لڑکا تھا وہ سمرقند کے قریب ایک گاؤں میں ۱۳۳۶ء میں پیدا ہوا تھا تینتیس سال کی عمر میں وہ چغتائی ترکوں کا سردار تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے بعد اس نے قرب و جوار کے علاقوں پر حملے شروع کئے اور ان کو فتح کرتا ہوا ۱۳۹۸ء میں اس نے برصغیر پر حملہ کرنے کی تیاری کی، اپنی مجلس مشاورت میں اس نے لوگوں کو بتایا کہ وہ یہاں کے غیر مسلموں سے جہاد کر کے غازی بننا چاہتا ہے۔ لیکن یہ صرف جوشیلے اور جاہل مسلمانوں کو جنگ کے لئے تیار کرنے کی تدبیر تھی، ورنہ تیمور خوب جانتا تھا کہ ہند پاکستان میں مسلمانوں کی حکومت ہے اور ان کے خلاف جہاد نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال ۱۳۹۸ء میں موسم گرما شروع ہونے سے قبل وہ سمرقند سے روانہ ہوا اور ستمبر میں دریائے سندھ کو عبور کر کے دہلی کی طرف بڑھا۔ راستہ میں اس

نے کئی سرداروں کو شکستیں دیں نتیجے میں بہت سامان و اسباب اور غلام ہاتھ آئے دسمبر میں وہ دہلی کے قریب لونی کے میدان میں پہنچ کر خیمہ زن ہوا۔

لڑائی میں دہلی کی فوج کو شکست ہوئی سلطان تغلق رات کے وقت گجرات کی طرف بھاگ گیا۔ تیمور نے دہلی میں دربار کیا، اور شہر کو لوٹا اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا۔ دولت جمع کر کے پہلی جنوری ۱۳۹۹ء کو وہ دہلی سے روانہ ہو گیا اور میرٹھ ہوتا ہوا ہردوار پہنچا، وہاں سے جموں آیا۔ یہاں ایک اور دربار منعقد کیا، خضر خاں کو جو ملتان کا حاکم تھا اور تیمور کے ساتھ ہو گیا تھا، اپنا نائب مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ تیمور کے حملہ نے سلطنت دہلی کو جو روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی، نیم مردہ کر دیا، جس سے مختلف علاقوں کے حاکموں اور سرداروں کو بغاوت کر کے خود مختار ریاستیں قائم کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔

۱۴۱۴ء میں خضر خاں نے آخری تغلق سلطان کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس کے خاندان میں اس کے بعد تین بادشاہ اور ہوئے۔ چونکہ خضر خاں سید تھا اس لئے مورخین اس کو سید سلاطین ہی لکھتے ہیں سیدوں سے حکومت لودیوں کو منتقل ہوئی اور اس خاندان کے آخری فرمانروا ابراہیم لودی نے بابر سے شکست کھائی اور ہند و پاک میں مسلمانوں کے دور حکومت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

دور اسلام سے پہلے برصغیر کی سیاسی زندگی طوائف الملوکی کا شکار ہو چکی تھی۔ یوں تو یہاں اشوک کے عہد کے چند سالوں کو چھوڑ کر کسی وقت بھی ایک سیاسی نظام جاری نہیں ہو سکا تھا لیکن بارھویں صدی کے نصف آخر میں اس

کے مختلف حصوں میں بہت سی خود مختار ریاستیں وجود میں آگئیں تھیں۔ سماجی زندگی میں بھی ہندوؤں میں اخوت و مساوات اور ہم وطنی کے جذبات کبھی کارفرما تھے۔ آریائی تہذیب کی بنیاد میں تقسیم ذات پر ہی رکھی گئی تھیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ ذات کی پابندیاں سخت ہوتی گئیں۔ بدھ مت کے وجود میں آنے سے تقسیم ذات کے اصول کو زبردست صدمہ پہنچا تھا اور ایک زمانہ میں اس قسم کے حالات پیدا ہوگئے تھے کہ خیال ہوتا تھا کہ ہند پاکستانیوں کو ان جکڑ بندیوں سے چھٹکارا مل جائے گا۔ لیکن برہمنوں نے اپنے مذہب اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے بدھ مت کا مقابلہ کیا۔ دونوں مذہبوں کی یہ جنگ صدیوں تک جاری رہی اور بالآخر ہندو بدھ مذہب پر غلبہ پانے میں کامیاب ہوگئے۔

آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم کے حملے کے وقت ہم کو سندھ وغیرہ کے علاقوں میں بدھ مذہب کے پیرو کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ لیکن سلطان محمود اور معز الدین کی ساری لڑائیاں ہندوؤں کے خلاف لڑی گئیں بہ الفاظ دیگر آٹھویں اور بارھویں صدی کے درمیان بدھ مت کے ماننے والے ہی نہیں بلکہ ان کی تہذیب و تمدن کے آثار بھی ختم کر دیئے گئے تھے۔ بہر حال قیام سلطنت کے وقت تمام برصغیر میں ہندو مذہب کا دور دورہ تھا اور برہمنی اقتدار اپنے عروج کے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکا تھا۔

برہمنی اقتدار اور تقسیم ذات کی سخت گیر پابندیوں نے ہند پاکستانی سماج کے جن اصولوں اور روایات کو مقدس اور مستحکم بنا دیا تھا ان میں سے اکثر اسلامی تعلیمات اور مسلم قوم کی روایات کے خلاف تھیں، یہی وجہ ہے

کہ ہندو مذہب جو قدیم زمانہ سے اس کا عادی ہو چکا تھا کہ باہر سے آنے والی فاتح قوموں کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے اپنے اصولوں اور روایتوں میں تبدیلی اور لچک پیدا کرلے۔ اس طریقہ کار کو مسلمانوں کے خلاف کامیاب نہ بنا سکا۔ مثلاً دوسری قومیں جو خود بت پرستی کے عقیدے پہلے ہی سے رکھتی تھیں اس کے لئے آسانی سے تیار ہو گئیں کہ ان کے دیوتا اور رسوم کو ہندو دیوتاؤں کی فہرست میں شامل کر لیا جائے۔ اور وہ ہندو کہلانے لگیں۔ اصنام پرست معاشروں کی ہمیشہ یہ صورت ہوتی ہے کہ مختلف گروہوں اور قبیلوں بلکہ مختلف خاندانوں کے مخصوص دیوتا ہوتے ہیں اور ان کی مورتیاں مخصوص مندروں میں بھی موجود رہتی ہیں اور خود لوگوں کے گھروں میں بھی۔ مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرنے والوں میں وجہ اشتراک صرف یہ بات ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے دیوتاؤں کی مخالفت نہ کریں اور ان کی پرستش کے راستہ میں حائل نہ ہوں برخلاف اس کے مسلمانوں میں توحید و رسالت پر عقیدہ ہونے کے علاوہ ان کی عبادت کی بنیاد اجتماع پر ہے۔ ہر مسلمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ روزانہ پانچ وقت جماعت سے نماز ادا کرے۔ تنہا نماز ادا کرنے کی اجازت مخصوص اور بعض مستثنیٰ حالتوں میں دی گئی ہے اور چونکہ اسلام نے دینی اور دنیوی امور کو دوسرے معاشروں کی طرح زندگی کے دو علیحدہ پہلو قرار نہیں دیا ہے بلکہ انسان کے لئے ایک ایسا مکمل اور جامع قانون حیات پیش کیا ہے جو روحانی اور مادی زندگی پر یکساں حاوی ہے اس لئے مسلمانوں کا تصور ہندوؤں کے نظریات سے بالکل مختلف ہے۔ بنیادی طور پر ہندو اور مسلمان کسی غیر شعوری یا کسی غیر محسوس

طریقہ پر ایک معاشرہ میں ضم نہیں ہو سکتے۔ اس مسئلہ پر ہماری تاریخ کا فیصلہ بالکل واضح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیق پاکستان اسی مسئلہ کی آخری اور یقینی منزل تھی۔

اسلامی معاشرہ

اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے۔ جہاں بھی مسلمانوں کو سیاسی اقتدار حاصل ہوا، وہاں مبلغین بھی سیاسی رہنماؤں کی معیت میں یا ان سے آگے پیچھے گئے۔ علماء دین کے علاوہ صوفیہ کرام بھی تبلیغ اسلام میں سرگرم رہتے تھے۔ علماء دین کا دائرہ عمل صرف پند و نصائح تک ہی محدود نہ تھا بلکہ وہ درس و تدریس، افتاء و قضا، اور تصنیف و تالیف وغیرہ میں بھی مصروف رہتے تھے، لیکن صوفیہ کرام نے ان چیزوں میں حصہ نہیں لیا اور مسلمانوں کی روحانی تعلیم و تربیت اور غیر مسلموں میں دعوت اسلام و تبلیغ دین میں مشغول رہے۔ ہندپاکستان میں سیاسی اور فوجی رہنماؤں نے اشاعت اسلام میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ ان کو خیال تھا کہ ایسے ملک کے حکمرانوں کو جہاں کی آبادی میں غیر مسلموں کی تعداد بہت زیادہ ہے، مذہب کے معاملات میں دلچسپی کا اظہار زیادہ نہیں کرنا چاہیئے۔ یہاں یہ بحث نہیں کہ ان کا خیال کس حد تک درست تھا لیکن ان کی اس پالیسی کا معاشرہ پر بہت گہرا اثر پڑا۔ تبلیغ کا کام تقریباً صوفیاء ہی کے ذمہ ہو گیا اس لئے ہم کو تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ ہندپاکستان میں اسلامی معاشرہ پر تصوف کا رنگ ہمیشہ بہت گہرا رہا۔ اور ہر طبقہ کے لوگ صوفیاء کے سلسلوں میں سے کسی نہ کسی سلسلہ سے منسلک ہوتے رہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ ہندپاکستان میں اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور تعمیر میں بہت بڑا حصہ صوفیاء کا ہے۔ صوفیاء کے بعد علماء اور ادباء کا حصہ ہے۔ علماء میں بعض نے درس و تدریس کے

علاوہ تبلیغی خدمات بھی انجام دیں، لیکن معاشرہ پر پائدار اثر صرف ان کی تصانیف کے ذریعہ ہوا۔

ان عوامل کا جائزہ لیتے وقت جو معاشرہ کی تشکیل میں کارفرما رہے ہیں، ہم اس کو نظرانداز نہیں کرسکتے کہ اس عمارت کی تعمیر میں یہاں کے رسم و رواج، آب و ہوا، علوم و فنون، غرضکہ پورے ماحول کا بھی اثر ہونا لازمی تھا آرٹ، ادب، زبان، رہنے سہنے کے طریقے، روزانہ کی زندگی سے متعلق رسم و رواج میں ہم مقامی روایات کا اثر پاتے ہیں اور یہ فطری امر ہے ایک دلچسپ پہلو اس مسئلہ کا یہ بھی ہے کہ بعض مقامی روایات اور رسوم جو اسلامی تعلیمات کی روح کے خلاف تھیں مسلمانوں کی سماجی زندگی میں داخل ہونے لگیں۔ دینی رہنماؤں کو ان کے روکنے کی جدوجہد کرنا پڑی۔

سو سال تک سلطنت کا دارالحکومت رہنے کے بعد دہلی کی اہمیت اور مرکزیت اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ دہلی کے لئے احترام کے طور پر حضرت کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ سیاسی اہمیت و مرکزیت کے علاوہ اب دہلی ہی دینی اور علمی زندگی کا مرکز اول بن گئی تھی اس کا سبب ہم کو دو شخصیتوں کے کارناموں میں ملتا ہے۔ دینی اور علمی زندگی کا سرچشمہ حضرت نظام الدین اولیاء کا قیام اور ان کے پند و نصائح تھے سیاسی اقتدار کی توسیع اور علم و فن کے لئے مناسب ماحول پیدا کرنے کا سہرا علاء الدین خلجی کے سر ہے۔ علوم و فنون کی ترقی اور اخلاقی اقدار کی بلندی کے لئے جس ماحول اور امن کی ضرورت تھی وہ علاء الدین ہی نے پیدا کیا تھا۔

امیر خسرو اور امیر حسن سنجری

علاء الدین کے عہد کے لئے برنی کی تاریخ کے علاوہ ہم کو سب سے زیادہ مواد امیر خسرو کی تصانیف میں ملتا ہے۔ موخر الذکر کے یہاں صرف واقعات کی تفصیلات ہی زیادہ نہیں، بلکہ بہت سے ان مسائل پر بھی گراں بہا معلومات موجود ہیں جو تاریخی کتابوں میں عام طور پر نہیں ملتیں۔ ان کی مثنوی، خضر خاں دول رانی، خمسہ کی پانچ مثنویاں اور نثر میں خزائن الفتوح اسی دور کے واقعات اور یادگاروں سے پُر ہیں۔

اُردو کی پیدائش اور ترقی کے ابتدائی مدارج کے سلسلے میں امیر خسرو کا ذکر دوسرے ابواب میں کیا جائے گا اس لئے یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

امیر حسن سنجری بھی امیر خسرو کی طرح شیخ نظام الدین اولیا کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ اور اپنے مرشد سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ برنی نے لکھا ہے کہ وہ اور امیر خسرو میرے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ ان دونوں کی ملاقات میں نے ہی کرائی تھی۔ اور " سالہا مرا با امیر خسرو و امیر حسن مذکور تودد یگانگی بودہ است و نہ ایشاں بے صحبت من بتوانستندے بود، نہ من توانستمے کہ مجالست ایشاں را گذرانم " امیر حسن کے بقول برنی چند دیوان ست و صحائف نہ نثر و مثنویات بسیار است "۔ ان کی تصنیف فوائد الفواد سماجی مسائل اور تاریخی معلومات سے پُر ہے۔ غرضیکہ مسلمان سلاطین اور حکمرانوں نے اپنے عہد اقتدار میں مذہبی، علمی، ادبی خدمات اور تہذیب و ترقی کے سلسلے میں جو کارنامے انجام دیئے، کوئی دوسرا ان کے مقابلے میں فخر نہیں کر سکتا۔ سب

سے زیادہ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ مذہبی معلومات میں مسلمانوں نے رواداری کو کسی وقت بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اس عام رواداری کے برتاؤ کا یہ اثر ہوا کہ زبان کے معاملہ میں بھی مسلمانوں نے نئی زبان کی بنیاد ایسے اصولوں پر رکھی کہ اس کا رشتہ مقامی زبانوں سے بہت قریب تھا۔ سلطنت دہلی کے خاتمہ کے وقت یہ زبان وجود میں آچکی تھی۔

تاریخ داؤدی کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اس مسئلہ پر بہت زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ بابر کی فتح کے تذکرہ میں وہ لکھتا ہے:۔

"سرش (سلطان ابراہیم) بریدہ پیش بابر بادشاہ آوردند۔ شخصے دراں معرکہ حاضر بود، ایں شعر بر زبان راند:

نو سے اوپر تھا بتیسا — پانی پت بھارت دلیا
اٹھیئن رجب سکر وارا — بابر جیتا ابراہیم ہارا

باب سوم

مغلیہ عہد کی سیاسی وسماجی حالت

مغلیہ سلطنت کا دور قیام واستحکام پانی پت کے میدان میں بابر کی فتح سے ہماری تاریخ کا سب سے اہم باب شروع ہوتا ہے۔ ۱۵۲۶ء میں سلطنت کے علاوہ برصغیر میں متعدد سلطنتیں اور خود مختار ریاستیں قائم ہو چکی تھیں، اور انہوں نے سیاسی اور ثقافتی زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

مثلاً بنگال، جونپور، گجرات، مالوہ اور دکن میں علوم وفنون میں جو ترقیاں مقامی حکومتوں کی سرپرستی میں ہوئیں وہ ہمارے ثقافتی ورثہ میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔

برصغیر پر بابر کے حملوں کا سلسلہ ۱۵۱۹ء میں شروع ہوا۔ آخری حملہ ۱۵۲۶ء میں ہوا۔ پانی پت کے میدان میں مغل اور افغان فوجوں میں زبردست معرکہ ہوا۔ ابراہیم لودھی کی فوج بہت زیادہ تھی لیکن آخر کار فتح بابر ہی کو ہوئی۔

پانی پت کے بعد دہلی و آگرہ اور قرب وجوار کے علاقے پر بابر کا قبضہ ہو گیا۔ باوجود لشکر کی مخالفت کے اس نے یہاں مستقل قیام اور نئی حکومت کا سنگ بنیاد رکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

بابر کی وفات کے وقت یوں تو بنگال اور گجرات کے علاوہ سارا شمالی ہند پاکستان اور کابل کا علاقہ مغلیہ حکومت میں شامل ہو چکا تھا لیکن افغان سرداروں کا اثر بہت سے علاقوں پر موجود تھا۔ ان حالات میں ہمایوں باپ کے تخت پر بیٹھا۔ شروع ہی سے اس کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مشکلات میں اس کے تینوں بھائی کامران عسکری اور ہندال اس کی مخالفت میں سرگرم رہے۔ اگرچہ خود اس کا برتاؤ نہایت مشفقانہ تھا۔ کامران کو کابل کا علاقہ سپرد کر دیا گیا تھا، لیکن یہاں اس نے تقریباً خود مختار کی حیثیت حاصل کر لی۔ کامران کا یہ رویہ مغلیہ حکومت کے لئے بہت مضر ثابت ہوا۔ عسکری اور ہندال نے بھی جہاں تک ان کے قبضہ میں تھا۔ ہمایوں کی پریشانیوں میں اضافہ ہی کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر سلطنت اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

سلطنت نکل جانے کے بعد ہمایوں جب سندھ کے علاقہ میں سرگرداں پھر رہا تھا ۱۵۴۲ء میں عمرکوٹ کے مقام پر اس کا لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جلال الدین رکھا گیا۔

۱۵۵۴ء کے آخر میں ہمایوں اپنی ہند پاکستانی سلطنت واپس لینے کی غرض سے کابل سے روانہ ہوا۔ اس کی فوجیں پنجاب کا علاقہ فتح کرتی ہوئی سرہند تک پہنچ گئیں۔ سکندر شاہ سور دہلی سے مقابلہ کے لئے آیا اور ایک مرتبہ پھر مغل و افغان فوجوں میں ۲۲ر جون ۱۵۵۵ء کو جنگ شروع ہوگئی۔ مغلوں کو فتح حاصل ہوئی اور ایک ماہ بعد ۲۳ر جولائی کو ہمایوں فاتحانہ انداز میں دہلی میں داخل ہوا اور ۲۶ر جنوری کو نیچے اترتے ہوئے سیڑھی سے گر کر اس جہاں سے رخصت ہوگیا۔ ہمایوں کی وفات کی خبر سن کر بیرام خاں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کلانور کے قلعہ میں اکبر کی رسم تخت نشینی ادا کی اور اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

مغل بادشاہ اور ان کی علمی اور ادبی زندگی

تہذیب و تمدن کی ترقی کے لحاظ سے مغلیہ سلطنت کا دور برصغیر کی تاریخ کا اہم ترین باب ہے۔ تمدن کے ہر شعبہ میں بھاری ترقی انتہائی عروج پر پہنچی اور ہند پاکستان اس زمانہ میں دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں شمار کیا جانے لگا۔ یورپ میں مغل شہنشاہ کو "مغل اعظم" کہا جاتا تھا۔ علوم و فنون کی ترقی کا مفصل تذکرہ یہاں ممکن نہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں بادشاہوں امیروں اور عالموں نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کی چند

خصوصیات اور ان سے متعلق اہم واقعات کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ یہ کہنا یہاں بے محل نہ ہوگا کہ سلاطین دہلی کے مقابلہ میں مغل حکمراں من حیث المجموع مذہبی زندگی اور دینی لٹریچر میں کم دلچسپی رکھتے تھے۔ عالمگیرؒ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی سرپرستی میں شاعری اور تاریخ نویسی نے زیادہ ترقی کی۔

دینی علوم سے متعلق جو کچھ لکھا گیا، اس کا بڑا حصہ انفرادی یا بعض اداروں کی کوشش تھی۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ تعلیم کی ذمہ داری حکومت نے کبھی نہیں لی یہ ٹھیک ہے کہ بعض حکمرانوں اور امراء نے مدرسے قائم کئے، ان کے لئے جائدادیں وقف کیں اور علماء وغیرہ کو عطیات و انعامات دیئے لیکن یہ سب چیزیں انفرادی حیثیت سے تھیں۔ جس حکمراں یا صاحب ثروت و اقتدار کو جس شعبہ سے زیادہ دلچسپی ہوتی، اسی کی وہ سرپرستی کرتا۔ حکومت کی اپنی کوئی پالیسی نہ تھی۔ آئندہ صفحات میں ان ہی واقعات کی طرف اشارہ کیا جائے گا ان واقعات سے بہ آسانی یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حکومت کی بے اعتنائی پالیسی کے باوجود اسلامی معاشرہ نے اس سلسلہ میں کس حد تک کوشش کی اور اس کا کیا کارنامہ ہے۔

بابر کو علم و ادب سے بڑا شغف تھا اور حکومت کی ان ذمہ داریوں اور سیاسی الجھنوں کے باوجود علمی اور ادبی محفلوں میں شریک ہوتا تھا، شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی، اور خود بھی ترکی اور فارسی زبان میں شعر کہتا تھا اور نثر

بھی لکھتا تھا۔ تزک بابری اس قدر دلچسپ اور قابل قدر تصنیف ہے کہ بعض مورخوں نے بابر کو Prince of Autobiographers (رئیس سوانح نگاران) کہا ہے اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پڑھنے کے بعد بابر کی خود اپنی شخصیت کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے ترجمے متعدد بار مختلف زبانوں میں ہوئے۔ عہد اکبری میں خود اکبر کے ایما سے مرزا عبدالرحیم خانخاناں نے اس کو فارسی لباس پہنایا، پھر جدید دور میں اس کا ترجمہ انگریزی اور روسی زبان میں ہوا۔ اردو زبان میں مرزا نصیر الدین حیدر نے اس کا ترجمہ کیا۔ شعر گوئی میں بابر کو بلند مقام حاصل تھا۔ ابوالفضل نے اس کے ترکی دیوان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔ "مضامین تازہ در آں مندرج ست" [۲] اسی زبان میں اس نے اپنے لڑکے کامران کے لئے مذہبی و فقہی مسائل پر مشتمل دو ہزار اشعار کی ایک مثنوی مبین لکھی۔ اس کا تذکرہ نقد بابری کے نام سے بعض جگہ آیا ہے۔ شیخ زین نے اس کی شرح لکھی۔ ایک کتاب رسائل و عروض کے نام سے ترکی شاعری کے عروض پر لکھی جسکا ذکر اکبر نامہ میں ہے [۳] اس کے فارسی کے اشعار بہت کم دستیاب ہوئے

---

[۱] بابر اور اس کے خاندان کے دوسرے شہزادوں کی شاعری کیلئے دیکھو ڈاکٹر امہ شمل کا مضمون، "بابر بادشاہ بحیثیت شاعر۔۔۔" اسلامک کلچر حیدرآباد دکن جلد ۳۴ ۲ اپریل ۱۹۶۰ء

[۲] اکبر نامہ جلد ا صفحہ ۱۱۸

[۳] اکبر نامہ جلد ۲ صفحہ ۲۷

ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابوالفضل کا بابر کی تعریف میں "بزبان فارسی نیز اشعار دلپذیر دارند" کہنا مبالغہ نہیں ہے۔

ایک موقع پر بابر نے اپنے ایک عزیز کو قلعہ بجور پر حاکم مقرر کیا، اس کے جانے کے بعد اس کی دوری اور جدائی بادشاہ کو گراں گزری۔ اس کا ذکر ان اشعار میں اس طرح کرتا ہے ؎

قرار عہد بیار ایں چنیں نہ بود مرا
گزید ہجر و مرا کرد بے قرار آخر
بہ عشوہ ہائے زمانہ چہ چارہ سازد کس
بجور کرد جدا یار را ز یار آخر

بابر کا ایک مشہور اور مقبول شعر ہے ؎

نوروز و نوبہار و مے و دلبرے خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ابوالفضل نے اس کی ایک رباعی اکبرنامہ میں نقل کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صوفیائے کرام اور درویشوں کی وہ کس قدر عزت کرتا تھا ؎

رباعی
درویشاں را اگرچہ نہ از خویشانیم
لیک از دل و جاں معتقد ایشانیم
دور است مگوی شاہی از درویشی
شاہیم ولے بندۂ درویشانیم

اپنے پیر و مرشد خواجہ عبیداللہؒ کے وصال کے بعد عالم تصور میں لکھتا ہے

در ہوائے نفس گمرہ عمر ضائع کردہ ایم
پیش اہل اللہ از افعال خود شرمندہ ایم
یک نظر با مخلصانِ خستہ دل فرما کہ ما
خواجگی را ماندہ ایم و خواجگی را بندہ ایم

ان اشعار سے بابر کے طبعی رجحان اور اس کی طبیعت کی سادگی اور منکسر مزاجی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بابر صرف شاعر ہی نہ تھا بلکہ سخن سنج اور سخن شناس بھی تھا۔ علماء، فضلاء اور شعراء کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔ متعدد علماء اور شعراء اس کے دربار میں حاضر رہتے۔ شیخ رکن الدین دفائی، شہاب الدین حقیر اور مولانا بقائی کا ذکر خاص طور سے کیا جاسکتا ہے۔ تاریخوں میں بعض واقعات مذکور ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اہل علم اور اہل فن کو دل کھول کر انعامات دیتا تھا۔ اسی طرح ہم کو کتابوں سے اس کی دلچسپی کا حال تاریخی واقعات میں ملتا ہے۔

ایک مختصر سا کتب خانہ سفر میں اس کے ساتھ رہتا تھا، فرشتہ نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے کہ لاہور کے قریب جب اس نے ایک سردار غازی خاں کو شکست دی، تو معلوم ہوا کہ غازی خاں کے کتب خانہ میں کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے، بابر نے ان تمام کتابوں کو حاصل کیا اور اہم اور بعض خاص کتابیں بابر نے اپنے ذاتی کتب خانہ میں رکھیں اور باقی ہمایوں اور کامران کے پاس بھجوادیں۔

یہ برصغیر کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی تاریخ میں سب سے شاندار

اور عظیم سلطنت کا بانی، علم وفضل اور ان کی سرپرستی کی روایتیں ہمراہ لایا تھا۔ اس کے دور رس نتائج ہم کو زمانہ مابعد کی تہذیب و تمدن کی غیر معمولی ترقی کی شکل میں نظر آتے ہیں۔

ہمایوں

بابر نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام بہتر کیا تھا اور اسی تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ اس کے دونوں لڑکے تعلیم و تربیت سے آراستہ تھے ہمایوں کے ذوق سخن اور شعر گوئی کا ذکر مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے اچھے الفاظ میں کیا ہے اور کہیں کہیں بطور نمونہ اس کے اشعار بھی نقل کئے ہیں۔

قنوج کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد ہمایوں لاہور اس غرض سے گیا کہ شاید اب بھی اس کا بھائی مرزا کامران اس کے ساتھ متحد ہو کر افغانوں کا مقابلہ کرے۔ کامران نے زمانہ کی نیرنگیوں سے ابھی کچھ تجربہ حاصل نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ظاہر میں ہمایوں سے اتفاق کی باتیں کرتا تھا، لیکن درپردہ شیر شاہ سے سازش کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ شیر شاہ لاہور کے بہت قریب پہنچ گیا اور ایک قاصد کامران کے پاس بھیجا۔ کامران نے اس کا استقبال کیا اور اس سلسلہ میں جشن منایا۔ ہمایوں کے قلب پر اس کا جو اثر ہوا ہوگا، ظاہر ہے اس سے متاثر ہو کر ہمایوں نے ایک رباعی پڑھی اور جیسا کہ گلبدن بیگم نے کہا ہے کہ ہمایوں نے لکھ کر یہ رباعی شیر خاں کے پاس بھیجی[1]

---

[1] گلبدن بیگم ہمایوں نامہ

در آئینہ گرچہ خود نمائی باشد
پیوستہ ز خویشتن جدائی باشد
خود را بنمائی غیر دیدن عجب است
ایں بوالعجبی کار خدائی باشد

جلاوطنی کی حالت میں جب شاہ ایران کی طرف رخ کیا اور اس سے مدد مانگی تو اس خط میں کچھ اشعار بھی لکھے جن میں سے چند قابل تذکرہ ہیں ؎

خسروا عمریست تا عنقائے عالی ہمتم
قلۂ قاف قناعت را نشیمن کردہ است
دشمنم شیر ست امالیشت بر من کردہ بود
ایں زماں از ضعف طالع روئے بر من کردہ است
التماس از شاہ آں دارم کہ بامن آں کند
انچہ با سلمان علی در دشت ارزن کردہ است

ان اشعار کے ساتھ جو رباعی اس نے لکھی تھی وہ بہت دلچسپ ہے ؎

اے شاہ جہاں کہ نہ فلک پایۂ تست
در دست ولایت ہمہ سرمایہ تست
شاہان جہاں جملہ ہمای طلبند
بنگر کہ ہما چگونہ در سایۂ تست

ابوالفضل نے ہمایوں کی موزونیِ طبع کی تعریف کی ہے، لکھتا ہے کہ "دیوان شعر آنحضرت در کتابخانہ عالی موجود ست" اس نے اپنی پسند کی

ایک رباعی مندرجہ ذیل لکھی ہے ؎

اے دل مکن اضطراب در پیش رقیب
حال دل خود مگوئے با ہیچ طبیب
کارے کہ ترا بآں جفا کار افتاد
بس قصہ مشکل ست و بس امر عجیب

اس طرح فرشتہ نے بھی کچھ غزلیں نقل کی ہیں، منجملہ چند لکھی جاتی ہیں۔

گذشت از دل سرگشتہ ناوکِ ستمش
نماند بر من دلدادہ لذت المش
بقصد کشتن عشاق گر کند میلے
عجب نباشد از اخلاق و شیوۂ کرمش
کراست زہرہ قرب حریم حرمت او
کہ جبرئیل امین نیست محرم حرمش
اگر بہ پرسش عشاق می نہد قدمے
ہزار جان گرامی فدائے ہر قدمش

صاحب تذکرہ مخزن الغرائب احمد علی سندیلوی نے ہمایوں "اہل دربار اہل فضل وکمال و مرجع اہل تقویٰ وصلاح و بہ شعر و شعراء" کی بابت ان لفاظ میں تعریف کی ہے "شعر نیکو گفتے" اور اس نے چند اشعار بطور نمونہ لکھے ہیں جن میں سے ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔

دریا دلیم و دیدۂ ما معدن درست
گر دست ما تہی ست ولے چشم ما پرست

ہمایوں کا دیوان حافظ شمس الدین (پٹنہ کالج) کے مقدمہ کے ساتھ ماہنامہ معاصر ۱۹۳۹ء پٹنہ میں شائع ہو چکا ہے۔ ہمایوں کا نعتیہ کلام بھی بلند پایہ کا ہے، اس میں سے دو رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

لہ سرور کائنات در اصل وجود
حقا کہ توئی حبیب حی معبود
برخیز نما جمال عالم آرا
زیرا کہ توئی ز خلق عالم مقصود

سلطان سریر انبیائی تو
خورشید سپہر اولیائی تو
مردم ہمہ پیرو طریق تواند
راہ شرع بخلق رہ نمائی تو

ہمایوں کو صرف شعر گوئی ہی کا شوق نہ تھا بلکہ شعراء و فضلاء کی صحبت کو بھی وہ عزیز رکھتا تھا متعدد شعرا اور علماء اس کے دربار سے وابستہ رہتے تھے، ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی درج کئے جاتے ہیں۔

جنونی بدخشانی :- ہمایوں نے جب بدخشان کو فتح کیا تو اس کو اپنے درباریوں میں شامل کر لیا۔ یہ اس کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔

لے دیکھو بزم تیموریہ ص ۳۵

نادری سمرقندی :۔ یہ حضرت ہندوستان سے ہمایوں کی قدردانی اہل علم وفن کی بابت سن کر ہمایوں کی خدمت میں آئے تھے۔

فارغی :۔ یہ ہرات کے باشندے تھے۔ عسرت کی حالت میں یہاں آئے اور شاہی الطاف واکرام کے باعث فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔

طاہر دکنی :۔ عراق سے آئے، لیکن ہمایوں کے درباری علما سے اختلاف کی وجہ سے دکن واپس چلے گئے۔

قاسم کاہی :۔ کابل سے یہاں آئے تھے۔ تفسیر، کلام اور تصوف میں کامل تھے شاعری میں بھی بڑی دستگاہ حاصل تھی، ہمایوں کو ان سے تعلق خاطر تھا۔ ہمایوں کی وفات پر جو قطعہ تاریخ کہا وہ بہت مقبول ہوا ؎

ہمایوں بادشاہ آں آفتابے	کہ فیض شامل او عام افتاد
بنائے دولتش چوں یافت رفعت	اساس عمرش از انجام افتاد
چو خورشید جہاں تاب از بلندی	بیاباں در نماز شام افتاد
جہاں تاریک شد در چشم مردم	خلل در کار خاص و عام افتاد
پئے تاریخ او کاہی رقم زد	ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

کاہی بعد میں دین الٰہی میں داخل ہو گیا تھا اس لئے عبدالقادر بدایونی اس سے ناراض تھے، لیکن اس کے کمالات شاعری کے معترف تھے جس کا ذکر منتخب التواریخ میں کیا ہے۔ ہمایوں نے جن دوسرے شعراء کے نام لکھے ہیں وہ یہ ہیں۔

شیخ امان اللہ پانی پتی۔ جلالی میر زیسی۔ ضمیری۔ موجی

ہمایوں کو ارباب فضل و کمال کی صحبت بہت پسند تھی، صاحب طبقات اکبری نے ہمایوں کی ان دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ رات رات بھر علماء و فضلاء کی مجلس میں بیٹھا رہتا تھا۔ ان مجلسوں میں علمی بحثیں ہوتی تھیں اور وہ بڑی دلچسپی سے ان کو سنتا تھا آگے لکھتا ہے۔ "ارباب فضل و ہنر را در عہدش رونق تمام پدید آمد" چند فضلا کا ذکر یہاں نہایت مختصر الفاظ میں کیا جا سکتا ہے۔

خواندامیر یہ ہرات میں پیدا ہوا، اور وہیں دربار سے وابستہ ہو گیا اس کی سب سے پہلی کتاب مآثر الملوک ہے۔ جو ملوک اور اولیاء کے حالات پر مشتمل ہے خلاصۃ الاخبار کے نام سے اس نے اپنے نانا میر خواند کی مشہور کتاب تاریخ روضۃ الصفاء کی تلخیص کی ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کی اور بھی کئی تصنیفیں ہیں۔ جب ہرات شاہ اسماعیل صفوی کے زیر اقتدار آگیا تو خواندامیر بھی اسی کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ شاہ اسماعیل کے وزیر کریم الدین حبیب اللہ کی سرپرستی میں اس نے اپنا شاہکار "حبیب السیر فی اخبار افراد البشر" تین جلدوں میں تیار کیا۔ یہ تاریخ ابتدائے عالم سے شروع ہوتی ہے اور آج تک اس کتاب کا شمار مستند اور معتبر کتابوں میں ہوتا ہے۔ ۱۸۵۵ء میں تہران سے اور ۱۸۵۷ء میں بمبئی سے شائع ہو چکی ہے۔ ابھی حبیب السیر ختم بھی نہ ہونے پائی تھی، کہ حبیب اللہ کا انتقال ہو گیا۔ خواندمیر ان حالات میں ایران چھوڑ کر قندھار آگیا اور وہاں سے ہندوستان آکر بابر

کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ بابر کے بعد ہمایوں نے بھی اس کی قدر دانی کی اور اس کو امیر مورخ کا خطاب عطا کیا۔ اس نے ہمایوں کے کہنے پر قانون ہمایونی تصنیف کی، جس میں اس زمانہ کی "اختراعات" کا ذکر کیا ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اس کو شائع کیا ہے۔

ہمایوں کے عہد کی ایک اور تاریخ قابل ذکر ہے۔ ہمایوں کے آفتابچی جوہر نے جو سفر و حضر دونوں حالتوں میں اپنے آقا کے ساتھ رہتا تھا، اس عہد کے واقعات قلمبند کئے ہیں اس کی تصنیف تذکرۃ الواقعات ہمایوں کے عہد حکومت کی بہتر تاریخ سمجھی جاتی ہے کیونکہ مصنف نے اس میں چشم دید واقعات و حالات لکھے ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں مصنف سے فرد گذاشتیں ہوئی ہیں، تاہم کتاب کافی حد تک مستند اور صحیح حالات کا ایک صاف مرقع ہے جس میں مبالغہ اور تصنع سے کام نہیں لیا گیا۔ آفتابچی جوہر کی علمی استعداد کیونکہ محدود تھی، اور عرصہ تک وہ آفتابچی کی خدمت پر مامور رہا اس وجہ سے تحصیل علم کی فرصت نہ مل سکی۔ اس لئے اس کی کتاب میں زبان سادہ ہے اور اس کی ادبی حیثیت نہیں ہے لیکن ہمایوں کے عہد کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے[1]

علم نجوم سے بھی ہمایوں کو بہت دلچسپی تھی، جلا وطنی کے زمانہ میں بھی علامہ الیاس اردبیلی جن سے اس نے یہ فن سیکھا تھا اس کے ساتھ رہے۔ اصطرلاب کے مطالعہ میں اس کو خاص مہارت تھی۔ صاحب

---

[1] اس کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر معین الحق کے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی سے شائع ہو چکا ہے۔

ماثر الامرار نے مولانا نور الدین ترخان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ہمایوں کے ندمار خاص میں تھے۔ اور کہا ہے بادشاہ از استفادہ علوم می کرد و کہا ہے اواز علم ریاضی خصوص اصطرلاب از جناب ہمایونی کہ دریں فن مہارت تمام داشت، استفاضہ می نمود" ؎۱

اکبری عہد کی علمی، ادبی سرگرمیاں اکبر کا دور حکومت مغلیہ سلطنت کا عنفوان شباب تھا۔ پچاس سال کی مدت میں سلطنت کی توسیع اور استحکام نظم کے ساتھ ساتھ معاشرے اور تمدنی زندگی میں بھی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں اکبر تقریباً ناخواندہ تھا، لیکن بدذوق نہ تھا، علم و ادب، فلسفہ و حکمت سے گہری دلچسپی تھی اس کے دربار میں شعراء، فضلاء اور اہل فن بڑی تعداد میں موجود رہتے اور اکبر ان کی بڑی قدر و منزلت کرتا۔ اکبر کی علمی سرپرستی اور ادب نوازی کے واقعات ابوالفضل نے کسی قدر مبالغہ سے بیان کئے ہیں جن کے قبول کرنے میں مورخانہ احتیاط ضروری ہے۔ متوازن اور محتاط مصنفوں کے بیانات کی بنا پر اس دور کی صحیح تصویر پیش کی جا سکتی ہے۔ اکبر کی شعر و سخن سے دلچسپی کا ذکر ابوالفضل کے علاوہ، دوسرے مصنفوں کے یہاں بھی ملتا ہے۔ ان کتابوں میں اکبر کے بعض اشعار ہی موجود نہیں بلکہ چند اصلاحوں کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ فغانی کا یہ شعر اکبر کے سامنے پڑھا گیا ؎

مسیحا یار و خضرش رہنماد ہمچناں یوسف فغانی آفتاب من بدیں اعزاز می آید

؎۱ ماثر الامرار جلد اول ص ۴۷۰

اس شعر کو سن کر "بزبان گوہر بار رفت کہ اگر بجائے آفتاب من شہسوار من برخوانید سزاوار باشد" ابوالفضل نے اکبر کے ایک شعر کی تعریف کی ہے جو اس کو پسند تھا ؎

نیست زنجیر جنوں در گردن مجنون یار
عشق دست دوستی در گردنش انگندہ است

(اکبرنامہ جلد اول ص۴۱)

ابوالفضل نے فیضی، نظیری، عرفی، ظہوری، غزالی، سورداس اور عبدالرحیم خانخاناں کو درجہ اول کے شعراء میں شمار کیا ہے اس کے بعد درجہ دوم کے شعراء کی ایک طویل فہرست دی ہے[1]

اس دور کا سب سے بڑا شاعر فیضی تھا، علم و ادب میں بھی اس کا پایہ بہت بلند تھا اکبر نے اس کو ملک الشعراء کے خطاب اور منصب سے نوازا۔ اور اس کا بے حد احترام کرتا تھا فیضی نے اکبر کی اس عزت افزائی کی طرف اپنے مندرجہ ذیل شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

آں روز کہ فیض عام کردند — مارا ملک الکلام کردند

---

[1] عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ کے حصہ سوم میں مشائخ کے علاوہ اس دور کے علماء فضلاء، شعراء اور حکماء کے حالات لکھے ہیں، جن لوگوں کے حالات ابوالفضل نے بوجہ تعصب اپنی تصانیف میں شامل نہیں کئے ہیں، یا بہت مختصر الفاظ میں ان کا ذکر کیا، ان کے لئے بدایونی کی کتاب بے حد مفید ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے فیضی کے متعلق لکھا ہے کہ "در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و انشا عدیل در روزگار نہ داشت" فیضی نے متعدد تصنیفات چھوڑی ہیں۔ ان میں اس کی تفسیر سواطع الالہام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جس میں یہ التزام رکھا ہے کہ کوئی منقوط حرف استعمال نہیں کیا گیا۔

نظم میں فیضی کی مثنوی نل دمن جو اکبر کی فرمائش پر ۱۰۰۳ھ میں لکھی تھی، قابلِ ذکر ہے۔ بدایونی کا قول ہے کہ امیر خسرو کے بعد ہندوستان میں تین سو سال میں ایسی مثنوی نہیں لکھی گئی۔ غزل اور نظم کی دوسری اصناف میں بھی فیضی کا کلام بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔

فیضی ہند پاکستان کے فارسی شعراء میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے اور ہر دور کے فضلاء نے اس کے کلام کی تعریف کی ہے اس کو خود بھی شدت کے ساتھ یہ احساس تھا کہ وہ بلند پایہ شاعر ہے۔

بلاک مین کا یہ خیال صحیح ہے کہ ہند پاکستان کے فارسی شعراء میں امیر خسرو کے بعد فیضی ہی کا مقام ہے [1]

فیضی کے علاوہ شاہی دربار اور سربرآوردہ امراء سے اور بھی بعض فضلاء اور شعراء وابستہ تھے ان میں مرزا عبدالرحیم خانخاناں اور ابوالفتح گیلانی کی مجلسیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ عبدالرحیم خود بھی ایک عالم،

---

[1] دیکھو انگریزی ترجمہ آئین اکبری۔ مقدمہ

ادیب اور شاعر تھا اور اہل فضل و کمال کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا۔ مآثر رحیمی کی ضخیم جلدیں اس کے علمی اور تاریخی کارناموں کی مستقل یادگار ہیں۔

تراجم و تصانیف شاعری کے علاوہ ادب کے دوسرے شعبوں اور آرٹ نے بھی اس دور میں بڑی ترقی کی۔ فارسی نثر کے دو شعبے قابل ذکر ہیں، یعنی سنسکرت کی مشہور کتابوں کے ترجمے اور تاریخی و سوانحی تصانیف کو فارسی کا جامہ پہنایا گیا۔ مہابھارت کے ترجمہ کی خدمت عبدالقادر بدایونی، فیضی، نقیب خان، ملا شیری اور دیگر فضلاء کے سپرد کی گئی۔ بدایونی نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ اکبر نے شاہنامہ اور داستان امیر حمزہ کو پندرہ سال میں لکھوایا تھا اور ان کو اچھی طرح مذہب کرایا تھا۔ اس کے بعد اس کو خیال آیا کہ یہ تو صرف "شاعری و ساختگی" ہیں۔ اب ہندوؤں کی وہ کتابیں جن کی بابت "دانایان مرتاض عابد نوشتہ اند" کہا گیا ہے اور جو "ہم صحیح و نص قاطعست و مدار دین و اعتقادات و عبادات ایشاں منوط برآنست" ہیں، ان کا بھی فارسی میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ مہابھارت کے ترجمہ کا حکم دیا گیا۔ ابتداء میں بدایونی اور نقیب کو یہ کام سپرد ہوا، چنانچہ تین چار مہینہ میں "از ہژدہ فن آں مزخرف لاطائل کہ ہژدہ ہزار عالم دراں تحیر است، دو فن نوشتہ شد" ظاہر ہے کہ بدایونی کا دل اس کام میں نہیں لگ سکتا تھا، مگر کیا کیا جائے کہ فقیر کے نصیب میں یہی کتابیں لکھی تھیں۔ بعد میں اور لوگ یعنی شیری حاجی سلطان اور فیضی نے بھی اس پر کام کیا۔ آخر میں بدایونی نے مترجمین کے لئے نہایت دلچسپ

الفاظ لکھے ہیں "ان فضلا مترجمین میں سے اکثر کوروں اور پانڈوں کے ساتھ "محشور" ہیں اور جو باقی بچے ہیں خدا ان کو نجات دے اور ان کی توبہ قبول کرے[1]

مہابھارت کے اس ترجمہ پر جس کا فارسی نام رزم نامہ رکھا گیا تھا، ابوالفضل نے خطبہ لکھا۔ اس کے نسخے انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں میں موجود ہیں[2]

باوجود ان خیالات کے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے سنہ ۹۹۲ھ میں بدایونی کو رامائن کے ترجمہ کا حکم ملا اور اس کام کو ملا نے انجام دیا[3] اس سے قبل بھی بدایونی کو کچھ ترجمہ کا کام سپرد کیا گیا تھا۔ مثلاً سنگھا سن بتیسی کا ترجمہ سنہ ۹۸۲ھ میں ہوا۔ ریاضی کی کتاب لیلاوتی کا ترجمہ فیضی نے کیا۔ کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ، ابوالفضل نے سنہ ۹۹۶ھ میں مکمل کیا اور اس کا نام عیار دانش رکھا۔ نل دمن کا ترجمہ فیضی نے نظم ہی میں کیا اور چار ہزار دو سو بیت کی یہ کتاب صرف پانچ ماہ کی مدت میں مکمل کردی۔ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے کشمیر کی سنسکرت تاریخ راج ترنگنی کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ سنسکرت کی ان کتابوں کے علاوہ بعض

---

[1] دیکھو بدایونی

[2] دیکھو کیٹلاگ انڈیا آفس۔ نیز کیٹلاگ برٹش میوزیم

[3] دیکھو بدایونی ص ۲۵۱

دوسری کتابوں کے ترجمے بھی اُردو میں کئے گئے ہیں۔ ان میں ابوالفضل کا ترجمہ انجیل۔ ملا احمد ٹھٹوی، قاسم بیگ اور شیخ منور کا ترجمہ معجم البلدان اور تاریخ الحکمار کا ترجمہ قابل ذکر ہیں۔

تاریخی تصنیفات

ترجموں کے علاوہ تصنیف و تالیف کے کام میں بھی ترقی ہوئی۔ نثر کی تصانیف کا جہاں تک تعلق ہے، فن تاریخ نویسی میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ابوالفضل۔ نظام الدین احمد۔ عبدالقادر بدایونی کی تصنیفات اس فن کی مشہور ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

ابوالفضل کا اکبر نامہ اور آئین اکبری ہمارے تاریخی سرمائے میں ایک مخصوص مقام رکھتی ہیں۔

عہد جہانگیر میں علمی و ادبی زندگی

مولانا شبلی کی رائے ہے کہ جس بے تکلفی، برجستگی اور دلآویزی کیساتھ جہانگیر واقعات بیان کرتا ہے وہ بڑے بڑے انشا پرداز نہیں کرسکتے۔ ممکن ہے کہ اس رائے میں کسی قدر مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ جہانگیر کے طرز ادا میں یہ خوبیاں یقیناً موجود ہیں۔ اکثر اوقات تاریخی واقعات کو ادیبانہ رنگ میں بیان کرتا ہے اور اس خوبی سے کہ تاریخی حقائق میں فرق نہیں پڑتا۔ اور جب کبھی محفل جشن وغیرہ کا حال لکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بزم کی قلمی تصویر کھینچ دی ہے۔ پہلے جشن نوروز کے متعلق اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:-

"فرمودم کہ ایوانہائے دولت خانہ خاص و
عام بدستور زمان والد بزرگوارم در اقمشہ
نفیسہ گرفتہ، آئینے درغایت زیب وزینت
لبستند واز روز اول نوروز تا نوزدہم، ورجہ
حمل کہ روز شرف است خلایق داد عیش و
کامرانی دادند، اہل سازو نغمہ از ہر طائفہ و ہر
جماعت جمع بودند، لولیان رقاص و دلبران ہند
کہ بکرشمہ دل از فرشتہ می ربودند، ہنگامہ مجلس
راگرم داشتند، فرمودم کہ ہر کس از مکیفات و
مغیرات آنچہ می خواستہ باشند بخورد، منع و
مانع نباشد۔" [۱]

جہانگیر کو شعر وسخن سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ امراء
میں بھی یہ ذوق پیدا ہوگیا۔

مرزا غازی بیگ ترخان، مرزا جانی بیگ کا لڑکا تھا۔ اکبر ہی کے
زمانہ میں وہ امراء دربار میں شامل ہوگیا تھا۔ جہانگیر کے عہد میں ملتان و
ٹھٹھہ کا حاکم تھا۔ اس کو شعر و شاعری سے گہری دلچسپی تھی اور اس کے پاس
ارباب فن کا مجمع رہتا تھا۔ طالب آملی اور وصلی ابتدا میں اسی کی مجلس سے

---

[۱] تزک جہانگیری ص۲۲

وابستہ تھے۔ وہ خود بھی شاعر تھا اور وقاری تخلص کرتا تھا بقول شیخ فرید اس نے جوان العمری میں وفات پائی باوجود اس کم عمری کے اس کا دیوان پانچ ہزار اشعار پر مشتمل شعر العجم میں مولانا نے کچھ منتخب اشعار نقل کئے ہیں ایک شعر مندرجہ ذیل ہے:۔

گریہ ام گر سبب خندہ او شد چہ عجب
ابر ہر چند کہ گرید رخ گلشن خندد

جہانگیر کے عہد میں اور بھی چند قابل ذکر شاعر گذرے ہیں۔ قوام الدین جعفری اکبر کے عہد میں عراق سے آیا تھا۔ اپنی عالی حوصلگی اور فطری صلاحیت کے باعث بڑے بڑے عہدے پر فائز ہوا۔ نظامی گنجوی کے تتبع میں مثنوی خسرو شیریں لکھی جس کے متعلق ماثر الامراء کے یہ الفاظ ہیں:۔

"با اعتقادے جمع بعد از شیخ نظامی گنجہ مثنوی خسرو شیریں بہ ازو کسے نہ گفتہ[1]"

اکبر اور جہانگیر دونوں کے عہد میں جہاں تک علمی سرگرمیوں کا تعلق ہے مرزا عبد الرحیم خانخاناں کی شخصیت بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ سیاسی بسط پر بھی اس کے کمالات کچھ کم نمایاں نہیں۔ یہ ہی سبب ہے کہ اسے صاحب سیف و قلم لکھا گیا ہے۔ اکبر کی علمی سرپرستی کی یادگار، ماثر رحیمی کی شکل میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اسی کے اوراق سے ہم عبد الرحیم کے علمی کمالات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مبالغہ آمیزی سے قطع نظر خالص واقعات کی بنیاد پر اس کی علمی خدمات کی

---

[1] حالات کے لئے دیکھو ماثر الامراء جلد اول صہ ۱۱۲

تصویر تیار کی جا سکتی ہے وہ کئی زبانوں میں مہارت رکھتا تھا، اس کی عربی دانی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو عبدالباقی نہاوندی نے ذکر کیا ہے کہ شریف مکہ کے پاس سے ایک خط ایسی ادق زبان میں آیا کہ ابوالفضل اور فتح اللہ شیرازی لغت کی مدد سے بھی اس کا مطلب نہ بتا سکے، چنانچہ مرزا سے کہا گیا، مرزا نے بلا تکلف اس خط کو پڑھ کر اس کا ترجمہ کر دیا[2]

وہ ترکی زبان سے بھی بخوبی واقف تھا۔ تزک بابری کا ترجمہ ترکی زبان سے فارسی زبان میں اسی نے کیا جس کو اس کا ایک قابل یادگار نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔ فارسی اور ہندی میں بلا تکلف شعر کہتا تھا۔ ہندی کے مسلمان شعرا میں وہ ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ عبدالباقی کے الفاظ میں "در زبان ہندی ید بیضا نمودہ اند چنداں اشعار متین و ابیات دل نشیں کہ ایشاں دراں زبان دارند، ہیچ یک از فحول شعرائے آں زبان را نیست.. ... و تجمل و انعام و احسانے کہ بہ شعرائے فارسی نمودہ، برابر آں بہندی زبان نمودہ باشند، و چنداں اشعار کہ آں جماعہ در مدح ایشاں گفتہ اند فارسی گویاں عشر عشیر نگفتہ اند[3]"

ضروریات سلطنت کے لئے اکبر نے اس سے کہا کہ یورپ کی کچھ زبانیں بھی سیکھ لے چنانچہ اس نے بعض زبانوں میں خاصی مہارت حاصل کر لی مگر معاصر

---

[2] مآثر رحیمی جلد ۲ صـ۵۵۶

[3] مآثر رحیمی جلد ۲ صـ۵۶۲

مورخین نے اس کی تفصیل نہیں دی۔ صاحب ماثرالامراء کے یہاں بھی کچھ زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"گویند کہ باکثر زبان ہا کہ در عالم رائج ست حرف می زد"

شیخ فرید نے ہماری معلومات میں اتنا اضافہ اور کیا کہ خانخاناں سندھی زبان میں بھی شعر کہتا تھا۔[1] عبدالرحیم شعراء کی سرپرستی میں بے دریغ دولت صرف کرتا تھا۔ اس عہد کے بہت سے شاعر اس سے وابستہ تھے۔ نوعی شیرازی کو اس نے سونے میں تلوایا۔ ایک موقع پر نظیری نے کہا کہ میں نے ایک لاکھ روپیہ کا ڈھیر نہیں دیکھا ہے۔ خانخاناں نے فوراً ایک لاکھ روپیہ منگوایا اور نظیری نے ایک لاکھ روپے کے ڈھیر کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ خانخاناں نے وہ سب روپیہ نظیری کو بخش دیا۔

اس عہد کے ممتاز شعراء میں عرفی تھا۔ وہ اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا تھا شہزادہ سلیم اس کی بہت سرپرستی کرتا تھا۔ شہزادہ نے اس کو پیغام بھیج کر بلوایا تو خوشی میں اس نے ایک قصیدہ اس کی شان میں کہا جس میں اپنی طلبی اور شاہانہ اعزاز کا ذکر کیا ہے۔

ازیں پیام دلم شد شگفتہ و شاداب
چنانکہ باغ ز شبنم چنانکہ گل ز نسیم

---

[1] ذخیرۃ الخوانین۔ ذکر عبدالرحیم خانخاناں۔ شیخ فرید نے خانخاں کے حالات اور کارنامے بہت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

بہ روز نقادم دگشتم چناں شتاب زدہ
کہ دست اہل کرم در نثار گوہر و سیم

شہزادہ کی نگاہ شاعر پر پڑی جس کا ذکر وہ اس طرح کرتا ہے سہ

نگفت و من بشنوم ہر آنچہ گفتنی داشت
کہ در بیان نگہش کرد بر زبان تقدیم

عرفی نے جہانگیر کی تعریف میں بہت سے قصیدے لکھے ہیں۔ جہانگیر کے علاوہ عرفی بعض دوسرے شعراء کی طرح عبدالرحیم خانخاناں کی قدرشناسی اور سخن پروری سے بھی مستفیض ہوتا تھا۔

شیخ فرید بھکری ذخیرۃ الخوانین میں لکھتے ہیں کہ "خانخاناں ملا عرفی را نادیدہ آں قدر از ہر سال می فرستادہ کہ محتاج بدر دیگر نبود" علامہ آزاد بلگرامی نے اس سلسلہ میں ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ خانخاناں نے ایک قصیدے کے صلہ میں عرفی کو ستر ہزار روپیہ عطا کئے۔ آزاد کی رائے ہے کہ "در قصیدہ گوئی صاحب ید طولی است، با وصف آں محاسن او چنداں خوب واقع نہ شدہ۔

ہذا بر زبان قلم نیامد۔ غزل و مثنوی او را مرتبہ مساوی دارد[1]"

اسی دور کے ایک سخن سنج کا خیال تھا کہ

مثنویش طرز فصاحت نداشت
کان نمک بود ملاحت نداشت

---

[1] مولانا غلام علی آزاد خزانہ عامرہ نولکشور لکھنؤ صفحہ ۳۱۲ - ۳۲۰

آزاد کے خیال میں شاعر کے ذہن میں وہ رباعی تھی جس کا پہلا شعر یہ ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم — تاریخ تخت است زنجر قدیم

کہا جاتا ہے کہ عرفی کو حاسدوں نے زہر دلوا دیا اور جہانگیر کی تخت نشینی سے پہلے ہی وہ ختم ہو گیا۔

طالب آملی دوسرا شاعر تھا جس کی جہانگیر نے سرپرستی کی۔ وہ پہلے مرزا غازی خاں حاکم قندھار و ملتان سے وابستہ رہا۔ بعد میں دربار شاہی میں حاضر ہوا۔ جہانگیر نے بہت نوازا اور آخر میں ملک الشعراء بنا دیا۔ اس کی خوش حالی اور جہانگیر کی سرپرستی کا ذکر اس کا معاصر عبدالنبی صاحب تذکرۂ میخانہ ان الفاظ میں کرتا ہے :-

" الحال بدولت این خسرو غریب دوست، مسکین نواز، دایں خورشید ذرہ پرور از ہمہ چیزے بے نیاز سرآمد سخنوراں و برگزیدہ نکتہ پروراں است "

جہانگیر نے جو اپنے باپ کی سنت ریش تراشی پر عمل کرتا تھا اور اس کو پسند بھی کرتا تھا، طالب سے ڈاڑھی منڈوانے کی فرمائش کی۔ طالب نے ایک قطعہ کہہ کر اس کی خدمت میں پیش کیا اور ڈاڑھی نہیں منڈوائی۔ اس کے دو اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

سفر می کنم صاحب درنہ من
چہ سر بلکہ گردن تراشیدمے

---

۵ بزم تیموریہ ص ۱۵۳

سر درکش و ابرو بدت و مژہ

برسم برہمن تراشیدے

طالب کی زیادہ عمر نہیں ہوئی اور ۱۰۳۶ھ میں جوان العمری میں فوت ہو گیا۔

مولانا علی احمد نشانیؔ عالم بھی تھے اور شاعر بھی۔ جہانگیر کے استاد رہ چکے تھے اور وہ ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ ایک مرتبہ جہانگیر کے محل میں محفل سماع گرم تھی۔ قوال نے امیر خسرو کا یہ شعر پڑھا ؎

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

مولانا نشانی کو اس پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی۔ جہانگیر نے اس کا مطلب دریافت کیا مولانا نے بحالت وجد ہی جہانگیر سے فرمایا کہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ حضرت امیر خسرو کے ساتھ جمنا کے کنارے گئے، وہاں کچھ ہندو اشنان کر رہے تھے۔ شیخ نے ان کو دیکھ کر کہا ؎

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

امیر خسرو نے فوراً اپنے مرشد کی طرف دیکھ کر جواب دیا کہ ؎

من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

اس وقت شیخ نظام الدین اولیاء طاقیہ اوڑھے ہوئے تھے اور وہ کچھ کج بھی تھی۔ یہ کہہ کر مولانا نشانی نے اپنی کلاہ کو کج کر لیا اور رقص کرتے ہوئے زمین پر گر پڑے اور جاں بحق ہو گئے۔

ان کے علاوہ متعدد شعراء جہانگیر کے دربار سے وابستہ تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو اس عہد کے امراء میں سے کسی کی سرپرستی میں رہ کر فن شعر کی خدمت کرتے تھے۔ ظہیری۔ شکیبی، لطفی، عطائی معنوی اور حسن بیگ خاکی کے نام قابل ذکر ہیں۔

جہانگیر اپنے عہد کے فضلا اور ادبار کا بہت خیال رکھتا تھا۔ ان میں سے چند کا ذکر مختصراً یہاں کیا جا سکتا ہے۔

میران صدر جہاں سے جہانگیر نے جہل حدیث پڑھی تھی۔ تخت نشینی کے بعد اس نے صدر جہاں کو چہار ہزاری منصب عطا کر کے تنوج کا علاقہ دیا[۲]

مرزا شکر اللہ شیرازی کچھ عرصہ شہزادہ خرم کے پاس دیوان رہے۔ بعد میں اجمیر کے ناظم مقرر ہوئے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ذکر تزک جہانگیری میں بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے اور ان کی تصنیف اخبار الاخیار کے لئے لکھتا ہے کہ

"خیلے زحمت کشیدہ"

جہانگیر کو منجملہ اور علوم کے تاریخ سے بھی بہت دلچسپی تھی اس عہد کے دو مورخ قابل ذکر ہیں۔ محمد ہادی نے تزک جہانگیری کا مفصل اور طویل مقدمہ لکھا، جس سے جہانگیر کے ابتدائی زمانہ کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ معتمد خاں نے تزک کے آخری چند سال یعنی جلوس کے سترہویں سال کے واقعات لکھ کر کتاب کو مکمل کیا۔

---

[۱] بزم تیموریہ دیکھو اور ریاض الشعراء ص ۱۵۰

[۲] دیکھو خزانہ عامرہ ص ۱۹۲

لیکن اس کی شہرت اقبال نامہ جہانگیری کی وجہ سے ہے اس کا تیسرا حصہ جو یقیناً سب سے زیادہ مفید ہے کیونکہ جہانگیر کے عہد پر مشتمل ہے۔ کلکتہ سے شائع ہو چکا ہے پہلے اور دوسرے حصوں میں جو کمیاب ہیں اور اب تک شائع بھی نہیں ہوئے، حضرت اکبر تک کے حالات ہیں سلہ جہانگیر کے عہد کی ایک اور تاریخ جو شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد لکھی گئی مآثر جہانگیری ہے۔ بعض لوگوں کی رائے میں یہ اقبالنامہ جہانگیری سے بہتر ہے۔ لیکن ابھی تک یہ شائع نہیں ہوئی۔

علم و ادب کی سرپرستی کے علاوہ۔ جہانگیر نے تعلیمی اداروں کی بھی کافی امداد کی۔ اپنے عطیات و اکرامات کے ساتھ اس کا حکم تھا کہ اگر کوئی مالدار آدمی یا لاوارث اجنبی کا انتقال ہو جائے تو اس کا مال مدارس اور خانقاہوں کی تعمیر و ترقی میں صرف کیا جائے۔

شاہجہاں کے عہد کے درباری شعراء شاہجہاں کی علمی صلاحیت کا اندازہ اس کے بعض مکاتیب اور فرامین سے ہوتا ہے، لیکن اس نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی۔ وہ خود شاعر تو نہیں تھا۔ لیکن شعر و سخن کا مذاق رکھتا تھا شعرا کی سرپرستی کرتا تھا، علماء فضلاء کا پورا پورا احترام کرتا تھا۔ اس کے عہد کے درباری شعراء میں حاجی محمد جان قدسی مشہدی کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند ہے مولانا غلام علی آزاد نے اس کو "صاحب سکہ سخندانی و مقرر پلۂ تخت شاہجہانی" لکھا ہے۔ وہ ۱۰۴۲ھ میں شاہجہاں کے دربار میں حاضر ہوا۔ اور ایک قصیدہ پیش کیا

سلہ مآثر الامراء جلد سوم ص ۳۵۰

جس کا مطلع یہ ہے :۔

اے قلم بر خود ببال از شادی و بکشا زباں
در ثنائے قبلۂ دیں ثانی صاحب قراں

شاہجہاں نے اس پر دو ہزار روپیہ اور خلعت عطا فرمائے۔ ۱۰۳۵ھ میں جشن کے موقع پر ایک اور قصیدہ کے صلہ میں پانچ ہزار روپے عطا کئے۔ نو سال بعد جہاں آرا بیگم کی صحت یابی پر بھی انعام پانے والوں میں قدسی شریک تھا۔ غرضکہ ایک مدت تک وہ شاہانہ انعام و اکرام سے مشرف ہوتا رہا۔ ۱۰۵۶ھ میں لاہور میں قدسی کا انتقال ہوا۔ صاحب خزانہ عامرہ کی رائے میں "قصیدہ و مثنوی او بمعراج بلاغت صعود نمودہ، غزل بہ آں مرتبہ نیست" [1]

دوسرا مشہور شاعر کلیم تھا۔ وہ کاشان کا رہنے والا تھا۔ جہانگیر کے زمانہ میں ہند پاکستان آیا اور سرہند پہنچ کر شاہ نواز خاں سے وابستہ ہو گیا جہانگیر اس کی بہت قدر و منزلت کرتا تھا ۱۰۲۸ھ میں ایران واپس چلا گیا لیکن وہاں بھی اس کو برصغیر بہت یاد آتا تھا۔ ایک غزل میں اس کا ذکر کرتا ہے :۔

ز شوق ہند زاں ساں چشم حسرت بر قفا دارم
کہ رو ہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را
اسیر ہندم و زیں رفتن بیجا پشیمانم
کجا خواہد رساندن پر فشانی مرغ بسمل را

---

[1] خزانہ عامرہ ص ۳۷۷

لیکن کلیم کی یہ آرزو پوری ہوئی اور اس کو ہند آنے کا ایک مرتبہ پھر موقع ملا۔

جہانگیر کے زمانہ میں طالب کے مقابلہ میں وہ زیادہ فروغ حاصل نہ کر سکا۔ لیکن شاہجہاں کے عہد میں اس کا کلام "شعلہ طور" بن کر چمکا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس عہد کی شاعری میں کلیم کے اشعار نے چار چاند لگا دیئے۔ تخت طاؤس کی تکمیل پر جو جشن منایا گیا۔ اس وقت بہت سے شعراء نے قصیدے کہے۔ لیکن کلیم کا قصیدہ بہت پسند کیا گیا۔ چند بیت بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں ؎

بوصف تخت مرصع گہر فشاں گشتم	خدا نصیب کند عمر خضر و طول مقال
ہزار سیلان یاقوت و صد بدخشاں لعل	برد نمائی گرفت ست تا نمود جمال
تواں ز آتش یاقوت آں چراغ افروخت	کہ نے ز باد رسد آفتش نہ ز آب زلال
فتادہ پرتو یاقوت و لعل بر الماس	چنانچہ عکس چراغاں فتد در آب زلال

اس قصیدہ کے صلہ میں بادشاہ نے کلیم کو روپیہ میں تلوایا اور وہ روپیہ اسی کو بخش دیا۔ قدسی نے ایک تاریخی مثنوی بہ عنوان بادشاہ نامہ بھی لکھی۔ آزاد بلگرامی نے اس کو "بسیار خوب" کہا ہے اور اس کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے [1]

سگ نفس را رفتہ از کار چشم
تو از عینکش کردہ چار چشم

---

[1] خزانہ عامرہ صفحہ ۳۸۰

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ قیصر روم نے اعتراض کیا تھا کہ شاہجہاں صرف ہندوستان کا بادشاہ ہو کر اپنے آپ کو دنیا کا بادشاہ کہتا ہے۔ شاہجہاں اس سے پریشان ہوا اور خیال کر رہا تھا کہ اپنا لقب تبدیل کر دے۔ کلیم کا مندرجہ ذیل شعر سن کر بادشاہ نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے

ہند و جہاں ز روئے عدد ہر دو چوں یکے است
شہ را خطاب شاہجہانی ست مبرہن

کلیم نے مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں سے ایک میں شاہجہاں کے عہد کے ۱۰۴۲ھ تک کے حالات ہیں۔ اس کا عنوان بھی قدسی کے بادشاہ نامہ کی طرح بادشاہ نامہ ہی ہے۔ لیکن بقول مولانا شبلی کلیم کا اصلی کمال غزل گوئی ہے۔[1]

دربار شاہجہانی سے وابستہ شعرا میں صائب کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ اس کا نام محمد علی اور تخلص صائب تھا۔ تبریز میں پیدا ہوا۔ اصفہان میں تعلیم پائی۔ صائب کے کلام نے اس کو بہت جلد عوام و خواص میں مقبول بنا دیا۔ آزاد بلگرامی کی نظر میں وہ "امیر الامرار کلام ؛ زانندہ رایات عالیات اقلام، امام ائمہ معانی و مجتہد علمائے سخندانی" ہے۔ اور ان ہی کے الفاظ میں "باوصفیکہ سنی المذہب بود در میان ایرانیان بکمال احتیاط در عقائد دین و حفظ اسرار علم و یقین مقبول خواص و عام گردیدہ چنانکہ

---

[1] شعر العجم حصہ سوم

باید و شاید زندگانی فرمود۔"

عہد جہانگیری کے آخر میں ہندوستان آیا اور ظفر خاں سے جو اپنے باپ کی نیابت میں کابل کا ناظم تھا وابستہ ہو گیا۔ شاہجہاں کی تخت نشینی پر ظفر خاں دار الخلافہ میں آیا تو صائب بھی اس کے ہمراہ تھا۔ ۱۰۴۲ھ میں ظفر خاں کو کشمیر کا ناظم مقرر کیا گیا وہ اپنے ساتھ صائب کو بھی لے گیا۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کر کے وہ اصفہان واپس چلا گیا۔ اور آخر وقت تک وہیں رہا۔

ہند کے قیام کے زمانہ میں صائب نے جعفر خاں وزیر سے بہت خوشگوار تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ ایران پہنچ کر وہاں سے اس نے جعفر خاں کو لکھا:

دور دستاں را باحساں یاد کردن ہمت ست

ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر می افگند

جعفر خاں نے اس پر پانچ ہزار روپیہ یا پانچ ہزار اشرفیاں اس کو بھیج دیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صائب کا کلام مولانا آزاد بلگرامی کو بھی بہت پسند تھا اور بہت سے اشعار منتخب کر کے انہوں نے اپنی بیاض میں لکھ رکھے تھے۔

فضلاء و ارباب ہنر | شاہجہاں کے عہد میں اس کے کئی امراء صاحب علم و فضل تھے سب سے زیادہ مشہور اور لائق خود اس کا وزیر تھا جو علامی سعد اللہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ۱۰۵۰ھ میں دربار میں حاضر ہوا اور ملازم ہو گیا۔ تدریجی ترقی کے بعد سات برس کی مدت میں وزارت کے

عہدہ پر فائز ہوا۔ ہفت ہزاری منصب ایک کرور دام کے انعام اور علامی
اور فہامی کے خطاب سے بھی نوازا گیا[۱]

شاہجہاں کا ایک اور امیر علی مردان بھی اپنی علم پروری کے لئے
مشہور ہے شاہجہاں کے عہد میں علم تاریخ کو بھی فروغ ہوا مورخوں میں کئی
مشہور شخصیتیں ہیں جن کے متعلق چند اشارات ضروری ہیں۔

محمد امین ابن ابو الحسین قزوینی شاہجہاں کی تخت نشینی کے پانچ سال
بعد مغلیہ سلطنت میں ملازم ہوا۔ چند سال بعد اس کو سرکاری مورخ مقرر کیا
گیا۔ چنانچہ بادشاہ کے عہد کے حالات اس نے ابتدا سے لکھے۔ خود شاہجہاں نے
اس کتاب کا نام بادشاہ نامہ رکھا۔ لیکن شاہجہاں چاہتا تھا کہ اس کے عہد
کے حالات ابو الفضل کے طرز پر لکھے جائیں۔ اس خدمت کے لئے ابوالفضل
کے ایک شاگرد عبد الحمید کا انتخاب ہوا۔ پہلے بیس سال کے حالات
عبد الحمید نے لکھ کر علامی سعد اللہ کو دکھلائے لیکن اب وہ ضعیف ہو چکا تھا
اس کے آخری دفتر اس کے ایک مددگار محمد وارث نے تیار کئے اور فاضل خاں
نے نظر ثانی کی پہلے دو دفتر یعنی دو حصے جو عبد الحمید کی تالیف ہیں کلکتہ سے شائع
ہو چکے ہیں۔

علم و ادب کی اشاعت اور سرپرستی میں مسلم سلاطین کا بڑا حصہ
ہے لیکن صوفیائے کرام کی کوششوں کو اولیت حاصل ہے۔ بالخصوص اسلامی

---

[۱] دیکھو عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۳۶

دور اقتدار کی ابتدائی منزلوں میں دینی زندگی کے باغ کو سینچنے اور اس کو سرسبز و شاداب رکھنے میں صوفیا کا بڑا حصہ ہے اور جس وقت اس باغ کو کفر کی طوفان خیز ہواؤں کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا تو پھر اسی طبقہ کے بزرگوں نے اس کی حفاظت کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ ان ہی کی خانقاہوں میں وہ جانباز سپاہی تیار ہوئے جنہوں نے باطل کی قوتوں کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کر کے دین و ملت کی شیرازہ بندی کو تباہی سے بچا لیا۔ علمائے خالص[1] کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں اور وہ شکست فاش کھا چکے تھے۔ اس لئے گوشہ نشین فقراء نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی اور بالآخر وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ علماء اور مشائخ کے طریق کار میں نمایاں فرق تھا۔ علماء کو ہر ہر مسئلہ میں شرعی نقطہ نظر سے فتویٰ دینا پڑتا تھا اس سلسلہ میں وہ زیادہ تر منقولات سے کام لیتے تھے اور ان ہی پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھتے تھے۔ اس میدان میں شیخ مبارک اور اس کی فوج کے دوسرے سپہ سالار بھی کچھ کم ماہر نہ تھے۔ اکثر معرکوں میں وہ فتح حاصل کر لیتے تھے اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ان کو بادشاہ وقت کی سرپرستی حاصل تھی۔ مشائخ نے علماء کے برخلاف اپنے اخلاقی و روحانی تصرفات و اثرات سے کام لیا، حکومت کی مشنری میں بادشاہ کے بعد سب

---

[1] قرون وسطیٰ کی تاریخ کو بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء اکثر کسی نہ کسی سلسلہ سے وابستہ ہوتے تھے لیکن کچھ علماء ایسے بھی تھے جو کسی سلسلہ سے وابستہ نہیں تھے، علماء خالص سے ایسے ہی علماء مراد ہیں۔ یہ لوگ صوفیہ پر طعن و تشنیع کرتے تھے، اس کی ایک روشن مثال اس عہد کے علماء میں شیخ عبدالنبی کی ہے جو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے پوتے تھے۔

سے زیادہ اہم پُرزے اس کے امرا اور لشکری تھے۔ چنانچہ ان ہی مشائخ نے اسلامی جذبہ کو استوار کرنے کی کوشش کی اور ان میں سے بعض کو اسلام کا اس قدر گرویدہ بنالیا کہ آخر کار ان ہی کے اثر سے حکومت اور حکمرانوں کا رویہ بدل گیا۔

ان اکابر صوفیا میں سے ایک مصلح اعظم حضرت مجدد سرہندی ہیں جن کی تبلیغی مساعی اور اصلاحی کوششوں سے اسلام کی اشاعت میں بڑی حد تک قوت حاصل ہوئی۔ اور حضرت مجدد صاحب نے اس دین کی خاطر قید و بند کی اذیتیں بھی برداشت کیں۔ اور اپنی نظر بندی کے زمانے میں بھی تبلیغ و اشاعت میں مصروف رہے۔ اس قید و بند سے پہلے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کرتے تھے اور ان میں جو اچھی صلاحیتیں رکھتے تھے ان کو دین کی اشاعت کے لئے مختلف مقامات پر بھیجا جاتا تھا۔ لیکن رہائی کے بعد آپ نے خود اپنی مرضی سے لشکر میں رہ کر یہ خدمت انجام دینے کا فیصلہ کیا۔ قید کے زمانہ میں آپ نے یہ محسوس کیا کہ شاہی لشکر میں رہ کر جو دین کی خدمت کی جا سکتی ہے، وہ خانقاہ کے گوشہ میں بیٹھ کر نہیں کی جا سکتی۔

حضرت مجدد صاحب نے اپنے صاحبزادوں کو جو وصیت فرمائی اس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں۔

"دربرکات عسکر کہ بودن در آں باختیار است فرزندان گرامی بجمعیت باشند" [۱]

[۱] مکتوبات جلد سوم ص ۱۴۲

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانہ میں جب کہ حضرت کا قیام لشکر میں رہا آپ کا فیض عام، اور اصلاحی تحریک نے بہت قوت حاصل کی اس قیام کی مدت صحیح طور پر نہیں بتائی جا سکتی۔ لیکن زبدۃ المقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۳۲ھ یعنی ۱۶۲۲ء میں آپ شہر اجمیر میں مقیم تھے۔ اور اس قیام کے دوران آپ نے فرمایا تھا کہ "آثار قربت انتقال ظاہر می شود" اسی وقت صاحبزادوں کو خط لکھا کہ اب ایام انقراض عمر نزدیک ہیں۔

اصلاحی تحریک کا پہلا دور حضرت مجدد صاحب پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا دور بھی ان ہی کے زمانہ میں شروع ہوتا ہے۔

مجدد صاحب نے شریعت و سنت کی اتباع کو ہر چیز پر مقدم رکھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ اخلاقیات اور تعمیر کردار کی ان کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی زندگی کے ہر پہلو کو شریعت کے مطابق بنانے کی کوشش کریں۔ شریعت کو نظر انداز کرنے کا جواز کسی صورت میں بھی نہیں۔ بہ الفاظ دیگر ان کا اصول وہی تھا جو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا تھا۔ شیخ عبدالحقؒ کو ان کے استاد کی ہدایت تھی کہ فقیہ صوفی بن کر زندگی گذاریں اور صوفی فقیہ نہ ہوں۔ صوفیا نے بعض مسائل کی جو توضیحات کی ہیں ان پر علماء کا ایک طبقہ اعتراض کرتا ہے۔ منجملہ ان مسائل کے ایک مسئلہ وحدت الوجود خاص طور پر اہم ہے۔ اور اس کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی نزاکت کا بھی احساس مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو ہر زمانہ اور ہر ملک میں رہا ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی نے اس پر بہت زور دیا ہے اور اس کی تشریح بہت مفصل اور مدلل طریقہ پر کی ہے ان کے علاوہ مولانا رومیؒ اور جامیؒ نے بھی اس کی حمایت کی۔ بڑے بڑے شعراء نے اس فلسفہ کو مختلف مضامین میں ادا کیا۔ غرضیکہ بہت جلد وحدت الوجود تصور فلسفہ کے دائرہ سے نکل کر علم وادب کے حلقوں تک پہنچ گیا۔ اور روحانی زندگی پر چھا گیا۔

یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی تصور یا مسئلہ مقبولیت حاصل کر لیتا ہے تو اس میں افراط و تفریط کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ وحدت الوجود کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مفکرین صوفیاء نے یہ کوشش کی تھی کہ یہ تصور عوام کی سطح سے بلند رہے۔ لیکن ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اور صوفیا کے ہر طبقہ تک وہ پہنچ گیا۔ ظاہر کہ اس طبقہ کے وہ لوگ جن میں اس مسئلہ کی حقیقت سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی اس میں غلو کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بعض اقوال و افعال شریعت کے اصول سے ٹکرا گئے۔ اس کی روک تھام ضروری تھی کیونکہ اس سے انتشاری قوتوں کو مدد ملتی تھی، مجدد صاحبؒ نے اسی ضرورت کے پیش نظر وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا ظاہری شکل میں تو ان ہر دو نظریات میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ مفکر اعظم حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنے رسالہ فیصلہ وحدت الوجود والشہود میں اس کی وضاحت کی ہے، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں بنیادی فرق نہیں۔ اور شیخ اکبر اور شیخ مجدد صاحبؒ کے خیالات میں تطبیق ممکن ہے۔ لیکن شیخ مجدد کو وحدت الشہود پر بہت زیادہ اصرار اس لئے تھا کہ وحدت الوجود کی اشاعت سے جہلا میں

نہایت خطرناک نتائج کے پیدا ہونے کا امکان تھا، اور جب بھی یہ مسئلہ عوام میں بحث و تمحیص میں آیا اس کے نتائج کچھ بہتر ثابت نہیں ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کی بابت اختلاف رائے کے باوجود شیخ مجدد، شیخ اکبر کا پورا پورا احترام کرتے تھے اور ان کو اولیاء اللہ میں شمار کرتے تھے[1]

ہند پاکستان میں اسلامی حکومت نے غیر مسلموں کے ساتھ ہمیشہ رواداری کی پالیسی پر عمل کیا۔ اور ان کو ان کے مذہب میں مکمل آزادی دی۔ حکومت کے علاوہ جمہور مسلمان بھی اسی راہ پر گامزن رہے۔ اس میں بہت بڑا دخل صوفیاء کے طریقہ کار کو بھی تھا۔ ان حضرات کو یقین تھا کہ تبلیغ و اشاعت اسلام کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے انتہائی رواداری ضروری ہے اور اس طریقہ میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ کثرت سے غیر مسلم ان کے پاس آتے اور ان میں اکثر مشرف باسلام ہو کر واپس جاتے۔

عالمگیر کا ادبی ذوق، مکاتیب عالمگیر دینی علوم کے علاوہ ادب کے دوسرے شعبوں سے بھی دلچسپی رکھتا تھا وہ خود کئی زبانیں جانتا تھا۔ محمد کاظم لکھتا ہے:۔

"اگرچہ اکثر اوقات بزبان سلیس ملیح فارسی تکلم می نماید لیکن ترکی جغتائی را بالغایت خوب می دانند و با ترکاں بدان زبان سخن می کنند

---

[1] زبدۃ المقامات میں کئی جگہ اس کا ذکر موجود ہے صـ۲۱۱

باجمعی از اہل ہند کہ فارسی نمی دانند یا نیکو نمی توانند گفت بضرورت زبان بلغت ہندی می کشایند" [1]

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی زبان جو یقیناً اردو تھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان بن چکی تھی لیکن عالمگیر کا جوہر انشاء پردازی میں نمایاں ہوا اور درجہ کمال تک پہنچا عالمگیر کی مصروفیات یعنی ریاضات و عبادات، انتظام حکومت اور لڑائیوں میں بذات خود شرکت، کو دیکھتے ہوئے اس نے جس تعداد میں خطوط لکھے ہیں وہ معمولی قابلیت کا انسان نہیں لکھ سکتا تھا۔ تعداد کے علاوہ طرز نگارش کے لحاظ سے بھی اس کے مکاتیب نے ہر طبقہ کے ادبار سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ اس کے رقعات میں ادائے مطلب کی قدرت، عبارت کی سادگی، فقروں کی ہمواری، مطالب کا اختصار پہلو بہ پہلو جملے، دلنشیں ترکیبیں نہایت حیرت انگیز ہیں [2]

عالمگیر کے خطوط طرز نگارش کو چھوڑ کر یوں بھی خاصے دلچسپ ہیں، امراء اور عہدہ داروں کو خطاب کرتے وقت انتظامی امور سے متعلق نصیحت کرتا ہے، مشورہ دیتا ہے اور ضرورت کے وقت ان پر کڑی تنقید کرتا ہے، شہزادوں کو ان کی غلطیوں اور بے راہ روی پر نہایت

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۵

[2] مضامین۔ عالمگیر

موثر الفاظ میں ان کو تنبیہ کرتا ہے، اس کا بڑا لڑکا محمد اعظم ایک سید کی لڑکی سے محبت کرتا تھا، ایک دن بحالت غضب اس نے لڑکی کے باپ سید ممتاز کو پاجی کہہ دیا، عالمگیر کو خبر ہوئی تو خط لکھا:۔

صبحدم مرغ چمن باگل نوخاستہ گفت
ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت
گل بخندید کہ زراست نہ نجیم لیکن
ہیچ عاشق سخن تلخ بمعشوق نہ گفت

عالمگیر کے درباری شعراء

عالمگیر کے خطوط پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشہور شعراء فارسی کے اشعار بہت دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ سعدی، حافظ، نظامی، نظیری، صائب، ملا شاہ اور فانی کشمیری کے دواوین عالمگیر کے مطالعہ میں رہتے تھے، اور ان کے کلام کا اکثر حصہ عالمگیر کو بر زبان تھا۔

مخلص خاں نے ایک بار دیوان صائب پیش کیا جس میں ایک لاکھ اشعار تھے۔ عالمگیر صائب کے ایسے اشعار پڑھ کر بہت محظوظ ہوا جو معرفت و تصوف میں ڈوبے ہوئے تھے اور اس دیوان کو محبوب رکھنے لگا۔ [1]

عالمگیر کو صائب کی ایک غزل بہت پسند تھی جس کا مقطع یہ ہے:۔

---

[1] بزم تیموریہ ص ۲۶۱

ایں سفر ہیچو سفرہائے دگر صائب نیست
رخت ہستی زخود اندا ختہ می باید رفت

جیساکہ اس زمانہ کا دستور تھا، عالمگیر بھی اپنے پسندیدہ اشعار ایک بیاض میں لکھ لیتا تھا اور بعض اشعار اپنے بیٹوں کی بیاض میں لکھوا دیتا تھا۔

بہ ہدایت اللہ زرین رقم بگوئید کہ ایں رباعی در بیاض کہ بپادشاہزادہ کام بخش مرحمت می شود، بخط خود بہ نویسد۔

آتش بدو دست خویش در خرمن خویش
من خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمن من نیست منم دشمن خویش
اے وائے من و دست من و دامن خویش

یہ امر قابل غور ہے کہ عالمگیر ان اشعار کو پسند نہیں کرتا تھا، جس میں اس کی خوشامد یا التعریف کا پہلو نکلتا ہو ماثر عالمگیری کے الفاظ میں کہ حضرت جہاں پناہ اگرچہ نظم و نثر کے سمجھنے اور لکھنے میں کمال قدرت رکھتے تھے لیکن بے فائدہ اشعار اور خصوصاً کاذب مدح سرائی کے سننے سے پرہیز فرماتے تھے، نصیحت آمیز اشعار سے البتہ بے حد ذوق تھا" بیماری کی حالت میں اکثر اشعار پڑھ کر دل بہلایا کرتا تھا، اپنے بستر علالت پر اکثر یہ شعر پڑھتا تھا ؎

بیک لحظہ بیک ساعت بیک دم
دگرگوں می شود احوال عالم

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ عالمگیر کبھی کبھی خود بھی طبع آزمائی کرتا تھا، لیکن اس کے اشعار کا پتہ نہیں چلتا جس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اس نے بہت ہی کم شعر کہے ہوں گے۔ بہرحال ایک شعر مولوی ذکاء اللہ نے اس کا نقل کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے:۔

غم عالم فراوان است و من یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیاباں را

نواب صدیق حسن خاں نے شمع انجمن میں یہ رباعی بھی عالمگیر کی نقل کی ہے ؎

دی روز پئے گلاب می گردیدم — پژمردہ گلے بر سر آتش دیدم
گفتم کہ چہ کردہ کہ می سوزندت — گفتا کہ دریں باغ دمے خندیدم

مندرجہ بالا واقعات کی بنا پر یہ کہنا غلط ہوگا کہ عالمگیر سخن شناسی اور نکتہ سنجی سے قطعاً بے بہرہ تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ شعر گوئی کو کار بیکاراں نہیں بنانا چاہتا تھا اور نہ یہ چاہتا تھا کہ لوگ اس کو پیشہ بنالیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ شعرا کی اس حد تک سرپرستی کرنے کے لئے تیار نہ تھا جیسی کہ اس کے اجداد نے کی تھی۔ چنانچہ اس نے ملک الشعراء کا عہدہ ختم کر دیا اور اس کے دربار سے جو شعراء ملحق رہے، شعر گوئی کے علاوہ دوسری مناسب خدمت بھی ان کے سپرد کر دی گئی تھی، ان حالات میں یہ امر تعجب انگیز نہ ہونا چاہیئے کہ عالمگیر کے عہد سے ہند پاکستان میں فارسی شاعری کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ فیض، طالب

قدسی اور کلیم کے مقابلہ نے فارسی گو شعراء ہم کو اس عہد میں یا زمانہ مابعد میں نظر نہیں آتے۔ بہر حال اس دور کے چند شعراء قابل ذکر ہیں :۔

نعمت خاں عالی نے ابتدا میں اپنا آبائی پیشہ طبابت اختیار کیا۔ بعد کو عالمگیر کی ملازمت اختیار کرلی ۱۰۸۲ھ میں باورچی خانہ شاہی کا داروغہ مقرر ہوا۔ آخر عمر میں مقرب خاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ بہادر شاہ کے عہد میں اس کو دانشمند خاں کا خطاب ملا۔ نعمت خاں کے اشعار کو بے مزہ کہا گیا ہے۔ لیکن ہجو لکھنے میں اس کو کمال حاصل تھا۔ چنانچہ ماثر الامراء کا مصنف اس کو ہاجی لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ "ہیچ یکے از زبانش نہ رستہ" حتےٰ کہ وقائع نعمت خاں عالی میں اس نے خود عالمگیر کی بھی ہجو ملیح لکھی ہے۔

عاقل خاں رازی کا نام میر عسکری تھا، عہد شاہجہانی میں برصغیر آیا اور شہزادہ اورنگ زیب کے تحت دکن میں ملازم ہو گیا۔ اورنگ زیب سے اس کے تعلقات خوش گوار تھے۔ تخت نشینی کے بعد عالمگیر نے اس کو دوآبہ کا حاکم مقرر کیا اور عاقل خاں کے خطاب سے سرفراز کیا اس کے بعد وہ برابر ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ آخر عمر میں وہ دہلی کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ بادشاہ کو اس کی دیانت داری اور خلوص بہت پسند تھا، اور اس پر بادشاہ کو بڑا اعتماد تھا، اس نے جنگ تخت نشینی کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ وقائع یا ظفر نامہ عالمگیر کے نام سے لکھے ہیں۔ دیوان کے علاوہ اس کی چند مثنویاں بھی ہیں۔ مرقع تصنیف رازی مولانا روم کی مثنوی کے طرز پر لکھی گئی ہیں۔

ثمرات الحیوٰۃ اس کے مرشد شیخ برہان الدین رازی کی تصنیف ہے جس
کو عاقل خاں نے مرتب کیا ہے۔ اس کو مولانا رومی کے کلام سے گہری دلچسپی
تھی، صاحب مآثر عالمگیری لکھتا ہے کہ وہ ان کے کلام کے دقائق حل کرنے
میں خود کو یکتا خیال کرتا تھا۔[1] ایک غزل کے دو شعر مندرجہ ذیل ہیں:۔

منتظر آن یار را جلوۂ ہر صور نکوست
سرمہ بود غبار رہ دیدہ انتظار را

چند غمے جہاں خوری دل چہ نہی بریں چمن
باد خزاں چو در پے ست جلوۂ ایں بہار را

روشن ضمیر ایران سے ہند پاکستان آیا۔ عالمگیر نے اس کی سرپرستی
کی، کچھ عرصہ کے لئے اس کو ایک عہدہ پر مامور کیا۔ عالمگیر نے کلام اللہ
حفظ کیا تو ضمیر نے مندرجہ ذیل تاریخ لکھ کر پیش کی ؎

محی الدین و مصطفی حافظ تو ۔۔۔ صاحب سیفی و مرتضی حافظ تو
تو حامی شرع و حامی تو شارع ۔۔۔ تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو

اس پر عالمگیر نے خوش ہو کر سات ہزار روپیہ انعام میں دیئے۔
ضمیر نے ہندی سیکھی اور اس کا بہت اچھا شاعر ہو گیا اس عہد کے ہندی گو
شعراء میں اس کی امتیازی حیثیت تھی۔ فن موسیقی کا بھی ماہر تھا۔
نغمہ اور رقص پر ایک ہندی تصنیف بار جاتک کا فارسی میں

---

[1] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ) صفحہ ۲۷۴

ترجمہ کیا۔[۱]

مراۃ الخیال کا مصنف جو صرف ہمعصر ہی نہیں بلکہ ان سے ذاتی تعلقات رکھتا تھا کہتا ہے کہ "مرزا اردشن ضمیر آسمان فضل و کمال کے بدر منیر تھے"[۲]

مرزا محمد علی ماہر اکبر آبادی اپنے زمانہ کے مشہور اساتذہ میں تھے وہ کلیم اور قدسی کی صحبت سے فیضیاب ہوئے تھے عالمگیر کی مدح میں ایک رسالہ گل اورنگ لکھا جو ظہوری کے طرز پر ہے۔ وہ قناعت پسند اور درویش صفت تھا، آخر عمر میں عزلت نشیں ہو گیا تھا۔ اس کے ایک شاگرد محمد افضل سرخوش نے ایک مرتبہ اس سے کہا کہ آپ کسی منصب کی کوشش کیوں نہیں کرتے جواب دیا کہ اب فقیری لے لی ہے اگر دنیا کی طرف لوٹا تو وہ حال ہو گا جو اس ہندو بیوہ کا ہوتا ہے کہ شوہر کی چتا پہ جلانے کے لئے لائی جائے تو وہ آگ سے ڈر کر بھاگ آئے تو بھنگی اس کا سر لکڑیوں سے کچل ڈالتے ہیں اور پھر اس کو آگ میں ڈال دیتے ہیں۔ آخر تک قناعت ہی کی زندگی بسر کی۔ دیوان کے علاوہ ماہر کی ایک مثنوی جامع نشاتین بھی ہے جو تحفۃ العراقین کی بحر میں لکھی گئی ہے۔[۳]

---

[۱] ید بیضا بحوالہ بزم تیموریہ صفحہ ۲۷۰

[۲] مراۃ الخیال صفحہ ۳۲۲

[۳] کلمات الشعراء اورنٹیل کالج میگزین

محمد افضل سرخوش ۱۰۵۰ھ میں کشمیر میں پیدا ہوئے۔ دربار سے وابستہ ہوکر خانہ زادان شاہ عالمگیر ہوئے اور ۱۰۸۰ھ میں حسن ابدال میں مشرفی عدالت کے عہدہ پر فائز ہوئے ۱۱۲۶ھ میں دہلی میں وفات پائی۔ ہندی نژاد فارسی گو شعراء میں سرخوش ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ سرخوش کے شاگردوں نے بھی شہرت حاصل کی جن میں بندرا بن خوشگو حکم چند ندرت حافظ محمد جمال تلاشش، بیغم بیراگی اور رکم گو کشمیری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سرخوش کے دیوان میں جس کو اس نے خود ہی مرتب کیا تھا پینتالیس ہزار شعر تھے اس کے علاوہ کئی مثنویاں بھی اس کی یادگار ہیں نور سے علے نور حسن وعشق قضا وقدر جس میں بعض خصوصیات ہند کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ جنگ نامہ محمد اعظم بھی قابل ذکر ہے۔

مولانا جامی کی لوائح کے تتبع میں ایک رسالہ روائح لکھا لیکن جس تصنیف نے اس کی شہرت کو عام کیا وہ کلمات الشعراء ہے جس میں عہد جہانگیر سے عالمگیر کے عہد تک کے شعراء کا مفصل حال لکھا ہے۔ بعد کے تذکرہ نگاروں نے جن میں آزاد بلگرامی بھی شامل ہیں سرخوش کے تذکرہ سے بہت استفادہ کیا ہے، کلمات الشعراء، لاہور سے شائع ہو چکا ہے،

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

ہوشیاری ساحجاب یار می دانیم ما	بیخودی را بزم بے اغیار می دانیم ما
تیز می سازد لقتل عاشقان شمشیر را	ایں قدر رحم از دلِ بسیار می دانیم ما

——— ٭ ———

خواہی کہ قدم براہ حق بگذاری
باید کہ بکف دامن پیری آری
بے آئینہ پنبہ در نگیرد ہرگز
یک عمر اگر در آفتابش داری

از بادہ مرا فزوں شود عقل و شعور
ساغر خضر رہ نشاطات و سرور
مے رو شنی طبع بود سر خوش را
روغن ہمہ در چراغ گردد نور

باشی لبسر حساب اگر اے ہمدم
وحدت نخورد ز جوشش کثرت ہم
در ہندسہ نہ را چو مضاعف سازی
ہر چند کہ بشمری نہ آید بہ رقم[1]

اس عہد کے ایک مشہور شاعر جن کی طبع غنا پسند نے ان کو دربار سے وابستہ نہ ہونے دیا غنیؔ کشمیری تھے وہ ملا محسن خاں کشمیری کے شاگرد تھے شاعری میں ان کا رتبہ یہ تھا کہ صائب ان کے کلام پر تضمین کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس کا شعر ہے ؎

ایں جواب آں غزل صائب کہ می گوید غنی
یاد ایامے کہ دیگر شوق ما سر جوش داشت

---

[1] تذکرہ شمع انجمن ص۲۰۰

سنہ ۱۰۷۹ھ میں انتقال ہوا۔ غنی کا دیوان شائع ہو چکا ہے چند شعر مندرجہ ذیل ہیں:۔

باتو نزدیکیم دے دورم زفیض عام تو　　موم دند زیر نگیں خالی است از نقش نگیں

رفتیم سوئے یار و ندیدیم روئے یار　　مانند راہروے کہ رود سوئے آفتاب

حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر　　دام ہمرنگ زمین بود گرفتار شدم

نمی کند بمن ناتوان نگراں شوخ　　زبیم آنکہ بگویند ناتواں بین است

از کنارم دختر رز کردہ تا پہلو تہی　　کار من اکنوں غنی با طفل اشک افتادہ است

ان کے علاوہ تذکروں میں اس عہد کے اور بہت سے شعراء کا ذکر ہے۔ اسیر لاہوری۔ سیادت لاہوری منیر لاہوری اعجاز اکبرآبادی۔ ضیا خیرآبادی۔ عارف۔ غریب۔ مشرقی۔ تسبقی۔ وحدت۔ ناصر علی سرہندی وغیرہم۔

امراء عالمگیری کا ادبی ذوق

اس عہد کے سربرآوردہ امراء، فضلاء و شعراء کی سرپرستی کے لئے مشہور تھے۔ گویا کہ ہمارے ادبی سرمایہ کی تعمیر میں ان کا بھی حصہ ہے۔ خود عالمگیر کا پہلا وزیر فاضل خاں علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت تامہ رکھتا

تھا۔ اور اہم شاہی فرامین وہ خود لکھتا تھا[1] عالمگیر کے آخری وزیر اسد خاں کا لڑکا ذوالفقار خاں نصرت جنگ بھی شعرا کی سرپرستی کرتا تھا۔ ناصر علی سرہندی کچھ مدت تک اس سے وابستہ رہے۔ منعم خاں نے حضرت شیخ کلیم اللہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنی خدمات کی بدولت خانخاناں کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ شیخ محمدی سے بیعت تھا چنانچہ اس کے کلام میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ معرفت میں الہامات منعمی ایک رسالہ اس کی تصنیف ہے۔ اسلام خاں اورنگ زیب کے ابتدائی متوسلین میں سے تھا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے ترقی کی اور بلند پایہ امراء میں اس کا شمار ہونے لگا۔ والا تخلص کرتا تھا۔ ماثر الامراء میں اس کے دو شعر مندرجہ ذیل موجود ہیں:۔

بے تو شام غم برو ز شبخون می زند
مردم چشمم زگریہ غوطہ درخوں می زند

دستے پیدا کن اے صحرا کہ شب در غمش
لشکر آہ من از دل خیمہ بیروں می زند

اسلام خاں کی طرح میر عیسیٰ ہمت خاں بھی شروع ہی سے اورنگ زیب کی سرپرستی میں تھا۔ اسی کی نوازشات کی بدولت وہ جامع فضل و کمال ہوا، مختلف عہدوں پر فائز ہوا، آخر عمر میں اجمیر میں بخشی تھا۔ ماثر الامراء

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۳۹۵

کا مولف اس کو "از مستعدان روزگار" لکھتا ہے اور آگے چل کر اس کی بابت لکھتا ہے "فصاحت وبلاغت از نظم ونثر بر صفحہ یادگار نگاشتہ" وہ فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتا تھا اور اس میں میرن تخلص کرتا تھا اس کے فارسی کے دو شعر مندرجہ ذیل ہیں۔

بجز خارے کہ مجنون داشت در دل
بیابانِ جنوں خارے ندارد

من چہ گویم کہ چہ مقدار بدل نزدیکی
چشم بد دور کہ بسیار بدل نزدیکی

احمد یار خاں ٹھٹہ کے صوبیدار تھے۔ لاہور کے ایک شاعر محمد عاقل بھی یکتا تخلص کرتے تھے ان کا اصرار تھا کہ احمد یار خاں اپنا تخلص بدل دیں لیکن انہوں نے تجویز کیا کہ ایک طرحی غزل دونوں کہیں جس کی غزل کو استادانِ فن بہتر بتلائیں وہی یہ تخلص اختیار کرلے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ احمد یار خاں کی غزل کے بعد محمد عاقل کو غزل پڑھنے کی بھی جرات نہیں ہوئی اور احمد یار خاں کا تخلص یکتا باقی رہا۔ اس طرحی غزل کا ایک شعر یہ ہے:۔

بامیدے کہ شود جلوہ گر آں سرو روان
خاک شد جبہ دو در راہ قدم بوسی ریخت

یکتا کے دو شعر اور ہیں:۔

از بس کہ سراپا ز غم عشق تو داغم
چوں کاغذ آتش زدہ یک شہر چراغم

چہ پرسی از سرو سامان من عمر لیست چوں کاکل
سیہ بختم پریشاں روزگارم خانہ بردوشم

۱۱۴۷ھ میں وفات پائی۔ یکتا کو تذکرہ نگاروں نے یکتائے اماثل لکھا ہے۔ ان کی دو مثنویاں تحدیث حسن و شہر آشوب ہیں۔

مرزا معزالدین محمد فطرت موسوی خاں ۱۰۸۶ھ میں ایران سے ہند پاکستان آیا۔ عالمگیر نے سرپرستی فرمائی۔ شاہ نواز خاں کی لڑکی یعنی شہزادہ اعظم کی خالہ سے شادی ہوئی۔ ۱۰۹۹ھ میں دیوان تن مقرر ہوا اور موسوی خاں کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۱۰۱ھ میں وفات پائی۔ موسوی خاں کے شاگرد سرخوش نے اپنے استاد کی بے حد مدح کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موسوی خاں کا شمار اعلیٰ ترین شعرا میں کیا جانا چاہیئے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:۔

شدم خاک و ہنوز از عشق او آتش بجاں دارم
در آغوش کفن جسمے چہ تب در استخواں دارم

چو سوز عشق را کامل کنی عیبت ہنر گردد
شود یاقوت ہر سنگے کہ لبریز شرر گردد

مرد حق در عین دنیاداری از دنیا بری ست
ملک در دست سلیماں نیست در انگشتری ست

ای سر مستی مرا از بادہ خود پرور لیست
شیشہ تا موج شکستن می زند بال پری ست

عشق در مصر جنوں لاف خدائی می زند
حسن گر یوسف شود در کسوت پیغمبری ست

دربار عالمگیری سے کئی ہندو شعراء و فضلاء بھی منسلک تھے واتق کھتری۔ رائے بندرابن۔ الیسر داس۔ بھیم سین اور سوجان رائے کھتری قابل ذکر ہیں اس عہد میں ہندوؤں کے علوم و فنون پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں مثلاً تحفۃ الہند[1] جس کا موضوع ہندوؤں کا فن بلاغت ہے اس کے علاوہ دوسری کتابیں بھی لکھی گئیں۔ جن سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ عالمگیر ہندوؤں کے علوم و فنون کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔

---

[1] دیکھو مضمون مولانا شبلی رح مقالات ادبی جلد دوم

چوتھا باب

دیسی زبانوں کی ترقی میں مسلمانوں کا حصّہ

ساتویں صدی عیسوی میں جب اسلام کا آغاز ہوا اس وقت ہند
ستان میں سنسکرت بطور علمی زبان کے خواص میں رواج پذیر تھی۔ قدیم
راکت عوامی بولی ہونے کے باعث اتنی بدل چکی تھی کہ اب ابھرنش کہلاتی
۔ ملک کے مختلف حصوں میں اس کے مختلف نام تھے مثلاً سندھ میں
اچڈی۔ شمالی مغربی علاقہ میں شورسینی مشرقی یوپی میں اردھاماگدھی
ہاسے آگے بڑھ کر ماگدھی جنوب کی طرف آونتی اور مہاراشٹری
گورجری بولی جاتی تھیں۔ جنوبی ہند میں دراویدی نسل کی زبانیں

رواج پذیر تھیں۔

۱۰۰۰ء کے قریب سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے وقت یہ بولیاں بھی نیا قالب اختیار کر چکی تھیں جس علاقہ میں ماگدھی بولی جاتی تھی وہاں بنگلہ اوڑیا بہاری، آسامی بولی جانے لگیں اردھا ماگدھی کے علاقہ میں پوربی یا شرقی ہندی مروج ہو گئی۔ شورسینی ترقی کر کے ہندی اور پنجابی بن گئی۔ مہاراشٹری سے مرہٹی اور گورجری سے گجراتی وجود میں آئیں۔ وراچڈی سے سندھی کی شکل اختیار کی مگر اس کے پہلو بہ پہلو براہوی اور بلوچی بھی بولی جاتی رہیں جن کا تعلق دراویڈی خاندان سے ہے ان میں سے بعض صرف بولیوں کی حد میں رہیں اور بعض نے ادبی حیثیت سے ترقی کی۔ یہاں صرف ان زبانوں کا جائزہ لیا جائے گا جن کی ترقی میں مسلمانوں کا معتدبہ حصہ ہے۔

تاریخی اعتبار سے سندھ کو اولیت حاصل ہے کیونکہ سب سے پہلے مسلمانوں نے یہیں قدم رکھا مگر سندھی زبان نے ادبی حیثیت عہد عالمگیر کے بعد حاصل کی اس لئے اس کا ذکر دوسری جلد میں آئے گا۔ جو علاقہ آج کل بنگال کہلاتا ہے مسلمانوں کے عہد سے پہلے متحدہ ملک نہیں تھا ونگا پنڈرا گوڑ وغیرہ خطوں میں منقسم تھا۔ ساتویں صدی مسیحی میں گوڑ کو زیادہ اہمیت ملی مگر مسلمانوں کے عہد میں ونگا کو اہمیت حاصل ہو گئی اور اسی قبیلے کے نام پر یہ پورا علاقہ ونگال یا بنگال کہلایا ونگا میں آل حرف نسبت ہے۔ ابتدائی زمانہ میں جو زبان یہاں بولی جاتی تھی اس کو اشورا کہتے تھے اس کے کچھ منق

مثلاً کوڑی (بیس) گنڈا (چار) وغیرہ آج بھی بولے جاتے ہیں۔ البتہ مہاستھان گڑھ[1]
ضلع بوگرہ میں جو سنگی کتبہ دریافت ہوا ہے اس کی زبان اپ بھرنش ماگدھی ہے
مگر ادبی حیثیت اختیار کرنے میں اس زبان کو کئی صدیاں لگیں۔

تیرھویں صدی کے شروع میں جب قطب الدین ایبک نے دہلی
میں خاندان غلامان کی بنیاد رکھی اس وقت یہ زبان ادبی حیثیت اختیار کر
چکی تھی اور چونکہ یہ علاقہ دارالحکومت سے بہت دور تھا اس لئے مرکزی
حکومت کا اقتدار کبھی دیرپا نہ ہوا اور عہد اکبری تک خود مختار یا نیم مخ.
فرماں روا یہاں حکمرانی کرتے رہے ابتدائی دور کے مسلمانوں کی کوئی
تخلیق ہنوز دریافت نہیں ہوئی مگر ان کے اثر سے ہندوؤں نے نئی تخلیقات
کی زیبائش شروع کر دی تھی۔ اسی دور کی ایک کتاب "شیخ شبھو دھیا" ہے
اس کا مصنف پنڈت ہلایدھ مسرا تھا اس میں شاہ جلال تبریزی متوفی
۱۲۲۵ء کی کرامات اور تبلیغی کارناموں کا ذکر ہے۔ شاہ صاحب موصوف
کی ملکیت میں صرف ایک گائے تھی اور آپ کی کم خوری کا یہ عالم تھا کہ
دس دن مسلسل روزہ رکھنے کے بعد گیارھویں دن گائے کے دودھ سے
افطار کرتے تھے ان کی یہ کرامت دیکھ کر بہت سے لوگ حلقہ بگوش اسلام
ہو گئے۔ اس کتاب کی زبان بنگلہ تو نہیں ہے مگر اس کے اثر سے متاثر ہے
اور ایک گیت بھی بنگلہ کا ہے۔

چودھویں صدی کے وسط میں سلطان غیاث الدین (۱۳۸۹ء تا

---

[1] یہ لفظ اردو میں بھی انہی معنی میں بولے جاتے ہیں۔

سنہ۱۴۰۹ء) نے اس سرزمین کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے سلطان موصوف نے خواجہ حافظ شیرازی کو اپنے وطن آنے کی دعوت دی۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ نے عزم سفر بھی کیا مگر مصائب سفر برداشت کرنے کی ہمت نہ تھی اس لئے یہ ارادہ منسوخ کرنا پڑا اور اپنی مشہور غزل "دیں بحث باثرانۂ غسالہ می رند" سلطان کی خدمت میں بھیج دی۔ مگر سلطان موصوف کا یہ کارنامہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ بنگلہ زبان کی سب سے پہلی تخلیق جو ایک مسلمان کی قوت فکر کا نتیجہ ہے اسی کے عہد میں قلم بند کی گئی۔ یہ یوسف زلیخا کی منظوم حکایت ہے خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف نے بچپن میں ایک خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور آفتاب و مہتاب مجھے سجدہ کر رہے ہیں اس خواب کو آپ نے اپنے پدر بزرگوار کو سنایا انہوں نے اپنے عزیز فرزند کو اس خواب کا ذکر کرنے سے منع فرمایا مگر کسی طرح آپ کے بھائیوں کو معلوم ہو گیا انہوں نے ازراہ حسد حضرت یوسف کو کنوئیں میں ڈال دیا اور باپ سے آکر کہہ دیا کہ بھیڑیا کھا گیا بعدازاں کھوٹے سکوں کے عوض ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا جس سے عزیز مصر فوطیفار نے خرید لیا اس کی بیوی زلیخا نے اظہار عشق کیا مگر عصمت نبوت نے حضرت یوسف کو پاک دامن رکھا جب اس کا چرچا ہوا اور زنان مصر نے زلیخا کو ملامت کی تو حضرت یوسف ان کے سامنے پیش کیے گئے اور ان عورتوں نے ترنج کے بجائے اپنی انگلیاں کاٹ لیں بعدازاں حضرت یوسف ناکردہ گناہ قید خانہ بھیج

دیئے گئے وہاں پر بادشاہ کے دو خادم بھی موجود تھے ان کے خوابوں
کی صحیح تعبیر آپ نے دی بعد ازاں خود والی مصر نے خواب دیکھا
اس کی تعبیر بھی آپ نے فرمائی اس کے معاوضے میں آپ رہا کئے گئے اور
عزیز مصر کے منصب پر فائز ہوئے۔ بادشاہ نے خواب میں جس قحط کو دیکھا
تھا جب وہ نمودار ہوا تو برادران یوسف بھی غلہ حاصل کرنے کے لئے مصر
پہنچے ان کو حضرت یوسف نے پہچان لیا یہ لوگ اپنے ساتھ حضرت یوسف
کے سگے بھائی یامین کو نہیں لے گئے تھے اس لئے حضرت یوسف نے
دوسری بار ان کے لانے کی شرط لگا دی یہ لوگ حسب خواہش ان
کو لے کر گئے اور وہاں پر یہ راز افشا ہوا کہ عزیز مصر ان کا فروخت کیا
ہوا بھائی یوسف ہے اب حضرت یعقوب بھی وہاں تشریف لے آئے۔

شعرا نے اس احسن القصص کی تعبیر اپنے طور سے کی اور زلیخا کا
ذکر جو ضمنی طور سے آیا تھا اس کو پوری شرح و بسط سے لکھا فارسی
میں سب سے پہلے جو یوسف زلیخا لکھی گئی وہ فردوسی کی طرف منسوب
ہے مگر اس موضوع پر سب سے کامیاب مثنوی ملا جامی کی تصنیف
ہے۔ شاہ محمد صغیر نے جامی سے تقریباً ایک صدی پہلے اس موضوع پر
قلم اٹھایا بادشاہ موصوف کے حالات زندگی کچھ زیادہ معلوم نہیں
اور یہ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتاب سلطان کے ایما سے
لکھی گئی البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کتاب کا مصنف سلطان کی ملازمت
میں منسلک تھا۔ صغیر نے اس کتاب میں تھوڑا سا مکی رنگ بھی بھر

دیا ہے یعنی تاجر کا نام "منی رد" یعنی موتیوں کا سوداگر لکھا ہے ہوسکتا ہے
کہ نکرہ کو بطور علم استعمال کیا ہو۔ اسی طرح حضرت یوسف کی قیمت بجائے
کھوٹے درہموں کے "تامردھیپہ" یعنی پیتل کا سکہ دیا۔ یہ سکہ بنگال سے
مخصوص ہے۔ اور بن یامین کی شادی مدھوپور کے بادشاہ کی بیٹی
بیدھوپرداکے ساتھ دکھائی گئی۔ ہوسکتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں ڈھاکہ
کا مدھوپور ہو۔ اس کتاب میں مصنف نے ایک تاریخی واقعہ کی عجیب
توجیہ کی ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ سلطان غیاث الدین اپنے باپ سکندر
شاہ کے خلاف نبرد آزما ہوا اور اس کو شکست دی۔ صغیر نے اس
کو اس انداز سے لکھا ہے کہ سلطان نے دانشوروں کی یہ مثل صحیح ثابت
کردی ہے کہ ہر بادشاہ یہ چاہتا ہے کہ ہر شخص پر فتح حاصل کرے البتہ
اس بات کو گوارا کرتا ہے کہ اس کا بیٹا یا شاگرد اس پر فتح یاب ہوجائے۔

چونکہ یہ قصہ قرآن شریف سے ماخوذ ہے اس سے تبلیغ مذہب
کا کام بھی لیا گیا ہے اور صغیر ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس کتاب
میں تبلیغ کا ذریعہ بنایا ہے۔

گوڑ کے سلطان یوسف شاہ ۸۱-۱۴۷۴ء کے درباری شاعر
زین الدین نے جنگ نامہ حضرت علی یا قصہ بیرالالم کے انداز میں رسول
وجے لکھی ہے۔ جس طرح قندورکو دو ماہ کے راستہ پر بتایا ہے یہاں
جنکیم کو چھ ماہ کے سفر کے فاصلہ پر لکھا ہے۔ مقاتل قندوری کا کردار
بہرام ادا کرتا ہے اور ویسی ہی خونریز لڑائی ہوتی ہے مگر بنگلہ نظم

نہ تمام ہے یا تو شاعر خود مکمل نہ کر سکا یا آخر کا حصہ دست برد زمانہ سے محفوظ نہیں رہا۔

پندرھویں صدی میں بنگال کے تیسرے مشہور شاعر زین ہل تھے وہ پیر بدرالدین بدر عالم متوفی ۱۳۴۰ء کے مرید تھے وہ چاٹگام کے رہنے والے صوفی شاعر تھے انہوں نے اپنے پیر کے حسب ہدایت شاعت نامہ ایک کتاب تصوف میں لکھی مصنف کا دعوی یہ ہے کہ یہ کتاب عربی کا ترجمہ ہے مگر انداز بیان سے طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے ہو سکتا ہے کہ آزاد ترجمہ کیا گیا ہو۔ کتاب میں بعض ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جن کا بہ ظاہر تصوف سے کوئی تعلق نہیں مثلاً بارش کے متعلق توہمات وغیرہ۔

مصنف کی دوسری کتاب نیتی شاستر درت ہے اس کے موضوعات تعبیر خواب۔ گرہن اور فلسفہ وغیرہ ہیں۔

اس عہد کے اہل قلم میں سبرید خاں اہم ہے وہ چاٹگام کے ایک ذی اثر پٹھان خاندان کا فرد ہے ملک کے منصب پر فائز تھا ان کی کئی تصنیفات خراب وخستہ حالت میں دستیاب ہوئی ہیں مثلاً رسول وجے ودیا سندر رحنیفہ و کاراپری۔

ودیا سندر کا قصہ پرانا ہے۔ ہر حصہ کے شروع میں سنسکرت کا ایک اشلوک اس انداز سے لکھا ہے کہ اس میں قصہ مابعد کا پورا خلاصہ آجاتا ہے۔ یہ قصہ ڈرامہ کے انداز میں لکھا ہے ڈرا سٹیج پر دکھانے

کے لئے اس میں ہدایات بھی درج ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ ایک تمثیلی قصہ ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دبجے نگر کے راجہ گن سرا اور رانی کلاوتی کا اکلوتا بیٹا سندر جب علم و فضل میں کامل ہو گیا تو اس کو ودیاپتی کا خطاب ملا ہیروئن وودیا وکرما کیشری کی بیٹی شیلا دیوی کے بطن سے تھی یہ اوجان کے شہر کانچی پور میں رہتی تھی علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھی اور اس کو ودیاوتی کا خطاب تھا اس نے مادھو کے ذریعہ یہ اعلان کر دیا کہ میں صرف اس شخص سے شادی کروں گی جو مجھ سے بڑا عالم ہوگا۔ ودیاپتی ودیاوتی کی ملاقات کے لئے روانہ ہوا۔ اس ڈرامہ کا آخری حصہ ناتمام ہے شاید انقلاب زمانہ کی نذر ہو گیا۔ بہر حال ودیاپتی پاکیزگی جسم اور ودیاوتی پاکیزگی روح کی تمثیلیں ہیں۔ یعنی پاکیزہ قالب میں پاکیزہ قلب رہتا ہے۔

سبرس نثر کی رسول دبجے زین الدین کی رسول دبجے سے شاعرانہ اعتبار سے بہتر ہے۔

حنیفہ اور کاترا پری کا قصہ یہ ہے کہ حنیفہ کی لڑائی راجہ سہی رام کی بیٹی جیگن عرف پاک دامن سے ہوئی اس میں جیگن کو شکست ہوئی اس پر دونوں میں شادی ہو گئی اس لڑائی کے دوران میں شاہ پری کی بیٹی کاترا پری حنیفہ پر عاشق ہو گئی اب حنیفہ فتوحات کے لئے نکلا اور اس نے بہت سے بادشاہوں کو شکست دے کر حلقہ بگوش اسلام کیا حنیفہ کا ایک رفیق مقبل طوائی تھا جو آٹھوں پہر اس کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک

لڑائی کے دوران میں جب حنیفہ زخموں سے چور ہوکر بے ہوش ہوگی تو کاترا
پری اس کو اٹھاکر اپنے شہر روکم لے گئی اور اس کے ساتھ جگین اور
مقابل حلوائی تھے مگر ان کو اس چوری کا حال معلوم نہ ہوسکا جب ان
کو خبر ہوئی تو نہایت غمناک ہوئے۔ اسی اثنا میں حضرت علیؓ کو اس کی
اطلاع ملی، آنحضرت کے روضہ مبارک پر حاضر ہوئے وہاں بشارت ملی
کہ حنیفہ کو کاترا پری لے گئی ہے اس کے مقابلہ میں جگین کو کامیابی ہوگی۔
اور ایسا ہی ہوا یعنی بادشاہ روکم سے جنگ ہوئی اور وہ شکست
کھانے کے بعد مسلمان ہوگیا۔

دونا غازی نے عزاول سے پہلے سیف الملک بدیع الجمال کا
قصہ نظم کیا اسی طرح دولت وزیر بہرام خاں نے نظامی گنجوی کی مشہور
مثنوی لیلیٰ مجنوں کو بنگلہ کے قالب میں پیش کیا۔

اس عہد کی اہم تصنیف محمد کبیر کی مدھو مالتی ہے۔ اس قصہ کا
خلاصہ یہ ہے کہ کانگڑا کا بادشاہ سورج بھان اولاد نہ ہونے کی وجہ
سے افسردہ رہتا تھا آخر بڑی دعائیں اور خیرات کرنے کے بعد اس کی
رانی کملا کے بطن سے منوہر پیدا ہوا حسب معمول نجومیوں سے اس کا
زائچہ بنوایا گیا انہوں نے یہ پیش گوئی کی کہ شہزادہ نہایت اقبال مند
ہوگا۔ البتہ بیندرہ سال کی عمر میں وہ ایک پیکر جمال کی طلب میں کچھ دنوں
کے لئے تاج و تخت چھوڑ کر چلا جائے گا۔ ہیروئن مدھو مالتی مہاراس
کے فرماں روا ابھی رام کی اکلوتی بیٹی تھی جو رانی روپیں منجری کے

بطن سے پیدا ہوئی تھی یہ نہایت حسین و جمیل تھی اس کے متعلق بھی نجومیوں
نے با اقبال ہونے کی پیش گوئی کی تھی جب منوہر کی عمر پندرہ سال کی ہوئی تو
بادشاہ سورج بھان نے تاج و تخت اس کے سپرد کیا اور خود یادِ الٰہی میں
زندگی گذارنے کا ارادہ کیا۔ تخت نشینی کا جشن نہایت شان و شکوہ سے
منایا گیا جشن سے فارغ ہو کر منوہر اپنے باغ میں جا کر سو گیا اتفاق سے کچھ
پریاں اپنے تخت رواں پر گزریں جو مدھومالتی کے محل سے آ رہی تھیں
انہوں نے اپنے دل میں یہ خیال کیا کہ مدھومالتی کے لائق یہی شہزادہ
ہے بعد اس کا پلنگ لے جا کر مدھومالتی کے پلنگ کے پاس بچھا
دیا جب دونوں کی آنکھ کھلی تو دونوں حیران رہ گئے مگر جب ایک
دوسرے کا حال معلوم ہوا تو ایک دوسرے کی محبت ان کے دلوں
میں جاگزیں ہو گئی اس لئے انہوں نے انگوٹھیاں اور بستر بدل لئے
صبح ہونے سے پہلے پریوں نے منوہر کو اس کے باغ میں پہنچا دیا جب
منوہر کی آنکھ کھلی تو وہ رات کے واقعہ کو خواب سمجھا مگر انگوٹھی
اور بستر کو دیکھ کر واقعہ ہونے پر یقین آیا۔ اور ایک لشکر کے ساتھ مدھومالتی
کی تلاش میں نکلا ایک دریا کے کنارے پہنچا اور ایک کشتی میں سوار ہو کر
چلا راستہ میں طوفان آ گیا کشتی ڈوب گئی اور اس کے ساتھی بھی غرقاب
ہو گئے البتہ منوہر ایک شہتیر سے چمٹ کر بچ گیا کنارہ پہنچ کر ایک
پگڈنڈی پر چلا وہاں جنگل میں ایک ٹانگی میں اس نے ایک دوشیزہ
پایما کو ایک دیو کی قید میں گرفتار دیکھا وہ چے بہار کے بادشاہ

چندرسین کی لڑکی تھی اور مدھومالتی کی سہیلی تھی منوہر نے دیو کو ہلاک کرکے پاتما کو آزاد کیا اور اس کے باپ کے پاس لے گیا وہاں مدھو مالتی سے ملاقات ہوئی۔ ماں نے اس امر کے پیش نظر کہ مدھومالتی کی وجہ سے خاندان کی عزت کو بٹہ نہ لگے مدھومالتی کو شک چڑیا کے قالب میں تبدیل کردیا یہ چڑیا اڑتی ہوئی مانک یارش پہنچی وہاں کے فرماں روا تاراچند نے پکڑ لیا اور پہچان کر جے بہار پہنچا دیا۔ اور چندرسین سے سفارش کرکے اس کی شادی منوہر سے کرادی۔

عہد اکبری کا سب سے پہلا شاعر سید سلطان متوفی ۱۶۴۸ئ ہے۔ اس نے متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں ان کی سب سے اہم تصنیف رزمیہ نبی بنگشا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ شاعر نے حضرت رسالت پناہ کو اوتار لکھا ہے مگر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ویدوں میں آپ کی بعثت کی خبر دی گئی ہے۔ انبیا علیہم السلام کے حالات بھی قلم بند کیے ہیں اس کتاب کا منشا توحید کی اشاعت ہے۔ حضرت آدم جب حضرت حوا سے جدا ہوئے تو اس فرقت کے شدائد کو باراماشی کے طرز پر لکھا۔

آپ کی دوسری اہم کتاب شب معراج ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا واقعہ نظم کیا ہے رسول وجے میں مغازی نظم کیے گئے ہیں۔ وفات رسول اس سلسلہ کی آخری نظم ہے جس میں سرور کائنات کی وفات حسرت آیات کا ذکر نظم کیا ہے۔ زین الدین کی رسول وجے کا مضمون جیکم راجہ لڑوئی نامی

کتاب میں قلم بند کیا ہے ابلیس نامہ میں شیطان کی سرکشی کا ذکر کیا ہے گویا سعدیؒ کے اس شعر کی وضاحت کی ہے ؎

تکبر عزازیل را خوار کرد — بہ زندان لعنت گرفتار کرد

مصنف مذکور کی آخری کتاب جنن پرادیپ یعنی چراغ حیات ہے اس کتاب میں اسلامی تصوف اور ہندو جوگ کے جملہ مسائل کی وضاحت کی ہے مثلاً عالم لاہوت جبروت ملکوت ناسوت کی تشریح ذکر فکر کا بیان اور اسی قسم کے مضامین ہیں سید سلطان نے مسائل تصوف لکھتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ کتابوں سے تصوف نہیں آتا بقول مولنا روم

بے قلاوز اندریں صحرا مرو

خلاصہ یہ ہے کہ سید سلطان نے اسلامیات کا ایک اچھا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

سترھویں صدی کے شعرا میں محمد خاں متوفی سنہ ۱۶۵۰ء کو خاص درجہ حاصل ہے ان کا وطن چاٹگام کا مشہور قصبہ ہت ہزاری ہے ان کا تعلق وہاں کے شاہی خاندان سے تھا۔ یہ سلطان محمد کے شاگرد تھے موصوف کی سات کتابیں اب تک دستیاب ہوئی ہیں ان میں سب سے اہم مقتول حسین ہے اس میں گیارہ باب ہیں پہلے باب میں حضرت فاطمہ کا ذکر ہے دوسرے باب میں اصحاب کہف کا ذکر ہے بعض لوگ اس کو مستقل تصنیف اصحاب نامہ سمجھتے ہیں تیسرے باب میں حضرت حسن کا ذکر ہے چوتھے باب میں حضرت مسلم کا واقعہ ہے پانچویں باب میں معرکہ کربلا

کی سرگذشت ہے چھٹے باب میں حضرت حسین کی شہادت کا ذکر ہے ساتویں باب میں حضرت زینب وغیرہ کے مصائب کا بیان ہے آٹھویں باب کا عنوان قاصد ہے نویں باب میں ولید اور دسویں میں یزید کی روداد ہے گیارھویں باب میں خاتمہ ہے یہ کتاب مہابھارت کا جواب معلوم ہوتی ہے مہابھارت میں اٹھارہ باب ہیں کیونکہ چھے اور ساتویں بابوں کا عنوان مہابھارت سے ملتا جلتا ہے اس کتاب کا گیارھواں باب بھی قیامت نامہ کے نام سے ایک مستقل تصنیف سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح سات کے بجائے صرف پانچ کتابیں سمجھنی چاہئیں۔

دوسری اہم کتاب ستیہ کامی دو اد سنگباد ہے۔ یہ ایک تمثیلی افسانہ ہے جس میں حق و باطل کی آویزش اور آخر میں حق کی فتح دکھائی گئی ہے۔ اس قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ راجہ جیتی واسا کی دو شہزادیاں پر کالی اور ستیا عاشق ہیں مگر نزاد کی عیاریوں کی بدولت اس کی شادی کالی سے ہو جاتی ہے اور نزاد کے اکسانے سے آدمی ستیا کے خلاف لڑنے جاتا ہے اس کا دیوتا سترا کانت صلح کی کوشش کرتا ہے مندر کا پجاری بھی دونوں میں صلح کرانا چاہتا ہے مگر نزاد کے مقابلہ میں کسی کی پیش نہیں جاتی اور جنگ شروع ہو جاتی ہے کالی کے فریبوں کے مقابلے میں ستیا کو شکست ہوتی ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اس کے گھر بھیج دیا جاتا ہے مصنف نے جنگ کے مناظر نہایت تفصیل سے دیئے ہیں۔ اس

کی بے ہوشی کی وجہ سے ستیاوتی کا رنج والم کا دلدوز منظر ہے۔ بعد ازاں سبودھی گرو دھننا نتری کو طلب کرتا ہے جو جوب علم اس کو کھلا دیتا ہے ستیا ہوش میں آجاتا ہے اور ستیاوتی جوگن بن جاتی ہے۔ پھر کالی سے جنگ ہوتی ہے اس مرتبہ ستیاوتی کو کامیابی ہوتی ہے اور کالی کو غش آجاتا ہے اس کی بیوی دو شیلا اس کو مردہ سمجھ کر ماتم شروع کر دیتی ہے اس پر دھننانتری اس کو بھی ہوش میں لاتا ہے۔ پھر لڑائی ختم ہو جاتی ہے مگر جانبین میں دورے عہد ثریا میں فسادات ہوتے رہے عہد دسیار میں آکر یہ فسادات بھی ختم ہوئے۔ اور آخر میں کالی نہایت ذلت و رسوائی کے ساتھ اپنے گھر واپس آگیا۔ یعنی حق کی باطل پر فتح ہو گئی۔

سبریہ خاں نے جو حنیفہ اور کا ترا پری کا قصہ لکھا ہے محمد خاں نے بھی اس کو حنیفہ لڑائی کے نام سے لکھا ہے۔ علاوہ ازیں مصنف کی دو کتابیں دجال نامہ اور قاسمیر لڑائی ہیں۔ قاسمیر لڑائی میں حضرت قاسم کی جنگ دکھائی گئی ہے۔ کتاب کا موضوع مقتول حسین سے تعلق رکھتا ہے مگر یہ مستقل تصنیف ہے۔

سید مرتضیٰ متوفی ۱۶۶۲ء کی یہ اہمیت ہے کہ ان کی کتاب جوگ قلندر کے دو مخطوطات عربی رسم الخط میں ہیں۔ سید صاحب موصوف کے والد سید حسن بریلی کے باشندہ تھے جو ترک وطن کرکے مرشد آباد آئے وہیں بالی گھاٹ میں سید مرتضیٰ کی ولادت ہوئی۔ ان کا تخلص آنند تھا

اور یہ سید سلطان کے نام سے مشہور رہیں یہ اپنے زمانہ کے مشہور پیر تھے
ابھی تک ان کا عرس رجب کی گیارہ تاریخ سے تیرہ تاریخ تک ان کے
مزار واقع سوتی میں ہوتا ہے۔ ان کے طریقے میں جوگ کو بھی داخل تھا۔
ان کی دو کتابیں جوگ قلندر اور پد اولی دستیاب ہوئی ہیں۔ جوگ قلندر
میں تصوف اور جوگ کو ملا کر لکھا ہے یہ کتاب تقریباً چار جزو کی ہے۔

شیخ مطلب ابن شیخ پیران بھی سید مرتضیٰ کے ہم عصر تھے ان کو
قبول عام حاصل تھا کیونکہ انہوں نے مذہبی تصانیف کیں ان میں
کفایت المصلین سب سے اہم ہے اس کتاب کے نسخے بھی عربی رسم الخط
میں ملتے ہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ اسلامی فقہ کی کتاب ہے
مصنف نے اپنی کتاب میں یہ معذرت کی ہے کہ کم علمی کے باعث لوگ
عربی کی کتابوں سے مستفید نہیں ہو سکتے اس لئے احکام شریعت بنگلہ میں
درج کئے گئے اگرچہ یہ امر بدعت ہے مگر جب لوگ اس سے استفادہ
کر کے مصنف کے حق میں دعائے خیر کریں گے تو خدا اس کو معاف کر دیگا

سید محمد شفیع یہ بھی سید مرتضیٰ کے معاصر تھے انہوں نے اول ما
خلق اللہ نوری کی وضاحت اپنی کتاب نور نامہ میں کی ہے اس کا دوسرا
نام نور قندیل بھی ہے۔ سید محمد شفیع حاجی محمد کے شاگرد تھے۔ مصنف
کی دوسری کتاب ساعت نامہ ہے جس میں عملیات پڑھنے والوں کے
لئے اوقات سعد و نحس کا ذکر کیا ہے۔ یک طرح یہ نجوم کی کتاب ہے۔

عبدالحکیم اس دور کے اہم شاعر ہیں جو کثیر التصانیف تھے۔ وہ

سندیپ کے قصبہ سدھارام کے رہنے والے تھے ان کے والد کا نام عبدالرزاق تھا اور تلمذ شہاب الدین محمد سے تھا اپنے عہد میں یہ نہایت مقبول تھے ان کے عہد میں مسلمانوں کا قدامت پسند طبقہ یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ علوم اسلامیہ کو ہندوؤں کی زبان میں لکھا جائے اس لئے جو لوگ بنگلہ میں مذہبی موضوعات پر کچھ لکھتے تھے ان کو برا سمجھا جاتا تھا اسی وجہ سے سید مرتضیٰ نے معذرت کی تھی مگر عبدالحکیم نے ان کو جلی کٹی سنائیں۔

عبدالحکیم کی ایک گراں قدر تصنیف یوسف زلیخا ہے۔ اس سے پہلے اس موضوع پر صغیر نے قلم اٹھایا تھا۔ مصنف کے عہد میں جامی کی کتاب کی شہرت ہو چکی تھی اس کتاب میں اس کا پرتو نظر آتا ہے دوسری کتاب لال متی سیف الملک ہے جس میں سیف الملک ابن سکندر کا عشق ایک بنگالی شہزادی لال متی سے دکھایا گیا ہے یہ طربیہ نظم ہے آخر میں لال متی کی شادی سیف الملک سے ہو جاتی ہے۔

مصنف کی تیسری اور اہم کتاب شہاب الدین نامہ ہے یہ مذہبی رسالہ ہے۔ مذہبیات کے موضوع پر اتنی اچھی کتابیں کم لکھی گئی ہیں۔ عبدالحکیم نے نور نامہ بھی لکھا تھا۔

اس عہد کا ایک شاعر نوازش خاں اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس نے گل بکاولی کا قصہ سب سے پہلی بار نظم کیا اور اسی قصہ کو اردو میں نظم کر کے نسیم نے لافانی شہرت حاصل کر لی۔ نوازش کا وطن سات کینا تھانہ کا گاؤں سکھ چاری تھا یہ گاؤں چاٹگام کے علاقہ میں تھا۔ ان کی سب

ہے اہم تصنیف کی بنا ذلی ہے جو دو دیا نا تھ رائے کی فرمائش پر قلم بند کی گئی۔ اس کا قصہ عام طور سے مشہور ہے۔ دوسری کتاب پٹھان سراہنگت میں سات کینیا کے پٹھان خاندان آدھو خاں کی تعریف کی گئی ہے۔ جردار سنگھ کیرتی میں ہزاری خاندان اور جردا سنگھ خاندان کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ مذہبی مضامین کا ایک مجموعہ بھی مصنف کی یادگار ہے۔

اراکان اگرچہ حدود بنگال سے باہر ہے اور وہاں ایک مدت تک آزاد و خود مختار حکومت رہی مگر آٹھویں نویں صدی مسیحی ہی میں مسلمان مبلغین وہاں پہنچے اور وہاں کے رہنے والوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا اور اقتدار اعلیٰ بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں آگیا اس علاقہ میں بھی متعدد بنگلہ کے شاعر پیدا ہوئے ان میں دولت قاضی سب سے پہلا اور سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کا مولد و منشا سلطان پور ہے جو روزن تھانہ کے حلقے میں تھا۔ اس نے کم سنی میں فضیلت علمی کی سند حاصل کی مگر اہل وطن نے قدر نہ کی اس لئے دل برداشتہ ہو کر اراکان گیا وہاں کے وزیر حرب اشرف خاں نے اس کی سرپرستی کی اس کی بہترین تخلیق ستی مینا۔ لور چندرانی ہے یہ نظم تین حصوں میں منقسم ہے پہلے حصہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ لور کی دو بیویاں ہیں ایک ستی مینا دوسری چندرانی۔ دونوں بیویوں میں کھٹ پٹ تھا ڈاہ کی وجہ سے سکون مفقود ہے اس زندگی کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ستی مینا اپنے شوہر سے جدا ہونے پر مجبور ہوئی۔ اب ستی مینا کو لور کی یاد ستانے لگی اور وہ برہ کی آگ میں جلنے لگی

اس موقع پر چھیتن نے ہمدردی کا اظہار کیا اور ستی مینا کو ورغلانے کی کوشش کی مگر ستی مینا کے قدم کو لغزش نہ ہوئی۔ آخرالامر ستی مینا اپنے شوہر کے پاس چلی آئی اور اپنی سوتن چندرانی کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگی

دربار ادا کان سے وابستہ دوسرا شاعر مردان ہے اس کا وطن کانجی تھا شاعرانہ اعتبار سے یہ اپنے ہم عصر دولت قاضی سے فروتر ہے اس کا شاہکار ناصرہ نامہ ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دو سوداگر عبدالحکیم اور عبدالنبی آپس میں گہرے دوست ہیں ان کی خواہش یہ ہے کہ اس الفت کو ... کرنے کے لئے اپنی اولاد کو رشتہ ازدواج میں منسلک کردیں۔ اس لئے عبدالکریم کی لڑکی ناصرہ کی نسبت عبدالنبی کے لڑکے عبدالصابر سے پختہ ہوگئی اتفاق سے عبدالکریم کو تجارت میں نقصان پہنچا عبدالنبی نے بھی آنکھیں پھیر لیں اور شادی کرنے سے انکار کردیا۔ عبدالکریم کو بہت ملال ہوا مگر اس موقع پر اس کی بیوی نے نہایت دانش مندی کا ثبوت دیا وہ عبدالکریم کی دلداری کرتی رہی اور اس کو یقین دلاتی رہی کہ تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ضرور پیش آئے گا اور خدا چاہے تو کبھی ہمارے دن بھی پھریں گے۔ قسمت کی بات کہ عبدالکریم کے اچھے دن آگئے اور اس کو تجارت میں پھر نفع ہونے لگا اور آخر میں ناصرہ عبدالصابر کے حبالہ عقد میں آگئی۔

اسی قسم کا ایک اور قصہ چندراوتی وزیر اعظم مگن ٹھاکر نے لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ملک بھدراوتی کے راجہ چندرسین کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام بیربھان رکھا گیا اور سراندیپ کے راجہ سورپال کی دختر

فرخندہ اختر کا نام چندراوتی رکھا گیا دونوں ایک دوسرے کا حال سن کر نادیدہ عاشق ہو گئے۔ بیربھان نے ایک ہزار کشتیوں کا بیڑہ تیار کیا اور سراندیپ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا وزیر زادہ سوت اس کا قلبی دوست اس کے ساتھ تھا راستہ میں طوفان آ گیا اور قسم قسم کی مصیبتوں کا سامنا کرنا بہر حال یہ بیڑہ ساحل سراندیپ پر لنگر انداز ہوا تو پتہ چلا کہ چندراوتی کسی دوسرے کی آغوش کی زینت بن چکی ہے یہ خبر سن کر بیربھان کے ہوش وحواس پرواز کر گئے مگر سوت اس کی ہمدردی کرتا رہا آخر سوت کو کامیابی ہوئی اور بیربھان سے چندراوتی کا بیاہ ہو گیا۔ اور اس طرح یہ نظم طربیہ ہو گئی۔

بنگلہ شاعروں کا گل سرسبد علاول تھا اس کی پیدائش جوبرا میں ہوئی یہ گاؤں تھانہ ہٹ ہزاری سے تعلق رکھتا تھا اس کے اسلاف گوڑ سے ترک وطن کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ علاول کا باپ فتح آباد کے حاکم مجلس خاں کا مصاحب تھا یہ اپنے باپ کے ساتھ ایک کشتی میں سفر کر رہا تھا کہ گورے قزاقوں نے حملہ کر دیا علاول کا باپ ان کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ علاول زخمی ہو کر اراکان پہنچا وہاں مگن ٹھاکر نے اس کی سرپرستی کی۔ مگن ٹھاکر کے بعد اور ذی جاہ امراء نے اس کی سرپرستی کی مگر وہ اس کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھتا تھا اسی وجہ سے وہ غیر مطمئن زندگی گزارتا تھا اور جا بجا اپنی تقدیر کا شکوہ کرتا نظر آتا ہے۔ علاول کی پانچ کتابیں محفوظ ہیں:۔

(۱) پدماوتی۔ یہ ملک محمد جائسی کی پدماوت کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

(۲) نظامی گنجوی کی مشہور مثنوی ہفت پیکر کا آزاد ترجمہ ہفت پیکر کے نام سے کیا ہے۔

(۳) یوسف گدا کی کتاب تحفہ کا ترجمہ فارسی سے بنگلہ میں کیا اصل کتاب ۷۹۵ھ مطابق ۱۳۹۲ء میں لکھی گئی تھی یہ نصح کی کتاب ہے۔

(۴) سیف الملک ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۵) سکندر نامہ آخری عمر کی تصنیف ہے جبکہ مصنف کا دور انحطاط تھا اور مالی مشکلات نے اس کے مصائب میں اضافہ کر دیا تھا۔

علاوہ ازیں دولت قاضی کی کتاب ستی مینا۔ لور چندرانی کا آخری حصہ بھی علاول نے مکمل کیا تھا۔

علاول کے عہد کے بعد عبدالکریم خندہ کار کو بہت شہرت ہوئی یہ اراکان کے پایہ تخت مردہانگ میں رہا اس کی سب سے اہم کتاب دلا مجلس ہے جو فارسی قصص الانبیا کا ترجمہ ہے۔ دوسری اہم کتاب ہزار مسائل ہے جس میں اسلامی فقہ کے مسئلے بیان کئے گئے ہیں یہ بھی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ مصنف نے نور نامہ اور تمیم انصاری کا قصہ بھی قلم بند کیا تھا۔

تری پورہ کے مسلمان مصنفین میں شیخ چاند متوفی ۱۶۲۵ء کو اس درجہ سے اہمیت حاصل ہے کہ ان کی تخلیقات میں بنگلہ نثر کے نمونے ملتے

ہیں۔ یہ شیخ محمد کے بیٹے اور شاہ دولہ کے مرید تھے۔ ان کا شاہکار رسول وجے ہے۔ جو قصص الانبیاء سے ماخوذ ہے۔ ان کی دوسری کتاب شاہ دولہ میں اپنے پیر کے ارشادات قلم بند کئے ہیں اس سے ملتی جلتی کتاب طالب نامہ ہے جس میں نثر بھی شامل ہے اور یہ اس عہد کی نثر کا نمونہ ہے جس طرح یہ دونوں کتابیں اسلامی تصوف سے تعلق رکھتی ہیں اسی طرح ہراگوڑی سنگباد میں جوگیوں کے آسنوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف کی ایک تصنیف قیامت نامہ ہے جس میں حشر و نشر کا بیان قلم بند کیا ہے۔

بنگال میں ایک بزرگ شیخ سعدی نام کے بھی تھے ان کی تصنیفات میں سے گدا ملکہ دستیاب ہوئی یہ ملکہ روم کی شہزادی تھی اور علم و فضل میں یکتائے روزگار تھی اس نے یہ اعلان کیا تھا کہ میں اس شخص سے شادی کروں گی جو میرے ایک ہزار سوالوں کا جواب دے گا سب لوگ اس امتحان میں ناکامیاب ہوئے صرف ایک فقیر کامیابی کے ساتھ جواب دے سکا۔ اور اس گدائے بے نوا کے ساتھ ملکہ کا عقد ہو گیا اس لئے یہ گدا ملکہ کا عنوان صادق آیا۔

اس مختصر جائزہ میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ بنگلا ادب میں جو تنوع ہے وہ نمایاں ہو جائے یعنی مذہبیات کی جتنی شاخیں ہیں مثلاً فقہ جو عام طور سے نصیحت نامہ کے نام سے پیش کی گئی ہے اس موضوع پر کفایت المصلین ہزار مسائل وغیرہ اہم ہیں۔ تاریخ اسلامی اس

ذیل میں کئی کتابیں رسول وجے کے نام سے لکھی گئیں اور نبی بنگشا وفات رسول وغیرہ اسی موضوع پر ہیں۔ ابتدائے آفرینش کے سلسلہ میں کئی مصنفوں نے نور نامے لکھے۔ تصوف کے موضوع پر متعدد اہل قلم نے خامہ فرسائی کی ان میں سے بعض صرف اسلامی تصوف کی وضاحت کرتے ہیں بعض اس کے ساتھ جوگ کو بھی ملا دیتے ہیں۔ رومانی قصوں میں بعض اچھے قصے تصنیف کئے گئے ہیں تاریخ کو بھی شعراء نے نظم میں پیش کیا ہے اور اس طرح رزمیہ ادبیات بھی موجود ہیں۔ اگرچہ انیس اور دبیر کے طرز کے مرثیہ گو بنگال میں نہیں ہوئے مگر پھر بھی مقتول حسین کو اہمیت حاصل ہے۔ تمثیلی نظموں میں سیتا کلی ودادسنگباد نہایت کامیاب ہے۔ جس طرح اردو فارسی میں غزلیں لکھی جاتی ہیں اسی طرح بنگلہ میں 'پد' لکھے جاتے ہیں بہت سے شعرا نے اس قسم کی منظومات کو پداولی کے نام سے جمع کیا۔ پد نویس شعرا کا ذکر اس مختصر جائزہ میں نہیں کیا گیا کیونکہ پد کا دائرہ نہایت وسیع ہے موسیقی اور نجوم وغیرہ پر بھی کچھ تصنیفات موجود ہیں۔[1]

ہند مہاچل اور ہمالیہ کے درمیان جو سرزمین ہے وہ تین حصوں میں منقسم ہے مشرقی حصہ یعنی بنگال کے ادبیات کا مختصر جائزہ پیش کرنے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ مسلم بنگلہ ساہتیہ از ڈاکٹر انعام الحق اردو انگریزی ترجمہ ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی

کے بعد وسطی حصہ کی زبان کے ارتقا میں مسلمانوں نے جو حصہ لیا ہے اس کا سلسلہ یوں ہے اس علاقہ میں کئی زبانیں بولی جاتی رہی ہیں مشرق کی طرف اردھا ماگدھی بولی جاتی تھی اس کی جگہ پوربی یا مشرقی ہندی وجود میں آئی جس کی سب سے اہم شاخ اودھی ہے اس کو بیسواری بھی کہتے ہیں اس کا وطن اجودھیا کی سرزمین ہے پوربی کی دوسری شاخیں بگھیلی اور چھتیس گڑھی ہیں۔ جمنا کے دوآبہ میں قنوجی کا رواج تھا متھرا کے علاقہ میں برج رواج پذیر تھی مغربی ہندی کی خاص شاخ بانگڑو ہے جو گنگا کے مغرب میں بولی جاتی ہے۔

ہندی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس کے آہنگ سے واقف ہونا ضروری ہے۔ ہندی کا آہنگ وہی ہے جو سنسکرت کا ہے۔ اس کے آہنگ کی بنیاد ماترا پر ہے۔ ماترا کی دو قسمیں ہیں ایک ہجائے کوتاہ یعنی ایک حرف متحرک جس کو لگھو کہتے ہیں دوسرا گرو یعنی ہجائے بلند یا سبب خفیف ماترا برت میں ایک ہجائے بلند دو ہجائے کوتاہ کے مساوی ہے۔ برن برت میں ہجائے کوتاہ اور ہجائے بلند مساوی ہیں چھندوں کی کوئی انتہا نہیں ہے اگر صرف چالیس ماترا یا چالیس برن کا حساب کیا جاتے تو دس کھرب ننانوے ارب سرسٹھ کروڑ بہتر لاکھ سات ہزار نو سو سترہ وزن برآمد ہوں گے ظاہر ہے کہ اتنے اوزان کے نام نہیں رکھے جاسکتے پھر بھی ہندی پینگل لکھنے والوں نے ہزاروں نام تجویز

کہتے ہیں۔ وہ اقسام ذیل میں منقسم ہیں۔

(۱) سم برت۔ وہ چھند جس کے ہر چرن کی ماترائیں یا برن مساوی ہوں مثلاً چوپائی۔

(۲) اردھ سم برت جس چھند کے طاق اور جفت چرنوں کی ماترائیں یا برن باہم برابر ہوں مثلاً دوہا۔

(۳) بشم برت جس چھند میں تین قسم کے چرن ہوں۔

(۴) جت جس کا چھند دو یا زیادہ چھندوں سے مرکب ہو۔ بعض مشہور چھندوں کے نام درج ذیل ہیں:۔

(۱) چوپائی میں سولہ ماترائیں ہوتی ہیں اگر آخری رکن فعولن کے وزن پر ہو تو اس کو پاداکلک کہتے ہیں یعنی مثنوی گلزار نسیم اور ترانۂ شوق کا ہر مصرعہ پاداکلک کے وزن پر ہے۔

(۲) دوہا سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ رواج پذیر صنف یہی ہے پورے دوہے میں اڑتالیس ماترائیں ہوتی ہیں تیرھویں ماترا پر بشرام یعنی وقفہ ہوتا ہے چوبیسویں پر پہلا مصرع ختم ہوتا ہے۔ سینتیسویں ماترا پر پھر وقفہ ہوتا ہے اور اڑتالیس پر دوہا تمام ہوتا ہے۔ یعنی ہر دوہے میں چار لگھ اور بائیس گرو کا ہونا ضروری ہے ہر گرو کے بجائے دو لگھ آتے ہیں تو نام بدل جاتا ہے۔ اس طرح دوہے کے متعدد نام ہیں۔ دونوں مصرعوں سے ایک ایک لگھ کم کر دیا جاتا ہے اس کو پنچا دوہا کہتے ہیں۔

(۳) سورٹھا اگر دوہے کی ترتیب بدل دی جائے یعنی گیارہویں پر وقفہ ہو تو سورٹھا کہلاتا ہے۔

(۴) چوبولا اس کے ہر چرن میں اٹھائیس ماترائیں ہوتی ہیں سولھویں پر وقفہ ہوتا ہے ایسے چار چرن کو چوبولا کہتے ہیں۔

جدید ہندی ادب کی تاریخ بھی مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا قدیم ترین نمونہ پرتھوی راج راسو میں ملتا ہے جس کا کچھ حصہ چاند بردائی کا لکھا ہوا ہے۔ جب اسلامی حکومت مستقل طور سے یہاں قائم ہو گئی اور اس کے ثقافتی اور مذہبی اثرات ظاہر ہوئے تو ہندوؤں میں بھکتی تحریک شروع ہوئی اس تحریک کے تین مختلف پہلو تھے ایک رام بھکتی کہلاتی تھی دوسری کرشن بھکتی تیسری التیوور بھکتی مگر سب میں امر مشترک یہ تھا کہ اسلامی توحید اور سادگی عمل کے ساتھ ہندو مذہب کو ہم آہنگ کیا جائے اس تحریک کا گل سرسبد گرو راما نندجی ہیں ان کی ولادت تیمور کے حملے کے وقت ہوئی اور بہلول لودی کے عہد میں ۱۴۷۶ء میں وفات ہوئی۔
گروجی کی تعلیم یہ تھی کہ ازلی و ابدی ذات کی پرستش رام کے نام سے کی جائے۔ اس کے بھگت تناسخ کے چکر سے نجات پا سکتے ہیں۔ راما نندجی کو پوری کامیابی ہوئی انہوں نے بنارس کو اپنے قیام کے لئے منتخب کیا۔ گروجی کا خیال تھا کہ جس کے من میں رام موجود ہو اس کو مندر میں جاکر بت پرستی کی ضرورت نہیں مگر کھل

کر بت پرستی کی مخالفت نہ کی۔ اگرچہ خود ہر ذات کے آدمی کو چیلا بنایا یہاں تک کہ رام داس چمار بھی ان کا چیلا تھا مگر ہندو معاشرہ کو ذات پات کے بندھنوں سے آزاد کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ گرو جی کو ادبیات میں کوئی درجہ حاصل نہیں ہے البتہ ان کے شاگردوں نے ہندی کی بہت خدمت کی۔ رام بھگتی تحریک کی روح رواں کبیر کی ذات ہے جس نے اپنے وجد آور نغموں سے ہندی ادب کو مالا مال کر دیا۔

باوجودیکہ کبیر کی شخصیت تاریخی ہے مگر اس کے حالات اس انداز میں لکھے گئے ہیں کہ ان پر یقین کرنا دشوار ہے یہ یقینی ہے کہ کبیر کی پرورش نیرو نامی بافندے کے گھر میں ہوئی بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ نیرو کے نور نظر تھے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک بیوہ برہمنی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے اس نے اپنی بدکاری کو چھپانے کے لئے راستہ میں پھینک دیا اتفاق سے نیرو بافندہ ادھر سے گذرا وہ لاولد تھا اس نے اس بچے کی پرورش شروع کر دی نیرو کی بیوی کا نام نعمہ تھا۔

کبیر کا سال وفات سنہ ۱۵۱۸ء ہے تاریخ ولادت میں اختلاف ہے بعض لوگ سنہ ۱۳۹۸ء[1] قرار دیتے ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ ان کی ولادت سنہ ۱۴۴۰ء میں ہوئی۔ اگرچہ کبیر کی پرورش مسلمان کے گھر میں ہوئی مگر ان کے اندر رنگ اسلامی پیدا نہ ہو سکی غالباً ان کے ہم صحبت

---

[1] سوامی شری یگلانند نے کبیر دوہاولی کے مقدمہ میں صفحہ ۵ میں یہ سن دیا ہے۔ مگر دوسرے تمام لوگوں نے [illegible] رام بابو سکسینہ بھی شامل ہیں دوسرا سن دیا ہے۔ تفصیل کیلئے کبیر صاحب جلد ہندوستانی اکیڈمی صفحہ ۲۰ اور بیان کبیر مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۵ ملاحظہ کیا جائے۔

ہندو زیادہ تھے اسی لیے وہ شروع سے ایشور بھگتی کے گیت بنایا کرتے
تھے اس زمانے میں گرو رامانند کی شہرت اپنے انتہائی عروج پر پہنچ چکی
تھی کبیر نے ان کے حلقہ ارادت میں شریک ہونا چاہا باوجودیکہ گرو جی
بہت آزاد خیال تھے اور چماروں تک کو اپنا چیلا بنا لیتے تھے مگر
کبیر کو اپنا چیلا بنانے پر آمادہ نہ ہوئے آخر کبیر کو ایک ترکیب
سوجھی یعنی کبیر کو یہ معلوم تھا کہ سوامی جی منہ اندھیرے گنگا اشنان
کرنے جاتے ہیں وہ ایک شب ان کے راستہ میں آکر پڑ گئے اور جب
سوامی جی وہاں سے گذرے اور ان کی کھڑاؤں ان کے جسم سے لگی
تو کبیر نے رونا شروع کر دیا سوامی جی نے سر پر ہاتھ پھیرا اور
تسلی دی اور کہا رام رام کہو اتنی سی بات پر کبیر نے خود کو سوامی
جی کا چیلہ مشہور کر دیا آخر میں سوامی رامانند نے کبیر کو اپنا چیلا
تسلیم کر لیا اور ان کی تربیت شروع کی۔ مگر کبیر ہر حیثیت میں
اپنے گرو سے فائق رہا۔ یہ درست ہے کہ کبیر نے اسلام کو خیرباد کہا
مگر پورے طور سے ہندو مذہب بھی اختیار نہیں کیا اور دونوں مذہبوں
کے ماننے والوں کو برا کہنا شروع کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو اور
مسلمان کبیر سے ناخوش ہو گئے اور دونوں گروہوں کے سربرآوردہ
لوگوں نے اس عہد کے بادشاہ سکندر لودی سے شکایت کی۔ سکندر
نے کبیر کو بنارس بدر کر دیا کبیر نے مگھر ضلع گورکھپور میں سکونت
اختیار کی شاید وہیں وفات ہوئی مگر بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ آخر

عمر میں کاشی آ گئے تھے اور وہیں انتقال ہوا مشہور ہے کہ ان کے مرنے
کے بعد ان کے پیروؤں میں یہ بحث چھڑی کہ لاش کے ساتھ کیا سلوک
کیا جائے۔ بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ نیرو کے بیٹے یا لے پالک ہیں اس
لیے مسلمانوں کی طرح دفن کیا جائے دوسرے لوگ یہ کہتے تھے کہ
گرو راما نند کے چیلے ہیں اس لیے کریا کرم کیا جائے اور لاش
کو جلایا جائے اس پر خود کبیر کا نسمہ نظر آیا اور اس نے کہا کہ بیوقوفو!
تم آپس میں لڑ رہے ہو چادر اٹھا کر تو دیکھو وہاں کیا ہے؟ چادر
اٹھائی تو دیکھا کہ لاش موجود نہیں ہے صرف چند پھول موجود ہیں
ان کو دونوں گروہوں نے تقسیم کر لیا آدھے پھول کبیر چورا کی سمادھی
میں رکھے گئے اور آدھے مگھر لے جائے گئے اور وہاں کبیر کی یادگار
میں روضہ بنایا گیا۔ کبیر کا ایک بیٹا بھی تھا جس کا نام کمال تھا وہ
نہایت ناخلف تھا اسی لئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ کبیر کا بیٹا
ہی نہ تھا۔ بعض لوگ صرف کپوت کہتے ہیں۔

کبیر نہایت پرگو شاعر تھا اس نے بے شمار نظمیں تصنیف کیں
مگر اپنی مخلوقات فکر کو کبھی قید کتابت میں نہ لایا نہ ان کی ترتیب
و تالیف کا کام انجام دیا اس کے شاگردوں نے اس کے بھجن دوہے
ساکھیاں اور شبد زبانی یاد کئے اور تقریباً نصف صدی کے
بعد اس سرمایہ کو قلم بند کیا اس لئے پورے وثوق سے نہیں کہا
جا سکتا کہ جو کلام کبیر کی طرف منسوب ہے اس میں سے کس قدر اس

کی قوت فکر کا نتیجہ ہے اور کس قدر الحاقی ہے اور کتنے کلام میں تحریف ہوئی ہے بہرحال سب سے پہلا مجموعہ بیجک کے نام سے ایک شاگرد بھگوان داس یا بھاگی داس نے ۱۵۷۰ء میں مرتب کیا اس میں صوری اور معنوی اعتبار سے ہر قسم کی نظمیں شامل ہیں۔ بیجک کا سب سے پہلا حصہ رامائنی کہلاتا ہے اس میں تینوں مذہب کی وضاحت کی گئی ہے اس کے بعد بھگت کے شبد میں جن کا موضوع بھی مذہبی ہے البتہ ان کا وزن رامائنی سے مختلف ہے اس کے بعد چونتیسا ہے جس میں ناگری حروف تہجی کی ترتیب سے مذہبی خیالات نظم کر رہے ہیں۔ بتیس بینتوں میں برہمنوں کے تقشف کا ذکر آیا ہے اس کے بعد بسنت ہنڈولا وغیرہ وزنوں میں مذہبی نغمے گائے ہیں سب سے آخر میں تقریباً چار سو ساکھیاں ہیں۔ اس مجموعہ کے علاوہ کبیر کے کلام کا ایک بہت بڑا حصہ آدی گرنتھ میں محفوظ ہے یہ گرنتھ اکبر کی وفات سے ایک سال پہلے ۱۶۰۴ء میں مدون ہوا تھا۔ ان دونوں مجموعوں کے علاوہ تقریباً پانچ ہزار ساکھیاں بھگت کی طرف اور منسوب ہیں بنارس میں کبیر سمادھی جو کبیر چورا کے نام سے مشہور ہے وہاں ایک خاص گرنتھ ہے جس میں بیس کتابیں ہیں ان میں سے صرف چند شائع ہوئی ہیں۔

بھگت کبیر کی زبان پرانی اودھی ہے عربی فارسی الفاظ خال خال استعمال کئے گئے ہیں اسلوب ناہموار اور کرخت ہے قواعد

کی خلاف ورزی عام ہے۔ الفاظ کا انتخاب بھی برمحل نہیں ہے اس لئے کلام ایک حد تک ناقابل فہم ہے علاوہ ازیں کلام میں ابہام سے کام لیا ہے اور تشبیہات غیر معمولی ہیں اس لئے اور بھی مشکل پیدا ہوتی ہے۔ مگر نقادان فن کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ بھگت کبیر کی قوت تخیل غیر معمولی طور سے بلند پرواز ہے اور اس میں شاعرانہ عظمت پائی جاتی ہے اسلوب میں جو خامیاں پائی جاتی ہیں وہ غیر اہم ہیں۔ بھگتی تحریک میں بھی کبیر کا درجہ بہت بلند ہے ان کے پیرو کبیر پنتھی کہلاتے ہیں اس نے ایشور بھگتی پر زور دیا اور اپنے زمانہ کے رسمی مذہب کی دھجیاں اڑا دیں اگرچہ وہ خود مسلمان نہیں رہا تھا مگر مسلمان کے گھر میں پرورش پانے کا اتنا اثر ضرور تھا کہ بت پرستی کا سخت مخالف تھا اور توحید پروردگار کا قائل تھا۔ اسی طرح مذہبی اعمال میں اسلامی عنصر غالب ہے جس طرح بھگت کبیر نے اپنے پیرووں کو بت پرستی سے روکا اسی طرح اس زمانہ کے ہندو مصلحین مذہب کو بھی یہی تلقین کی سکھ مت میں اس کا اثر نمایاں ہے وہ لوگ بھی بت پرستی نہیں کرتے البتہ عملی طور سے وہ ہندوؤں سے زیادہ قریب ہیں۔

بھگت کبیر کے ایسے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جو اردو داں طبقہ کی سمجھ میں آسانی سے آ سکے۔

کہتا ہوں کہے جات ہوں، کیا بجاؤں ڈھول + سواسا خالی جات ہیں تین لوک کا مول

ایک ایک سانس کی قیمت تینوں لوک یعنی سورگ لوک (بہشت بریں) مرتیو لوک (دنیا) پاتال لوک (تحت الثریٰ) کی برابر ہے اور جو سانس الشور بھکتی سے خالی ہے وہ ضائع جاتا ہے یہ بات میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں اب کیا ڈھول بجا کر کہوں۔

سوانس سوانس پہ رام کہو۔ برتھا جنم مت کھوئے
کو جانے اس سوانس کا۔ آون ہوئے نہ ہوئے

یعنی ہر ایک سانس میں رام کا نام لے، اور اپنی زندگی کو بیکار نہ کھو کیا معلوم پھر سانس آئے یا نہ آئے۔

پریم پیالہ جو پیئے۔ سیس دکھشنا دے
لوبھی سیس نہ دے سکے۔ نام پریم کا لے

جو شخص جام محبت منہ کو لگاتا ہے اس کو سر کی قربانی دینی پڑتی ہے لالچی آدمی جو سر کی قربانی نہیں دے سکتا وہ عبث محبت کا نام لیتا ہے۔

مایا چھایا ایک سی برلا جانے کوئے
بھگتاں کے پاچھے لگے سن مکھ بھاگے سوئے

دولت سایہ کی طرح سے ہے مگر ہر شخص اس راز کو نہیں جانتا جو اس سے بھاگتے ہیں ان کے پیچھے لگتی ہے اور جو روبرو آتے ہیں ان سے بھاگتی ہے۔

دکھ میں سمرن سب کریں سکھ میں کرے نہ کوئے
جو سکھ میں سمرن کرے تو دکھ کاہے کو ہوئے

یعنی مصیبت میں ہر شخص کو خدا یاد آتا ہے عیش و مسرت میں کوئی اس کو یاد نہیں کرتا اگر لوگ عیش میں بھی اس کو یاد رکھیں تو مصیبت کیوں آئے۔

مانگن مرن سمان ہے مت کوئی مانگے بھیکھ
مانگن سے مرنا بھلا یہ ست گورو کی سیکھ

بھیک مانگنا مرنے کی برابر ہے اس لئے کوئی بھیک نہ مانگے بلکہ بہتر یہ ہے کہ مرجائے یہ سبق ست گرو نے دیا ہے۔

چاہ مٹی چنتا گئی منوا بے پرواہ
جن کو کچھ نہ چاہیئے سوئی شاہنشاہ

اگر دل میں خواہش نہ ہو تو تردد نہ ہو اور دل بے پرواہ ہو جائے اصل میں شہنشاہ وہی ہے جس کو کوئی خواہش نہ ہو۔

پانی کا ببلا سے اس مانش کی ذات
دیکھت ہی چھپ جائیگے جیوں تارا پربھات

آدمی کی ہستی پانی کے بلبلہ کی طرح ہے اور جس طرح صبح کو تارے چھپ جاتے ہیں۔ اسی طرح دیکھتے ہی دیکھتے آدمی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔

کرنا تھا سو کیوں کیا اب کر کیوں پچھتائے

بویا پیڑ ببول کا　　　آم کہاں سے کھائے

جو کام نامناسب تھا وہ تو نے کیوں کیا اور وہ کام کر کے اب کیوں پچھتاتا ہے اے بیوقوف جب تو نے کیکر کا درخت لگایا تو اس سے آم کا پھل کس طرح کھائے گا۔

پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا　　　پنڈت بھیا نہ کوئے
ایک اکشر پیو کا پڑھے　　　سو پنڈت ہوئے

لوگ کتابیں پڑھ پڑھ کے مرے جاتے ہیں مگر ان میں سے کوئی عالم فاضل نہیں ہوتا مگر جو شخص اپنے پروردگار کا ایک حرف پڑھ لے وہی عالم فاضل ہو جائے۔

سانچ برابر تپ نہیں　　　جھوٹ برابر پاپ
جا کے بھیتر سانچ ہے　　　تا کے بھیتر آپ

سچائی کے برابر کوئی نیکی نہیں اور جھوٹ کے برابر کوئی گناہ نہیں پس جس کے اندر سچائی ہوگی اس کے دل میں پروردگار خود موجود ہوگا۔

جہاں کام تہاں نام نہیں جہاں نام نہیں کام
دونوں کبھی ناہیں ملیں روی رجنی اک ٹھام

انسان جہاں کام کرتا ہے وہاں اس کا نام نہیں ہوتا اور جہاں نام کی خواہش ہوتی ہے وہاں کام نہیں ہوتا جس طرح چاند اور سورج کبھی ایک جگہ نہیں ملتے۔

کبیر سنگت سادھو کی　　　جیوں گندھی کی باس
جو کچھ گندھی دے نہیں　　　تو بھی باس سو باس

اے کبیر سادھو کی صحبت عطر فروش کی خوشبو کی طرح ہے چاہے عطر فروش عطر نہ دے تو بھی خوشبو تو مل ہی جاتی ہے۔

نہائے دھوئے کیا ہوا　　　جو من میں میل سمائے
مین سدا جل میں رہے　　　دھوئے باس نہ جائے

اگر کسی شخص کے دل کے اندر میل موجود ہو تو وہ نہا لے دھونے سے دور نہیں ہوتا۔ مچھلی ہمیشہ پانی میں رہتی ہے مگر دھونے سے اس کی بدبو نہیں جاتی۔

اوگن کہوں شراب کا　　　گیان ونت سن ایہہ
مانس سے پشو کرے　　　دام گانٹھ سے دیہہ

اے دانش مند آدمی! سن میں شراب کا عیب بتاتا ہوں کہ دام گانٹھ سے دے کر آدمی جانور بن جاتا ہے۔

کبیر تین لوک نو کھنڈ میں　　　گرو تے بڑا نہ کوئے
کرتا کرے نہ کر سکے　　　گورو کرے سو ہوئے

اے کبیر سورگ مرتیو پاتال تینوں عالموں اور نو آسمانوں میں گرو سے بڑا کوئی نہیں یہاں تک کہ ایشور بھی وہ کام نہیں کر سکتا جو گرو کر سکتا ہے۔

ان بسمل ان جھٹکا کینا　　　دیا دوہوں سے بھاگ

کہت کبیر سنو بھائی سادھو — آگ دو پال گھر لاگی

یہ وزن چپیالا کہلاتا ہے اس میں ۳۰ ماترئیں ہوتی ہیں۔ سولھویں پر وقف ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کبیر سادھو کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ بسم اللہ کہہ کر ذبح کرنے والے اور جھٹکا کرنے والے دونوں سے رحم دور ہوگیا ہے۔ اور دونوں ہی گنہگار ہوتے ہیں۔

مورکھ کو سمجھاونے — گیان گانٹھ کا جائے
کوئلہ ہوئے نہ اوجرا — سو من صابن لائے

نادان کو سمجھانے سے اپنی عقل کی بات ضائع ہو جاتی ہے۔ کوئلہ صابن سے دھونے کے باوجود کوئلہ سفید نہیں ہو سکتا۔

چار وید کو بھید ہے — چار مکتی نر چار
پانچویں مکتی بے رنگ ہے — کیوں بھگتی آدھار

چاروں ویدوں میں نجات کے چار مختلف طریقے بتائے گئے ہیں مگر نجات کی پانچویں قسم ہے جس کا کوئی رنگ نہیں وہ صرف بھگتی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔

کبیرا تیری جھونپڑی — گل کٹن کے پاس
کرن گے سو بھرن گے — تو کیوں بیٹھے اداس

اے کبیر! تیری جھونپڑی گلا کاٹنے والے مجرموں کے پڑوس میں ہے وہ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے تو کیوں اداس ہوتا ہے۔

کبیرا آپ ٹھگائیے ۔۔۔ اور نہ ٹھگیۓ کوۓ
آپ ٹھگے سکھ اپجے ۔۔۔ اور ٹھگے دکھ ہوۓ

اے کبیر! دوسروں کو فریب دینے سے بہتر ہے کہ آدمی خود دوسروں کے فریب میں آجائے کیونکہ دوسروں کو فریب دینے سے تکلیف ہوتی ہے اور خود فریب کھانے سے راحت ہوتی ہے۔

یہ تن وش کی بیلری ۔۔۔ گورو امرت کی کھان
سیس دے جو گورو ملیں ۔۔۔ تو بھی ستا جان

انسان کا جسم زہر کی بیل ہے گرد آب حیات کا سرچشمہ ہے اگر سر دے کر بھی گرد ملے تو ارزاں ہے۔

مستشرقین نے تصوف کا اشتقاق یونانی لفظ سوفی بمعنی دانش سے کیا ہے۔ مگر انہوں نے اس حقیقت کو بھلا دیا کہ تصوف میں تکلف پایا جاتا ہے یعنی حقیقی صوفی نہیں ہیں صرف صوفی بنتے ہیں۔ اس لئے درست وہی معلوم ہوتا ہے جو عرب کے اہل لغت نے لکھا ہے کہ عہد جاہلیت میں خدام کعبہ کی ایک جماعت صوفہ کے نام سے ملقب تھی اور ان کو کچھ رعائتیں بھی حاصل تھیں عہد اسلامی میں کعبہ دل کے خدام نے وہی لفظ اپنے لئے اختیار کیا اور چونکہ وہ حقیقت میں صوفہ نہیں تھے اس لئے صوفہ بن گئے۔

تصوف کے عملی پہلو کا نشان تو خیر القرون میں ملتا ہے۔ مگر نظری پہلو بعد کو پیدا ہوا۔ اور اسی میں عجمی اثرات نمایاں ہیں۔ بعیت تصوف

کا سلسلہ لوگ بیعت رضوان[1] سے ملاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد اصغر کے لئے بیعت لی تھی اسی
طرح جہاد اکبر کے لئے بیعت لی۔ ہند پاکستان میں جتنے طریقے رواج
پذیر ہیں وہ سب پانچویں چھٹی صدی ہجری کے اہل تصوف کی طرف
منسوب ہیں سلسلہ قادریہ کے بانی غوث اعظم محی الدین شیخ عبدالقادر
جیلانی پانچویں صدی میں تھے سلسلہ چشتیہ حضرت خواجہ اجمیری سے
شروع ہوا ان کا زمانہ چھٹی صدی ہے سلسلہ سہروردیہ کے بانی
شیخ شہاب الدین سہروردی چھٹی صدی میں تھے اور خواجہ بہاؤالدین
نقشبندی بھی اسی زمانے میں تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے
گیارھویں صدی کے اوائل میں سلسلہ مجددیہ شروع کیا جو در حقیقت
سلسلہ نقشبندیہ کی ایک شاخ ہے۔ بجز نقشبندیہ کے سب ذکر جہری[2]

---

[1] ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ حرم کعبہ کی زیارت
سے مشرف ہوئے ہیں۔ اس کے بعد آپ بغرض حج کعبہ روانہ ہوئے چودہ سو صحابہ آپ کے ساتھ تھے اپنے ارادہ سے
آگاہ کرنے کے لیے آپ نے حضرت عثمان کو مکہ معظمہ بھیجا وہاں کفار نے آپ کو روک لیا مگر آپ کو یہ اطلاع ملی
کہ وہ شہید کر دیئے گئے ہیں تو آپ نے صحابہ سے بیعت جہاد لی چونکہ اس بیعت کے بعد آیۂ رضوان
یعنی خوشنودی الٰہی نازل ہوئی اس لئے اس کو بیعت رضوان کہتے ہیں۔ کفار سے مقابلہ کرنے کو جہاد
اصغر اور نفس کشی کو جہاد اکبر کہتے ہیں۔ [2] قلب کی صفائی کے لئے یہ لوگ کلمہ ایک خاص طرح بلند آواز
سے پڑھتے ہیں اس کو ذکر جہری کہتے ہیں۔

کے قائل ہیں اور اختلافات سے قطع نظر چشتیہ سماع کے قائل ہیں اور قادریہ پرہیز کرتے ہیں۔ پاک و ہند کے صوفیوں نے جوگیوں سے بھی استفادہ کیا جیسا کہ بنگلہ ادب کے سلسلہ میں لکھا جا چکا ہے نظری تصوف کے مسائل فلسفہ کی طرح مجردات سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے ان کو عام فہم بنانے کے لئے تمثیلات کا سہارا لیا جاتا ہے۔ تمثیلات عام طور سے قصہ کہانی کی صورت میں ہوتی ہے اس لئے سننے اور پڑھنے والوں کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ کم فہم لوگ صرف حکایات میں کھو جاتے ہیں اور فہیم و فرزانہ لوگ اس کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں ملک محمد جائسی نے بھی مسائل تصوف کو ایک تمثیلی قصہ کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

ملک محمد جائسی کی جائے پیدائش صحیح طور سے معلوم نہیں البتہ وہ بچپن ہی میں جائس ضلع رائے بریلی میں آکر سکونت گزیں ہو گئے تھے اور اسی لئے جائسی مشہور ہو گئے خود کہا ہے ؎

جائس نگر دھرم استھانو
تہاں آئے کب کینھ بکھانو

یعنی قصبہ جائس جو ایک مقدس مقام ہے وہاں آکر میں نے شاعری شروع کی جائسی خاندان چشتیہ میں سید اشرف جہانگیرؒ کے مرید ہوئے اس نسبت کے متعلق یہ بہت ہے ؎

سید اشرف پیر پیارا   جیہہ موہنہ پنتھ دینہ اجیارا

یعنی سید اشرف میرا پیر ہے جس کے باعث دین اسلام منور ہو گیا ہے۔

جائسی نے اپنے پیر سید اشرف کے فرزند حاجی شیخ اور ان کے دو پوتوں شیخ محمد اور شیخ کمال کا بھی نام لیا ہے علاوہ ازیں اپنے مشائخ کا ایک شجرہ بھی دیا ہے یعنی محی الدین، شیخ برہان، الہ داد سید محمد دانیال، خواجہ خضر، سید راجے۔ پیدائش کی بیتیں یہ ہیں ؎

گرو ہدی کھیوک میں سیوا
چلے اتائیل جیہ کر کھیوا

یعنی محی الدین ناخدا ہیں اور میں مرید اور خادم ہوں اور ان کے کھینے سے کشتی ہلکی اور تیز چلتی ہے۔

اگوا بھیو شیخ برہانو پنتھ لائے جھنہ دیہ گیانو

ان کے پیشوا شیخ برہان تھے جنہوں نے راہ راست پر لگا کر خدا شناسی سکھائی۔

الہ داد بھل تیہ کر گرد دین دنی روسن سرخ رو

ان کے مرشد الہ داد تھے جو دین و دنیا میں روشن اور سرخ رو تھے۔

سید محمد کے وے چیلا سدھ پرکھ سنگم جیہ کھیلا

وہ (الہ داد) سید محمد کے مرید تھے جن کی تربت سے لوگ کامل بن جاتے تھے۔

دانیال گرمنیتھ لکھائے   حضرت خواج خضر تیہ پلے

ان کو پیر دانیال نے راہ راست پر لگایا اور ان کو مرشد خواجہ خضر ملے۔

سبے پرسن اوہ حضرت خواجے   لے مرے جہنہ سید راجے

حضرت خواجہ سے سید راجے خوش ہوتے اور انہیں اپنی شخصیت میں جذب کرلیا۔

اوہ سیوت میں پائی کرنی   اگھری جیبی پریم کب برنی

ان سب حضرات کی خدمت سے مجھے یہ موقع ملا کہ میری زبان کھل گئی اور نغمات محبت سنانے لگا۔

بچپن میں جائسی کے چیچک نکلی تھی اس میں ایک آنکھ جاتی رہی تھی اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے سے

ایک نین کب محمد گنی   سوی بھوہا جیہٰ کب سنی

ایک آنکھ والے فرزانہ شاعر محمد کا کلام جس نے سنا فریفتہ ہوگیا۔

ملک محمد جائسی کے چار دوست تھے جو آپس میں نہایت اخلاص برتتے تھے یہ چاروں دوست یوسف ملک۔ سالار خادم، سلونے میاں اور شیخ بڑے تھے۔ ان کے متعلق جائسی کا قول ہے سے

محمد یو چار میت مل بھئے جو ایکے چت

یہ جگ ساتھ جو نبھا اوہ جگ بچھڑن کت

یعنی اے محمد یہ چاروں دوست آپس میں مل کر ایک دل

ہو کر اس دنیا میں سنجا جائیں تو دوسری دنیا میں کہاں بچھڑیں گے۔
امیٹھی کا راجہ جائسی کا نہایت معتقد تھا کہا جاتا ہے کہ راجہ لاولد تھا ملک صاحب نے اس کے حق میں دعا کی اور خدا نے اس کو فرزند سے نوازا اسی وجہ سے جب کسی شکاری نے شیر کے دھوکہ میں جائسی کو ہلاک کر دیا تو راجہ نے اپنے کوٹ کے سامنے مزار بنوا دیا جو آج تک قصبہ امیٹھی میں مرجع خاص و عام ہے۔
ملک محمد جائسی نے چار کتابیں پدماوت اکھراوٹ مینا وت اور پوستی نامہ لکھیں۔ ان میں سے پدماوت سب سے زیادہ مشہور اور مقبول ہے۔ اس کتاب کا سال تصنیف ۹۴۷ھ مطابق ۱۵۴۱ء ہے جب کہ دہلی کے تخت پر شیر شاہ جلوہ افروز تھا۔ مطبوعہ پدماوت کی چوپائی جس میں سال دیا گیا ہے غلط ہے۔ وہ یہ ہے ؎

سن نو سے ستائیس اہا
کتھا ارمبھ بین کب کہا

اس سال کے غلط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ۹۲۷ھ میں دہلی کے تخت پر ابراہیم لودی تھا اور جائسی نے پدماوت میں شیر شاہ کی تعریف کی ہے جس کا عہد ۱۵۴۰ء میں شروع ہوتا ہے۔
فارسی مثنویوں کی طرح پدماوت کا آغاز حمد و نعت سے کیا گیا ہے اس کے بعد شیر شاہ والی دہلی کی تعریف و توصیف ہے بعد ازاں سلسلہ مشائخ و احباب کا ذکر ہے اس کے بعد قصہ کا

خلاصہ یوں درج کیا ہے ؎

سنگدیپ پدمنی رانی — رتن سین چتوڑ گڑھ آنی
الادین دہلی سلطانو — راگھو چیتن کینہہ بکھانو
سنا ساہ گڑھ چھینکا آئی — ہندو ترکن بھئی لڑائی
ادانت جس کا تھا اہے — لکھ بھاکھا چوپائی کہے

یعنی سراندیپ کی رانی پدمنی رہتی تھی اس کو راجہ رتن سین چتوڑ لایا اور سلطان علاء الدین فرماں روائے دہلی نے راگھو چیتن کی زبانی اس کا حال سنا اور چتوڑ پر حملہ کر دیا اور ہندو مسلمانوں میں لڑائی ہوئی اور یہ قصہ از ابتدا تا انتہا میں نے بھاکھا کی چوپائی میں نظم کیا ہے۔

اسلوب نظم یہ ہے کہ ہر سات چوپائی کے بعد ایک دوہا آتا ہے

پدماوت کے قصہ کا خلاصہ یہ ہے:

جزیرہ سنگلدیپ کے راجہ گندھرب سین کی شہزادی پدماوتی نہایت حسین تھی۔ شہزادی نے ایک طوطا پالا تھا جس کا نام ہیرامن رکھا تھا۔ جب شہزادی جوان ہوئی اس نے طوطے سے اپنے لئے شوہر تلاش کرنے کو کہا کسی نے راجہ کو اطلاع کر دی راجہ نے طوطے کے مار ڈالنے کا حکم دیا مگر پدماوتی نے طوطے کی جان بچا لی۔ ایک دن جب پدماوتی تالاب میں نہانے گئی تھی ایک بلی طوطے پر جھپٹی مگر طوطا اڑ گیا لیکن قسمت کی بات کہ ایک چڑی مار کے

جال میں پھنس گیا۔ اس چڑی مار سے چتور گڑھ کے ایک بنجارے نے خرید لیا جو بہ سلسلہ تجارت سنگلدیپ آیا تھا اور واپس آکر چتور گڑھ میں بیچنا چاہا تو اتفاق سے اس کو راجہ رتن سین نے خرید لیا۔ ایک دن راجا کی عدم موجودگی میں رانی ناگ متی نے سولہ سنگار کر کے طوطے سے اپنے حسن کی داد چاہی مگر طوطا جو پدماوتی کو دیکھ چکا تھا اس سے کیا متاثر ہوتا اس نے پدماوتی کے حسن و جمال کی تعریف کی اور کہا تو اس کے پیر کے برابر بھی نہیں۔ رانی کو بہت غصہ آیا اور طوطے کو ہلاک کرنا چاہا مگر ایک دایہ جو راجہ کی مزاج داں تھی اس نے اس کو چھپا لیا اور رانی سے کہہ دیا کہ طوطے کو ہلاک کر دیا گیا جب رتن سین کو طوطے کے مرنے کا حال معلوم ہوا تو وہ رانی کی جان لینے پر آمادہ ہو گیا مگر دایہ نے جیتا جاگتا طوطا پیش کر دیا اور انی کی جان بچالی۔ اب طوطے کی زبان سے پدماوتی کے فردوسی سن کی تعریف سن کر راجہ نادیدہ عاشق ہو گیا اور سولہ ہزار ؍ بھکاروں کے ساتھ جوگی بن کر سنگلدیپ گیا اور پدماوتی سے شادی کر کے چتور گڑھ واپس آیا اس اثنا میں سلطان علاؤالدین نے پدماوتی کی تعریف سنی اور اس کو حاصل کرنے کے لئے اس نے تور گڑھ پر حملہ کر دیا آخر الامر یہ قرار پایا کہ شہنشاہ آئینہ میں ماوتی کے جمال کا نظارہ کرے اس کے بعد سلطان نے رتن سین قید کر لیا اور اس کی رہائی کی یہ شرط قرار دی کہ پدماوتی خود کو

سپرد کردے۔ راجپوتوں نے یہ چال چلی کہ پدماوتی محل میں داخل ہونے کو تو آتی ہے مگر محل میں آنے سے پہلے راجہ سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ ان ڈولیوں میں راجپوت سپاہی سوار تھے انہوں نے راجہ کی بیڑیاں کاٹ دیں اور لڑتے بھڑتے اپنے قلعہ میں جا پہنچے۔ راجہ کی قید کے دوران میں دیوپال نے پدمنی کو اغوا کرنے کی کوشش کی مگر ناکامیاب رہا۔ جب راجہ قید سے چھوٹ کر آیا تو دیوپال سے لڑائی ہوئی۔ اس جنگ میں دیوپال نے زہر آلود تلوار سے رتن سین کو زخمی کر دیا مگر رتن سین نے مرتے مرتے دیوپال کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد راجہ کی لاش پر دونوں رانیاں پدمنی اور ناگ متی ستی ہو گئیں۔

اس داستان کا کچھ حصہ تاریخی ہے اور کچھ غیر تاریخی ہے مگر جیسا کہ خود جائسی نے صراحت کی ہے یہ صرف ایک تمثیلی قصہ ہے جس کی تشریح پدماوت کے آخر میں اس طرح کی گئی ہے ؎

تن چتور من راجا کینھا	ھیے سنگھل بدھ پدمن چینھا
گرو سوا جیئی پنتھ دکھاوا	بن گر جگت کو نرگن پاوا
ناگ متی یہ دنیا دھندھا	باچا سوی نہ یہ چت بندھا
راگھو دوت سوی شیطانو	مایا علاء الدین سلطانو

یعنی چتور جسم انسانی ہے اس کی روح راجا رتن سین ہے دل، سنگلدیپ ہے اور عقل رانی پدمنی ہے۔ طوطا مرشد ہے جس

نے رہنمائی کی اور بغیر مرشد کے کسی کو دنیا میں خدا نہیں ملتا۔ راجا ناگ متی سے مراد یہ دنیا ہے جس نے دنیا سے دل نہ لگایا اس کو نجات مل گئی اور راگھو گمراہ کرنے والا شیطان ہے اور سلطان علاؤ الدین سے مراد حرص و ہوا ہے۔

پدماوت کی زبان اودھی ہے۔ اس تصنیف سے معلوم ہوتا ہے کہ جائسی کو ہندو مذہب اور ہندو تلمیحات پر کس قدر عبور تھا کہیں اسلامی روایات کا سہارا نہیں لیا ہر جگہ ہندو دیو مالا کے حوالے ہیں۔ سامان جنگ و آلات حرب کی پوری تفصیل دی ہے اسی طرح موسیقی سے پوری واقفیت کا ثبوت دیا ہے اور منظر کشی میں تو کمال دکھایا ہے۔ مگر مجموعی طور سے اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں اسلامی تصوف کو تمثیلی پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔ اگر لڑائی وغیرہ کا ذکر نہ ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ رومی کی داستان کنیزک اور جامی کی سلامان و ابسال سے ملتی ہوئی تمثیل ہے۔

جائسی نے فطرت انسانی کا نہایت گہرا مطالعہ کیا تھا اس کی مثال کے لئے چند چوپائیاں درج کی جاتی ہیں جن میں نوجوان لڑکیوں کی آئندہ زندگی کی امید و بیم کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

اے رانی من دیکھ بچاری	یہ نیہر رہنا دن چاری
جب لگ رہے پتا کر راجو	کھیل لیہہ جو کھیلہ آجو
پن ساسر ہم گو نب کالی	کت ہم کت یہ سرو پانی

کت آدن پن اپنے باتھا ۔۔۔ کت مل کے کھیب ایک ساتھا
ساس نند بولیھ جیو لیہیں ۔۔۔ دارن سسرہ نسرے دیہیں

پیو پیار سر او بر پن سو کرے دھن پاہ
دھن سکھ راکھے کی دکھ دھن کس جنم بناہ

ملہ رہس سب چڑھنہ ہنڈوری ۔۔۔ جھول لیہہ سکھ باری بھوری
جھول لیہ نیہر جب تائیں ۔۔۔ پھر نہنہ جھولن دیہہ سائیں
پن سا سرئے راکھ ہتاں ۔۔۔ نیہر جاہ نہ پاؤب جہاں
کت یہ دھوپ کہاں یہ چھاہاں ۔۔۔ رہب سکھی بن مندر ماہاں
بن پوچھ اولا یہ دد کھو ۔۔۔ کون اتر پادب تہنہ موکھو
ساس نند کے بھونہہ سکورے ۔۔۔ رہب سنکوچ ددو کر جورے
کت یہ رہس جو آدب کرنا ۔۔۔ سرے انت جنم دکھ بھرنا

کت نیہر پن آدب کت سسرے یہ کھیل
آپ آپ کہنہ ہوہیہ پرب پنکھ جس ڈیل

پدماوتی اپنی سہیلیوں کے ساتھ جب تالاب پر نہانے گئی ہے تو اس وقت اس کی الھڑ سہیلیاں کہتی ہیں " اے رانی دل میں سوچ کہ میکہ میں صرف چار دن رہنا ہے اور جب تک باپ کا راج ہے تو جو کھیل کھیلنا ہے اسے آج ہی کھیل لو۔ اور کل سسرال جانا ہوگا تو ہم کہاں اور یہ تالاب کہاں ۔ پھر یہاں آنا اپنے بس میں نہ ہوگا۔ اور پھر ایک ساتھ مل کر کھیلنا بھی نصیب نہ ہوگا۔ ساس نندیں طعنے

دے دے کے جان لیں گی۔ اور سسر بغیر بہ دے کے نہ نکلنے دے گا ساس سب سے بڑھ کر پیارے شوہر کی فرماں روائی سر پہ ہو گی۔ نہ معلوم وہ کیا قیامت ڈھائے گا۔ آرام سے رکھے گا یا تکلیف سے اور کس طرح زندگی ہو گی۔ سب سہیلیاں مل کر ہنڈولے پر چڑھیں اور کہا کہ آج سکھ چین سے جھول لیں کیونکہ یہ جھولا صرف میکہ کی زندگی تک ہے پھر شوہر جھولنے نہ دے گا۔ اور سسرال میں رکھے گا جہاں میکہ کی خبر بھی نہیں ملے گی۔ یہ دھوپ چھاؤں بھی نصیب نہ ہو گی۔ اور محل میں بغیر سہیلیوں کے رہنا ہو گا۔ پہلے ہمارے ہنر معلوم کرے گا اور پھر الزام دے گا۔ اس وقت کیا جواب دیا جائے ساس نند کے تیور دیکھ کر دست بستہ عاجزی کرنا ہو گی۔ پھر یہ کھیل کا موقع نصیب نہ ہو گا اور سسرال میں یہ کھیل کب نصیب ہو گا۔ خودداری بس ایسی ہو گی جیسے کوئی پرندہ بہیلے کے قبضہ میں ہو۔

اس اقتباس سے اس زمانہ کی معاشرت کا بھی پتہ چلتا ہے بابا فرید ملتانی کے مشہور شاعر ہیں انہوں نے بے شمار کافیاں لکھی ہیں مگر دوہے اور پنچم دوہے بھی لکھے ہیں جو بطور ضرب المثل مشہور ہیں مثلاً ؎

روکھی سوکھی کھائے کے ٹھنڈا پانی پی
دیکھ پرائی چوپڑی نہ ترسائیں جی

یعنی اپنی محنت کی خشک روٹی کھا کر ٹھنڈا پانی پینا بڑی نعمت

سے دوسرے کی گھی لگی روٹی دیکھ کر لالچ نہ کرو اس طرح قناعت کا سبق دیا ہے۔

فریدا میں جانیا دکھ مجھ کو دکھ سبائے جگ
اپے چڑھ کے دیکھیا تاں گھر گھر ایہا اگ

یعنی میں سمجھا تھا کہ میں ہی مصیبت زدہ ہوں مگر جب دنیا پر نگاہ ڈالی تو ہر گھر میں یہی آگ لگی ہوئی تھی۔ اگ پنجابی تلفظ ہے۔

اکبر اعظم اپنی علمی سرپرستی کے لئے مشہور ہے اس نے سنسکرت اور ہندی کی متعدد کتابوں کے ترجمے فارسی میں کرائے ان میں سے چند یہ ہیں :۔ (۱) رزم نامہ ترجمہ مہابھارت۔ (۲) لیلاوتی فن ہندسہ (۳) رامائن (۴) سنگھاسن بتیسی (۵) اتھر بن وید (۶) تاریخ کرشن جی (۷) تاریخ کشمیر (۸) بھگوت گیتا (۹) جوگ وششٹ (۱۰) کرشن جوشی۔

کہا جاتا ہے کہ جب جہانگیر کی شادی راجہ بھگوانداس کی بیٹی سے ہورہی تھی اور برات کا جلوس دلہن کے گھر پہنچا تو راجہ نے کہا۔

ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری ہم باندھ کلام رہے

تو اکبر نے برجستہ جواب دیا

تمہاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی تم صاحب سردار رہے

اکبر کا یہ دوہا بھی خوب ہے سے

جا کو جس ہے جگت میں جگت سراہے جاہ

تاکو جیون سپھل ہے کہت اکبر ساد

یعنی جو آدمی اچھا ہوتا ہے دنیا اس کی تعریف کرتی ہے شاہ اکبر یہ کہتے ہیں کہ ایسے آدمی کی زندگی رائیگاں نہیں گئی۔ کہا جاتا ہے کہ ذیل کا کبت بھی اکبر نے موزوں کیا تھا ؎

شاہ اکبر بال کی باہنہ اچنت گہی چل بھیتر بھونے
سندر دوار ہی درشٹ لگائے کے بھاگوے کی بھرم پادت گونے
چونکت سی سب اور بلوکت شنک سکوچ رہی مکھ مونے
یوں چھب تیں چھبیلی کے چھاجت مانو بچھوڑ پرے مرگ چھونے

(اکبر کہتا ہے کہ) ایک دن اکبر بادشاہ نے محل میں جاکر اچانک ایک دوشیزہ کی باہنہ پکڑلی۔ اس وقت وہ پیکر جمال دروازہ پر نظریں جمائے بھاگنے کا راستہ ڈھونڈنے لگی۔ اور ہر طرف دیکھ دیکھ کر چونک پڑتی تھی گو شرم و حیا کے باعث اس کی زبان بند تھی مگر آنکھیں ایسی لگتی تھیں گویا ہرنی کے دو بچے اپنی ماں سے بچھڑ گئے ہیں اور سہمے ہوئے ہر طرف دیکھ رہے ہیں

امرائے اکبری میں خانخاناں عبدالرحیم کو جو مرتبہ حاصل ہے اس سے ہر شخص واقف ہے۔ عبدالرحیم اکبر کے اتالیق خانخاناں بیرم خاں کا بیٹا تھا اس کی ماں جمال خاں میواتی کی بیٹی تھی اس کی بڑی بہن خود اکبر سے بیاہی تھی اس طرح اکبر اس کا خالو تھا مگر ماثرالامراء کا بیان ہے کہ وہ ہمایوں کی حرم تھی اس رشتہ سے ہمایوں اس کا خالو

تھا۔ عبدالرحیم کی پیدائش ۱۵۵۳ء میں ہوئی۔ نو سال کی عمر میں یتیم ہوگیا اور اس کی پرورش اکبر کی نگرانی میں ہوئی۔ ترکی فارسی ہندی میں ماہر تھا۔ ۱۵۸۲ء میں شہزادہ سلیم کا اتالیق مقرر ہوا تزک بابری کو ترکی سے فارسی میں منتقل کیا۔ ۱۶۲۰ء میں زوال شروع ہوا پہلے بڑا لڑکا ایرج فوت ہوا اور دوسرے سال دوسرا لڑکا مرگیا۔ عبدالرحیم کی پوتی یعنی شاہ نواز کی بیٹی شاہ جہاں سے بیاہی تھی جب نورجہاں نے شہریار کو ولی عہد کرنے کی کوشش کی تو خان خاناں اور آصف جاہ نے نورجہاں کی مخالفت کی اور یہیں سے فساد شروع ہوا مگر خان خاناں جہانگیر سے بھی بگاڑ پسند نہیں کرتا تھا اس لئے اپنے قلم سے ایک خط جہانگیر کو لکھا وہ شاہجہاں کے ہاتھ آگیا اس وجہ سے شاہجہاں کے دل میں گرہ پڑگئی اور جہانگیر کا دل بھی صاف نہ ہوا آخر ۱۶۲۶ء میں راہگرائے ملک بقا ہوا۔ خان سپہ سالار کو، سے ۱۰۳۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ ہندی تصنیفات میں سات سو دوہوں کا مجموعہ "رحیم ست سئی" ہے اس کے علاوہ "بروے نائک بھید" رس پنچا دھیائی اور سنگار سورٹھا ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

کام نہ کاہو آوئی — مول نہ کوئی لیجئے
باز و ٹوٹے باز کو — صاحب چارہ دے

یعنی جب باز کے بازو شکستہ ہوجاتے ہیں تو وہ کسی کے کام

نہیں آسکتا اور نہ ایسے باز کو کوئی خریدتا ہے مگر خدا اس کو رزق دیتا ہے۔

کھیر خون کھانسی خوسی ‏ ‏ ‏ بیر پریت مدھوپان
رحمن دابے نا دبے ‏ ‏ ‏ جانت سبکل جہان

یعنی صدقہ دینا قتل کرنا کھانسنا کسی کو خوشی ہونا یا کسی کے دل میں کسی کی دشمنی یا محبت جاگزیں ہوجائے یا کوئی شراب پئے یہ افعال چھپتے نہیں ساری دنیا میں شہرت ہوجاتی ہے۔

مکتا کر کر پور کر ‏ ‏ ‏ چاتک تر شہر سوئے
اتو بڑد رحیم جل ‏ ‏ ‏ کنٹھل پرسے بس ہوئے

یعنی اے رحیم پانی کی شان عجیب ہے سمندر میں گرتا ہے تو موتی بن جاتا ہے۔ کیلے میں کافور بن جاتا ہے۔ چاتک یعنی پپیہے کی پیاس بجھ جاتی ہے۔ مگر سانپ کے منہ میں زہر بن جاتا ہے۔

فرزیں شاہ نہ ہو سکے ‏ ‏ ‏ گت ٹیڑھی تاثیر
رحمن سودھی چال تے ‏ ‏ ‏ پیادہ ہوت وزیر

یعنی اے رحیم سیدھی چال چلنے والا شطرنج کا معمولی مہرہ وزیر بن جاتا ہے مگر ٹیڑھی چال کا یہ اثر ہے کہ فرزیں کبھی شاہ نہیں بن سکتا۔

نوٹ:۔ مشہور ہے کہ پپیہا بارش کا پہلا قطرہ پیتا ہے۔

شطرنج کا قاعدہ ہے کہ پیادہ چلتے چلتے جب آخری خانہ میں پہنچتا ہے تو جس مہرہ کے گھر میں پہنچتا ہے تو بشرطیکہ وہ مہرہ پٹ چکا ہو تو اس پیادہ کے عوض وہ مہرہ رکھ لیا جاتا ہے تو اس طرح جب بادشاہ یا فرزیں کے خانہ میں پیدل پہنچتا ہے تو فرزیں بن جاتا ہے۔

بگڑی بات بنے نہیں   لاکھ کرو کن کوئے
رحمن بگڑے دودھ کو   متھے نہ ماکھن ہوئے

یعنی اے رحمن لاکھوں قسم کی کوشش کرنے سے بھی بگڑی بات نہیں بنتی جس طرح پھٹے ہوئے دودھ کو متھنے سے مکھن نہیں نکلتا۔

مانگے مکر نہ کو گیو   کیہہ نہ چھاڑیو ساتھ
مانگت آگے سکھ لہیو   تے رحیم رگھو ناتھ

یعنی اے رحیم دنیا میں کون شخص ہے جس سے سوال کیا جائے اور وہ انکار نہ کرے اور کون ہے جو ساتھ نہ چھوڑ دے مگر پروردگار عالم سے مانگو تو وہ خوش ہوتا ہے۔

رحیمن چپ ہو بیٹھئے   دیکھ دنن کے پھیر
جب نیکے دن آئیں گے   بنت نہ لگیہے دیر

یعنی جب برے دن ہوں تو اے رحیم خاموش بیٹھ جانا چاہئے اور جب اچھے دن آئیں گے تو کام بننے میں کچھ دیر نہ لگے گی

رحیمن دھاگا پریم کا   مت توڑو چٹکائے
ٹوٹے سے پن نا ملے   ملے گانٹھ پڑ جائے

یعنی اے رحیم رشتہ محبت کو نہ توڑو کیونکہ اول تو پھر جوڑنا ممکن نہیں اگر جوڑا بھی تو گرہ ضرور پڑ جائے گی۔ ع

گرہ جو پڑ گئی دل میں وہ مشکل سے نکلتی ہے

رحیمن ات مشکل بھیو گاڑھے دووٗ کام

سانچ کہے تو جگ نہیں جھوٹے ملے نہ رام

یعنی اے رحیم دونوں طرح ہماری مشکل ہے اگر سچ بولتے ہیں تو اس دنیا میں راحت نہیں اور اگر جھوٹ بولتے ہیں تو پروردگار ناراض ہوتا ہے۔

رحیمن دیکھ بڑوں کو لگھو نہ دیجے ڈار

جہاں کام آوے سوئی کیا کام کرے تروار

یعنی اے رحیم جب بڑی چیز مل جائے تو چھوٹی چیزوں کو نہ پھینکنا کیونکہ تلوار سوئی کا کام نہیں کرتی۔

رحیمن بول جس ہوت ہے   اپکاری کے رنگ

بانٹن والے کو لگے   جیوں مہندی کا رنگ

اے رحیم بروں کو بھی اچھوں سے فائدہ پہنچتا ہے جیسے بانٹنے والے کو مہندی کا رنگ لگ جاتا ہے۔

سید مبارک علی بلگرامی کی ولادت ۱۵۸۳ء میں ہوئی۔ علم و فضل کے اعتبار سے محدث تھے۔ کئی زبانوں کے ماہر تھے ہندی میں دو کتابیں الک تتک، اور تل شنک، یادگار ہیں۔ پہلی

کتاب میں زلف اور دوسری میں تل کی توصیف میں دوہے کہے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

کاھُ کی بانکی چتون چبھی | چت کاٹھ توں جھانکی ری بال گو چھن
دیکھی ہے نوکھی سی چوکھی سی | کواں ادچے پھریں ابھ جب جا چھن
ماریو گنبھیرہے موبارک ہے | سہجے کجرارے مرگا چھن
کاجرہ دے دی نہ اے دیدی سہاگن | آنگری تیری کٹے گی کٹا چھن

یعنی تو کل جب جھروکے سے جھانک رہی تھی تیری بانکی چتون کانہا (سری کرشن) کے دل میں چبھ گئی تھی اور جب سے وہ نگاہ شوخ انہوں نے دیکھی ہے مست اور دیوانہ وار پھر رہے ہیں تیری کالی غزالی آنکھوں نے بلاتکلف دل کو زخمی کر دیا اے سہاگن تو کاجل نہ لگا ورنہ چھری کی مانند تیز آنکھ سے تیری انگلی کٹ جائیگی

الک مبارک تے بدن | لٹک پری یوں صاف
خوش نویس منشی مدن لکھیو | لکھیو کانچ پر قاف

اے مبارک! اس کے چہرۂ تاباں پر زلف اس طرح خم کھا رہی ہے جس طرح کوئی اچھا خوش نویس منشی شیشہ پر قاف لکھ دے۔

نوٹ:- فارسی والے لام زلف کہتے ہیں۔

سب جگ پیرت تلن کو تھکیو چت یہ ہیر
تو کپول کو ایک تل سب جگ ڈاریو پیر

یعنی دنیا کے سب لوگ تیل نکالنے کے لئے تلوں کو کولھو میں پیلتے ہیں مگر میں حیران ہوں کہ تیرے رخسار کے ایک تل نے ساری دنیا کو پیس ڈالا ہے۔

عہد اکبر میں ایک دوسرے شاعر ناصر تھے جو آگرہ کے رہنے والے تھے ان کا ایک کبت یہ ہے:۔

کام کرنک کرودھ کبوتر گیان کے بان سوں مار گرائے
نیہ کا لون لگائے بھلی بدھ مت کی سیکھ میں آن بہلائے
اچھیا جارے کرے کوئلا پن پریم کے پاوک آن لپکائے
ایسے کباب بنائے کے ناصر بایشنو ہوت کباب کے کھائے

یعنی شہرت کے ہرن اور غصہ کے کبوتر کو عقل کے تیر سے شکار کرے اور عشق الہٰی کا نمک لگا کر اچھی چال سے صداقت کی سیخ پر چڑھائے اور خواہش دنیوی کو جلا کر کوئلہ بنائے پھر اخلاص قلب کے چولھے پر اس کو بھونے تو ایسے کباب بنا کر کھانے سے اے ناصر بایشنو بنتا ہے۔

بایشنو یا لشنوی کبھی گوشت نہیں کھاتے۔

سرزمین بلگرام سے ہندی کے متعدد شعرا اٹھے ان میں سید رحمت اللہ بھی تھے یہ شاہزادہ شجاع کے دامن دولت سے وابستہ تھے اسی کی مدح سرائی کی۔ ان کی وفات ۱۰۸۸ھ میں ہوئی تشبیہات کے بادشاہ ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

کرا چال جمہائی تے دھاری کچھ یہ بھلے
متو چپلا دو دی چمک ہوے گری بھوم پہ آئے

یعنی میرے محبوب نے جمائی لیتے وقت دونوں بازو اوپر اٹھا کر نیچے گرائے تو ایسا معلوم ہوا کہ دو کوندتی ہوئی بجلیاں زمین پر گر پڑیں۔

مگر یہ محل انگڑائی کا ہے اسی لئے تو عزیز نے کہا ہے ؎

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

نظام رامپوری کا شعر ہے ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دکن کی مہمات میں جب ایک طویل مدت صرف ہو گئی اور اس کی فوج ظفر موج کے سپاہیوں کو وطن آنے کی اجازت نہ ملی تو دلی کی عورتوں نے ایک درخواست بھیجی جس میں اپنے مافی الضمیر کو اس دوہے میں ظاہر کیا تھا ؎

دلی شہر سہاونا اور برسے کنچن نیر
سب کے کنت بچھڑ کے لے گیو عالمگیر

یعنی دلی بہت خوب صورت شہر ہے اس میں ہن برستا ہے مگر سب کے

سوامیوں کو عالمگیر جمع کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔
شہنشاہ نے اس کے جواب میں یہ دوہا خود تصنیف کر کے بھیجا ہے
بیٹھی رہو قرار سے من میں راکھو دھیر
صاحب سے بنتی کرو جو بہوریں عالمگیر
یعنی اپنے دل میں صبر کو جگہ دو اور اطمینان سے بیٹھی رہو
اور خدا سے یہ دعا کرو کہ عالمگیر واپس آجائیں۔
عہد عالمگیری میں سید نظام الدین بلگرامی نے نہایت شہرت حاصل کی موصوف کا تخلص مدھنایک تھا بنارس جاکر سنسکرت اور بھاشا سیکھی موسیقی میں اس درجہ کمال حاصل تھا کہ نایک کہلاتے تھے۔ آپ کی تصنیف سے دو کتابیں نار چندر کا اور مدھنایک سنگار یادگار ہیں ۱۶۹۵ء میں وفات ہوئی نمونہ کلام یہ ہے ؎
جو چیترا ان چیت چڑھے نہ بڑھے بدھ بیدن گرنتھ نہ گائے
بہار بھی بھوری کری بھریں چپ جو گن جوگ اٹھیہ گنائے
جو مکھ جوت جگی نہ تھکی مدھنایک گھونگھٹ چنچل تائے
جھنن دو کول چھپے جھلکی اچھے براجت رچھ رچھائے
یعنی باوجودیکہ تیری آنکھیں نقاب کے اندر ہیں مگر ان کی خوب صورتی چھپ نہیں سکتی اور ان کی خوش نمائی تو فرشتوں کے ذہن میں بھی نہیں آسکتی۔ اور نہ آسمانی کتابوں میں ان کی شاد صفت پائی جاتی ہے۔ ناطقہ حیران ہے اور جوگی جو تسبیح ہاتھ

میں لئے ہوئے وہ ان کی تعریف کر رہا ہے خلاصہ یہ ہے کہ ان کا جمال جو باریک دوپٹے کے اندر سے نظر آتا ہے وہ بیان نہیں ہو سکتا۔
ایک دوسری نظم میں کلف ماہ کی توجیہات پیش کی ہیں وہ یہ ہیں ؎

کوؤ کہے چند کے مرگنگ انک دیکھیت
کوؤ کہے چھایا چھپ بھوتل پرکاس کی
کوؤ کہے اندھکار پیو ہے سو پیکھیت
کوؤ کہے کالماں کلنک رین اس کی
مدھنا یک کہے سار ہر لیو کرتار
تاہی کی سنواری بھاماں کانھ کے بلاس کی
تاہی ون تے پرے چھید چھاتی چھپاکر کے
وارپار دیکھیت نیلتا آکاس کی

کوئی کہتا ہے کہ چاند کی گود میں جو خرگوش ہیں وہ نظر آتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ زمین کا عکس اس میں جا چھپا ہے کوئی کہتا ہے کہ چاند نے رات کا اندھیرا پی لیا ہے۔ وہی کلف بن کر نظر آتا ہے کوئی کہتا ہے اندر کے کہنے سے جو دھوکا دیا تھا وہ کلنک کا ٹیکہ بن کر نمودار ہوا ہے۔ مدھنا یک کہتا ہے کہ خدا نے چاند کا جوہر نکال کر کرشن کے محل کی عورتیں بنائیں پس جہاں جہاں سے وہ جوہر ضائع ہوا وہیں سوراخ پڑ گئے انہیں میں وارپار آسمان کا نیلا

رنگ نظر آتا ہے اس سے زیادہ کلف ماہ کی حقیقت نہیں۔
اس نظم میں راجہ اندر کی جو تلمیح ہے اس کا قصہ یہ ہے کہ راجہ اندر ایک شوہردار عورت اہلیا پر عاشق تھے جب کسی طرح کامیابی نہ ہوئی تو چاند سے مدد چاہی اس نے آدھی رات کو مرغ بن کر بانگ دی اہلیا کا شوہر صبح کے خیال سے جنگل کو چلا گیا اس کی عدم موجودگی میں راجہ اندر اہلیا کے پاس پہنچ گئے اس فریب دہی کے عوض چاند کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا یا گیا جو آج تک کلف کی شکل میں نمودار ہے
عہد عالمگیری کے ایک اور ممتاز شاعر سید عبدالجلیل بلگرامی تھے انہوں نے ایک فارسی قصیدہ میں یہ بیت موزوں کی ہے ؎

اسیس دے کے کہے ہندوی میں یوں سمبت
رہے جگت میں اچل باس یہ وزیر سدا[1]

انہیں کا ایک مشہور سورٹھا ہے ؎

کہوں کہاں لو بھید | پیارے تیرے چرن کے
جھانواں چھاتی چھید | چھن بچھرت جاکے پڑے

یعنی اے پیارے میں تیرے قدموں کے اوصاف کہاں تک بیان کروں ایک پل کے لئے جھانواں جدا ہوا اور غم سے سوراخ پڑ گئے۔
جس عہد کی تاریخ یہاں پر درج کی جارہی ہے اس عہد میں پنجابی میں جو کتابیں لکھی گئی ان کا موضوع زیادہ تر مذہبی تھا مثلاً

---

[1] ۱۱۲۲ھ برآمد ہوتا ہے۔

مولنا عبداللہ نے جو اپنے زمانے کے متجر عالم تھے عہد جہانگیر میں تصنیفات کا سلسلہ شروع کیا اور عہد شاہجہان تک برابر لکھتے رہے ان کی سب سے پہلی تصنیف تحفہ ۱۰۲۵ھ مطابق ۱۶۱۷ء اور آخری کتاب خیر العاشقین ۱۰۶۵ھ مطابق ۱۶۵۶ء ہے ان کے علاوہ انواع العلوم اور سراجی وغیرہ کتابیں قلم بند کیں۔

عہد عالمگیر میں عبدی نے فقہ ہندی اور عبدالکریم نے نجات المومنین لکھی ان کے علاوہ اور لوگوں نے بھی مذہبی کتابیں لکھیں۔

۱۰۹۰ء میں یوسف زلیخا کا قصہ حافظ برخوردار حافظ آبادی نے نظم کیا۔ اس کے علاوہ کوئی قابل ذکر تصنیف نہیں ہوئی۔

پانچواں باب

اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے مختلف نظریے

آغازِ اردو کے متعلق اب تک جتنے نظریات پیش کیے گئے ہیں ان میں سے بعض کو علمی حیثیت حاصل نہیں مثلاً میر امن نے باغ و بہار کے مقدمہ میں جو کچھ اردو کے بارے میں لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دلّی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے، انہیں کی حکومت یہاں قائم تھی اور وہ

لوگ اپنی زبان بولتے تھے ہزار برس سے مسلمانوں کی فرماں روائی کا دور آیا پہلے غزنویوں کی اور پھر شنسبانی حکومت ہوئی بعد ازاں پٹھانوں نے فرماں روائی اور آخر میں چغتائی خاندان بر سر اقتدار آیا میر امن کے زمانے تک ان کا اقتدار برائے نام باقی تھا۔ مغلوں کی آمد سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا اسی وجہ سے اس کا نام بازار اردو رکھا گیا۔ اکبر کے عہد میں مختلف زبانیں بولنے والے یکجا ہو کر رہے آپس میں حالات کرنے کے لئے انہوں نے زبان اردو سے کام لیا پھر شاہ جہاں کے زمانے میں دہلی کی رونق دوبالا ہوئی اور اس کا نام شاہ جہاں آباد مشہور ہوا اور وہاں کا بازار اردوئے معلیٰ کہلایا۔ بہر حال امیر تیمور کے وقت سے عالمگیر ثانی کے وقت تک زبان اردو منجھتے منجھتے ایسی منجھی کہ ہر شہر کی بولی اس کے مقابلہ میں ہیچ ہو گئی۔[1]

یہ حقیقت میں کوئی نظریہ نہیں ہے صرف ایک روایت ہے اردو بھی یہ ہے کہ دارالحکومت دہلی کی زبان اس برصغیر کے تمام شہروں سے بہتر ہے۔

علمی طور سے اس مسئلہ پر جن لوگوں نے روشنی ڈالی ہے۔ ان میں اولیت کا شرف شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کو ہے وہ اپنی مشہور کتاب آب حیات میں لکھتے ہیں کہ اردو زبان برج بھاشا

---

[1] باغ و بہار مطبوعہ انتظامی کانپور ۱۹۳۱ء ص ۵۔

سے نکلی ہے برج بھاشا اس علاقے میں تقریباً آٹھ
سو سال پہلے عام طور سے رواج پذیر تھی مگر اس سے
پہلے ضرور سنسکرت عام بول چال کا ذریعہ رہی ہوگی سنسکرت
اس سرزمین میں ضرور پروان چڑھی۔ مگر اس سے پہلے جو زبان
یہاں رواج پذیر تھی اس کی اصلی صورت بالکل محو ہو چکی ہے
اس کی نشانیاں جنوبی ہند کی زبانوں تامل تیلگو اور ملیالم میں مل
سکتی ہیں۔ یعنی پہلے دراویڈی زبان بولی جاتی تھی۔ اس زبان
میں عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اور اب اس کی قائم مقام
جو زبانیں ہیں ان میں سے تامل بالکل جنوب میں بولی جاتی
ہے۔ مدراس کے علاقے میں ملیالم ہے۔ حیدرآباد دکن
میں تیلگو ہے۔ اڑیسہ میں اوڑیا ہے۔ دراویڈی لوگ پہلے
پہل پورے ملک پر قابض تھے۔ آریاؤں کی آمد پر ان سے نبرد
آزما ہوئے مگر شکست کھاکر دور افتادہ مقامات پر چلے گئے۔
اور جو لوگ اپنے وطن کی محبت کی وجہ سے وہیں رہ گئے
یا راہ فرار نہ پا سکے وہ آریاؤں کے غلام ہوکر رہے۔
ان کو آریاؤں نے شودر اور چنڈال قرار دیا۔ آریا جو
زبان بولتے تھے وہ ویدک کہلاتی تھی۔ کچھ مدت کے
بعد اس میں تبدیلیاں ہوگئیں۔ اور اس کا نام سنسکرت
رکھا گیا۔ آریا لوگ اپنے زیردستوں سے مساوات

کا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ ان کو اس قدر حقیر سمجھتے
تھے کہ اگر وید پڑھتے ہوئے کوئی اشلوک کوئی شودر سن
لیتا تو اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا۔ مگر
کاروبار کی خاطر شودروں سے بات چیت کرنی پڑتی تھی۔
اس لئے انہوں نے پراکرت کو ترقی دی اور سنسکرت
کے قواعد وضوابط مدون کرکے ایک طرف تو اس کو تبدیلیوں
سے محفوظ رکھا۔ مگر دوسری طرف اس کی ترقی کو ختم کر دیا۔ مگر
باوجود اس کے سنسکرت میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ مثلاً
وید اور منوسمرتی کی زبان میں نمایاں فرق ہے۔ جو پراکرتیں
اس عہد میں پیدا ہوئیں ان میں ماگدھی شورسینی مہاراشٹری
گورجری راجستھانی اہم ہیں ان میں سے ہر زبان میں سنسکرت
کے الفاظ موجود ہیں۔

سنسکرت کے دو زبردست محافظ تھے ایک مذہبی گروہ
جو محدود تھا۔ اور اس زبان کو عام کرنا نہ چاہتا تھا تاکہ بگڑنے
سے محفوظ رہے دوسرے حکومت ان کی طرف داری کرتی تھی
اور اس طرح عوامی بولی نہ ہونے کے باعث اس میں تبدیلی
کا خطرہ نہ تھا

۵۴۳ ق م میں بدھ مذہب کی اشاعت شروع ہوئی
بدھ مذہب کے بانی شاکیہ منی سرزمین مگدھ میں پیدا

ہوئے تھے۔ اس لئے دہیں کی پراکرت میں وعظ کہتے تھے۔ اور جب سلطنت پر بدھ مذہب کا قبضہ ہوگیا تو راج دربار کی زبان پالی قرار پائی۔ اب بدھ مذہب کے پیروؤں نے یہ دعویٰ کیا کہ تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے۔ اس موقع پر آزاد نے وہ فقرہ لکھا ہے۔ جو ضرب المثل کی حقیقت رکھتا ہے۔ یعنی "دیکھو۔ جو لونڈی تھی وہ رانی بن بیٹھی۔ اور رانی منہ چھپا کر کونے میں بیٹھ گئی"۔

بدھ مذہب کا اقتدار تقریباً ڈیڑھ ہزار سال رہا۔ اس اثنا میں برہمن مبلغین نے اپنے مذہب کی اشاعت از سرِ نو کی۔ ان کے پیش رو شنکر آچارج تھے۔ برہمن مذہب کا دوبارہ عروج ہوا۔ اور مہاراجہ بکرماجیت کا عہد سنسکرت کا عہد زریں کہلاتا تھا۔ اس زمانے میں جو ڈرامے تصنیف کئے گئے ہیں ان میں یہ دکھایا گیا ہے کہ خواص سنسکرت بولتے ہیں اور عوام پراکرت۔ گویا اس کے بعد مسلمانوں کی آمد تک ہند دخواص کی زبان سنسکرت اور عوام کی بولی پراکرت رہی۔

اس برصغیر میں جو مسلمان وارد ہوئے۔ اور ان کا اثر و نفوذ اس ملک میں بڑا وہ فارسی بولنے والے تھے۔ اور فارسی بھی آریائی زبان تھی اس لئے آزاد نے فارسی کی سرگزشت بھی درج

کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جس طرح ہندوستان میں انقلابات
آئے اس طرح کے انقلابات ایران میں بھی آئے۔ مگر باوجود اس
کے ہزاروں الفاظ دونوں زبانوں میں یکساں ہیں۔ آزاد
کہتے ہیں کہ جس طرح اس برصغیر کے آریاؤں کو یہاں کے مقامی
باشندوں سے لڑنا پڑا اسی طرح ایران میں بھی لڑنا پڑا ہوگا۔
مگر اس زمانہ کی نشانیاں موجود نہیں۔ ایران کی سب سے
قدیم کتاب زرتشت کی اوستا ہے۔ اس مذہب کا رواج بھی
[illegible]ھ کے عہد کے قریب ہوا۔ مگر اس کے رواج کو تقریباً
دو سو سال ہوئے تھے کہ سکندر رومی نے والی ایران
دارا کو شکست دے کر ایران کا نظام ابتر کر دیا۔ چونکہ
یونانی فاتح تھے۔ اس لئے ان کی زبان کا بھی اثر پڑا ہوگا۔
مگر اس کو زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ کہ پارتھیا والوں نے
ایران پر قبضہ کر لیا۔ ان لوگوں نے اپنے عہد فرمانروائی
میں مجوسیت کے نشان مٹانے کی پوری کوشش کی۔ مگر جس
طرح بدھ مذہب یہاں کامیاب نہ ہوا اسی طرح پارتھیا والے
وہاں کامیاب نہ ہوئے آخر مجوسیوں کا دوبارہ تسلط ہوا اور
ساسانیوں نے سلطنت حاصل کر کے اس مذہب کو فروغ
دینا شروع کیا۔ مگر ساتویں صدی ہجری میں مسلمانوں نے
ایران پر قبضہ کیا تو کچھ ایرانی پناہ لینے کو اس برصغیر میں آئے۔

اگر ہندوؤں کی اور آتش پرستوں کی مذہبی کتابوں کا موازنہ کیا جائے تو صرف زبان ہی کی یکسانیت کا پتہ نہیں چلتا بلکہ ان کے بہت سے معتقدات کی یکسانی کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہندوؤں میں چار ذاتیں ہیں۔ اسی طرح ایرانیوں میں بھی چار ذاتیں ہیں۔ بہرحال مسلمان جو فارسی بولتے تھے وہ در اصل فارسی قدیم سے مختلف تھی۔ کیونکہ اس میں عربی فارسی الفاظ اور اسالیب رواج پا چکے تھے اس ملک میں ایک مدت تک ہندوؤں نے مسلمانوں کو ملکش میچھ کہا اور ان سے کسی قسم کا کاروبار نہ کیا مگر آپس کی ضرورتیں گفتگو کرنے پر مجبور کرتی تھیں جب دو مختلف زبانیں بولنے والی قومیں ایک جگہ مل جل کر رہتی ہیں تو ان کو ایک دوسرے کے لفظ لئے بغیر چارہ نہیں کیونکہ بہت سی نئی چیزیں ہوتی ہیں۔ جن کے تمام بجنسہ دوسری زبان میں سے لئے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بعض مفہوم ادا کرنے کے لئے اصل زبان کا ایک لفظ کافی ہوتا ہے اور دوسری زبان میں ایک فقرہ بھی ناکافی ہوتا ہے اگر دونوں فریقوں میں دوستی اس قدر ہو جائے تو پیار محبت میں بھی ایک دوسرے کے الفاظ بول جاتے ہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب کوئی قوم اقتدار سے محروم ہو جاتی ہے۔ اور کوئی غیر ملکی جماعت ان

پر فرماں روائی کرتی ہے تو نفسیاتی طور سے یہ لوگ خود کو حقیر سمجھتے ہیں اور اپنے حکمرانوں کی زبان کو بہت شستہ سمجھتے ہیں۔ اور ان کے الفاظ بول کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

آزاد کہتے ہیں کہ اس زمانے کی زبان کا نمونہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے کیونکہ اس زمانے کی کوئی تصنیف دستیاب نہیں ہوئی۔ البتہ ۱۱۹۳ء میں جب ترائین کے میدان میں پرتھوی راج کو شکست ہوئی تو چند کوی نے پرتھی راج راسا لکھی۔ اس کتاب میں عربی فارسی کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں۔ آزاد کے نزدیک اس زمانے کی زبان کا نمونہ یہی کتاب ہے۔ پروفیسر شیرانی نے اس کتاب کو جعلی ثابت کیا ہے[۱]

آخر پندرھویں صدی میں سکندر لودی کے عہد میں کالیستھ فارسی پڑھ کر شاہی دفتر میں داخل ہوئے۔ اور ہندو مسلمانوں کا ارتباط بڑھنے لگا۔ اور اکبر کے عہد میں حد کمال کو پہونچا۔ اس زمانے کے ہندو شرفا ہی نہیں بلکہ راجہ مہاراجہ فارسی بول کر فخر محسوس کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں آزاد

---

[۱] پنجاب میں اردو ص ۱۲۱ تا ۱۲۴

نے امیر خسرو وغیرہ کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔

اس کے بعد آزاد میر امن کی روایات کا سہارا لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں یہاں کے مسلمان بھاشا میں گفتگو کرتے ہوں گے اور چونکہ فارسی ان کی مادری زبان تھی۔ اس لئے اپنا ما فی الضمیر ادا کرنے کو عربی فارسی الفاظ زیادہ بولتے ہوں گے آخرالامر شاہ جہاں کے زمانے میں جب سلاطین تیموریہ کا عہد زریں تھا بادشاہ نے نئی دلی آباد کر کے شاہ جہاں آباد نام رکھا اور مختلف شہروں کے آدمی دارالخلافہ میں جمع ہوئے اور ترکی میں اردو لشکر کو کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اردوئے شاہی یعنی لشکر میں اور بادشاہ کے دربار میں مختلف گروہوں کے لوگ ملے جلے لفظ بولتے تھے۔ اس سے وہاں کی بولی کا نام اردو ہو گیا۔

اس کے بعد آزاد نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دراوڑی زبان جو اس برصغیر کی اصلی زبان تھی اس کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ وہ ہر زبان کے اثر کو قبول کر لیتی ہے یعنی جب آریا آئے تو ان کی زبان کا اثر قبول کیا۔ اور پراکرتیں وجود میں آئیں۔ اس کے بعد جب مسلمان اس ملک کے فرماں روا ہوئے تو عربی فارسی الفاظ کو اپنے اندر جذب کر کے

اردو کو جنم دیا۔ اور اب اردو میں انگریزی الفاظ اس طرح شامل ہو رہے ہیں گویا یہاں کی زبان میں کچھ خلا تھا۔ اور اس کو انگریزی پُر کر رہی ہے۔ اردو کا دوسرا نام ریختہ بھی ہے۔ کیونکہ اس میں مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔

اس کے بعد آزاد نے ان سوالوں کا جواب دیا ہے کہ اردو کہاں سے نکلی اور کیونکر نکلی؟۔ آزاد کا قول ہے کہ اردو زبان پہلے پہل کاروباری معاملات اور معاشرتی امور کی وجہ سے وجود میں آئی۔ اور ہندوؤں کے ساتھ ساتھ ہندی مسلمان بھی اس زبان کو اپنی زبان سمجھتے تھے۔ اور یہ اصول ہے کہ ہر زبان میں شعر و شاعری پہلے جاتی ہے۔ اس لئے اردو اور ریختہ میں بھی شاعری کا آغاز محمد شاہی عہد میں ہوا۔ فارسی کے نمونے پر غزلیں اور قصیدے شعرا نے لکھنے شروع کئے ظاہر ہے کہ شعرا کے خیالات ایک خاص نہج پر ہوتے ہیں اس لئے جہاں تک فن سخن کا تعلق ہے اس کے لئے ہر قسم کے اسالیب وجود میں آ گئے۔ محمد شاہی عہد مغلوں کے دور زوال کا آئینہ دار ہے۔ اس لئے اس زمانے میں علوم و فنون کا چرچا نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمی اصطلاحات سے یہ زبان محروم رہی۔ کیونکہ اس عہد میں کسی علم و فن پر کتابیں

لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ورنہ ان کے اظہار کے لئے بھی الفاظ کا ذخیرہ موجود ہوتا۔ بہرحال جس حد تک جو کام ہوا وہ اپنی جگہ پر خوب تھا[1]

ان میں سے بعض امور آزاد نے بالکل درست لکھے ہیں اور بعض جگہ تسامحات ہوئے ہیں۔ مثلاً اردو کے متعلق یہ کہنا کہ برج بھاشا سے نکلی ہے۔ اور برج بھاشا متھرا کی زبان ہے۔ یہ غلط ہے ہندوؤں کے نزدیک برج کا علاقہ متھرا کے ہر چہار طرف چوراسی کوس تک ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو مغربی یو۔پی کا بڑا حصہ اور مغرب کی طرف مشرقی پنجاب اور راجپوتانہ اور جنوب میں بندیلکھنڈ تک اس کی حدود ہوں گی مگر اس کے مشہور شہر متھرا گوکل اور برندابن کے نام لئے گئے ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ برج تھا تو متھرا اور اس کے مضافات کا علاقہ مگر مبالغہ کے طور پر اس کو چوراسی کوس کہتے تھے ورنہ اس وسیع علاقے میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ برج بھاشا جس زبان کو سمجھا جاتا ہے۔ وہ صرف متھرا کے محدود علاقے کی زبان ہے۔ اور اگر آزاد کا مفہوم یہ ہو کہ اس وسیع رقبہ کی ہر زبان اردو کا ماخذ ہے تو ایک حد تک درست ہے مگر

---

[1] تفصیل کے لئے آب حیات مطبوعہ مبارک علی لاہور بار چہارم صفحہ ۲۰ تا ۲۹ ملاحظہ فرمائیے۔

آزاد کے عہد میں یہ مفہوم نہ تھا۔

برج کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے۔ اور وہ ہجوم یا گروہ کے معنی میں آتا ہے اور اس سے مراد عوام ہوتے ہیں اسی مفہوم میں بنگال کی ایک شاخ برج بولی یا ورج بولی کہلاتی ہے۔ گوبی رنجن شری گنڈ اور شیخ کبیر نے اسی زبان میں شاعری کی ہے۔ ظاہر ہے کہ بنگلہ زبان کی شاخ برج متھرا کی زبان نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ عوام کی زبان کے لئے یہ لفظ بولا گیا[1]۔ عربی میں بھی سوقہ کی زبان حقیر سمجھی جاتی ہے خود اردو میں سوقیانہ محاورہ تحقیر کے لئے بولتے ہیں۔

قدر بلگرامی نے اپنی کتاب قواعد العروض میں برج بھاشا کے متعلق لکھا ہے۔

(برج بھاشا) بکسر اول و سکون رائے مہملہ و جیم تازی سنسکرت میں اس کی اصل درج بھاشا ہے۔ درج بکسر دال بہ معنی ابزہ و خلط و شمول۔ بھاشا بہ فتح موحدہ مع ہائے مخلوط و شین معجمہ بہ الف کشیدہ بہ معنی آواز گفتگو۔ برج اصطلاحاً ہندوستان میں ایک مغربی احاطے کا نام جو چوراسی کوس کے گرد میں ہے۔ اس میں کئی بن شامل ہیں جیسے برندابن اور متھرا اور گوکل وغیرہ

---

[1] مسلم بنگالی ادب صفحہ ۵۱

اسی برج کی زبان کو برج بھاشا کہتے ہیں۔ [1]

ایک کوس دو میل سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ اور چوراسی کوس کے گرد میں، صحیح نہیں ہے۔ بلکہ چاروں طرف چوراسی چوراسی کوس ہے۔ اس طرح ہر طرف تقریباً ایک سو ستر میل ہوئے لیکن ممکن ہے کہ قدر کا ذہن اس طرف منتقل ہوا ہو کہ برج بھاشا عوام کی زبان ہے۔ لیکن واضح طور سے نہیں کہا اور فی الحال صرف ایک خیال ہے جس کی کوئی سند موجود نہیں ہے اور جب تک اس کی سند نہ مل جائے اس وقت تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانے کے اہل قلم نے برج بھاشا کو صرف عوام کی زبان سمجھا ہے۔

آزاد جس عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں نظریہ یہی تھا کہ پراکرتیں سنسکرت کے بعد وجود میں آئیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اہل قلم نے اپنے نتائج افکار کو محفوظ رکھنے کے لئے خواص کی زبان کو آلہ بنایا۔ عوام کی زبان جلد جلد بدلتی ہے۔ اور خواص کی زبان ایک مدت کے بعد بدلتی ہے۔ اسی لئے سنسکرت آج تک اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اور عہد بہ عہد کی پراکرتیں جداگانہ ہیں

---

[1] قواعد اردو مس صفحہ ۶۷ مطبوعہ شام اودھ ۱۳۵۳ھ

جب مسلمانوں نے ہندوستان کی تسخیر شروع کی تو فوجی مقاصد کے پیش نظر یہاں کی زبانیں سیکھیں۔ اور یقیناً بہت سے مسلمان ایسے ہوں گے جو یہاں کی زبانیں مقامی باشندوں کے لہجے میں پوری روانی کے ساتھ بولتے ہوں گے۔ عصر حاضر میں فلبی نہایت شستہ اور رواں عربی بولتا تھا۔ اور مدت تک عربوں کو اس کے غیر عرب ہونے کا شبہ تک نہ ہوا۔ جب کشور کشائی کا دور گذر گیا تو انتظام سلطنت کی خاطر مسلمانوں نے یہاں کی زبانوں میں دستگاہ بہم پہونچائی۔ اہل مذہب نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے لئے یہاں کی مقامی بولیوں کو حاصل کر لیا۔ اور آخر کار معاشرتی ضروریات سے مسلمانوں کو یہاں کی زبانیں بولنی پڑیں ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے بولنا تو سیکھ لیا۔ مگر تحریر کے لئے اپنا رسم الخط اسی طرح باقی رکھا۔ جس طرح اہل یورپ نے رومن رسم الخط سے کام لیا۔ اور رفتہ رفتہ ایک نئی زبان وجود میں آگئی۔ اور اس کا نام اردو رکھا گیا مگر یہ نام عہد شاہجہاں کی یادگار نہیں ہے۔ اس کی بحث آئندہ آئے گی۔

پروفیسر محمود شیرانی کا نظریہ یہ ہے کہ اردو زبان پنجاب سے نکلی ہے۔ وہ اپنی مشہور تصنیف پنجاب میں اردو

میں لکھتے ہیں کہ ایران میں لفظ اردو مغلوں کے
عہد میں امراء وسلاطین کی فرودگاہ یا کیمپ کے معنی میں
چھٹی صدی ہجری کے نصف سے بولا جانے لگا۔ کتب تاریخ میں
یہ لفظ سب سے پہلے جہاں کشائے جوینی میں ملتا ہے۔ اس
سے پہلے کی کسی تاریخ میں نہیں ہے۔ ہندستان میں اس
لفظ کا استعمال بابر کے عہد سے شروع ہوا۔ مگر اس
وقت اپنے اصلی معنی میں مستعمل تھا۔ زبان کے معنی میں
تقریباً سوا سو سال سے استعمال ہونا شروع ہوا ہے۔ اردو
ادب میں جو کتابیں تصنیف ہوئی ہیں۔ ان میں سب سے پہلے
یہ نام میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے اختیار کیا ہے۔ ان
کی کتاب نوطرز مرصع (سنہ ۱۲۱۳ھ) میں یہ فقرہ ہے

”اور جو کوئی حرص سیکھنے زبان اردوے معلی کا رکھے
گا سو مطالعہ اس گلدستہ نگارین کے سے ہوش اور شعور
بخواے کلام حاصل کرے۔“

میر امن نے تحسین کی تقلید کی اور صرف چار سال بعد
سنہ ۱۲۱۷ھ میں یہی نام تجویز کیا۔ اس کے بعد زبان کے معنی
میں یہ لفظ عام ہو گیا۔ میر انشاء اللہ خاں نے دریائے
لطافت سنہ ۱۲۲۲ھ میں تصنیف کی۔ اس میں انہوں نے اردو
قدرت نے اپنے تذکرہ میں زبان کو اسی نام سے پکارا

مولوی کرم علی نے دو سال بعد ۱۲۲۵ھ میں اخوان الصفا کا ترجمہ کیا تو اس کے دیباچہ میں لکھا۔

"رسالہ اخوان الصفا کہ انسان و بہایم کے مناظرہ میں ہے تو اس کا زبان اردو میں ترجمہ کر لیکن نہایت سلیس کر الفاظ غلق اس میں نہ ہو دیں"

اس کے بعد محمد بخش مہجور نے غازی الدین حیدر والی اودھ کے عہد میں نورتن تصنیف کی تو اس کے دیباچہ میں لکھا۔

"سنا ہائے عجیب بہ عبارت رنگین اور مضمون تو آئین زبان اردو میں تحریر اور تسطیر کی ہیں"

اس زبان کا یہ نام کیوں رکھا گیا۔ اس کے متعلق جلوہ خضر کے حوالے سے خیر الانشا کی یہ عبارت نقل کی ہے۔

"چوں بازار را در ترکی و فارسی اردو گویند جز درت استعمال ایں زبان مرکب در بازار ہا ضرور تر شد خصوصاً در بازار خاص پادشاہی کہ بہ تنظیم نام بازار خاص اردوے معلی بود لہذا نام نو و تازہ مرکب نیز اردوے معلے قرار یافت تا اینکہ بہ انقراض ازمنہ آں تخصیص آداب شاہی باقی نہ ماند آں التزام لفظ معلی ہم نہ ماند فقط اردو باقی ماند پس وجہ تسمیہ اردو ہمیں است و اسم باسمی ریختہ است یعنی زبانی عربی و فارسی درین ریختہ اند

میرامن اور سر سید احمد خاں (انہی کے ہم نوا ہیں)۔
سر سید احمد نے فرہنگ آصفیہ میں لکھا ہے
"چونکہ اول اول اس کی شاہ جہانی لشکر سے ابتدا ہوئی۔ لہذا اس کا نام بھی اردو پڑ گیا۔ قلعہ معلی کے بعد لاہوری دروازے کے سامنے اردو بازار کے نام سے ایک بازار بھی آباد ہو گیا۔ جو دتی بیگم کے کوچے اور چاندنی چوک کی سڑک کے جنوبی پہلو پر واقع تھا۔"
قریب قریب سب اہل قلم اس امر پر متفق ہیں کہ اردو زبان کا نام دہلی کے اردو بازار کی بنا پر تجویز کیا گیا۔ مگر یہ کیونکہ ممکن ہے کہ ایک بازار کے نام پر اس زبان کا نام رکھا گیا ہو۔ اور اس وجہ سے اس کو قبول نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کوئی قدیم نام نہیں۔ البتہ حکیم شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں اس نام کی قدامت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ قابل توجہ ہے۔ وہ یہ ہے:
"مؤید الفضلاء سے (جو فارسی کی ایک مستند لغت ہے اور بابر کی آمد سے ایک عرصہ پہلے سلطان ابراہیم کے عہد میں لکھی گئی) ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان میں اسلامی لشکرگاہیں اردو کہلاتی تھیں۔ اور زبان اردو کو اہل اردو کی زبان کہا کرتے تھے۔ چنانچہ کتاب مذکورہ میں

ایک مقام پر تحریر ہے۔

"درزبان اہل اردو خرن خرابانا مند"

موید الفضلا مطبوعہ نولکشور میں یہ عبارت ضرور موجود ہے۔ مگر مطبوعہ نسخہ کی سند قابل اعتبار نہیں کیونکہ قلمی نسخول سے مقابلہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں بے شمار عبارتیں الحاقی ہیں مثلاً لفظ برسم کی تشریح کرتے ہوئے موید الفضلا میں یہ عبارت درج ہے۔

"فقیر گوید کہ ایں لغت را از مجوسے کہ در دین خود بہ نہایت فاضل بود و آرد شیر نام داشت و در عہد محمد اکبر شاہ از کرمان بہ ہندوستان آمدہ بود تحقیق نمودم" ص ۱۵۹

ظاہر ہے کہ یہ بیان صاحب موید الفضلا[سلہ] کا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اس کی کتاب ۹۲۵ھ میں مکمل ہو چکی تھی۔ محمد عطا حسین تحسین کے پیش رووں کی جتنی کتابیں اب تک دستیاب ہوئی ہیں ان میں کسی نے زبان کے معنی میں اردو یا اردوے معلی کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ وہ اس زبان کو ہندی یا ریختہ کہتے ہیں۔ تحسین کے بعد بھی ہندی اور ریختہ کے الفاظ رائج رہے۔ مثلاً مولوی خرم علی نصیحت المسلمین میں لکھتے ہیں (۱۲۳۸ھ)۔

"بندہ خرم علی کے دل میں آیا کہ اس شرک کی برائی قرآن

سلہ یہ الفاظ جمال الدین حسین یجوئے فرہنگ جہانگیری میں لکھے ہیں اور دہیں مناسب تھا

شریف سے ثابت کیجئے۔ اور ہر آیت کا ترجمہ ہندی زبان میں
صاف صاف بیان کر لے تاکہ ہر ایک کوفائدہ عام ہو۔

۱۸۹۶ء میں ایک رسالہ کا ترجمہ کیا گیا جو رد سماع میں لکھا
گیا تھا۔ اس میں یہ فقرہ غور طلب ہے۔

لیکن عام اس کی فہم سے عاجز تھے۔ اس لئے ریختہ
زبان میں اس کے ترجمہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ جس طرح اس
زبان کا نام اردو تجویز کرنے کے متعلق ہمارے اہل قلم نے
عجیب خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اسی قسم کے خیالات ریختہ
کے بارے میں بھی قلم بند کئے گئے ہیں۔ مثلاً خزینۂ علوم
کے مصنف منشی درگا پرشاد نادر نے لکھا ہے۔

ریختہ بمعنی گرے ہوئے کے ہیں۔ پس جو زبان اپنی
اصلیت سے گر جائے اس کو زبان ریختہ بولتے ہیں۔

شمس العلما آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے:

ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی پریشان چیز چونکہ اس
میں الفاظ پریشان جمع ہیں اس لئے اسے ریختہ کہتے ہیں۔"

صفیر بلگرامی جلوۂ خضر میں رقم طراز ہیں۔

"اس زبان کا نام ریختہ شاہجہاں کے وقت میں
رکھا گیا۔ چونکہ ریختہ پختہ کو کہتے ہیں پختگی کے لحاظ سے
اس کو ریختہ کہنے لگے۔

سرخوش نے تذکرہ اعجاز سخن میں لکھا ہے:-

"اگرچہ لفظ ریختہ کے فارسی میں کئی معنے ہیں مگر زبان کے تعلق میں غالباً اس سے ٹوٹا پھوٹا یا شکستہ ہی مراد لی جاسکتی ہے"

ان تمام بیانات کے بعد شیرانی اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ فارسی زبان میں ریختن کے کئی معنی ہیں ان میں سے مضمون کی مناسبت سے جو معنی موزوں ہیں وہ یہ ہیں (۱) بنانا ایجاد کرنا۔ (۲) کسی چیز کو قالب میں ڈھال کر نئی چیز بنانا۔ (۳) الفاظ کو وزن کے سانچے میں ڈھالنا تیسرے مفہوم کا اثر ساتویں صدی ہجری میں ہندوستان میں ظاہر ہوا اس کی تفصیل یہ ہے کہ امیر خسرو دہلوی نے ہندوستانی اور ایرانی موسیقی پر عبور حاصل کرنے کے بعد دونوں جہتوں کے نغمات کے امتزاج سے نئے راگ پیدا کئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے نئی اصطلاحات بھی وضع کیں۔ ان میں سے ایک اصطلاح ریختہ ہے جس کا مفہوم یہ تھا کہ فارسی خیال ہندی کے مطابق ہو۔ اور اس میں دونوں زبانوں کے نغمے ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں۔ اس کو ریختہ کہتے ہیں اس کو کسی پردہ کی قید نہ تھی ہر پردہ میں باندھا جاتا تھا

دوسرے الفاظ میں ریختہ کا اطلاق ایسے موزوں
پر ہوتا ہے جس میں ہندی اور فارسی شعر یا مصرع
یا فقرے ایک ہی تال اور راگ میں گائے جا سکتے
تھے۔ یا ملا دیے جاتے تھے۔ اس کی مثال یہ شعر ہے

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
چو تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

امیر خسرو کے بعد جن لوگوں نے ریختہ کو ترقی دی
ان میں میر شیخ باجن متوفی ۹۱۲ھ شیخ جیون محمد پور
دشیر شاہ اور دوہرا ایبرتا کے شیخ سعدی ہیں۔ ان بزرگوں
کا کلام پیش نظر رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریختہ
ریختہ اور گیت کا ہم معنی سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض
ریختے کبیر کی طرف منسوب ہیں۔ یہ نہیں معلوم ہوا کہ
یہ کبیر ہندی کا مشہور شاعر اور کبیر پنتھیوں کا بانی ہے
یا کوئی اور شاہ کبیر یا کبیر داس ہے۔ مگر ہندی
موسیقاروں کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصرع
مثمن اخرب مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن کا نام ریختہ

---

[1] یہاں شیخ سعدی سے مراد سعدی شیرازی نہیں بلکہ دوسرے بزرگ
ہیں غلطی سے لوگ انہیں سعدی شیرازی سمجھنے لگے۔

رکھا گیا تھا۔ اتنا ضرور ہوتا تھا کہ مصرع کے آخر سے سبب خفیف حذف کر دیا جاتا تھا۔ اس رتنا دلی میں اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مگر کسی عہد میں ریختہ اس بحر میں محدود نہیں رہا دیگر بحور میں بھی نظم کیا گیا۔

کچھ زمانہ گزر جانے کے بعد ریختہ صرف موسیقی کی اصطلاح نہ رہی بلکہ ہر کلام منظوم جس میں دو زبانوں کی آمیزش ہو ریختہ کہا جانے لگا۔ اسی لئے میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں ریختہ کی حسب ذیل چار قسمیں قرار دی ہیں۔ جو ان کے ذہن کی اختراع معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) ایک مصرع ہندی ایک مصرع فارسی۔

(۲) نصف مصرع ہندی نصف مصرع فارسی۔

(۳) فارسی عنصر حرف و فعل کی صورت میں ہو۔

(۴) فارسی ترکیبیں ہوں۔

گیارھویں صدی ہجری میں اردو نظم کو عام طور سے ریختہ کہنے لگے۔ مگر اس وقت اس سے زبان مراد نہیں لی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا اطلاق اردو نثر پر اور پھر زبان پر ہونے لگا۔ شیخ باجن نے اس زبان کو دہلوی کہا ہے۔ اہل دکن اسی زبان کو دکنی اور اہل گجرات گجراتی کہتے ہیں۔ شیخ محمد خوب نے

مثنوی خوب ترنگ ۹۸۶ھ میں نظم کی۔ اس کی زبان اردو ہے۔ مگر شیخ اس کو گجراتی بولی کہتے ہیں۔ اسی طرح چھو گام دنی کی جواہر اسرار اللہ اردو زبان میں ہے۔ مگر اس کے مرتب شیخ حبیب اللہ قریشی الاحمدی نے اس کو گوجری زبان بتایا ہے۔ محمد امین نے یوسف زلیخا عہد عالمگیر میں ۱۱۰۹ھ میں نظم کی۔ اس کی زبان دکنی ہے مگر اس کو بھی مصنف نے گوجری کہا ہے۔

اہل یورپ نے پہلے پہل اس کو لینگویج آف اندوستان یا ہندوستان کہا۔ پھر ہندوستانی کہنے لگے۔ مگر خود اردو کے مصنفین نے بھی یہی نام اس کو دیا تھا وجہی نے سب رس میں اردو کو زبان ہندوستان کہا اور میراں جی شمس العشاق نے ہندی یا ہندوی کہا۔

ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد پروفیسر شیرانی اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ دلی اکبر اور شاہ جہاں سے پہلے موجود تھی۔ اور وہاں ہندو اور مسلمان مل جل کر رہتے تھے۔ اور آپس میں کاروبار کرتے تھے۔ اس لئے اردو کی داغ بیل اس دن سے پڑی جس دن سے مسلمان یہاں آکر آباد

ہونے لگے۔ اردو کے بعض تذکرہ نگاروں نے جو اردو کو برج بھاشا سے ماخوذ بتایا ہے اس کی بھی پروفیسر شیرانی تردید کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ برج کے علاقہ پر قبضہ شہاب الدین غوری کے عہد میں ہوا اور اس سے پیشتر مسلمان محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ میں آباد ہو چکے تھے۔ اور بعد ازاں محمود غزنوی کے عہد میں پنجاب کو اپنا مسکن بنا چکے تھے۔ اور جس طرح یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہیں میں مل جل کر رہنے سے ایک نئی زبان وجود میں آئی تو وہ زبان سندھ یا پنجاب میں پیدا ہونی چاہیے تھی۔ شیرانی اس کا سہرا پنجاب کے سر باندھتے ہیں۔

شیرانی کا قول ہے کہ اردو کی وضع قطع اور ڈھنگ برج بھاشا سے بالکل مختلف ہے۔ دونوں کے قواعد ضوابط ایک دوسرے سے جدا ہیں اور ایک حد تک پنجابی سے اور اس سے زیادہ ملتانی سے مشابہ ہے۔ یہ درست ہے کہ برج بھاشا کے کچھ اثرات اردو میں نمایاں ہوتے ہیں۔ مگر جس قدر اردو متاثر ہوتی ہے اس سے زیادہ برج بھاشا پر اردو کا اثر پڑتا ہے۔ صرف برج ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی

ہر زبان میں اس قسم کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ا
اردو کا آغاز بین الاقوامی ضروریات کی بنا
پر ہوا۔ اور اسی سبب سے تمام ہندوستان میں اس
کا رواج ہو گیا۔

محمد بن قاسم نے پہلی صدی کے اواخر میں سندھ
اور ملتان کا الحاق اسلامی قلمرو سے کیا اور اس
علاقے میں اسلامی تہذیب و تمدن رواج پا گیا
تیسری صدی میں صفاریوں نے ان علاقوں پر قبضہ
کر کے ایرانی اثرات کے پھیلنے کا آغاز کر دیا۔ اس
زمانے میں جو غیر ملکی سیاح یہاں آئے وہ اس امر
کی شہادت دیتے ہیں کہ یہاں کے باشندے بلا
امتیاز ہندو اور مسلمان ہونے کے عراقی لباس
پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اصطخری چوتھی صدی ہجری
کا مشہور سیاح ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ملتان اور
منصورہ کے باشندے بالعموم دو زبانوں میں گفتگو کرتے
ہیں۔ اور وہ دو زبانیں فارسی اور سندھی ہیں۔ اہل
ایران نے موجودہ بلوچستان کے ایک حصہ کا نام
توران رکھا۔ اس کا دارالحکومت قصدار یا قزدار
تھا۔ وہ قرم کے قریب ایک شہر کا نام کرمان اور گندابہ

کا نام بدل کر قند ہار رکھ دیا۔ اسی طرح انہوں نے ریگستان ملتان کو دشت قبچاق کا نام دیا۔ دریائے سندھ کو جیحوں مہران اور سندرود کہتے تھے۔ دریائے چناب کو چندر رود یا چمدرود پکارتے تھے۔ منصورہ کے قریب ایک شہر دوشاب کی نشان دہی مسعودی نے کی ہے اس نام کا فارسی ہونا ظاہر ہے۔ اسی طرح جس زمین پر پانچ دریا بہتے ہیں۔ اس کو انہوں نے پنجاب کا نام دیا۔ یہ امور شہادت دیتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان سب سے پہلے انہی علاقوں میں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے۔

اس کے بعد غزنوی دور کا آغاز ہوا۔ اس خاندان کا گل سرسبد محمود غزنوی ہے جس نے سنہ ۳۸۸ھ سے سنہ ۴۲۱ھ تک فرماں روائی کی اس نے سنہ ۴۱۳ھ میں لاہور پر قبضہ کر کے اس کا نام محمود پور رکھا اور اپنے نائب کا صدر مقام قرار دیا۔ یہاں پر بڑی فوج رہتی تھی۔ جس میں زیادہ تر ترک۔ افغان خلج اور ہندی تھے اگرچہ محمود کے بعد ایران میں غزنوی سلاطین سلاجقہ کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے مگر ہندوستان میں ان کا اقتدار بڑھتا رہا اور مسلمان کثیر تعداد میں آکر یہاں آباد ہوئے

وہ یہاں کی دیسی زبان کو اپنی زبان سمجھتے تھے۔ مسعود
سعد سلمان نے اپنے حبسیات میں لاہور کو مادر وطن
کے نام سے یاد کیا ہے۔ لاہور کا سب سے پہلا
شاعر ابو عبداللہ روزبہ ابن عبداللہ النکتی اللاہوری
ہے۔ اس کا خلف الرشید ابوالفرج رونی نہایت
مشہور شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ
مضافات لاہور میں ایک موضع رونہ نام کا تھا یہ
ابوالفرج اسی کی طرف منسوب ہے۔

علما میں سب سے پہلے شیخ اسمٰعیل لاہوری متوفی
۴۴۸ھ ہیں شیخ مذکور ۳۹۵ھ میں بخارا سے لاہور تشریف
لائے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے مواعظ حسنہ سن
سن کر ہزاروں ہندو مسلمان ہو گئے۔ مشائخ کے
سلسلہ میں آپ کے معاصر حضرت داتا گنج بخش ہیں۔
جن کی وفات ۴۶۵ھ میں ہوئی۔ آپ کی کتاب کشف المحجوب
تصوف کی ابتدائی اور اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔
غزنوی خاندان کے دو آخری بادشاہ خسرو شاہ
متوفی ۵۵۵ھ اور خسرو ملک متوفی ۵۸۳ھ لاہور میں
آکر سکونت پذیر ہوئے۔ اور اسی کو اپنا دار الحکومت
قرار دیا پنجاب کے علاقہ پر غزنویوں نے تقریباً ایک

سو ستر سال حکومت کی اور ان کے زیر سایہ مسلمان اور ہندو مل جل کر رہے اس لئے نئی زبان کا وجود میں آنا ناگزیر تھا سرکاری ضروریات کی بنا پر شاہی عہدہ داروں اور ملازموں کو یہاں کی زبان جاننا ضروری تھا۔ یہ خیال کہ جب تک مسلمان پنجاب میں رہے انھوں نے یہاں کی کسی مقامی بولی سے کوئی سروکار نہیں رکھا قابل قبول نہیں۔ آخر جو وجوہ برج بھاشا کو اپنی زبان بنانے کے تھے۔ وہ سب پنجاب میں تھے۔ اس لئے انھوں نے خود پنجاب میں ایک زبان بنائی۔ اور عقل اس کو قبول نہیں کرتی کہ پنجاب میں کوئی مقامی بولی اختیار نہیں کی۔ جب دہلی پہونچے تو برج بھاشا کو اپنی زبان بنایا۔ صرف تعلیم یافتہ گروہ فارسی جانتا تھا۔ اور وہ اپنا کام نکال لیتا تھا مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ غیر تعلیم یافتہ تھا۔ وہ فارسی بالکل نہیں جانتا تھا۔ وہ لوگ جو زبان بولتے تھے اس کو مسلمان ہندی کہتے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں غزنین میں ایک دارالترجمہ قائم تھا۔ اور اس میں ہندی زبان کے ترجمان موجود تھے ان میں سے "تلک ہندی اور بہرام" کا نام تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ شیرانی کا خیال ہے کہ شاید خود سلطان

ہندی سمجھ سکتا تھا۔ غزنوی کے عہد کے مشہور صوفی شاعر
حکیم سنائی ہندی سے واقف تھے۔ اور عثمان مختاری
غزنوی نے ایک شعر میں دو ہندی لفظ نظم کئے۔ خواجہ
مسعود سعد سلمان کے متعلق تمام تذکرہ نویس متفق ہیں
ان کا ایک ہندی دیوان بھی تھا جس کی ایک بیت بھی
آج محفوظ نہیں۔ مگر خواجہ کے فارسی دیوان پر ہندی
کا اثر موجود ہے۔ یعنی بارہ ماسہ کے طرز پر انھوں نے
مدحیہ دوازدہ ماہہ کہا ہے۔ ہندی بھاشا اور اردو
میں بارہ ماسہ میں صرف ایک ہجران زدہ عورت کی
داستان ہوتی ہے۔ خواجہ نے دوازدہ ماہہ سے
ترقی کر کے غزلیات ایامیہ و اسبوعیہ بھی لکھیں۔
یہ ان میں تاریخیں نہیں گنی جاتیں بلکہ تیس دنوں کے
علیحدہ علیحدہ نام ہیں۔ اس طرح ہر دن سے منسوب
کرتے ہوئے خواجہ نے غزلیں لکھیں۔ اور غزلیات
اسبوعیہ ہفتہ کے دنوں سے منسوب ہیں۔ علاوہ ازیں
خواجہ نے شہر آشوب بھی لکھے۔ اس قسم کی نظمیں غالباً
سنسکرت میں بھی ہوتی ہیں۔ اس قسم کی نظموں کے
نمونے فارسی میں موجود نہیں یا تو خواجہ کو منفرد
ماننا چاہئے اور یہ کہا جائے کہ یہ سب ان کی ایجادات

ہیں یا یہ سمجھا جائے کہ اس برصغیر میں پیدا ہونے کی
وجہ سے یہاں کی ادبیات سے متاثر ہو کر اس قسم
کی اصناف پر انھوں نے طبع آزمائی کی۔
سلطان معزالدین محمد بن شام نے ۵۸۲ھ میں لاہور فتح کیا ۵۸۹ھ میں
قطب الدین ایبک نے دہلی اور میرٹھ پر قبضہ کیا۔ اور
پایۂ تخت لاہور سے دہلی منتقل ہوا۔ شیرانی کے زمانہ
میں پایۂ تخت کلکتہ سے دہلی تبدیل ہوا تھا۔ اس سے
شیرانی نے موازنہ کیا ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ اس
زمانے میں تو صرف دفاتر منتقل ہوئے اس وجہ سے
سرکاری ملازمین منتقل ہو کر دارالحکومت کو آ گئے
دفاتر کے لئے نئی عمارات بن گئیں۔ مگر اس زمانے میں
دارالحکومت تبدیل کرنے کا مطلب یہ تھا کہ لاکھوں
انسان پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی اور اس
کے مضافات میں آباد ہو گئے۔ ان میں فوجی لوگ
بھی تھے۔ اور دوسرے کاروبار کرنے والے
بھی۔ بہرحال ایک بڑی تعداد پنجابیوں اور ملتانیوں
کی ترک وطن کر کے دہاں گئی۔ یہ درست ہے کہ
قطب الدین ایبک کے ساتھ ولایت زاد ترک خلج
افغان وغیرہ بھی ہوں گے۔ مگر زیادہ تعداد پنجابیوں

کی ہو گی۔ اور ظاہر ہے کہ وہ لوگ کوئی زبان بولتے ہوں گے۔ جو موجودہ پنجابی کی مماثل یا اس کی قریبی رشتہدار ہو گی۔

غلاموں اور خلجیوں کے زمانے میں اس کے عہد کے سیاسی وجوہ کی بنا پر پنجاب کو اہمیت حاصل تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ تاتاریوں کے فتنوں نے وسط ایشیا سے اٹھ کر اپنے قرب و جوار کے ممالک کا امن و امان برہم کر دیا تھا دوسرے غازی ملک تغلق کے بادشاہ بن جانے کی وجہ سے پنجاب کے بہت سے لوگ دہلی میں آ بسے تھے دہلی کی زبان ان پنجابیوں کی زبان سے مماثل تھی بس اس میں تازہ خون دوڑ گیا۔ اس عہد میں دہلی میں جو زبان اظہار خیال کا ذریعہ تھی اس کے نمونے دکنی دیوان میں موجود ہیں۔ اور یہی قدیم اردو کی شکل ہے۔ دکنی میں شعر و شاعری کا آغاز نویں صدی ہجری کے آخر میں ہوا۔

دکن میں مسلمان سب سے پہلے خلجیوں کے عہد میں پہونچے۔ اور اس طرح اردو وہاں داخل ہوئی۔ مگر تغلقوں کے عہد میں ایک نہایت اہم واقعہ پیش آیا

یعنی محمد تغلق نے ۱۳۲۸ء میں یہ اعلان کیا کہ دہلی اور چار چار کوس تک مضافات دہلی کے جملہ باشندے نئے دارالحکومت دولت آباد کو منتقل ہو جائیں اس طرح بے شمار افراد دکن گئے اور وہاں آباد ہو گئے کچھ مدت کے بعد ان لوگوں کو واپسی کی اجازت مل گئی مگر پھر بھی بیشتر افراد دکن میں رہ گئے یہ لوگ اردو بولتے تھے۔ اس زبان کو دکن میں رواج دیا۔ محمد تغلق کے زمانے میں حسن گنگو بہمنی نے دکن پر قبضہ کر کے خود مختار بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ایک مدت کے بعد یہ سلطنت پانچ مستقل ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔

ان میں دو ریاستیں۔ بیجاپور کے عادل شاہی خاندان اور ریاست گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان کو اس وجہ سے خصوصیت حاصل ہے کہ ان کی سرپرستی میں اردو ادبیات کو فروغ ہوا۔ اس زمانے میں اہل دکن کا براہ راست اہل دہلی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکنی اردو متعدد امور میں دہلی کی زبان سے مختلف ہو گئی۔ ان میں سے بعض امور کا تعلق محاورہ سے ہے۔ اور بعض صرف

دکھوے۔ دونوں زبانوں کا یہ فرق ظاہر کرنے
کے لئے اہل علم نے ایک زبان کو دکنی اور دوسری
کو اردوئے معلی کے نام سے پکارا۔ حقیقت
یہ ہے کہ دکن میں وہی زبان پہنچی جو عہد
تغلق میں دہلی کی زبان تھی، اور چونکہ دہلی [illegible] بعد
سے دوچار ہوتی رہی اس لئے وہاں کی زبان
بدل گئی۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ عہد شمس سے
پہلے اردو ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی
گجرات اور دکن کے مسلمان جو اردو بولتے تھے اس
کو دکنی اور گجراتی کہا جاتا ہے۔ وہ قدیم اردو ہے
گجراتی میں دسویں صدی سے تصنیفات کا آغاز ہوا۔
اور شمالی ہند میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ وہ جدید
اردو ہے۔

عہد تغلق کے بعد بھی دہلی پر پنجاب کا اثر پڑتا
رہا۔ یعنی تغلقوں کے فوراً بعد خضر خاں نے ۱۴۱۴ء
میں دہلی پر قبضہ کیا۔ اس وقت اس کے ساتھ ساٹھ
ہزار پنجابی سوار تھے۔ اور اس طرح دہلی کی زبان پر
پنجابی کا اثر پھر پڑا۔ سید خاندان کے بعد ۱۴۵۱ء میں بہلول
لودی دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ اگرچہ اس کے لشکر میں

زیادہ افغان تھے مگر وہ ایک مدت تک پنجاب میں رہ چکے تھے۔ اور ان کی زبان پنجابی سے متاثر ہو چکی تھی۔ اس طرح دہلی پر سیاسی طور سے پنجاب چھایا رہا اور سیاسی واقعات کا اثر زبان پر ہمیشہ پڑتا ہے۔ یہ اثر اردو اور پنجابی زبانوں کے موازنہ سے واضح ہو جاتا ہے۔ دونوں زبانوں کی صرف ونحو اور عالم ہئیت کی مماثلت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دونوں زبانوں کا منبع ایک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب اور جب نداب دونوں ہمسایہ ملک ہیں۔ مگر دونوں کا رسم و رواج بالکل مختلف ہے

۳. پنجاب کے علاقہ میں جو زبان بولی جاتی ہے اس کو پنجابی کہتے ہیں۔ مگر یہ نام پرانا نہیں ہے۔ امیر خسرو نے اس علاقے کی زبان کو لاہوری کے نام سے ابوالفضل نے ملتانی کے نام سے یاد کیا ہے اور مغرب کے علمائے لسانیات نے پنجاب کو شمالاً جنوباً دو حصوں میں تقسیم کر کے مشرقی حصہ کی زبان کو پنجابی اور مغربی حصہ کی زبان کو لہندا کے نام سے موسوم کیا ہے پنجابی کو مغربی ہندی سے مشابہ بتاتے ہیں اور لہندا کو کشمیری اور سندھی کے حلقہ میں شمار کرتے

ہیں۔ مگر اہل پنجاب اس تقسیم کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک پنجابی اور لہندا میں بنیادی فرق نہیں ہے۔ صرف لہجہ اور محاورہ کا ہے اس لئے یہ تقسیم غلط ہے۔

جغرافیائی اصطلاح کے اعتبار سے پنجاب کا اطلاق اس سرزمین پر ہوتا ہے جو ستلج بیاس راوی چناب جہلم سے سیراب ہوتی ہے۔ یعنی ان دریاؤں کی وادی میں محدود ہے۔ مگر زبان صرف اس حد تک ہی محدود نہیں ہے۔ مغرب میں دریائے سندھ کے ماورا۔ در مشرق میں جمنا پار اس زبان کے اثرات موجود ہیں مغرب کے علمائے لسانیات کا نظریہ یہ ہے کہ مغربی ہندی کا اثر مشرقی پنجاب میں نظر آتا ہے۔ اور جس قدر ہندی مغرب کی طرف بڑھی اسی قدر پنجابی یعنی ہندا مغرب کی طرف ہٹتی گئی۔ یہ نظریہ بالکل غلط ہے یعنی کہ سیاسی طور سے پنجابی مسلمان مشرق کی طرف بڑھتے رہے بھی مشرق کی طرف سے پنجاب میں آکر آباد نہیں ہوئے عہد اسلامی کے بعد جب زمام حکومت سکھوں کے ہاتھ میں آئی تو وہ بھی پنجاب سے نکل کر مشرق کی طرف گئے۔ اور اس علاقہ پر قابض ہوگئے۔ [illegible] بگڑ دیا بیکانیری بولی جاتی تھی۔ اس سے [illegible] کے برعکس

ہندی بولنے والوں کا غلبہ یا تفوق مشرقی پنجاب میں ہونا
محال ہے۔ اور اس طرح یہ نظریہ غلط ہے۔

پنجابی زبان میں شعر و ادب کا وافر ذخیرہ موجود ہے
ان میں کی بیشتر کتابیں مسلمان مصنفوں کے نتائج افکار
کا ثمرہ اور ان کے ذہن کی پیداوار ہے۔

اگر پنجابی اور اردو کا از روے قواعد صرف و
نحو موازنہ کیا جائے تو یکسانیت واضح ہو جائے گی
چند اہم قواعد ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں مصدر
وضع کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے یعنی امر کے آخر میں
علامت مصدر "نا" اضافہ کر دی جاتی ہے۔ مثلاً رونا
گانا وغیرہ۔

مسعود حسین صاحب فرماتے ہیں کہ "نا" کی علامت
مصدری پنجابی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہریانی میں
"ن" کے ساتھ "نا" بھی ملتا ہے۔ اور پنجابی میں بھی "ن"
مستعمل ہے

(۲) اسی طرح تذکیر و تانیث کے قواعد دونوں
زبانوں میں یکساں ہیں یعنی

(۱) جو الفاظ "الف" پر ختم ہوتے ہیں ان کی تانیث

"ی" سے کی جاتی ہے۔

یعنی الف کو یاسے بدل دیتے ہیں مثلاً لڑکا لڑکی بکرا بکری کالا کالی۔

(ب) اگر اسم مذکر حرف صحیح پر ختم ہو تو دونوں زبانوں میں تانیث کے لیے "نی" یا "انی" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً مغل مغلانی ڈوم ڈومنی۔

(ج) اگر مذکر کے آخر میں "ی" ہو تو مونث میں اس "ی" کو "نون" سے بدل دیں گے۔ مثلاً جوگی جوگن۔تیلی تیلن دھوبی دھوبن۔

(۳) برج بھاشا میں اکثر اسما و صفات واو مجہول پر ختم ہوتے ہیں۔ مگر اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں الف آخر کلمہ میں آتا ہے۔ مثلاً۔ لڑکا۔ کتا کتا۔ نیولا نیولا وغیرہ

(۴) صفت موصوف میں تذکیر و تانیث اور وحدت و جمعیت میں مطابقت ہوتی ہے۔ مثلاً اردو میں۔ اونچا گھوڑا چھوٹی لڑکی وغیرہ کہیں گے تو پنجابی میں اچا گھوڑا انگی کڑی کہیں گے۔ مگر برج بھاشا میں اونچو گھوڑا او بولیں گے

قدیم اردو میں موصوف کی جمعیت کی صورت میں

صفت بھی جمع لائی جاتی تھی۔ مثلاً راتیں کالیاں مگر میرو سودا کے عہد سے یہ قاعدہ ابتر ہو گیا۔ اور صفت ہر حالت میں واحد ہوتی ہے۔

(۵) صفت موصوف کی طرح مبتدا خبر میں بھی جنس اور عدد میں مطابقت ہوتی تھی۔ مگر اردو میں اب یہ قاعدہ بھی بدل گیا ہے۔ اور گو عصر حاضر میں دونوں زبانوں میں اختلاف ہے۔ مگر قدیم اردو میں اس قاعدہ کی موجودگی دونوں زبانوں کے اتحاد اور ان کی یکسانیت پر دلالت کرتی ہے

پروفیسر مسعود حسین صاحب کی رائے یہ ہے کہ یہ خصوصیات دہلی کی زبان میں آج بھی پائی جاتی ہیں مگر ادب کی زبان میں یقیناً یہ قاعدے ابتر ہو چکے ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے اسی مطابقت پر زور دیگر توافق لسانیں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۶) قدیم اردو اور پنجابی میں اضافت کے قاعدے میں بھی یکسانیت تھی۔ یعنی اپنے فاعل کی جنس اور عدد میں مطابقت ہوتی تھی۔ مگر اردو میں یہ قاعدہ بھی برہم ہو چکا ہے۔

(۷) پنجابی اور اردو میں ماضی مطلق کا صیغہ یکساں

طریقہ سے بنایا جاتا ہے۔ مگر عصر حاضر میں جمع مونث کے صیغہ کی پابندی پنجابی میں موجود ہے۔ اردو میں ختم ہو گئی ہے یہ بھی متاخرین کی اصلاحی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

(۸) ماضی قریب کی گردان میں پنجابی اور اردو میں قدرے اختلاف ہے۔ مگر یہ امر مسلم ہے کہ دونوں زبانوں میں فعل معاون میں تصریف ہوتی ہے

(۹) ماضی قریب کی طرح ماضی بعید میں فعل معاون کی تصریف ہوتی ہے۔

(۱۰) ماضی ناتمام میں لہجہ کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اردو بولنے والے "تا" برتتے ہیں۔ اور اہل پنجاب "دال" برتتے ہیں۔

(۱۱) ماضی احتمالی یا شکیہ دونوں زبانوں میں یکساں ہے۔

(۱۲) مضارع بھی دونوں زبانوں میں یکساں ہے۔

(۱۳) دونوں زبانوں میں فعل حال کی گردان ایک ہی اصول سے کی جاتی ہے۔ البتہ ماضی ناتمام کی طرح یہاں بھی دال "اور تا کا ابدال ہوتا ہے یعنی

جہاں پنجابی میں "دا ں" بولی جاتی ہے اردو میں وہاں "تا" بولی جاتی ہے۔ مونث کی گردان میں آج کل اختلاف ہے مگر اردوئے قدیم اور پنجابی میں یکسانیت تھی۔

(۱۴) مستقبل کی گردان دونوں زبانوں میں ایک ہی طرح کی جاتی ہے۔ یعنی واحد میں "گا" اور جمع میں "گے" کے اضافہ سے تصریف ہوتی ہے۔

(۱۵) اردو اور پنجابی میں امر بنانے کا قاعدہ ایک ہے۔ یعنی علامت مصدر کو دور کر دیا جائے تو امر باقی رہ جاتا ہے۔ اور امر تعظیمی میں جمع مخاطب میں ایک واؤ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ذیل کے امور بھی ذہن میں رہیں۔

(ا) دونوں زبانوں میں مصدر سے امر کا کام لیا جاتا ہے۔

(ب) اردو میں امر کے بعد "یے" بڑھا کر مضارع بنایا جاتا ہے۔ مگر اس سے کبھی کبھی امر کا کام لیا جاتا ہے پنجابی میں بھی یہ قاعدہ موجود ہے۔

(ج) امر کے آخر میں جب "یے" بڑھاتے ہیں تو اس میں کبھی کبھی پہلی "یا" کو جیم سے بدل دیتے ہیں اور "جے"

بولتے ہیں۔ اس امر میں دونوں زبانوں یکسانیت ہے۔
دکنی اردو میں اس "ج" کے ساتھ نون غنہ کی آواز
بھی پیدا ہوئی مغرب کے اہل قلم یہ کہتے ہیں کہ یہ پہلے
پنجابی میں اردو کے اثرات سے آگئی۔ مگر پنجابی کے
مضارع اور ماضی احتمالی ہیں یہ شکل پہلے سے موجود
ہے۔ اور صیغہ جمع متکلم میں ملتی ہے۔ اس لئے اردو سے
اخذ کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ شیرانی کی رائے
یہ ہے کہ شاید شروع میں اس کا استعمال جمع متکلم کے لئے
مخصوص تھا۔ مگر امتداد زمانہ سے اس کا استعمال جمع غائب
مخاطب اور واحد مخاطب پر تعمیماً ہونے لگا
پروفیسر مسعود فرماتے ہیں کہ امر کا یہ قاعدہ ہندوستان
کی تمام جدید آریائی زبانوں میں مشترک ہے۔

(۲) "گا" پنجابی میں حال کے لئے بھی مستعمل ہے۔ قدیم
زمانہ میں اردو میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً
میر کا شعر ہے ؎

ابر اٹھا تھا کعبہ سے اور جھوم پڑا میخانے پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشے پر پیمانے پر

یہ شعر کلیات میر مطبوعہ نولکشور مرتبہ آسی الالٰی میں اس طرح ہے:-
ابر سیہ قبلے سے اٹھ کر آیا ہے میخانے پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے کچھ شیشے پر کچھ پیمانے پر

(۱۷) پنجابی اور اردو میں دعائیہ فعل ایک ہی نہج پر واقع ہوئے ہیں۔

(۱۸) فعل لازم و متعدی دونوں زبانوں میں ایک ہی اصول پر مبنی ہے۔ اور متعدی بالواسطہ کا قاعدہ بھی یکساں ہے۔

(۱۹) اردو زبان میں مجہول بنانے کے لئے فعل معاون "جانے" کی تصریف کی جاتی ہے۔ اور پنجابی میں بھی یہ طریقہ رواج پذیر ہے۔

(۲۰) ندائیہ کلمات اور اسلوب میں دونوں زبانیں متفق ہیں۔

(۲۱) کلمات نفی مثلاً نہ نا ناں نہیں نیں ناہی نا ہیں پنجابی میں آج تک مروج ہیں ان میں سے بعض کلمات اردو میں آج کل متروک ہیں مگر اردوے قدیم میں مستعمل تھے۔

(۲۲) بہت سے خیالات ادا کرنے کے لئے معاون افعال کی مدد سے مرکب افعال بنائے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں مشترک ہے۔ مثلاً روشن کرنا۔ آرام پانا۔ وغیرہ

مذکورہ بالا امور یعنی تذکیر و تانیث کے اصول

وحدت وجمعیت کے قواعد افعال کی گردانیں جو زبان کی ساخت میں اساسی اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں وہ اردو اور پنجابی میں مشترک اور یکساں ہیں اس سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں زبانیں ایک ہی جگہ پیدا ہوئیں۔ اور ان دونوں زبانوں کا منبع ایک ہی زبان ہے عہد مابعد میں جو ان زبانوں میں اختلاف پیدا ہوا وہ اس وقت کا ہے جب اردو کی تہذیب و تدوین شعرا اور تعلیم یافتہ طبقہ نے دہلی اور لکھنؤ میں کی۔ انہوں نے اپنی دانست میں اس زبان کی اصلاح کی مگر ایک صرفی کے نقطہ نظر سے قواعد میں ابتری پیدا کر دی۔ جمع کا پرانا قاعدہ ترک کر دیا۔ افعال و اسماء سے جمع مونث کی صورت کو خارج کر دیا۔ اس کی وجہ سے زبان کی موسیقیت اور خوش آہنگی ختم ہو گئی۔

اردوئے قدیم میں اسم کی مرفوعی منصوبی مجروری تینوں حالتیں جدا جدا تھیں۔ مثلاً راتاں راتوں راتیں لیکن بعد کو ان کا استعمال بے قاعدہ ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ بعض صورتیں متروک ہو گئیں۔ مونث کلمات میں تو یہ تینوں شکلیں موجود ہیں۔ مثلاً لڑکیاں لڑکیوں

لڑکیں ۔ مگر مذکر میں یہ صورت باقی نہیں ہے اس
طرح ہم کی شکل ہمارں ہوں اور ہمیں ہونی چاہیئے
لیکن یہاں تو شعرائے قدیم کے ہاں بھی نہیں ہے
البتہ ہموں کو متاخرین نے ترک کر دیا ہے۔

بعض ایسے امور ہیں جو دوسری زبان کے
مقابلے میں اردو اور پنجابی میں مشترک ہیں۔ اس
سلسلہ میں جو مثالیں پیش کی جائیں گی۔ وہ قدیم
زبان کی ہوں گی ۔ اور وہ اکثر آج کل متروک
ہیں مگر پنجابی میں ابھی تک رواج پذیر ہیں۔ ہو
سکتا ہے کہیں کہیں کچھ تغیر ہوا ہو۔

(۱) قدیم زمانے میں جمع کے ساتھ فعل بھی جمع
استعمال ہوتا تھا۔ اور صفات اضافات حال ضمیر وغیرہ
سب میں جمع الف نون سے بنائی جاتی تھی۔ مثلاً سودا
کا شعر ہے ؎

جب لبوں پر یار کے مسی کی دھڑیاں دیکھیاں
جوں زحل کی ساعتیں اس دل پہ کڑیاں دیکھیاں

(۲) پنجابی میں امر بنانے کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ
امر کے آخر میں " ئیں " یا " دیں " بڑھا دیتے ہیں مثلاً
آویں جا دیں لا دیں وغیرہ مثلاً محمد امین دکنی

نے یوسف زلیخا میں لکھا ہے ؎

مرے محبوب کو عزت سو لائیں
براتی جتنی اوپر بٹھائیں

(۳) اردو اور پنجابی میں مستقبل بنانے کے لئے "گا" کا اضافہ کرتے ہیں۔ مگر اس کے علاوہ "سی" کے اضافہ سے بھی فعل مستقبل بنایا جاتا تھا۔ جو پنجابی میں رواج پذیر ہے اور اردو میں متروک ہے لہذا یا ملتانی کا کلمہ ہے۔ ولی کا شعر ہے ؎

کہا ہے زہر کا تل تیر اس میں
نہ چل سی کچھ مرا تدبیر اس میں

(روضۃ الشہدا)

(۴) کھڑا اردو میں عام طور سے مستعمل ہے۔ اہل لغت نے اس کا ماخذ پراکرت کا "کھڈ داؤ" قرار دیا ہے۔ اس سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ اس کو پنجابی مصدر کھڑنا کی ماضی یا اسم مفعول سمجھا جائے "کھڑنا" پنجابی میں چلنا اور ٹھہرنا دونوں معنی میں آتا ہے۔

(۵) تھا کی حالت اس سے بھی عجیب ہے۔ اہل لغت اس کو مصدر "ہونا" سے مشتق مانتے ہیں اور ہونا کی ماضی کہتے ہیں مگر "ہونا" کی ماضی "ہوا"

موجود ہے۔ جب اس کی نشان دہی کی جاتی ہے تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کی دونوں ماضیاں ہیں۔ اور سنسکرت کے "بھو" سے ماخوذ ہیں۔ مگر اس سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ ہمالی زبان میں ایک مصدر "تھو نا" مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم بھی ہونا کا ہے "تھونا" کی ماضی "تھیا" ہے اردو میں جس طرح ماضی کے درمیانوں سے ہائے اشمام ساقط ہو لی یہاں بھی حذف ہو گی۔ اور "تھا" رہ گیا۔ اردو کا سب سے قدیم فقرہ جو تاریخ فیروز شاہی کے ۵۲۱ صفحہ پر درج ہے وہ یہ ہے

برکت شیخ تھیا اک موا اک بھا

اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ شیخ کی برکت سے ایک فوت ہو گیا۔ اور دوسرا بھاگ گیا۔ اس فقرہ کا پس منظر یہ ہے کہ جب محمد تغلق نے سندھ پر حملہ کیا تو اس حملہ کے دوران وفات پاگیا اور اس کے جانشین فیروز شاہ کی فوج کو رسد نہ پہونچ سکی اور اس کے جانور دبا سے مر گئے تو وہ لڑائی کو ناتمام چھوڑ کر گجرات چلا گیا۔

تاریخ فیروز شاہی مطبوعہ میں تھیا کی جگہ تھبا

اور ہنا کی جگہ بہتا ہے۔ اس کی تشریح شمس سراج عفیف نے خود یہ کی ہے

۔ اعنی از آثار تقدیر زبانی سلطان محمد تغلق درپے ماجان داود سلطان فیروز از پے ماگریخت

ڈاکٹر مسعود حسین خاں مقدمہ تاریخ زبان اردو کے صفحہ ۲۱۲ پر لکھتے ہیں کہ بتا یا کھپا اس عہد کے بڑے بزرگ تھے۔

پیر حسام الدین راشدی کا خیال ہے کہ لقب غلط ہے یہ بچھا ہے۔ جو ایک شیخ کا نام تھا۔ اور تہا کے متعلق آپ کی رائے یہ ہے کہ اس کو صحیح پڑھنے کے لئے مخطوطات کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ اس میں غالباً بدگا ہو گا (میر صاحب کا خط بہ نام غضنفر صاحب) ہو سکتا ہے کہ تہا تھتکارا کے معنی میں ہو کیونکہ تہ فارسی میں ہتاح دہن یعنی تھوک کو کہتے ہیں۔ مگر اصلیت کا پتہ مخطوطات سے چل سکتا ہے مگر اتنا ثابت ہے کہ اس سے تبرائی کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔

اب رہی کھفا کی اصل مسعود استھا بتاتے ہیں۔ اور سبزواری ہو تقا' اردو کا ارتقا صفحہ ۲۸۸) اور یہ بھی

کہتے ہیں "تھا" میں الف ہ کا بدل ہے۔ مگر تھیو نا کا ماضی تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اردو میں فعل معاون ہونے کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا اردو میں فعل مستقل بھی ہے مثلاً غالب،

نہ تھا کچھ تو خدا تھا
کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

داغ سے

تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر یہ نام کس کا تھا

(۶) پنجابی میں ماضی کا اشتقاق خلاف قاعدہ بھی کیا جاتا ہے۔ مثلاً 'کیتا' یہ لفظ برج بھاشا یا اودھی یا راجستھانی میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔ مگر اردوئے قدیم میں اس کا استعمال عام تھا۔ برج بھاشا وغیرہ میں کینا دینا کینو دینو ضرور مستعمل ہیں

(۷) غیر زبان کے الفاظ جب پنجابی میں لائے جاتے ہیں تو اکثر ان میں ایک "یا" کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً نظر سے نظری حیات سے حیاتی۔ قدیم اردو میں اس کا رواج تھا۔ اور دکنی میں آج بھی اسی طرح بولے جاتے ہیں۔ مگر زمانہ حال کی اردو

میں یہ طریقہ متروک ہے

(۸) "مانگا تانگا" اور "مانگے تانگے" اردو میں عام طور سے بولے جاتے ہیں۔ مگر قواعد نویس اور اہل لغت "تانگا" کو تابع مہمل کہتے ہیں پنجابی میں یہ کلمہ بامعنی ہے۔ اور مصدر "تانگنا" سے جو مانگنے کا مرادف ہے مشتق ہے۔

(۹) "چپ چپاتا اور چپ چپاتے" میں کلمہ مابعد کو اردو میں تابع مہمل سمجھا جاتا ہے۔ مگر پنجابی میں یہ بھی بامعنی اور چپ کا مرادف ہے

(۱۰) اسی طرح دن دہاڑے میں "دہاڑے" کو تابع مہمل سمجھا جاتا ہے۔ مگر پنجابی میں "دہاڑا" "دن" کا ہم معنی کلمہ ہے۔

(۱۱) اسی طرح "ہلنا جلنا" چلنا کا مترادف ہے

اس قسم کے محاوروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب مسلمان پنجاب سے دہلی جاکر آباد ہوئے تو انہوں نے پنجابی اور دہلی کی زبان کے مترادف ساتھ بولے تاکہ مفہوم سمجھنے میں آسانی ہو۔ جیسے برتن بھانڈا۔ باسن بھانڈا۔ گوراچٹا۔ بھلا چنگا۔ موٹا تکڑا۔ سنڈا مسٹنڈا۔

(۱۳) پنجابی زبان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جملہ ایسے کلمات جن میں حرف دوم حرف علت ہو تو اس حرف علت کو ساقط کر دیتے ہیں مثلاً ناک نک کان کن وغیرہ۔ اس کو دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ برج بھاشا میں پہلے حرف کی حرکت کو دراز کر کے حرف علت بولتے ہیں۔ لیکن اردو کا میلان پنجابی کی طرف ہے مثلاً ماچھر کو مچھر ساپنج کو سچ بیاکل کو بیکل بولتے ہیں۔

(۱۴) پنجابی میں حالت مجروری ظاہر کرنے کے لئے کلمہ کے آخر میں "دن" اضافہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً پچھیوں ہاتھوں یعنی پیچھے سے؛ دریا تھ سے دکن میں بھی یہ استعمال نظر آتا ہے مثلاً

بیٹی کا حال دیکھا آکے نظردں
کمر گئی لوٹ اس دہشت کی فکردں

یعنی نظردں نظر سے اور فکردں فکر سے۔

اسی طرح حالت ظرفی "یں" سے ظاہر کرتے ہیں مثلاً

بہت آرام تھا ساری خلق کوں
نہ ماری کوئی اس راتیں پلک کدں

راتیں یعنی رات میں یا رات کو۔

(۱۶) دکنی میں بعض سماعی جمعیں پنجابی کے مطابق مستعمل ہیں سات سے ستیں اور دو سے دوہوں۔

(۱۷) جب مصدر کی اخرانی شکل استعمال کی جاتی ہے۔ تو اردو اور پنجابی دونوں میں "الف" کو "ی" سے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً کہنے لگا۔ سننے لگا۔ مگر پنجابی میں اکثر اس "نا" کو حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً کہن لگیا۔

(۱۸) پنجابی اور اردو کے اکثر مصدر مشترک ہیں لیکن بعض مصادر اردو میں ترک کر دیئے گئے ہیں۔ مگر پنجابی میں ہنوز مستعمل ہیں۔ مثلاً۔

(ا) آکھنا کہنا (ب) سڑنا جلنا (ج) لوڑنا ضرورت ہونا (د) اپڑنا پہونچنا (ہ) پچھننا۔ پہچاننا۔ (و) سٹنا۔ پھینکنا ڈالنا۔ (ز) لبھانا تلاش کرنا (ح) لنگانا۔ (ط) پانا ڈالنا۔ (ی) لڑنا سانپ کا ڈسنا (ک) نسنا بھاگنا۔

(۱۹) بعض کلمات جو پنجابی اور اردو میں مشترک تھے مگر اردو میں اب ترک کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً۔

(ا) دل طرف (ب) نال ساتھ (ج) کان واسطے لئے (د) چکڑ کیچڑ (ہ) گھیر گھی (و) چوہڑا خاکروب (ز) کیر ملتانی میں دودھ کو کہتے ہیں۔

(۳۰) بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جو اردوئے قدیم میں پنجابی لہجہ میں بولے جاتے تھے۔ مگراب یہ تلفظ متروک ہے مثلاً

(ا) منگنا مانگنا۔ (ب) ہندنا باندھنا (ج) ہسنا ہنسنا۔ بہ تخفیف نون غنہ (د) ٹُٹنا ٹوٹنا (ہ) پٹی پاٹی بمعنی لوح (و) ہتھ ہاتھ (ز) بھکا بھوکا (ح) ڈُبنا ڈوبنا (ط) بھین بہن (ی) ہور اور (ک) لوک لوگ (ل) جوک جونک بہ تخفیف نون غنہ۔

(۳۱) پنجابی اور اردو کے مشترک کلمات میں کبھی ہم مخرج حروف آتے ہیں مثلاً

(ا) پنجابی (واو) اردو میں "بے" سے بدل جاتا ہے مثلاً وٹا بٹہ دیاج بیاج وگاڑ بگاڑ وس بس وغیرہ۔

(ب) پنجابی کی "ہے" اردو میں "سین" سے بدل جاتی ہے مثلاً کیہا کیسا چالیہ چالیس تیہ تیس۔ سرہوں سرسوں وغیرہ۔

(ج) پنجابی کی "ہے" اردو میں "الف" سے بدل جاتی ہے مثلاً ہک ایک ہور اور وغیرہ (د) پنجابی کی "دال" اردو "تے" سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً دھاگا۔ تاگا۔ وغیرہ (ہ) بعض حروف میں تقدیم تاخیر ہو جاتی ہے

مثلاً پچھان پہچان سہرند سرہند وغیرہ۔ قدیم اردو میں پنجابی لہجہ غالب تھا مثلاً پنجابی میں دوسرے حرف علت کو مخفف بولتے ہیں۔ فارسی کی کتابوں اور تاریخوں میں جو ہندی الفاظ نقل کئے گئے ہیں ان کا لہجہ بالکل پنجابی کے مطابق ہے۔ مثلاً قطب الدین ایبک کو لک داتا کہتے ہیں لک کو آج کل اردو میں لاکھ کہتے ہیں۔ نویں صدی ہجری کی مشہور تصنیف شرف نامہ ہے جس کا مصنف ابراہیم فاروقی بنگالی ہے۔ اس نے کھٹ کھٹ کھاٹ یعنی چارپائی کو لکھا ہے۔ امیر خسرو نے پگڑی کو پاگ کے بجائے پگ لکھا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی میں بھانڈ کو بھنڈ لکھا ہے۔

ایک زمانے میں برج بھاشا اور پنجابی لہجہ کا سخت مقابلہ رہا اور دونوں طرح ایک لفظ بولا جاتا تھا مثلاً بازار بزار۔ مگر آخر کار بعض الفاظ میں پنجابی تلفظ قبول کیا گیا۔ مثلاً چپاتی گھنٹی وغیرہ۔ اور بعض الفاظ میں برج کے تلفظ کو ترجیح دی گئی۔ -

— برج بھاشا اصل میں تو متھرا کے ضلع میں بولی جاتی تھی۔ مگر اس کے بعد اس کے مضافات میں پھیلتی گئی اور اس کا حلقہ بہت دور تک پھیل گیا مسلمان

کے عہد میں اس زبان کی وسعت اور بڑھ گئی مسلمان اس
کو صرف بھا کا یا بھاشا کہتے تھے۔ اور برج کا لفظ حذف
کر دیا کرتے تھے۔ بھاشا کی شاعری نہایت دل پذیر تھی۔
مسلمان شعرا نے بھی اس میں طبع آزمائی کی اور اس طرح
مسلمان تین زبانیں استعمال کرتے تھے۔ پہلی فارسی جس میں
تاریخ نویسی کے علاوہ شعر و ادب کے لئے بھی استعمال
کرتے تھے۔ دوسری اردو جس کو پنجاب سے اپنے ساتھ
لائے تھے۔ تیسری بھا کا یا بھاشا جس کی دلآویز موسیقی
نے ان کو اس کے اوپر آمادہ کیا کہ شعر گوئی اسی زبان
میں کریں۔ اس زمانہ میں اس کو گوالیاری کہتے تھے۔ خلجیوں
کے عہد سے فارسی رو بہ زوال ہو گئی۔ کیونکہ وہ عام
طور پر نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اور اس کی جگہ بھاشا کا رواج
ہو گیا۔

۱؎ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی کتاب داستان اردو
میں اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اردو کی صورتیں قدیم
میں لہنداوہ پنجابی سے ماخوذ نہیں ہیں حالانکہ شیرانی کا
مقصد ہے کہ دونوں زبانوں میں مشابہت اس طرح قائم
ہوتی ہے کہ ابدال کا قاعدہ عام ہے۔ مثلاً جہاں اردو
میں سین ہے پنجابی میں "ہ" ہے۔ یہ دعویٰ نہیں ہے کہ

ہ، کی شکل قدیم ہے۔ اس کی اصل صورت متعین کرنے کے لیے پرانی زبان کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ مثلاً اردو میں "کا" اور پنجابی میں "دا" ہم معنی ہیں۔ مشابہت ثابت کرنے کو اتنا کافی ہے۔ لہٰذا لسانی قدامت کا پتہ لگانے کے لئے اس کی اصل کا سراغ لگانا ضروری ہے۔ پروفیسر شیرانی کا دعویٰ صرف اتنا ہے کہ اردوئے قدیم پنجابی سے زیادہ مشابہ تھی رفتہ رفتہ برج کے اثر سے اردو پنجابی سے بالکل مختلف ہو گئی۔

برج میں مصدر "لو" یا "دو" یا "نو" آخر میں لگانے سے بنتا ہے۔ مثلاً ہوبو ہونا بوجھو بوجھنا چلنو چلنا۔ اسماء افعال اور صفات کے آخر میں ایک واو مجہول اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً اپنو اپنا ہمارو ہمارا۔ یا واؤ معروف بڑھا دیا جاتا ہے جیسے نسبتِ مستقبل میں "گا" کے بجائے "گو" مثلاً ماروں گو ماروں گا۔ لیکن زیادہ رائج شکل ماروں یا مارے ہوں ہے۔ "ہے" کی گردان اردو برج اور پنجابی میں یکساں ہے۔ تھا کی تعریف برج میں مختلف ہے یعنی واحد مذکر "ہو"

جمع ہے" مونث "ہی" "ہیں"۔

ماضی نا تمام میں بجائے "تھا" "ہو" لاتے ہیں۔
جمع کے لئے بالعموم اسم کے آخر میں ایک نون کا
اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً کان کانن پھول پھولن
وغیرہ۔

ظرف کے لئے اسم کے آخر میں "یا" لاتے ہیں مثلاً
گھر سے گھرے یعنی گھر میں "ن" "نی" "نون" بغرض
جارہ آخر میں لگا دیتے ہیں۔ مثلاً بھوکن بھوکنی۔ اور
بھوکنوں یعنی بھوک سے۔

"کا" اور "کے" کی جگہ "کو" آتا ہے۔ مثلاً گل پھولن
کو ہار یعنی گلے میں پھولوں کا ہار۔

مجہول کا کم رواج ہے۔ لاحقہ "نے" اکثر اوقات
افعال لازمی کے ساتھ بر خلاف اردو اور پنجابی کے)
مستعمل ہے مثلاً لوہڑے بیٹا نے چلیو یعنی چھوٹا بیٹا
چلا۔

واؤ اکثر میم سے بدل جاتی ہے۔ آمتو آوتا یعنی آتا۔

اردو میں صفت موصوف دونوں منصرف ہوتے
ہیں۔ برج میں صرف صفت منصرف ہوتی ہے۔ مثلاً کالے
گھوڑا کو زین کی ہے۔

ردو کی "لام" برج" میں "رے" سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً چلنا۔ جرنا۔ اردو کی "ڑے" ہداے مہملہ سے بدل جاتی ہے مثلاً رڑی لری۔ یا "ڈال سے بدلتی ہے۔ جیسے گاڑی گاڈی۔

شہر دہلی میں اگرچہ اردو بولی جاتی ہے۔ لیکن آس پاس کے دیہات میں ہریانی موجود ہے۔ جو اردوئے قدیم کی ایک شکل ہے۔ یہ نظریہ کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ اس عقیدے پر مبنی ہے کہ قدیم زمانوں میں دہلی میں برج زبان بولی جاتی تھی حالانکہ آج دہلی برج کے علاقے سے قصہ پارینہ ہے۔ مسلمانی عہد سے بیشتر ممکن ہے کہ دہلی میں برج کا رواج ہو۔ لیکن اردو پر برج کے اثرات کی توجیہ اور طرح سے کی جاتی ہے۔ سکندر لودھی کے عہد سے شاہجہاں کے زمانے تک آگرہ لودھیوں۔ سوریوں اور مغلوں کا پایۂ تخت تھا جو برج کے علاقہ میں واقع ہے

حافظ شیرانی نے اہم امور کی طرف توجہ دلائی ہے

پنجاب میں اردو از صفحہ ۷ تا ۱۰۹۔

اور اپنے ہر دعوے کے ساتھ دلیل پیش کی ہے۔ مگر
کچھ امور مبہم رہ گئے ہیں۔ مثلاً شیرانی نے سندھ میں نئی
زبان کے پیدا ہونے کا امکان تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ نئی
زبان سندھ ہی میں وجود میں آئی۔ محمد بن قاسم کے
عہد میں بحر عرب سے کشمیر تک جو وسیع علاقہ پھیلا ہوا ہے
اس کو سندھ کہتے ہیں۔ محمد بن قاسم نے اس کل علاقہ
کو زیر نگیں کیا۔ مگر اس کے جانشین اس پورے علاقہ
پر قابض نہ رہ سکے۔ اور جب آل عباس کی مرکزی
حکومت کمزور ہو گئی۔ اور وہاں سے مسلمانوں کی کمک
آنی بند ہو گئی اور یہاں ہندوؤں نے سرکشی کی تو
مسلمان منصورہ وغیرہ میں محدود ہو کر رہ گئے۔ مگر
باوجود اس کے اسلام کا اثر اتنا پختہ تھا کہ وہاں کے
باشندوں کی اکثریت آج تک مسلمان ہے۔ اور یہاں
کی مقامی بولی جو دراچڈی کہلاتی تھی۔ مسلمانوں
کی زبان ہے۔ اور آجکل سندھی کہلاتی ہے۔

در وغیرہ سے مسلمانوں کی آمد چوتھی صدی ہجری
میں شروع ہوئی اور پہلے فوجی ضروریات
سے بعد ازاں سیاسی ضروریات سے مسلمانوں
نے یہاں کی مقامی زبانیں سیکھیں۔ اور

حسب معمول یہاں کی زبانوں میں تغیرات ہوئے
مگر جب دہلی اور آگرہ دارالحکومت ہوئے تو وہاں
کی مقامی بولیوں کا اثر بھی اردو پر پڑا ۔ اور جو
زبان حدود پنجاب میں تشکیل پا چکی تھی اس سے
وہاں کی زبان مختلف ہو گئی ۔ اور یہ تبدیلی اس دعوے
کی دلیل ہے کہ اردو کی اساس صرف ایک زبان
نہیں ہے ۔ بلکہ اس برصغیر کی بولی جانے والی ہر
زبان سے کسی کا اثر زیادہ ہے اور کسی کا کم ہے
پروفیسر شیرانی کا یہ بیان تسلیم نہیں کیا جاتا کہ
دوسری زبانیں بھی اردو کے پرتو سے خالی نہیں
وہ اردو نہیں فارسی کا پرتو ہے ۔ مرہٹی گجراتی ننگلہ
سندھی وغیرہ ہر زبان میں فارسی عربی کے الفاظ کی
آمیزش ہوئی ۔ مگر یہ مسلمانوں کا اثر ہے ۔
یہ درست ہے کہ ابتدا میں یہ غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی
زبان تھی ۔ اسی وجہ سے اس کو برج بھاشا کہتے تھے
اور بعد کو ریختہ کہنے لگے ۔
غزنوی اور غوری اگرچہ افغان تھے ۔ مگر وہ
فارسی سے متاثر تھے ۔ آسان زبان ہونے کے باعث
وہی زبان مشرقی ممالک کی عام زبان تھی ۔ اور وہی

پاکستان و ہندوستان کے علاقوں کی دفتری زبان قرار دی گئی۔

مسعود سعد سلمان کا بارہ ماسہ وغیرہ۔ سہ

ہر روز ز روز عید بہ ہر شب شب برات

کی تفصیل ہے۔ البتہ شہر آشوب میں مقامی اثر ہے وجہ یہ ہے کہ دیگر ممالک میں پیشہ بہ طور میراث نہیں چلتا ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق پیشہ اختیار کر سکتا ہے لہذا اقتصادی بد حالی سے افراد دوچار ہوتے ہیں۔ تمام اہل حرفہ نہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں پیشہ میں وراثت ہے۔ دھوبی کا بیٹا دھوبی ہی ہوگا اور موچی کا بیٹا موچی ہی رہے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر اہل حرفہ بد حال رہتے ہیں کیونکہ وہ دوسرا پیشہ اختیار نہیں کر سکتے اور اس پیشہ میں ان کا گذر نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے دیگر ممالک میں شہر آشوب نہیں لکھے جا سکتے۔ البتہ جب کبھی کسی حملہ آور کا استیلا ہوا۔ تو لوگوں نے مرثیے وغیرہ لکھے۔ سقوط بغداد کے موقع پر سعدی نے نہایت معرکۃ الآرا مرثیہ لکھا۔ جس کے دو شعر یہاں نقل

کے جاتے ہیں سہ

آسمان را حق بود گر خوں بہ بارد بر زمین
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین
اے محمد گر قیامت سر بروں آری ز خاک
سر بروں آر و قیامت درمیان خلق بیں

اس برصغیر میں ہمیشہ دار الحکومت بدلتا رہا ہے
مگر کبھی پوری آبادی نے انتقال وطن نہیں کیا۔ اس
لئے قطب الدین ایبک یا خضر خاں وغیرہ کے دہلی
آنے پر ایک کثیر آبادی کا ہجرت کرنا ثبوت طلب
ہے۔ چونکہ یہ واقعات امور تاریخی سے تعلق رکھتے
ہیں۔ لہذا ان کی تائید میں روایت ہونی چاہیئے محمد
تغلق نے جب اس قسم کا حکم دیا تو خاص طور سے تاریخ
میں نقل کیا گیا۔ اور پھر یہ کہ ان کی تعداد اہل دہلی
سے زیادہ ہو یا موثر اقلیت ہو۔ موثر ہونا تو تسلیم
کیا جا سکتا ہے۔ مگر تعداد مشکوک ہے۔ پس ایسی
صورت میں استدلال غلط ہے قطب الدین ایبک کے
رفقا میں پنجابیوں کے عنصر کا زیادہ ہونا ثابت
نہیں بلکہ اس کا قرینہ ہے کہ وہ لوگ زیادہ تر
بیرونی تھے۔

ادبیات دکنی کی زبان میں عہد تغلق کا پرتو ضرور ہے۔ مگر ساتھ ہی جنوبی ہند کی زبانوں کا اثر بھی ہے۔ اسی وجہ سے جب یہ زبان شمالی ہند میں پہونچی اور وہاں کے محاورہ کے خلاف الفاظ نظر آئے تو وہ زبان سے خارج کئے گئے اور احتراماً ان کو متروکات کہا گیا۔ شاہ حاتم کے ذہن میں دہلی کا محاورہ جنوبی ہند کی کتابی زبان سے مختلف نظر آیا اس پر انہوں نے متروک کا حکم لگایا۔ ورنہ ان متروکات میں تقریباً ہر لفظ آج بھی جنوبی ہند کے محاورہ میں موجود ہے۔

محمد تغلق کے زمانہ میں اہل دہلی کی خانہ دوستی ہی نہیں صعوبات سفر بھی ہلاکت کا سبب ہوئیں۔ مگر ان لوگوں کا بادل نخواستہ اس سفر پر آمادہ ہونا ہی اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس طریقہ ترک وطن پر لوگ آسانی سے تیار نہیں ہوتے لہذا قطب الدین ایبک یا خضر خان کے ساتھ کبھی کوئی بڑی جماعت دہلی میں جا کر ہمیشہ کے لئے متوطن نہیں ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ ایبک کے ساتھ اس کے فوجی تھے۔ یا ان کی وجہ سے کچھ بنجارے۔ اور وہ مستقل سکونت کی نیت سے

وہاں نہیں گئے۔ اور جب اپنی خدمت سے سبکدوش ہوئے پھر اپنے وطن چلے گئے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ انفرادی طور سے وہاں مسکین گزیں ہو گئے ہوں۔ اس سے کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ حقیقت الامر یہ ہے کہ اسلامی فتوحات کے پہلو بہ پہلو اسلام کے مبلغین ہندوں میں تبلیغ کرتے تھے۔ ان کے اثر سے ہزاروں آدمی حلقہ بگوش اسلام ہوتے تھے یہ نومسلم اپنی زبان بولتے تھے۔ مگر خود کو ہندوں سے اعلیٰ سمجھنے کے باعث فارسی عربی الفاظ کی آمیزش اپنی زبان میں کرتے تھے۔ جس طرح ہمارے زمانے کے عیسائی یا اینگلو انڈین۔ جو انگریزی بول کر رعب ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح اس زمانے کے مسلمانوں نے مقامی بولی ترک کرنا چاہی اور درست فارسی نہ آئی اس لئے ایک مخلوط زبان پیدا ہو گئی جس کو انگریز دوغلی زبان کہتے تھے۔

شیرانی لہندا اور مشرقی پنجابی کو ایک ہی خاندان کی زبان قرار دیتے ہیں۔ اس کی تائید مثالوں سے ضروری تھی۔ مگر شیرانی نے اس اہم فرض کی ادائیگی سے کوتاہی کی مگر سندھ کے خیال میں لہندا کا تعلق سندھی سے ہے اور پنجابی کا مغربی ہندی سے۔ اس نظریہ کو اس وقت

تک ترک نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کے خلاف
شواہد پیش نہ کئے جائیں۔

اٹھارویں صدی سے پہلے (کی پنجابی) میں جو کچھ حوالہ
قرطاس کیا گیا ہے۔ اس کی ادبی اہمیت محل نظر ہے
معجزہ آل نبی معجزہ ہرنی وفات نامہ نور نامہ جنگ نامہ
محمد حنیف وغیرہ قسم کی کتابیں کبھی ادبیات میں شمار نہیں
کی گئیں۔ عہد عالم گیر تک اس قسم کی تصنیفات موجود ہیں
البتہ اس عہد کے بعد ہیر رانجھا وارث شاہ کی اہمیت
سے انکار نہیں۔ اسی طرح سندھی میں شاہ جو رسالو سے
پہلے کوئی قابل ذکر ادبی تخلیق وجود میں نہیں آئی۔

قواعد کے جتنے ضابطے شیرانی نے قلم بند کئے ہیں
مغربی ہندی کے قریب قریب ہر شاخ میں ان پر عمل درآمد
ہوتا ہے۔ پس صرف پنجابی کا اثر نہیں کہا جا سکتا بعد کے محققین
نے اسی وجہ سے سورسینی پراکرت کو اردو کا ماخذ قرار
دیا ہے چونکہ پنجابی بھی سورسینی خاندان سے تعلق
رکھتی ہے۔ اس لئے وہ بھی ان قواعد کی پابند ہے۔ مگر اس
کا مقصد یہ نہیں کہ اس امر کا انکار کیا جاتا ہے کہ اردو
کی ابتدائی تشکیل اس علاقہ میں ہوئی جو پنجاب میں شامل
ہے۔ جب اردو دہلی میں بولی جانے لگی تو وہاں جو

زبان بولی جا رہی تھی اس کے قواعد کے سانچے میں ڈھل گئی۔ اور جو ترکیبیں پنجابی یا دکنی کے اثر سے اس زبان میں موجود تھیں۔ وہ خود بخود خارج ہو گئیں۔ اور یہ امر اس پر دلالت کرتا ہے کہ پنجابی کے علاوہ دوسری زبانیں بھی اپنا اثر ڈال رہی تھیں۔ صیغوں کا فرق اصلاحی کوششوں کا نتیجہ نہیں بلکہ مقامی زبان کا اثر ہے۔ اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے متروکات خواہ تصریف میں ہوں یا الفاظ ہیں یا ترکیب میں۔ وہی ہیں جو مقامی زبان کے مخالف تھے۔ یہ قواعد میں ابتری نہیں ہوئی۔ بلکہ مقامی زبان کا تقاضا یہی تھا کہ بے قاعدگی کو زبان سے دور کیا جائے اور جہاں قواعد میں یا الفاظ میں یا تراکیب میں یکسانیت تھی اس کو علی حالہ رہنے دیا۔ اور کہیں کہیں دونوں صورتوں کو قائم رکھا۔

گھڑا اور گھڑا کے متعلق شیرانی کی توجیہ کی ہمنوائی کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ شیرانی نے بہت سے الفاظ کی فہرست دی ہے۔ جو اردو میں لطور تابع استعمال ہوتے ہیں۔ مگر پنجابی میں بامعنی کلمات ہیں آزاد نے بھی اس طرف توجہ دلائی تھی اور یہ لکھا تھا کہ چٹا تنہا مستعمل نہیں یہ درست ہے کہ پنجابی میں ان کے معنی ہیں اور یہ مفرد استعمال ہوتے

ہیں مگر اردو محاورے میں یہ توابع ہی رہیں گے۔ بہت سے متجانس الفاظ ساتھ بولے جاتے ہیں ان میں سے ہر ایک تابع کا بے معنی ہونا ضروری نہیں مثلاً چلتے پھرتے یہاں سے بھی گزرے۔ تانگا۔ اردو میں گھوڑے کی ایک خاص قسم کی گاڑی کو کہتے ہیں۔ دہاڑا تو نہیں البتہ دہاڑی روزانہ اجرت کے لئے اب رواج پا رہا ہے بھجنگ کالا کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ دونوں لفظوں کے معنی سانپ کے ہیں۔

الفاظ کے آخر میں "ی" کا اضافہ دکنی میں تھا۔ بلکہ جنوبی ہند میں آج تک رواج پذیر ہے۔ البتہ شمالی ہند میں عام گفتگو میں کبھی مروج نہ ہوا۔ اسی وجہ سے آتش نے جب محرشی لکھا تو اس پر اعتراض کیا گیا۔ کیا آتش سے غلطی نہیں ہو سکتی؟ آتش کی غلطیوں پر بعض لوگوں نے مبسوط مضامین لکھے ہیں۔

جس طرح پنجابی میں حالت ظرفی و مجروری لاحقہ کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ اسی طرح اس برصغیر کی تمام آریائی زبانوں میں فاعلی و مفعولی غرض ہر حالت لاحقات کے ذریعہ ظاہر کی جاتی ہے۔ سنسکرت میں آٹھ حالتیں ہوتی ہیں اور ہر ایک حالت لاحقے کے ذریعہ ظاہر کی جاتی ہے

اردو اس معاملہ میں منفرد ہے۔ اسی لئے یہ کہنا درست ہے کہ افعال لازمی کے ساتھ فاعلی اور افعال متعدی کے ساتھ مفعولی حالتیں تو فعل سے متعلق ہیں اور باقی حالتیں حروف مغیرہ کی مرہون منت ہیں۔ مثلاً

ہوا چلی۔ گھوڑا دوڑا۔ ریل گاڑی آئی۔ زید مر گیا وغیرہ

خالد نے خط لکھا۔ زینب نے روٹی کھا لی۔ طالب علم نے کتاب پڑھی۔ رقیہ نے کھلونا لیا۔ وغیرہ۔

حروف مغیرہ کے اثرات فاعلی صورت اور بر جگہ ہے۔

مفعولی صورت "کو" کے ساتھ۔

خالد نے بیٹے کو روپیہ دیا۔ شکیلہ نے اپنے شوہر کو دیکھا۔ عورتوں نے زینب کو مارا۔ کچھ مردوں نے زینب کو بچایا۔

آلی صورت "سے" کے ساتھ۔

خالد نے قلم سے کاغذ پر دستخط کئے۔ مزدور نے پھاوڑے سے زمین کھود دی۔

ظرفی صورت "میں" کے ساتھ۔

اس مکان میں رقیہ رہتی ہے۔ چار مہینہ میں لڑائی

ختم ہو جائے گی۔

انہی پہ دوسری صورتوں کو قیاس کر لیا جائے۔
اس لئے اہل قواعد کا ان کو فعل سے متعلق کہنا غلط ہے
اور عربی سنسکرت یا انگریزی کی بے جا تقلید ہے۔ ان
سب صورتوں میں یہ مجرد ذات ہیں۔

یہ تسلیم ہے کہ پنجابی کے بعض مصادر قدیم اردو میں
پائے جاتے ہیں۔ مگر دکنی میں بہت سے مصادر ایسے
ہیں۔ جو پنجابی میں نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جنوبی
ہند کے الفاظ ہیں اس لئے شمالی ہند میں مستعمل نہیں۔
مثلاً اجنا اچھنا۔ یعنی اٹھنا۔ اڑکنا یعنی اٹکنا۔ بکنا یعنی کھلنا
بلکنا یعنی ہاتھ سے پھاڑنا۔ چکنا ٹپکنا۔ دسنا دکھائی دینا
نکسنا نکلنا وغیرہ۔

اسی طرح دوسرے الفاظ بھی آج اجنبی معلوم
ہوتے ہیں مثلاً نس دات کبُل سخت۔ اچھے ہے۔ اکنگ
تنہا۔ بالا بہانہ۔ بھت نگ سادہ برح وغیرہ۔

جس طرح پنجابی کی 'واؤ' اردو میں 'ب' سے تبدیل
ہوتی ہے۔ اسی طرح ہندی کی "واؤ" بھی 'ب' بن جاتی
ہے۔ بلکہ اکثر الفاظ میں ہندی میں دونوں تلفظ ہیں جس
سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو مغربی ہندی سے ان الفاظ

کو اخذ کر رہی ہے۔ مثلاً دس دش بس (زہر) دلیس بلیس
اس باب کے شروع میں ایسے چند الفاظ دئے جا چکے ہیں
مسلمانوں میں تین زبانوں کے رواج پا
جاتے ہیں۔ تامل کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ
مسلمانوں کی بھاشا اردو سے علیحدہ وجود نہیں رکھتی تھی
جو زبان بولتے تھے سی میں شاعری کرتے تھے اتفاق
سے اس زمانے میں وہ بھاشا تھی مگر علمی اور دفتری زبان
فارسی تھی۔ اس زمانے کی بھاشا ہی شمالی ہند کی قدیم اردو
ہے اس کے علاوہ کسی اور زبان کا دعوی کرنا ثبوت
چاہتا ہے۔

بہرحال شیرانی سے جہاں تک محاسن ہوئے۔ وہ اس
پر موقوف تھے۔ کہ پنجابی اور اردو کو متحد ثابت کیا جائے
اس دعوے سے تو اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ مگر صرف پنجابی
کو اس کی اساس بتانا غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان
پہلی صدی کے آخر میں براہ مکران راجہ داہر کے علاقہ
میں داخل ہوئے۔ یہ پورا علاقہ آج کل مغربی پاکستان
میں شامل ہے۔ بلکہ یہ سمجھ لیا جائے کہ کل مغربی پاکستان
ہے۔ یہاں کے بیشتر علاقے پر مسلمان قابض و متصرف
رہے۔ پہلے فوجی ضرورت سے پھر دفتر کی ضرورت

سے یہاں کی زبانیں سیکھیں۔ وہ زبانیں ضرور دراجڈی اور لہندا تھیں۔ ان زبانوں میں تصرفات ہو کر نئی زبانیں وجود میں آئیں۔ محمود غزنوی کو جہاں مشرکین سے معرکہ آرائی کرنی پڑی وہیں اس نے مبتدعین سے بھی جہاد کیا۔ اس کے عہد میں ملتان ابوالفتوح قرمطی کے زیر نگیں تھا۔ سلطان نے اس کو ہزیمت دے کر گرفتار کیا۔ اس کے عہد تک برصغیر میں عربی تمدن کا غلبہ تھا۔ اب درہ خیبر سے ایرانی آمیز ترکی تمدن پہنچا۔ اور عربی کے بجائے فارسی کا اثر پڑنا شروع ہوا۔ آل غزنہ کے زمانے میں جو زبان ترقی پا رہی تھی وہ آل شنسب کے زمانے میں اور آگے بڑھی۔ اور اس کا حلقہ اثر دہلی سے لے کر بنگال تک ہو گیا۔ اب یہاں کی زبانیں بھی فارسی سے متاثر ہوئیں۔ لبعد ازاں خلجی عہد میں دکن مفتوح ہوا۔ اور وہاں کی زبانوں پر بھی فارسی کے اثرات پڑنے لگے۔ تغلقوں کے عہد میں دکن میں بہمنی سلطنت قائم ہوئی۔ جو بعد کو پانچ ریاستوں میں منقسم ہو گئی۔ اور اس طرح شمالی ہند سے اس کے تعلقات منقطع ہو گئے۔ اب گو مسلمان زماں روا تھے۔ مگر رعایا کی اکثریت ہندو تھی۔ اس لئے ادبیات کی سرپرستی وہاں کے فرماں رواؤں نے کی۔ جب اورنگ زیب نے دکن کی ریاستوں

کو ختم کیا تو دو بارہ فارسی کی ترویج مشکل ہو گئی۔ بلکہ شمالی ہند میں بھی فارسی میں ضعف آگیا۔ در شمالی ہند کے ادیبوں نے بھی ملکی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ قرار دیا۔

یہ یاد رہے کہ صرف فاتحین ہی کا اثر نہیں پڑا کرتا بلکہ مفتوحین کا بھی اثر پڑتا ہے۔ اور اگر مفتوحین کی تعداد زیادہ ہو یا ان کو ثقافتی برتری حاصل ہو تو فاتحین ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ چنگیز خاں۔ اور ہلاکو کس طرح دنیائے اسلام پر چھا گئے۔ یہاں تک کہ سقوط بغداد نے تمام اہل اسلام کے قلوب کو مجروح کر دیا۔ مگر اسی خاندان کے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اور بقول اقبال ؎

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے

اس خاندان کی ایک شاخ نے خادم الحرمین الشریفین ہونے پر فخر کیا۔ دوسری شاخ نے ہندوستان میں اسلامی پرچم کو بلند کیا۔ اور انہی کی سرپرستی میں اردو پروان چڑھی۔

یہ مسلم ہے کہ اردو قدیم نام نہیں ہے۔ اور اس برصغیر کی قریب قریب سب زبانیں کم و بیش عربی فارسی سے متاثر ہوئی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک زبان کو خاص طور سے اردو کہنے لگے۔ اور دوسری زبانیں محروم رہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شورسینی پراکرت سب سے زیادہ متاثر ہوئی۔ اس لئے جب وہ

اس قدر بدل گئی کہ اصل زبانوں سے بالکل مختلف ہو گئی تو اس کا نام ہندی و ہندوی سے بدل کر ریختہ اور بعد ازاں اردو رکھا گیا۔

رام بابو سکسینہ نے جو نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کا خلاصہ ان کے مترجم مرزا محمد عسکری کے الفاظ میں یہ ہے۔

زبان اردو اس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی جس کا تعلق شورسینی پراکرت سے بلاواسطہ تھا۔ یہ بھاشا جس کو مغربی ہندی کہنا بجا ہے۔ زبان اردو کی اصل ہے۔ گو کہ "اردو" کا نام اس زبان کو ایک عرصہ دراز کے بعد دیا گیا۔ زبان اردو کی صرف و نحو محاورات اور کثرت سے ہندی کے الفاظ کا اس میں استعمال ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی۔ اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی عام زبان بن گئی جس کی وجہ یہ ہوئی کہ دہلی جو اس زبان کا مرکز تھا مسلمان حملہ آوروں اور بادشاہوں کا جائے ورود اور ان کا دار السلطنت بنا ہوا تھا۔ پس یہ خیال کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ جس میں وہ سب زبانیں داخل ہیں جو کسی زمانے میں دہلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھیں صحیح نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ لشکر یا بازار سے اس زبان کو اس قدر تعلق تھا۔ کہ اس کا نام ہی "اردو" ہو گیا۔ جس کو زبان ترکی میں لشکر کہتے ہیں۔

اس زمانے میں انگریزی تقلید میں اردو کو ہندوستانی کہتے ہیں
مگر یہ لفظ صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح برج بھاشا کو اردو کا ماخذ قرار
دینا صحیح نہیں ہے۔ اردو کا اصلی ماخذ مغربی ہندی کی ایک شاخ
کو سمجھنا چاہیے جو شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی۔ مگر زمانۂ حال
کی "ہندی" اردو سے پیدا ہوئی ہے۔ یعنی فارسی الفاظ نکال کر
ان کی جگہ سنسکرت کے لفظ رکھ دیئے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ
زمانے کی ادبی اردو اور ادبی ہندی میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا

شروع میں یہ زبان نہایت سادہ تھی۔ جوں جوں ایک ادبی
زبان بنتی گئی اسی قدر اس میں فارسی اور عربی ورثہ کی الفاظ شامل
ہوتے گئے۔ اس کے ساتھ فارسی رسم الخط بھی کچھ تھوڑی سی
ترمیم کے ساتھ ہندی کی جگہ پر رائج ہو چلا۔ شاعری پر بھی فارسی
کا بڑا اثر پڑا۔ فارسی بحریں استعمال ہونے لگیں۔ طرز زبان وغیرہ
بھی فارسی سے لیا گیا۔

مسلمان بہ حیثیت فاتح ہندوستان میں آئے اور فارسی جو ان
کی مادری زبان تھی ہندوستان کی شاہی زبان بن گئی۔ جس کا نتیجہ
یہ ہوا کہ دیسی زبان مثل خادمہ کے اپنی مالکہ زبان فارسی کی خدمت
کرنے لگی۔ جدت پسند طبیعتوں نے نئی زبان کی طرف رخ کیا اور
اس کو نہایت شوق سے سیکھنے لگے۔ اسی وجہ سے قدیم ہندی شعرا
کی تصانیف میں فارسی الفاظ کی کثرت تعجب خیز معلوم ہوتی ہے

مثلاً چند کوی کی "پرتھی راج راسو" فارسی الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔
فاتح کا اثر مفتوح پر زیادہ ہوا کرتا ہے۔ پس مفتوح قوم کی دیسی زبان یعنی ہندی پر فارسی کا بہت بڑا اثر پڑنے لگا۔ مگر ہندی نے اپنا اثر فارسی پر کم ڈالا۔ کیونکہ فارسی کے زبان داں اپنی زبان کو اس قسم کی آمیزش سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں ایک ہندو وزیر مال کی تاکید سے ایک حکم جاری کیا گیا۔ کہ ہر سرکاری ملازم کو فارسی سیکھنا ضروری ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ فارسی عربی الفاظ بڑے شوق سے بولنے لگے۔ کیونکہ ان سے بولنے والے تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے۔
اردو میں فارسی الفاظ کی کثرت کے کئی اسباب ہیں مسلمان جب اس ملک میں آئے تو اپنے ساتھ بہت سی نئی چیزوں کے نام لائے جن کے حروف سنسکرت یا دیسی بھاشا میں نہیں مل سکتے تھے اس لئے فارسی الفاظ زبان میں داخل کرنا پڑے۔ کیونکہ مفتوح اپنے مالکوں کو زیادہ خوش رکھنا چاہتے تھے۔ لہذا انہوں نے ان کو خوش کرنے کے لئے ان کی زبان سے زیادہ اخذ کیا۔ بہ نسبت اس کے ان کے مالکوں نے ان کی زبان سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ اظہار قابلیت کے لئے بھی عربی فارسی الفاظ کثرت سے بولے جانے لگے۔ اردو کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ شاعری فارسی داں لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ لوگ زبان ہندی بہت کم جانتے تھے۔ اور سنسکرت

سے بالکل ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے یہ ہونہار بچہ اپنے حقیقی والدین
سے جدا ہو کر اپنے مصنوعی والدین کی آغوش محبت میں تربیت پاتا رہا۔
یہ ضرور ہوا کہ فارسی کے اثر سے اردو ایک مستقل زبان کی شکل میں
آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ لیکن اس کا افسوس بھی ہوتا ہے کہ
اصلی زبان کی خوبیاں فنا ہو گئیں [1]

ان میں سے بعض امور پر تبصرہ اوپر آچکا ہے۔ اگر مالکوں کو
خوش کرنا ہی مقصود تھا تو سنسکرت میں تبدیلی کیوں نہیں کی۔ حقیقت
یہ ہے کہ سنسکرت بولنے والے ہمیشہ عوام الناس سے علیحدہ رہے
انہوں نے مسلمانوں کو ہمیشہ ملکش سمجھا۔ ان کی زبان کے الفاظ سے اپنی
زبان کو آلودہ کرنا پاپ جانا اس لئے دیو بانی زبان سنسکرت کی
کسی تصنیف میں ایک لفظ بھی عربی فارسی ترکی کا نہیں آنے دیا۔ عوام
الناس کی زبان پر ان کا قابو نہ تھا۔ کیونکہ اس کے بولنے والے برہمنوں
کے تشدد سے بچنے کے لئے اسلام کی آغوش میں پناہ لے رہے تھے۔

مفتوحین کو اپنے فاتحین کی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی
بلکہ فاتحین کو اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لئے اور مفتوحین کی سازشوں
کو ناکام بنانے کے لئے ان کی زبان سیکھنا پڑتی ہے۔ صدر اسلام
میں ایک مدت تک رومی اور فارسی زبان میں دفتری کارروائی ہوتی

---

[1] تاریخ ادب اردو نولکشور بار سوم از صفحہ ۱ تا صفحہ ۷۔

ربی عبدالملک ابن مروان کے عہد میں تمام ممالک محروسہ کے انتظام میں یکسانی پیدا کرنے کے لئے عربی کو دفتری زبان قرار دیا گیا۔ اسی طرح اس برصغیر ہندی میں کاغذات مال رکھے جاتے تھے مگر ہندوؤں کی بے ایمانی سے راجہ ٹوڈرمل کی حقہ واقف تھا۔ لہذا اس نے ان کاغذات کو فارسی میں لکھنے کا حکم دیا۔ مگر پھر بھی کاغذات مال انہی ہندوں کے ہاتھ میں رہے۔ اور پٹواری جس طرح اندراج کرتے ہیں۔ جن کی بنا پر ہزاروں مقدمات دائر ہوتے رہتے ہیں۔ اسکا بیان غیر ضروری ہے۔ یہ کہنا کہ مسلمان ہندی بہت کم جانتے تھے۔ [illegible] ہے۔ بلکہ ان میں سے بیشتر خاندانوں کی مادری زبان یہیں کی دیسی زبانیں تھیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ سکسینہ نے کوئی نئی بات نہیں کی پرانی باتوں کا اعادہ کر دیا ہے۔ اور شیرانی نے ثابت کر دیا کہ [illegible] نی راج رَسو کا بڑا حصہ جعلی ہے۔ لہذا اس سے استدلال غلط ہے۔

پروفیسر مسعود حسین نے اپنی کتاب تاریخ زبان اردو میں اپنا نظریہ اس طرح پیش کیا ہے کہ جو لوگ لسانیات سے ناواقف ہیں وہ اردو کو ایک کھچڑی زبان کہتے ہیں۔ جو عربی فارسی۔ ترکی۔ ہندی کے اختلاط سے پیدا ہوئی۔ مگر سب سے پہلے آزاد نے اس امر کی کوشش کی کہ اس زبان کا پتہ لگایا جائے جو ترقی پاکر اردو کے

نام سے موسوم ہوئی۔ ان کے علاوہ جو نظریات ہیں یعنی اردو کا مولد و منشا
دکن یا سندھ یا گجرات ہے یہ غلط ہے۔ سب سے پہلے گریرسن
نے ہند آریائی زبانوں پر تحقیقی کام کیا۔ اور ان کے باہمی رشتے معلوم
کیے۔ مگر بعض جگہ اس سے تسامحات ہوئے مثلاً اس نے کھڑی بولی
کو مستقل زبان تسلیم کیا ہے۔ مگر یہ غلط ہے۔ اسی طرح کہنا کہ کھڑی بولی
برج بھاشا اور پنجابی کی آمیزش سے پیدا ہوئی درست نہیں۔
پروفیسر شیرانی نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا۔ مگر چونکہ دہلی
کی قدیم زبان کے متعلق قیاسات سے کام لیا ہے۔ اس
لئے ان سے بھی غلطیاں ہوئیں۔ زبان اردو کی تاریخ لکھنے کے
لئے نواح دہلی کی بولیوں پر نگاہ ہونی چاہیئے۔ اور ان کا
مقابلہ پنجابی برج بھاشا اور راجستھانی سے بھی کرنا چاہیے

اردو زبان ہند یوروپی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر یہ
ضروری نہیں ہے کہ یہ لوگ ایک ہی نسل سے ہوں۔ ان کو عام طور سے آریا
کہا جاتا ہے۔ مگر یہ لوگ سب سے پہلے کہاں آباد تھے۔ اور ان کا اصلی وطن
کہاں ہے۔ اس پر ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ غالباً ان کا وطن وسط ایشیا
میں تھا۔ ہیوگو ونکلر کو ۱۹۰۷ء میں کچھ ایسی دریافتیں ہوئیں جن سے اس نظریہ کی مزید
تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں اندر، ورن دیوتاؤں کے نام ملتے ہیں۔ بہرحال
تقریباً دو ہزار قبل مسیح میں یہ لوگ ایشیا میں داخل ہوئے اور اس سے تقریباً
پانچ سو سال بعد ہندوستان میں۔ یہاں ان کا مقابلہ دراویدی قوم سے

ہوا جن پر آریا غالب آ گئے۔ دراویدی تمدن کی لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اس لئے آریا ان سے متاثر ہوئے۔ مگر چونکہ خود فاتح تھے اس لئے ان کا اثر بھی یہاں کے تمدن پر پڑا۔ اور اس طرح ایک نئے تمدن کی بنیاد پڑی۔ گو شمالی ہند میں دراویدی زبانوں کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر زبانوں کے مطالعہ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ زبانیں بھی ایک دوسرے سے متاثر ہوئی ہوں گی۔ اور شمالی ہند کی بولیوں میں دراویدی عناصر ضرور موجود ہوں گے۔

اس سرزمین پر قدم رکھنے سے پہلے آریا جو زبان بولتے تھے اس کا کوئی مستند نمونہ ہم تک نہیں پہونچا۔ مگر یہاں پہونچنے پر جو زبان بولتے تھے اس کا نہایت مستند نمونہ رگ وید میں موجود ہے۔ رگ وید کا کچھ حصہ ہندوستان سے باہر تصنیف ہوا تھا۔ اور اس طرح اس کی تصنیف تقریباً چونے دو ہزار سال میں ختم ہوئی۔ اس کی زبان وہی ہے جو عام طور سے آریہ بولتے تھے۔ اور جس میں صناعی کو دخل نہیں تھا۔ یہ زبان مغربی ہندوستان میں رواج پذیر تھی۔ جو آج کل پاکستان کا علاقہ ہے۔ اس زبان کو ویدک کہتے ہیں۔ اس میں قدیم فارسی کی طرح "ر" کی آواز تھی "ل" کی نہ تھی۔ اور مخلوط آوازوں کے بجائے صرف "ھ" بولتے تھے۔ کچھ دن کے بعد مغربی ہندوستان میں "ر" اور مشرقی پاکستان میں "ل" اور پالی اور سنسکرت میں دونوں آوازیں مسموع ہوتی ہیں۔ آریا جس قدر مشرق کی طرف بڑھے انہوں نے دیسی زبانوں سے استفادہ کیا۔ یہاں کے الفاظ

میں اپنی زبان میں داخل کیے۔ مثلاً پھلا (پھل) راتری (رات) بیجا (بیج) نیلا
(نیلا) پوجا (پوجا) وغیرہ۔

جب آریا تمام شمالی ہند میں پھیل گئے تو ان کی زبانوں میں تبدیلیاں
رونما ہوئیں۔ بعض علاقوں میں تلفظ بدل گیا۔ بعض میں اجنبی الفاظ داخل
ہو گئے۔ اس طرح ایک زبان کے بجائے بہت سی زبانیں بولی جانے لگیں۔ ان
کی گروہ بندی اس طرح کی گئی۔

(۱) اُدیچہ۔ موجودہ مغربی پاکستان کی زبان۔

(۲) مدھیہ دیش۔ الٰہ آباد تک کی زبان۔

(۳) پراچیہ۔ مشرقی ہندوستان اور مشرقی پاکستان کی زبان۔

مغربی علاقہ کے باشندے پراچیہ کو حقیر سمجھتے تھے۔ اور اس کو اسوروں
کی زبان اور اشدھ کہتے تھے۔ مغربی زبان اپنی اصل سے زیادہ قریب تھی
اس لیے معتبر سمجھی جاتی تھی۔ وسطی علاقہ کی زبان کے متعلق کچھ زیادہ معلومات
نہیں ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ وہ نہ اتنی ٹکسالی تھی جتنی مغربی اور نہ اتنی حقیر
جتنی پراچیہ۔ مگر جب آریا تہذیب کا مرکز دوآب گنگ جمن ہوا تو یہی زبان ترقی
کر گئی۔ اس وقت یہ تجویز ہوئی کہ زبان کو ٹکسالی بنایا جائے اور جو لفظ ہر
جگہ بولا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے اس کو بحال رکھا جائے۔ اور جس کا تلفظ
بگڑ گیا ہے۔ اس کا صحیح تلفظ رائج کیا جائے۔ بہرحال اصلاح زبان
کی ایک کوشش کی گئی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت وجود میں آئی۔
اور یہ زبان مہاراشٹری یا مگی یا بیز انعو بجی بن گئی۔ سنسکرت کے بعد

یہ درجہ مہاراشٹری کو حاصل ہوا۔ اور آج کل ہندوستانی کو حاصل ہے۔
مشرقی ہندوستان کے لوگ سنسکرت بول نہ سکتے تھے۔ مگر سمجھ لیتے تھے
یہ خیال کہ سنسکرت ہمیشہ سے کتابی زبان رہی اور کبھی گفتگو میں کام نہیں
آئی غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پانینی ۳۰۰ ق م میں سنسکرت کے قواعد مدون
نہ کر سکتا۔ اور اس نے سنسکرت کو بھاشا کہا ہے جو اس کے اوپر دلالت
کرتا ہے کہ یہ بول چال کی زبان تھی۔ اصل یہ ہے کہ سنسکرت شستہ کو کہتے
ہیں اور پہلے یہ لفظ بطور صفت استعمال ہوا۔ اور پھر بطور علم استعمال ہونے
لگا۔ اور زبان کا نام بن گیا۔ گو قواعد نویسوں نے معیاری اور غیر معیاری
زبان میں امتیاز قائم کیا۔ مگر زبان میں تغیر و تبدل کو نہ روک سکے اور عہد
بہ عہد کی تصنیفات سے زبان کی تبدیلیوں کا پتہ چل سکتا ہے۔

رفتہ رفتہ سنسکرت کا استعمال کم ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مہاتما
بدھ اور مہاویر نے مذہبی تبلیغ اپنی مقامی بولیوں میں کی۔ ان کے پیرووں نے
ان زبانوں کو ترقی دی اور سنسکرت کو ترک کر دیا۔ اس لئے برہمنوں نے
اپنی زبان کی اور زیادہ شدت سے حفاظت کی اور اس طرح سنسکرت عوام
سے بالکل دور ہو گئی۔ یعنی ادبی سنسکرت چونکہ فطری رجحانات کا لحاظ نہیں
رکھتی تھی۔ بلکہ ایک طرح مصنوعی تھی جس میں خوبصورت الفاظ بہترین اسالیب
میں جمع کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس لئے عوام میں مقبول نہ تھی البتہ
دوسری بولیاں جو عوام بولتے تھے۔ ان میں ویدک زبان کا اثر تو تھا
مگر ایک خاص قسم کی لچک بھی تھی۔ اور اسی سے پراکرت یا فطری زبان

تھی۔ اس بحث سے یہ ظاہر ہو گیا کہ عوام کی بولی شروع ہی سے مخلوط
زبان تھی یعنی آریوں کی زبان، جو مقامی بولیوں سے مل کر ایک زبان وجود
میں آئی تھی اور وہی پہلی پراکرت تھی۔ اسی کا ادبی روپ پالی ہے۔ مگر پراکرت
نام بعد کو رکھ گیا ہے۔ پالی سنسکرت کے پنکتی یعنی پنتی سے نکلا ہے
مگر ایک خیال یہ ہے کہ بدھ دھرم شاستر کی سطروں کو پالی کہتے ہیں اس لئے
جس زبان میں وہ عبارت سطور تھی اس کو پالی کہنے لگے۔ اسی پالی کو قدیم
ماگدھی بھی کہتے ہیں اور چونکہ مہاتما بدھ نے اسی زبان میں تبلیغ کی تھی، اس
لئے بدھ مت کے پیرو اس کو دنیا کی قدیم ترین زبان مانتے ہیں۔ اور
کہتے ہیں سنسکرت وغیرہ اسی زبان سے نکلی ہیں اس زبان کے نمونے
بدھ مت کی مذہبی کتابوں اور اشوک کی لاٹوں پر ملتے ہیں۔ یہ زبان دو
رسم الخطوں میں لکھی ہوئی ملی ہے۔ ایک کھروشٹری دوسری براہمی۔ ان
لاٹوں کے کتبات کا مقابلہ کر کے محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اشوک
کے زمانے میں کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ چار زبانیں رواج پذیر تھیں
ادوان میں اختلافات نمایاں تھے۔ شہباز گڑھی کی لاٹ پر جو کتبہ ہے اس کی
زبان سنسکرت سے بہت زیادہ متاثر ہے یہ اس زمانہ کی مغربی پراکرت
ہے اور مشرق کے علاقہ بہار کی زبان جو مشرقی پراکرت ہے۔ وہ اس سے
بہت مختلف ہے مغربی پراکرت ترقی کر کے شورسینی کہلائی۔ اور مشرقی
پراکرت کا نام ماگدھی رکھ گیا۔

پانچویں صدی قبل مسیح سے چھٹی صدی مسیحی تک عہد وسطیٰ میں دوسری

پراکرت کا زمانہ ہے اس زمانے میں ایک طرف پراکرتوں نے ادبی حیثیت اختیار کی اور دوسری طرف سنسکرت کی اہمیت علمی حلقوں میں بڑھ گئی۔ کیونکہ اس کا رشتہ قدیم زبان سے تھا۔ اس لئے قدامت پسند طبقہ اس کو پسند کرتا تھا۔ دوسرے اس کی صلاحیتیں عہد وسطیٰ سے ہم آہنگ تھیں۔ اس لئے وہ لوگ بھی اس کو پسند کرتے تھے۔ ویدک زبان کے بہت سے الفاظ اس عہد میں متروک ہو گئے۔ اور نئے لفظ رواج پا گئے۔ مگر جس طرح سنسکرت ترقی کر رہی تھی۔ اسی طرح دوسری پراکرتیں بھی ترقی کر رہی تھیں پہلی اور دوسری پراکرت کا زمانہ متعین کرنا دشوار ہے۔ مگر پالی کے اندر اس کے خد وخال نظر آتے ہیں۔

تلفظ کی طرف سے بے پروائی سب سے پہلے ہندوستان کی مشرقی بولیوں میں شروع ہوئی اور اسی وجہ سے الفاظ میں تبدیلی نمودار ہوئی۔ ان بولیوں میں حروف بیج کا میلان جذب پذیری کی طرف پایا جاتا تھا اور زبانی آوازیں (مثلاً "ر" کا "ل" میں بدل جانا) ۔ نخی آوازوں میں بدل جاتی تھیں یہ خصوصیات آج بھی بنگال اور بہار کی بولیوں میں پائی جاتی ہے۔

مشرقی ہندوستان میں دوسری پراکرت کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح میں شروع ہوتا ہے۔ مگر پنجاب میں بعد کو شروع ہوا۔ آج بھی ان علاقوں کی بولیوں میں انفی آوازوں اور مشدد لفظوں کی کثرت ملتی ہے۔ جو عہد وسطیٰ کی پراکرت کی نمایاں خصوصیتیں تھیں [۱]۔ مگر اس عہد کی پراکرت میں یہ رجحان کیوں تھا۔ اس کا جواب دینا دشوار ہے۔ یہ خیال کہ دراویڈی اور آسٹری

---

[۱] تاریخ زبان اردو حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی صفحہ ۳۸

خون کے اثرات کا نتیجہ ہو۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان
زبانوں کے متعلق معلومات کافی نہیں۔ ہو سکتا ہے یہ زبان کی فطری ارتقا ہو
بہر حال اس عہد میں ادبی پراکرت کی پانچ شکلیں تھیں۔

(۱) مہاراشٹری پراکرتوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھی اس
زمانے کا منظوم ادب زیادہ تر اسی زبان میں ہے۔ قواعد نویس اس کا ذکر
بطور نمونہ کے کرتے تھے۔ اور دوسری پراکرتوں کو کہہ دیتے ہیں کہ وہ
مہاراشٹری سے مشابہ ہیں۔ موسیقی میں بھی یہ زبان مقبول تھی۔ کیونکہ
اس میں حروف علت کی تعداد زیادہ ہے۔ اس وجہ سے ایک خاص
قسم کا لوچ پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر چٹرجی اس کی علیحدہ حیثیت تسلیم نہیں کرتے
بلکہ شورسینی کی ترقی یافتہ شکل مانتے ہیں۔

(۲) شورسینی۔ اس زبان کا مرکز شورسین یعنی دوآبہ گنگ و جمن کا وسطی
حصہ متھرا کا علاقہ تھا۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ سنسکرت کے ساتھ ساتھ اس کو
ثانوی زبان کی حیثیت سے بولتے تھے سنسکرت سے بہت زیادہ
قریب ہے حضرت مسیح کے زمانہ ولادت ہی میں اس نے ادبی حیثیت
اختیار کر لی تھی۔

(۳) ماگدھی۔ مگدھ دیس یعنی جنوبی بہار کی زبان تھی۔ اس کا نشو و نما
آریائی تمدن کے مرکز سے دور ہوا تھا۔ اس لیے سنسکرت کا اثر اس
میں کم تھا۔ اور اسی لیے آریا لوگ اسکو غیر مہذب اور ناشستہ زبان سمجھتے
تھے۔ بعض لوگ اس پراکرت کو پالی سے خلط ملط کر دیتے ہیں حالانکہ پالی

کو ماگدھی سیلون کے بدھوں نے کہا ہے۔ اور وہ لوگ یہاں کی زبانوں کے اختلافات سے پورے طور سے واقف نہ تھے۔

(۴) اردھ ماگدھی شورسینی اور ماگدھی پراکرتوں کے درمیانی علاقے کی زبان تھی۔ ماگدھی اور اردھ ماگدھی کے علاقہ کو آج کل پورب کہتے ہیں۔ اس زمانہ میں پراچیہ کہتے تھے۔ ماگدھی سے زیادہ اردھ ماگدھی کو ترقی ہوئی۔ کیونکہ شاہی خاندان کے لوگ بھی اس کو استعمال کرتے تھے۔ گوتم بدھ اور مہابیر جین نے اسی زبان میں اپنے مذہب کی تبلیغ کی اس زمانے میں مشرقی ہندی اسی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

(۵) پشاچی پراکرت پنجاب اور کشمیر کے علاقہ میں بولی جاتی تھی پشاچ گوشت کھانے والوں کو کہتے ہیں۔ اسی نام سے اس کی تحقیر ظاہر ہوتی ہے۔ بہر حال پشاچی زبان خالص اور مخلوط دونوں طرح یہاں رواج پذیر تھی۔ خالص زبان کی سات اور مخلوط زبان کی چار شاخیں رواج میں تھیں۔ مگر آریائی زبان ہونے کے باوجود آریائی زبانوں سے بہت مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ لوگ اس وقت علیحدہ ہوئے جب آریائی زبان اپنی ابتدائی صورت میں تھی یا یہ کہ پہاڑوں وغیرہ میں بسنے کی وجہ سے ان کی زبان اس حد تک مختلف ہو گئی

اگرچہ ان پراکرتوں کے علاقے علیحدہ علیحدہ سمجھے جاتے ہیں۔ مگر حقیقت میں ان کا تعلق ان مقامات سے برائے نام ہے۔ اور یہ وہاں کی بولیوں کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ مثلاً پالی جسے ماگدھی بھی کہتے ہیں۔

مگدھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اسی طرح شورسینی کی ترقی یافتہ صورت مہاراشٹری ہے۔ اس کا مہاراشٹر کے علاقہ سے کوئی تعلق نہیں۔

آریائی زبانوں کا تیسرا دور چھٹی صدی سے شروع ہو کر دسویں صدی میں ختم ہوا۔ اس عہد کی بولیوں کو اپ بھرنش کہا جاتا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ ادب کی زبان چونکہ خواص کی ہوتی ہے اس لئے دیرپا ہوتی ہے۔ مگر عوام کی زبان تیزی سے بدل جاتی ہے۔ یہی صورت یہاں رونما ہوئی۔ کہ دوسری پراکرت کا روپ بدل گیا اور قواعد نویسوں نے ان کو اپ بھرنش یعنی بگڑی ہوئی زبانیں قرار دیا۔ شروع شروع میں تعلیم یافتہ گروہ نے ان گنوار لوگوں کی زبان کو اپ بھرنش کہا رفتہ رفتہ ایک خاص زبان کے مفہوم میں اس لفظ کا اطلاق ہوا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد تعلیم یافتہ طبقہ نے بھی اس کو اپنا لیا۔ اور اس طرح تمام شمالی ہند میں اس کا رواج ہو گیا۔ اپ بھرنش کی تین قسمیں تھیں۔ ایک ناگر اپ بھرنش جس نے ترقی کر کے گجراتی اور راجستھانی روپ دھارا۔ یہ خود شورسینی کا نقش ثانی معلوم ہوتی تھی۔ ہندی رسم الخط کو اسی نسبت سے ناگری کہتے ہیں۔ اور گجرات کے ناگر برہمنوں کی نسبت سے اس کو ناگر اپ بھرنش کہتے تھے۔ دوسری مشہور اپ بھرنش جو سندھ کے علاقہ میں رواج پذیر تھی۔ یہ ترقی پا کر سندھی کے نام سے موسوم ہوئی۔ تیسری اپ بھرنش ناگر اور براچڈ کی آمیزش بنی تھی۔ مگر ماگدھی نے کوئی ترقی نہیں کی اور اس کو حقیر سمجھا جانے لگا بہرحال یہ اپ بھرنش زبانیں بھی ادبی بن گئیں۔ اس اثنا میں مسلمانوں

آمد اس برصغیر میں شروع ہوئی اور ان کی وجہ سے ان زبانوں کو اور تقویت پہونچی۔ اور سنسکرت کا اثر کم ہو گیا اور عصر حاضر کی زبانیں وجود میں آئیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) شورسینی اپ بھرنش سے (ا) کھڑی بولی یا ہندوستانی جس نے ترقی پاکر اردو اور ہندی کا نام پایا۔ (ب) راجستھانی (ج) مشرقی پنجابی (د) گجراتی اور پہاڑی بولیاں۔

انتباہ:- یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ گجراتی اور راجستھانی شورسینی کی اس شکل سے نکلی ہیں جس کو ناگر اپ بھرنش کہتے ہیں۔

(۲) ماگدھی کے علاقہ میں مختلف نام رکھے گئے۔ مثلاً بنگال میں راچیہ گوڑ اور ڈھکی اور ان سے بنگلہ اور آسامی نکلیں اور اڑلیسہ میں اتکلی جس سے اوڑیا نکلی۔ اور بہار میں گھی بنی۔

(۳) اردھ ماگدھی سے پوربی ہندی یعنی اودھی وجود میں آئی۔

(۴) مہاراشٹری کا مرکز بہار تھا۔

(۵) شمالی مغربی ہندوستان کی پراکرتیں اور اپ بھرنش کے متعلق معلومات ناکافی ہیں۔ شاید ان کی یہ شاخیں ہوں گی۔ (ا) براچڈا اپ بھرنش جس سے سندھی وجود میں آئی۔ (ب) کیکئی اپ بھرنش جس سے لہندا نکلی۔

لسانیات کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ امر نہ بھلانا چاہیئے کہ ادب کی زبان تو ایک وسیع علاقے میں ایک ہوتی تھی مگر مقامی بولیاں اپنی جگہ قائم رہتی تھیں چونکہ ان زبانوں نے ادبی حیثیت اختیار نہیں کی۔ اس لئے

ان کے نمونے آج کل دستیاب نہیں ہوتے اور صرف ان زبانوں کے نمونے ملتے ہیں جنہوں نے ادبی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ یعنی جب آریا ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کی زبان کو اہمیت تھی۔ اس کے بعد تقریباً ڈھائی ہزار سال تک ہر وہ زبان ترقی کرتی رہی جس کو شاہی سرپرستی حاصل ہوئی۔ مثلاً اشوک کے زمانے میں اردھ ماگدھی کو عروج ہوا۔ اس کے بعد ہرش وردھن اور راجپوتوں کی فتوحات کے زمانے میں دوآبہ کی زبان شورسینی اور بعد ازاں برج بھاشا ادبی زبان قرار پائی۔ اس زمانے میں بھی یہیں کی ایک زبان کھڑی بولی پورے ہندوستان کی گنوار نیکا ہے

۱۸۸۰ء میں ہارنل نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ اس برصغیر کی زبانوں کے موازنہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں کی آریائی زبانیں دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ آریا دو مختلف گروہوں میں اور مختلف زمانوں میں اس ملک میں داخل ہوئے پہلے گروہ کو دوسرے نے مشرق کی طرف دھکیل دیا۔ گریرسن نے اس نظریہ کو تھوڑی ترمیم سے قبول کیا۔ کہ دوسرے گروہ نے جب پہلے گروہ کو اس ملک پر قابض پایا تو جنوب کی طرف ہٹ کر مشرق کی طرف پہنچ گیا۔ بہرحال ان میں سے ایک گروہ اندرونی کہلاتا ہے۔ اور دوسرا بیرونی یعنی مغربی ہندی مشرقی پنجابی۔ گجراتی۔ راجستھانی بھیلی خاندیشی اندرونی زبانیں ہیں اور لہندا سندھی شمال مغرب میں اور مرہٹی جنوب میں۔ اور آسامی بنگالی

اڑیا اور بہاری مشرق میں بیرونی زبانیں ہیں۔ ان دونوں زبانوں کے بیچ میں پوربی ہندی رواج پذیر تھی پہاڑی علاقوں کی بولیاں نیپالی وغیرہ ان سے مختلف ہیں

گریرسن نے اس تقسیم کی تائید میں جو دلائل پیش کئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ دونوں گروہوں کے تلفظ میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً اندرونی زبانیں "س" بولتے ہیں تو بیرونی زبانوں میں "ش" اور فارسی میں "ہ" مثلاً سپت، ہفت، سندھ ہند۔ مغربی پنجابی اور سندھ میں کرس کو کوہ بولتے ہیں۔ بنگالی مرہٹی میں "ش" بولیں گے۔ آسامی میں (چ) اور س کے درمیان کی آواز ہوتی ہے۔ اندرونی زبانوں میں اعرابی حالت حروف کی مدد سے ظاہر کی جاتی ہے۔ یعنی تفصیلی حالت سے ترکیبی صورت رواج پاگئی ہے۔ مگر بیرونی زبانوں میں لاحقے نہیں آتے صرف کلمات میں تبدیلی ہوتی ہے۔ اسی طرح فعل ماضی کی تصریف جنس کی نشان دہی کرتی ہے۔ مگر اندرونی زبانوں میں فعل کی ایک ہی صورت رہتی ہے۔ اس لئے صرف فعل سے فاعل کی جنس یا تعداد کا پتہ نہیں چلتا

گریرسن نے اپنے نظریہ کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت پیش نہیں کی صرف لسانی دلائل سے ثابت کرنا چاہا ہے۔ اور لسانیات میں بھی صرف صوتیات سے کام لیا ہے حالانکہ زبانوں کی یکسانیت کی بنیاد صوتیات سے زیادہ صرفی و نحوی قواعد پر ہے۔ اور "س" کا "ہ" سے بدلنا بیرونی زبانوں کی خصوصیت نہیں سنسکرت "تاس" تا "ہن" جاتا

ہے رتاکو اور تابی برج بھاشا میں آج تک رواج پذیر ہے) بیرونی
زبانوں میں بھی "س" مستعمل ہے۔ مثلاً لہندا میں کرے سی اور راجستھانی
میں کرسی (بہ معنی کرے گا) مستعمل ہے عدد کا "س" دونوں جگہ "ہ" سے
بدلتا ہے مثلاً چوستر سے چوہتر۔ مغربی ہندی میں اعرابی علامات
محذوف بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً سودا و میر کے وقت تک علامت فاعل
"نے" محذوف ہوتی تھی۔ وہ بھوکوں مر گیا۔ یعنی بھوکوں سے آج تک مروج
ہے۔ لہذا یہ کسی خاص گروہ کی خصوصیت نہیں۔

گریرسن کے مقابلہ میں ڈاکٹر چیٹرجی کا نقشہ تھوڑی سی ترمیم کے
بعد قابل قبول ہے۔ وہ یہ ہے

الف۔ مدھ دیش کی خاص زبان مغربی ہندی ہے۔

ب۔ مدھ دیش کی زبان سے گہرا رشتہ رکھنے والی
زبانیں پنجابی راجستھانی گجراتی پہاڑی بولیاں ہیں اور بیرونی زبان
سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبان پوربی ہندی ہے۔

(ج) شمال مغربی ہندوستان کی زبان لہندا اور سندھی ہیں۔

(د) مشرقی ہندوستان کی زبانیں بہاری اڑیا بنگالی آسامی

(د) جنوبی ہندوستان میں آریائی زبان صرف مرہٹی ہے۔

مذکورہ بالا زبانوں کی تفصیل گریرسن کے یہاں سے نقل کی ہے
لہندا پہلے لنڈا رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ اب فارسی رسم الخط میں
لکھی جاتی ہے مشرقی پنجابی سے مختلف ہے پشاچی پراکرت سے متاثر ہے سندھی

بولنے والے زیادہ مسلمان ہیں اس لئے اس میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش زیادہ ہے برا چڈاپ بھرنش سے نکلی ہے۔ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اس کی پانچ بولیاں ہیں جن میں وسطی علاقہ کی زبان نے ترقی کر کے ادبی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ لہذا اور سندھی دونوں دوآبہ کی زبانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے اردو کے آغاز کا سلسلہ ان زبانوں سے نہیں ملایا جا سکتا گو مسلمان اول اول انہیں زبانوں کے علاقے میں داخل ہوئے تھے[1]

مرہٹی زبان پونا کے آس پاس برار اور سی پی کے جنوبی اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ پونا کی زبان نے ادبی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ گجراتی کی طرح اس میں بھی تثنیہ کا صیغہ ملتا ہے۔ دکنی کی ساخت میں اس کا اثر موجود ہے مثلاً تاکید کے لئے "چ" بڑھائی جاتی ہے جیسے آپچ (آپ ہی)

آسامی کے قواعد بنگلہ سے ملتے ہیں۔ مگر ادبی رجحانات میں فرق ہے۔

بنگالی زبان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ دیہاتی اور شہری زبان میں نمایاں فرق ہے۔ ادبی بنگالی میں سنسکرت الفاظ کی کثرت ہے۔ رسم الخط دیوناگری سے ماخوذ ہے۔

---

[1] تاریخ زبان اردو صفحہ ۶۹

اڑیا رسم الخط مشکل ہے۔ قواعد بنگالی سے ملتی ہے اس لئے
ایک زمانے میں بنگالی کی ایک شاخ سمجھی جاتی تھی۔ حقیقت میں ماگدھی
اپ بھرنش سے نکلی ہے۔ ایک زمانے میں اس علاقے میں مرہٹوں
کا اقتدار تھا۔ اس لئے ان کی زبان کے الفاظ کثرت سے شامل ہوگئے
ہیں۔

بہاری بولیاں بنگالی سے ملتی ہیں۔ ان کی تین بولیاں میتھلی مگہی
بھوج پوری قابل ذکر ہیں۔ یہ زبانیں ناگری میں چھاپی جاتی ہیں عام
تحریر میں کیتھی کا استعمال ہے اور میتھلی کا ایک اپنا رسم
الخط بھی ہے۔ بہاری زبان حقیقت میں ماگدھی کی بچی جو نہیں ہے۔
ڈاکٹر چیٹرجی نے بھوج پوری کو بہاری تسلیم نہیں کیا ہے۔

مشرقی ہندی کی تین بولیاں اودھی بگھیلی چھتیس گڑھی اہم ہیں
ان میں اودھی ادبی حیثیت میں سب سے آگے ہے۔ اس کے افعال
پر مغربی ہندی کا اثر ہے اور اسما وضمائر میں بہاری سے متاثر ہے

پہاڑی بولیاں نیپالی کی بولی گڑھوالی وغیرہ راجستھانی سے ملتی
جلتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلطانوں کے عہد میں راجپوتوں نے اس علاقے
میں پناہ لی تھی۔ اس لئے ان کی زبان یہاں رواج پاگئی۔

گجراتی زبان اس اعتبار سے اہم ہے۔ کہ ویدی عہد سے مسلسل
اس کا نشان ملتا ہے گریرسن اس کو اندرونی حصے میں شامل کرتا ہے
مگر اس کا تعلق بیرونی زبانوں سے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً "س"

اور "ہ" کا تلفظ ادا نہ کر سکنا۔ ماضی میں "ل" کا استعمال ہے قواعد کے اعتبار سے مغربی ہندی خصوصاً برج بھاشا سے بہت ملتی ہے۔

راجستھانی کی چار بولیاں (۱) مارواڑی یا میواڑی (۲) مالوی۔ (۳) جے پوری (۴) میواتی اہم ہیں۔ پرانی مارواڑی اور گجراتی میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ اس کا قدیم ادب ڈنگل کے نام سے مشہور ہے جے پوری اور مارواڑی گجراتی سے میواتی برج بھاشا سے اور مالوی بندیل کھنڈی سے مشابہ ہیں۔ برج بھاشا کی طرح مستقبل کے لئے دو علامتیں "ہوں" اور "گو" مستعمل ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے ... کو پنجابی کی خصوصیت بتایا ہے، وہ برج اور راجستھانی کی بعض بولیوں میں مستعمل ہے۔

پنجابی کا اطلاق عام طور سے ان تمام بولیوں پر کیا جاتا ہے۔ جو دریائے سندھ سے ضلع انبالہ تک بولی جاتی ہیں۔ پورے پنجاب کی زبان نہیں ہے پروفیسر شیرانی نے اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیا ہے کہ پنجابی زبان کا تعلق قدیم زمانے میں بیرونی شاخوں سے تھا جس کے اثرات جدید پنجابی میں موجود ہیں۔ اور موجودہ پنجابی مدھ دیش کی زبانوں سے متاثر ہوئی ہے یہ تاریخی حقیقت ہے کہ فتوحات کا رخ مغرب سے مشرق کی طرف تھا۔ مگر سیاسی اقتدار ہمیشہ دوابہ گنگ جمن رہا ہے۔ اور اس طرح اس علاقہ کی زبانیں ہمیشہ دوسری زبانوں پر اثر انداز ہوتی رہیں۔ گریرسن کے خیال میں معیاری پنجابی باری دوآب کی

بولی ماجھی ہے۔ جس کا مرکز امرتسر ہے مگر غلطی سے یورپ کے
علما نے لدھیانہ کی زبان کو معیاری سمجھا تھی۔ ل۔ ماجھی میں موجود نہیں
ہے، برج بھاشا میں بھی نہیں ہے۔ مشرقی پنجاب کھڑی بولی اور بانگڑو
یعنی ہریانی میں ملتا ہے بانگڑو سے منتقل ہو کر راجستھانی میں آگیا۔
ادبی اردو اور ہندی میں اس کا استعمال گنوار سمجھا جاتا ہے اس
اعتبار سے اردو برج بھاشا کی پیرو ہے[1]

اور اندرونی زبانوں میں جس کو خالص اندرونی زبان کہہ سکتے
ہیں۔ وہ مغربی ہندی ہے۔ یہ مدھ دیش میں بولی جاتی ہے سرہند
سے الہ آباد اور ہمالیہ سے بندھیاچل تک اس کا علاقہ ہے اس
کا نام مغربی ہندی گریرسن نے تجویز کیا ہے۔ اسی علاقہ میں سنسکرت شورسینی
پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش بولیوں کا رواج رہا تھا۔ اب کھڑی بولی
یعنی ہندوستانی برج بھاشا ہریانی بولی جاتی ہیں۔ جو مغربی ہندی کی
شاخیں ہیں۔ مغربی ہندی شورسینی اپ بھرنش سے نکلی ہے اس میں
سنسکرت کا اثر سب سے زیادہ تھا۔ اس کا مرکز متھرا تھا۔ اور راجپوتوں
کے زمانے میں یہ زبان لاہور سے بنگال تک ادبی طور سے استعمال
کی جاتی تھی۔ مغربی ہندی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا عام
رجحان تفصیلی ہے۔ یعنی اس میں تصریف کم ہے اور سابقوں یا
لاحقوں کی مدد سے حالتیں ظاہر کی جاتی ہیں۔
گریرسن کے نزدیک پانچ زبانیں (۱) کھڑی بولی یعنی

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ ۸۰

ہندوستانی (۲) ہریانی یا بانگڑو (۳) برج بھاشا (۴) قنوجی (۵) بندیلی اس کی شاخیں ہیں۔

شورسینی اپ بھرنش کی زبانوں میں ایک نمایاں فرق یہ ہو گیا تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کھڑی بولی، ور ہریانی کے اسم و افعال (ا) پر ختم ہوتے ہیں۔ اور باقی زبانوں میں (او) پر اس لئے پہلی زبانوں کو کھڑی اور دوسری زبانوں کو پڑی کہتے تھے۔

ڈاکٹر مسعود حسین کو تسلیم ہے کہ ہریانی اردو میں بندیلی کا تعنے۔ واج پذیر ہے (۱)

سنہ ۱۰۰۰ء کے قریب شورسینی اپ بھرنش سے مغربی ہندی پیدا ہوئی۔ اس کا علاقہ بہت وسیع ہے اس لئے اس میں جزوی اختلافات ناگزیر تھے۔ مغربی روہیلکھنڈ دوآبہ جمنا کے شمالی حصہ در ضلع انبالہ میں جو زبان بولی جاتی ہے گریرسن نے اس کو ہندوستانی کا نام دیا ہے۔ اس میں اردو اور ادبی ہندوستانی یعنی اردو میں بیرونی اثرات کی وجہ سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مگر دوسری جگہ گریرسن نے اس کو برج بھاشا کا روپ مانا ہے جو پنجابی میں بہ تدریج ضم ہوتا چلا گیا اور یہ

---

(۱) مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ ۸۶

بظاہر تضاد ہے۔ کیونکہ پنجابی کو لہندا اور مغربی ہندی کی آمیزش کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔

پنجابی نے مسلمانوں کی فتوحات کے وقت مدھ دیش کی بولیوں پر ان کی فاتح افواج کے ساتھ چڑھائی کی اور مغربی ہندی کی شمالی مغربی بولیوں (ہریانی اور کھڑی) پر اثر انداز ہوئی۔ اس طرح مغربی ہندی کی وہی پرانی خصوصیات جو کبھی لہندا کی سرزمین میں کھپ گئی تھیں، مغربی ہندی کی ان بولیوں کو پھر واپس مل جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی گرامر کا وہ حصہ جسے پروفیسر شیرانی پنجابی کا اپنا بتاتے ہیں (جس سے تفصیلی بحث آگے کی گئی ہے) وہ دراصل براہ راست مغربی ہندی کی قدیم شکل (شورسینی اپ بھرنش) سے ماخوذ ہے۔ [1]

ادبی ہندوستانی (اردو) اور مغربی ہندوستانی میں بعض الفاظ کے لہجے میں اختلاف ہے۔ نحی حروف 'ن' اور 'ل' آزادانہ طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ 'ان' سے جمع بنانے کا قاعدہ اب اردو میں متروک ہے۔ اسی طرح مارون مرون بھی غیر مستعمل ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستانی یا اردو کے بارے میں محققین کا فیصلہ یہی ہے کہ اس کا کینڈا برج سے زیادہ قریب ہے اور قدیم زمانے

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ ۹۴ - ۹۵

سے یہ دہلی اور اس کے مضافات کی زبان تھی۔ اس کے مختلف نام رکھے گئے ہیں۔ مثلاً دہلوی کھڑی ہندوستانی وغیرہ۔ مگر اس سے مراد یہی زبان ہے۔

اس برصغیر کی زبانوں میں اردو کو اہمیت حاصل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آریوں کے ہندوستان داخل ہونے سے لے کر مسلمانوں کی آمد تک مدھ دیش کی زبان کو ہر زمانے میں اہمیت حاصل رہی۔ رگ وید کے آخری منتر جمنا کی وادی میں لکھے گئے کلاسیکی سنسکرت کی بنیاد متھرا یا اس کے مضافات کی کسی زبان پر تھی۔ بعد ازاں پالی نے ترقی کی جس کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ اس کا تعلق بھی مدھ دیش سے تھا۔ اور بہار سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ البتہ موریہ خاندان کے عہد حکومت میں مشرقی ہندوستان کی زبان ضرور کچھ عرصہ کے لئے رواج پذیر رہی۔ مگر پھر شورسینی نے ادبی حیثیت اختیار کر لی۔ اس کے بعد اسی سرزمین کی اپ بھرنش عروج پر رہی۔ مسلمان جب پنجاب میں داخل ہوئے تو شورسینی اپ بھرنش کا طوطی بول رہا تھا۔ اور راجپوتوں نے اس کو بہت ترقی دی تھی

ہندی کے مشہور عالم پنڈت چندر دھر شرما گلیری کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں نے مغربی یوپی کی پڑی بولی کو کھڑی بولی بنا کر اپنے مزاج کے موافق کر لیا۔ اور اس طرح اردو کا آغاز ہوا۔ یہ اس

قسم کا مغالطہ ہے جس کا شکار پروفیسر شیرانی ہوئے اور انھوں نے ہندوستانی اور ہریانی دونوں کی قدامت سے انکار کر دیا۔ مگر ہندوستانی کی شناخت یہ ہے کہ اس میں حروف مغیرہ اور اسمائے اشارہ اور اسمائے موصولات ایک خاص اسلوب سے بولے جاتے ہیں۔ وہ پرانے ادب میں موجود ہیں اور وہیں سے اس زبان کی قدامت کا ثبوت ملتا ہے۔

جس طرح پراکرتوں کی جگہ اپ بھرنش بولیاں رواج میں آئیں۔ تو اسی طرح جب اپ بھرنش زبانیں دبی ہو گئیں تو نئی زبانیں بولی جانے لگیں۔ اور پھر وہی ادب کی زبانیں بن گئیں مسلمانوں کی آمد کے وقت بدھ دھرم اپنی بگڑی ہوئی شکل میں ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ بارھویں صدی میں جب بختیار خلجی نے اس علاقہ پر قبضہ کیا تو بدھ مذہب کے رہنما منتشر ہو گئے وہ۔ انہوں نے عوام کی زبان میں دوہے لکھے۔ ان میں ایسے الفاظ استعمال کیے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انداز پنجابی سے مخصوص نہیں۔ مثلاً کیا۔ اندھارے۔ ناہیں وغیرہ۔ اسی طرح ان کی زبان میں پوربی کے اثرات بھی ہیں۔ مثلاً دیکھی لے۔ بوڑی لی) یہ ل مشرقی زبانوں میں ماضی کی علامت ہے۔ مگر ان کے مقابلہ میں ناتھ پنتھی۔ گجرات راجپوتانے۔ اور متھرا کی زبان سے متاثر تھے۔ اور ان کی زبان میں جو سو ما۔ یام وغیرہ کی موجودگی سے پتہ چلتا ہے

کر دِ شورسینی سے ماخوذ زبان بولتے تھے۔

اس عہد کی سب سے اہم تصنیف ہیم چندر کی قواعد ہے جس نے اپ بھرنش پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور اس کے نمونے بھی دئے ہیں۔ ان میں کسو کا (کیا) تجھہ (تیرا) مجھ (میرا) جَن (آدمی) وغیرہ ایسے لفظ استعمال کئے ہیں۔ جو صاف قدیم ہندوستانی معلوم کے ہوئے ہیں

دوسری اہم تصنیف پربند چنتامنی ہے۔ اس میں اپ بھرنش کے اشعار بھی نقل کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک دوہا یہ ہے

بانہہ بچھوڑی جاہی تو ہوں ہوؤں تے دین کا دوس
ہیائیٹھے جی نیس دی جانوں منج سر دس

اسی خیال کو برج بھاشا میں یوں کہا گیا ہے۔

بانہہ چھڑائے جات ہو جان کر بل موئے
ہردے میں سے جاؤگے تو مرد بدھوں گی توے

اپ بھرنش زبانوں کی یہ خصوصیت تھی کہ سنسکرت کے تت سم (خالص) الفاظ سے اجتناب کرتے تھے۔ ان کے بجائے تدبھو (غیر خالص) الفاظ استعمال کرتے تھے۔ مثلاً ہردے کو ہیا بنالیا مگر بعد کو اس کی پابندی نہ رہی۔ اور دکنی میں تت سم الفاظ بہ کثرت موجود ہیں۔

اس عہد کے بعد ہندی ادب کا وہ دور آیا جس کو ویر گا تھا۔

سے پہلے سندھ کا الحاق کیا۔ اس کے بعد پنجاب پر قابض ہوئے بعد ازاں مشرق کی طرف بڑھے اور یہاں اس زبان سے سابقہ پڑا جو ادبی حیثیت سے مروج تھی اور وہ شورسینی اپ بھرنش یا قدیم ہندی تھی۔ آل غزنہ کے عہد میں البیرونی نے کتاب الہند اور کتاب الصیدنہ[1] کو حوالۂ قرطاس میں کیا ان میں بہت سے لفظ یہاں کے لکھے۔ وہ سب ملتانی کے ہیں اور سنسکرت کا کوئی نہیں۔ اسی عہد کے دوسرے شاعر مسعود سعد سلمان تھے جو ہندوستان کی کسی زبان میں شاعری کرتے تھے غالباً وہ دیوان عہد امیر خسرو تک موجود تھا۔ مگر آج اس کا پتہ بالکل نہیں چلتا۔ اس لئے اس زبان کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی۔؟

بارھویں صدی کے آخر میں دہلی اس برصغیر کا دارالحکومت قرار دیا جاتا ہے تو پروفیسر شیرانی اس منتقلی کو وہی درجہ دیتے ہیں جو دولت آباد کے متعلق تھا اور تاریخ میں اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ کسی بڑے پیمانے پر نقل مکانی کیا گیا ہو۔ اور ان ہجرت کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ ان کی مدد دولت دوآبہ گنگ و جمن کے بالائی حصہ میں ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑ جائے۔ اور چونکہ وہ ہریانی کو قدیم اردو کہتے ہیں۔ اس لئے ان کی پیدائش بھی اس ہجرت کے بعد ہونی چاہیئے شیرانی کے اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر

---

(۱) غالباً صحیح نام کتاب الصیدلہ ہوگا۔

س علاقہ میں کونسی زبان بولی جاتی تھی۔ اس کے متعلق شیرانی رقم طراز
ہیں کہ وہ راجستھانی یا برج ہوگی کیونکہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی متوفی ۹۴۴ھ
کا کلام برج کی مماثل زبان میں ہے۔ اسی طرح مخدوم بہاء الدین برناوی
کے اشعار بھی برج میں ہیں۔ اور بقول شیرانی برج اور ہریانی خارج ہو گئیں
اور ان کی جگہ اردو رواج پا گئی۔ اس نظریہ کے ثبوت میں شیرانی نے
کوئی شہادت پیش نہیں کی صرف قیاس آرائی سے کام لیا ہے۔ یہ واقعات
شیرانی کی تائید نہیں کرتے۔ بلکہ ان سے اس کا عکس ثابت ہوتا ہے یعنی
جب دہلی پایۂ تخت قرار پا گیا تو اس کا اثر پنجاب پر پڑا۔

جدید زبانیں جو آج کل اس برصغیر میں بولی جا رہی ہیں، ادبی حیثیت
اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں ان کی تشکیل ہو رہی تھی اس لئے پندرھویں
صدی تک کے نمونے نہ ہونے کی برابر ہیں۔ ہریانی میں اورنگ زیب سے پہلے کوئی
ادبی تصنیف وجود میں نہیں آئی۔ راجپوتانہ کے بھاٹ بھی ڈنگل کے ساتھ ساتھ
پنگل میں شاعری کرتے تھے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ برج وہاں کی زبان تھی
اسی طرح عبدالقدوس گنگوہی اور برناوی کے کلام سے استنباط غلط ہے شیرانی
نے اپنے نظریہ کا ابطال یہ کہہ کر خود کر دیا ہے کہ "باجن پہلے شخص ہیں جنہوں نے
اردو زبان کو زبان دہلی کے نام سے یاد کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ
اردو ان ایام میں برج سے علیحدہ مانی جاتی تھی۔ امیر خسرو اور ابوالفضل نے
دہلوی اور لاہوری کو جدا جدا زبان لکھا ہے۔ اس کے بعد پروفیسر مسعود نے
اپنا نظریہ اس طرح پیش کیا ہے۔

اور دوسرے ارتقائی یعنی خود اس زبان میں عہد بہ عہد کسی قسم کی تبدیلیاں ہوئیں۔ اردو زبان کے سلسلہ میں یہ امر مسلمہ ہے کہ اس کا تعلق آریائی خاندان سے ہے۔ مگر عربی آمیز فارسی سے بہت حد تک متاثر ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کو اس امر سے انکار ہے کہ اردو کھچڑی زبان ہے۔ حالانکہ خود پراکرت کو مخلوط زبان لکھا ہے حقیقت یہ ہے کہ آج کل دنیا میں کوئی زبان بھی خالص نہیں۔ ہر زبان میں دوسری زبانوں کے بے شمار الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔ مگر جب تک ان بیرونی الفاظ کا غلبہ نہیں ہوتا ان کی وجہ سے ان کی اسالیب نہیں بدل جاتے وہ زبانیں مستقل ہیں اور جب ان کے اسالیب بدل جائیں گے یا نئے الفاظ غالب آجائیں گے تو اس کی نئی ہستی قائم ہوگی۔ اور اس امر کی تائید خود ڈاکٹر صاحب کے بیان سے ہوتی ہے یعنی جب آریا اس سرزمین میں داخل ہوئے تو جو زبان وہ بولتے تھے وہ غالباً وہی ہے جو رگ وید میں محفوظ ہے۔ اور اس کو ویدی زبان کہتے ہیں۔ اس کے بعد اس میں تبدیلیاں ہوئیں اور عوام کی زبان پراکرت قرار پائی۔ اور چونکہ جگہ جگہ کی پراکرت جدا جدا تھی۔ اس لئے بین الصوبجاتی مقصد کے لئے سنسکرت زبان وجود میں آئی پھر ان الفاظ میں بھی اس حد تک تبدیلیاں ہوگئیں کہ ان کے دوسرے نام رکھے گئے۔ پھر یہی زبانیں اپ بھرنش ہوگئیں۔ یعنی اپنی اصل سے بگڑ گئیں

ان زبانوں کا تقابلی مطالعہ اپنی جگہ نہایت اہم ہے کیونکہ اس طرح دنیا کی زبانوں کے کھوئے ہوئے رشتوں کا سراغ ملتا ہے۔ مگر اردو کے آغاز کی گتھی حل کرنے میں زیادہ مدد نہیں دیتے۔ ڈاکٹر صاحب بھی اردو اسی زبان کو قرار دیتے ہیں جو مسلمانوں کی آمد کے بعد وجود میں آئی تو اب یہ سوال ہے کہ وہ ہندوستان کی کونسی زبان تھی جو ترقی پا کے اردو بنی شیرانی نے پنجابی کو قرار دیا ہے آزاد نے برج بھاشا کو اور ڈاکٹر صاحب نے کھڑی بولی کو۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ سلاطین دہلی کے عہد میں اس پر اہل پنجاب کی زبان کا گہرا اثر رہا ہے (۱) شیرانی کا دعویٰ بھی یہی ہے۔

یہ بات درست ہے کہ اہل لاہور نے کبھی بڑی تعداد میں دہلی کی طرف ہجرت نہیں کی۔ مگر زبان کی تعمیر میں اکثریت یا قلیت اثر انداز نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ ان افراد کی اہمیت ہوتی ہے جو ان میں تبدیلی کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً دہلی میں شاہ حاتم نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے اصلاح زبان شروع کی۔ اور سب لوگوں نے ان کی پیروی کی اور پھر دہلی اور لکھنؤ کی زبان وہی قرار پائی جو شاہ حاتم یا ناسخ کی تجویز کردہ تھی۔ اسی طرح اگر اس عہد میں اہل لاہور میں سے کوئی اہم شخص اس امر کا باعث ہوا ہو تو کوئی تعجب نہیں۔

---

(۱) مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ ۱۳۸ -

زبانوں کے ارتقا کے سلسلے میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ
ان میں تبدیلیاں غیر شعوری طور سے ہوتی ہیں حالانکہ ہر عہد میں اس کے
لئے شعوری طور سے کام کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک مقام کے باشندے
ایک لفظ کو اچھے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور دوسری جگہ ان کے
دشمن آباد ہیں تو اس لفظ کو برے معنی میں استعمال کریں گے۔ جیسے
ہندوستان میں دیو یا دیوتا معبود کے لئے اچھے معنی میں استعمال کرتے
ہیں۔ ایران کے لوگ دیو شیطان کو کہتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی زبان
کو آج کل ہم مصنوعی کہتے ہیں کچھ دنوں کے بعد رواج پا جائے
گی۔ اسی طرح پہلے بھی شعوری طور سے کوشش کی جاتی رہی ہے۔

— پروفیسر شیرانی نے اردو اور پنجابی میں مشترک قواعد کی نشان دہی
کی تھی پروفیسر مسعود نے یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے بعض قواعد
ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ساتھ بھی اشتراک رکھتے ہیں اس
لئے اردو پنجابی سے متاثر نہیں۔ پروفیسر شیرانی نے اس امر سے انکار
نہیں کیا کہ دوسری زبانوں میں یہ قواعد نہیں ہیں۔ مگر مجموعی طور سے اس
حد تک مشترک نہیں ہیں پروفیسر مسعود نے ضمائر کے اختلاف پر یہ زور
دیا ہے کہ پنجابی اور اردو میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح
اعداد بھی مختلف لہجے میں بولے جاتے ہیں بہت سے افعال کے
اختلاف بھی درست نشان دہی کی ہے۔

پروفیسر مسعود نے قدیم دکنی کے بعض الفاظ و محاورات کی توجیہ بیانی

کے استعمال سے کی ہے۔ یہی ہم بھی کہتے ہیں کہ اردو کی بنیاد پنجاب میں پڑی
دہلی میں پہنچ کر یہ ہریانی اور کھڑی بولی کے زیر اثر اس میں تبدیلیاں ہوئیں
اور خالص پنجابی کے اثرات زائل ہو گئے اور نکھر کر اردو کی موجودہ
شکل پیدا ہوئی۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے "اردو زبان کا ارتقا" نامی کتاب میں
اپنے نظریہ کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ اردو کے آغاز کے متعلق بہت
سی غلط فہمیاں ہیں۔ مگر وہ سب قیاس آرائیاں ہیں جن کی نمائندگی علمی
سنجیدگی سے نہیں ہوئی صرف پروفیسر شیرانی نے علمی طور پر تحقیق کی۔ در
عام طور سے اردو میں فارسی عربی الفاظ کی موجودگی سے لوگوں نے
یہ غلط نتیجہ نکالا کہ اردو فارسی سے پیدا ہوئی ہے اور اسی وجہ سے اس
بنیاد پر جو عمارت اٹھائی گئی ہے وہ سر تا سر غلط ہے۔ اردو کا مسلمانوں
سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ مگر مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے اس برصغیر
میں اردو موجود تھی ہندو مسلمانوں کی آمیزش سے پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ
صرف اس کی تربیت ہوئی ہے۔ اور جس طرح مسلمانوں کے تہذیبی اور ادبی
الفاظ اردو میں شامل ہیں اسی طرح دوسری زبانوں کے بھی شامل ہیں مثلاً
فارسی ترکی وغیرہ پھر اس کو مسلمانوں کی ساختہ پرداختہ زبان کیوں نہیں
کہا جاتا۔

شیرانی نے سب سے پہلے پنجابی ہریانی برج بھاشا سے اردو
کا مقابلہ کر کے تقابلی لسانیات سے آگاہ کیا۔ مگر ان کی گرفت زیادہ گہری

نہ تھی کیونکہ آریائی خاندان کی تمام زبانوں اور ان کے باہمی تعلقات سے واقف نہ تھے۔ اردو کا مولد متعین کرنے کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ اس کی موجودہ حالت کا موازنہ معاصرانہ زبانوں سے کیا جائے۔ بلکہ اس کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اردو کی حقیقی صورت کیا تھی اور اس کے بعد عہد بہ عہد کیا تبدیلیاں ہوئیں جس کو لسانیات کی اصطلاح میں تاریخی گرامر کہتے ہیں اور جب وقت اردو کی تاریخی گرامر مدون نہ ہو اور اس کا لسانی تجزیہ مکمل نہ ہو یہ مطالعہ ناقص رہے گا۔ شیرانی نے موجودہ اردو کا موازنہ موجودہ پنجابی سے کرکے یہ ثابت کیا کہ دونوں زبانوں کی شباہت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ دونوں ماں بیٹیاں ہیں حالانکہ شباہت بہنوں بہنوں میں بھی ہوتی ہے۔

دنیا میں بے شمار زبانیں بولی جاتی ہیں ماہرین لسانیات نے ان کی ساخت اور قواعد پر غور کرکے ان کو گروہوں خاندانوں اور زمروں میں تقسیم کر دیا اس عمل تقسیم کا دار و مدار باہمی مقابلہ اور مماثلت پر ہے زبانوں کی تقسیم کی اساس دو اصولوں پر رکھی جا سکتی ہے ایک صوری دوسری نسلی۔ یعنی اشتقاق کلمات اور ترکیب جمل یعنی صرفی و نحوی تغیرات کی بنیاد پر یکساں زبانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا جاتا ہے۔ اور ایک خاندان قرار دیا جاتا ہے پھر جو زبانیں اس طرح ایک جگہ منسلک کی گئی ہیں ان کے باہمی تعلقات کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک نسل کے لوگ

جو زبان بولتے تھے اور ان سے مختلف شاخیں پھوٹیں۔ ان کے بھی خاندان قائم کئے گئے مگر ان کا مطالعہ بڑے غور و فکر سے کرنے کے بعد یہ قائم کی جاتی ہے کہ ان میں ام الالسنہ کون ہے اور اخوات کونسی زبانیں ہیں ۔

ظاہر ہے کہ زبان الفاظ کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور یہ الفاظ بامعنی کلمات ہوتے ہیں ان کلمات کی تالیف سے جملے بنائے جاتے ہیں۔ مگر ہر زبان میں جملوں کی تالیف کا طریقہ جدا ہے۔ مثلاً بعض زبانوں میں الفاظ پہلو بہ پہلو رکھ دیئے جاتے ہیں۔ مگر ان کی حیثیت مستقل ہوتی ہے یہ ارتقائے زبان کی پہلی منزل ہے اور چینی زبان آج تک اس منزل سے آگے نہیں بڑھی مثلاً تسیو لیاؤ کہیں گے جس کا مفہوم علیحدہ علیحدہ 'چلنا ختم' ہے اس سے 'چلا' کا مطلب لیا جاتا ہے۔ مگر یہ دونوں مستقل کلمے ہیں دوسری صورت یہ ہے کہ بعض کلمات اپنے مستقل معنی نہیں دیتے۔ بلکہ صرف علامت کے طور پر مستعمل ہے یہ ارتقا کی دوسری منزل ہے یعنی تالیفی یا ترکیبی زبان کو پہلی زبان کے مقابلہ میں ترقی یافتہ کہیں گے۔ مگر دوسری زبانوں سے کم ترقی یافتہ۔ اس کی مثال ترکی زبان ہے مثلاً 'یازمق' لکھنے کو کہتے ہیں۔ اس میں سے علامت مصدر مق کو علیحدہ کر کے یاز کو ترکیب کلمات کے لئے کام میں لائیں گے مثلاً 'یازدی اس نے لکھا' یازدیدی' اس نے لکھا تھا' یازدیدی لر' ان سب نے لکھا تھا۔ نفی کے لئے 'م' کا اضافہ کیا جائے گا۔ مثلاً یازمدیدی لر

ان سب نے نہیں لکھا تھا۔ علیٰ ہذا القیاس دوسری علامتوں کا اضافہ نحو ہو جائے۔ مگر اس صورت میں کلمات اور ان کی علامات علیحدہ علیحدہ کی جا سکتی ہیں اور شناخت کی جاتی ہیں۔

کلمات کو ترکیب دینے کی ایک صورت یہ ہے کہ دونوں جزو مل کر اس طرح پیوست ہو جائیں کہ ایک نیا لفظ وجود میں آ جائے اس کو اصطلاح میں تصریف یا گردان کہتے ہیں۔ مثلاً سنسکرت میں 'سمی' کے معنی 'میں ہوں' ہے اس میں سے 'اس' ہونا کے معنی میں ہے 'اڈمی' تنہا ان معنی میں مستعمل نہیں۔ یونانی میں 'ای می' یہی معنی رکھتا ہے۔ لاطینی میں 'سم' بن گیا ہے۔ اور انگریزی میں صرف 'ایم' رہ گیا ہے۔ اسی طرح عربی میں 'لن' 'لا' اور 'ان' سے مرکب ہے۔ تفعلت اور تفعل میں 'ت' ضمیر مخاطب ہے جو انت کا مخفف ہے۔ مگر دونوں ٹکڑے مل کر ایک لفظ بن گئے۔ یہ ارتقا کی تیسری منزل ہے۔ اس میں آریائی اور سامی زبانیں شریک ہیں۔ چوتھا درجہ یہ ہے کہ مرکب لفظ بسیط معلوم ہونے لگے مثلاً انگریزی میں goes میں فاعل شامل ہے۔ مگر انگریزی میں اس سے پہلے فاعل He یا She لایا جاتا ہے۔

میکس مولر نے پہلے تین درجوں کا ذکر کیا ہے۔ چوتھے کو مستقل حیثیت نہیں دی۔ پہلا درجہ بنیادی دور سے تعلق رکھتا ہے جس کو جان بمز ترکیبی یا نحوی کہتا ہے بعض لوگ اس کو احادی المقطع (مگر یک ہجائی بہتر لفظ ہے) یا انفرادی کہنے

ہیں دوسرے دور کو میکس مولر اختتامی اور بیمز وغیرہ تالیفی یا التصاقی
کہتے ہیں سامی اور آریائی زبانوں کے علاوہ سب اسی دور میں ہیں
سامی اور آریائی زبانیں تصریفی کہلاتی ہیں۔ مگر اردو انگریزی وغیرہ
تحلیلی ہیں۔ دراوڑی زبانیں تالیفی ہیں مگر آریائی زبانوں میں بنگالی
آسامی تصریفی ہیں سندھی پنجابی مرہٹی ہندی اردو تحلیلی ہے۔

دور اول کی زبانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ مرکب کا ہر لفظ مستقل
اور بامعنی ہوتا ہے ترکیب کی صورت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی صرف
الفاظ پہلو بہ پہلو ہوتے ہیں۔

دور دوم کی زبانوں کی حیثیت بھی دور اول کی زبانوں سے ملتی
ہے۔ مگر ان میں جو الفاظ مرکب کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض مستقل
کلمات ہوتے ہیں اور بعض صرف علامتیں ہوتی ہیں۔ ان زبانوں میں
مادہ مستقل ہوتا ہے تغیری یا تشبیہی علامات عام طور پر بطور لاحقہ استعمال
کئے جاتے ہیں۔ لاحقہ کی حرکت مادہ کی حرکت سے متاثر ہوتی ہے۔ دوم
مادہ اور علامت پہلو بہ پہلو ہوتے ہیں اس لئے ان کو تالیفی یا التصاقی
ہیں۔ تیسری منزل میں تالیف کلمات تصریف کی صورت اختیار کر لیتی
ہے اور دو اجزا ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ اور ان
دونوں اجزا کی شکل ناقابل شناخت ہو جاتی ہے اور اس عمل کو نحت
کہتے ہیں۔ مثلاً ہجوں اور ہیں مرکب کئے ہیں۔ اس عمل کے تحت
مادہ اور تغیری الفاظ مل کر ایک کلمہ بن جاتے ہیں اور دونوں میں

کبھی اتنا تغیر ہو جاتا ہے کہ ناقابل شناخت اور ناقابل انفکاک ہوتا ہے
یہ ایک طرح کی تخریب ہے۔ مگر زبانوں کی تاریخ میں ایسا اکثر ہوا ہے
زبانوں کی دوسری تقسیم نسلی کہلاتی ہے جس کے ذریعہ سے
مختلف زبانیں ایک سلسلہ میں منسلک کی جاتی ہیں۔ مختلف زبانوں
کا موازنہ کرتے ہوئے صرفی و اشتقاقی تغیرات کے اصول و قواعد
اور صوتی تبدیلیوں کے ضوابط پیش نظر رہتے ہیں۔ غیر ترقی یافتہ
زبانوں کا تقابلی مطالعہ ہنوز پورے طور پر نہیں ہوا بلکہ ترقی یافتہ
زبانوں میں اب تک تصریفی زبانوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے تصریفی
زبانوں کے کلمات دو قسموں تقسیم کئے گئے ہیں ایک اصلی RADICAL
دوسری تعمیری FORMAL تقابلی مطالعہ کرتے وقت دونوں قسم کے
الفاظ پر نگاہ ڈالنی چاہیئے چونکہ زبانیں جب ایک دوسرے سے جدا
ہو گئیں تو امتداد زمانہ سے ان میں اتنے تغیرات ہو چکے ہیں کہ اب
ان کی شناخت دشوار ہے۔ اس لئے بنیادی الفاظ کی مشابہت
زبانوں کے یکساں ہونے پر دلالت کرے گی۔ مثلاً

(۱) قریبی رشتوں پر دلالت کرنے والے اسما جیسے ماں باپ
وغیرہ۔

(۲) اعداد ضمائر اشارات وغیرہ۔

(۳) روزمرہ کی ضروریات بتانے والے افعال مثلاً کھانا پینا
وغیرہ۔

جن زبانوں میں تعریف ہوتی ہے ان کے دو بڑے خاندان ہیں سامی اور ہند آریائی اور ان میں سے ہر ایک کی بے شمار شاخیں ہیں ان میں سے سامی خاندان کے تین بڑے قبیلے یہ ہیں۔

(ا)۔ آرامی جو شام عراق بابل اور نینوہ کی زبان ہے ان کی دو شاخیں کلدانی اور سریانی اہم ہیں۔

ب۔ عبرانی جو یہود کی مقدس زبان سمجھی جاتی ہے۔ اس کی دو فنیقی اور قرطاجنی ہیں۔ یہ دونوں زبانیں مردہ ہیں۔

(ج) سامی خاندان کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان عربی ہے۔ اسلام کے بعد اس کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا۔

ڈاکٹر لائنز شمالی افریقہ کی زبانوں کو سامی خاندان میں شامل کرتا ہے مگر میکس مولر زیادہ شہادت چاہتا ہے۔

اس خاندان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان زبانوں کے اکثر مادے سہ حرفی ہیں اور مادوں کے اندر تبدیلی کر کے مختلف مفہوم ادا کئے جاتے ہیں۔ اور اسماء کی اعرابی حالتیں حرکات کے تغیر سے ظاہر کی جاتی ہیں۔

ہند یورپی خاندان سب سے بڑا ہے۔ یورپ اور ایشیا کی اکثر زبانیں اسی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے آٹھ گھرانے ہیں۔ ان میں ہند ایرانی شاخ اہم ہے۔

(ا) یونانی یا جرمانی جس کی چار شاخیں ہیں۔

(ا) لوجرمن جس میں انگریزی فرلشین ڈچ وغیرہ شامل ہیں۔
(ب) ہائی جرمن۔ اس میں مختلف زبانوں میں زبردست تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس نے اس کے تین دور مانے جاتے ہیں۔ قدیم ساتویں سے بارھویں تک متوسط سترھویں تک۔ اور جدید موجود ہے۔
ج۔ گھوتھک ٹیوٹانی خاندان کی سب سے قدیم شکل ہے۔
د۔ سکنڈی نیویا سویڈن وغیرہ کی زبانیں۔
(۳)۔ اطالوی یا لاطینی جس کی پانچ شاخیں ہیں۔
(ا) ہپر وشن اطالیہ کے غنائی شاعروں کی زبان ہے۔
ب۔ فرانسیسی۔
ج۔ اطالوی۔
د۔ ہسپانوی۔
ہ۔ پرتگالی۔
۳۔ یونانی۔
(۴) کیلٹک۔ آریوں کا یہ گروہ سب سے پہلے یورپ جا کر آباد ہوا۔
(۵) سلاوی بحر اسود کے شمال میں سارے روسی علاقے میں بولی جاتی ہیں۔ اس خاندان میں لتھوانی بھی شمار کی جاتی ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ آریائی زبان کی قدیم ترین شکلیں اس میں موجود ہیں۔

(۶) البانوی پہلے اس کو سلاوی کی شاخ سمجھا جاتا تھا مگر بعد کو اس کے واضح خصوصیات کے پیش نظر علیحدہ قرار دے دیا گیا۔

(۷) ہند ایرانی۔ اس میں سنسکرت اور قدیم فارسی شامل ہیں۔ ایرانی زبان کے تین دور ہیں۔ اوستا اور پہلی منشی بادشاہوں کے کتبے قدیم زبان میں ہیں جو رگ وید کی زبان سے مشابہ ہیں۔ درمیانی دور میں پہلوی کا رواج تھا۔ اس زبان میں ژند اور مذہبی رسائل موجود ہیں۔ اسلام کے بعد جدید زبان وجود میں آئی۔

پشاچی ان آریائی نسل کے قبائل کی زبان ہے جو کوہستان ہمالیہ میں آباد ہو گئے تھے۔ کشمیری وغیرہ اسی کی شاخیں ہیں۔

(۸) آرمینی آرمینیا کی زبان ہے اس پر فارسی کا گہرا اثر ہے۔ اس زبان کے مادے ایک حرف سے لے کر چار حرف تک موجود ہیں۔ لاحقوں اور سابقوں کی مدد سے گردان کی جاتی ہے اعراب کا اظہار بھی لاحقوں سے ہوتا ہے۔

سامی اور آریائی خاندانوں کے علاوہ ایک تورانی خاندان بھی ہے جس میں تنگاسی منگولی ترکی فنی زبانیں شامل ہیں۔ ان میں سے تنگاسی سب سے کم ترقی یافتہ ہے۔ منگولی نے کچھ زیادہ ترقی کی ہے ترکی بھی ہے کیونکہ اس کے بولنے والے بہت زیادہ ہیں۔ اشتقاقی اور صرفی تغیرات بھی بہت ہوتے ہیں مگر اس معتبار سے فنی بڑھی ہوئی ہے

جنوبی ایشیا میں تامولی تھائی برمی ملائی ایک علیحدہ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں سے تامولی کے دو حصے ہیں۔ ایک منڈا یا کول جس میں سنتھال کول گونڈ منڈاری جو ہنج زبانیں شامل ہیں دوسری دراوڑ جس میں کنٹری

تلیگو تامل ملیالم شامل ہیں۔

افریقہ کی زبانوں کے متعلق ابھی تحقیقات مکمل نہیں ہوئی صرف جغرافیائی حدود میں زبانوں کی گروہ بندی کی گئی ہے اس لئے ڈاکٹر شرکت نے انکا ذکر نہیں کیا۔

ڈاکٹر سبزواری کے نزدیک جنوبی ہند کی زبانیں تامل تلیگو کرل گونڈ وغیرہ تورانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور باقی زبانیں آریائی ہیں۔

ہند آریائی زبانوں کے تین دور ہیں قدیم متوسط۔ جدید۔ عہد قدیم ۱۵۰۰ قبل مسیح سے ۵۰۰ قبل مسیح میں ختم ہو گیا۔ اس ایک ہزار سال کی مدت کو بھی تین دور میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا دور رگ وید کا ہے دوسرا دور باقی ویدوں کا ہے جس میں زبان کی شائستگی بڑھ گئی ہے تیسرے دور میں پانینی والمیک وغیرہ ہیں جب زمانے میں اس کو سنسکرت کہنے لگے سنسکرت لغتیں شائستہ مہذب اور فصیح کو کہتے ہیں۔ یہ صرف ادبی زبان تھی ویدوں کی زبان عام بول چال کی زبان تھی اسی لئے وہ پراکرتوں سے زیادہ مشابہ ہے جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(۱) آخری کلمات سے حروف صحیح ساقط کر دیئے جاتے ہیں۔ خلاً پشچات کی جگہ پشچا

(۲) مخلوط حروف میں ایک کو گرا کر حرکت کا اشباع کیا گیا مثلاً درناس سے دوناش۔

(۳) کہیں جدا کر دیا گیا مثلاً راتریا ۔

(۴) درگ دہائے مختفی) نے ذ کی شکل اختیار کر لی خاشہ حت سے سوحت

(۵) ڈ ڈھ سے اور ''ل'' سے بدل گئی مثلاً دوڈبہ اصل میں دودبو تھا۔

(۲) 'دھ' 'ج' نے بدلی شکل اوڈھیرتی سے اڈیرتی۔

(۳) 'ر' ساکن کر دیا گیا جیسے سُرِدنا میں 'ڈ' کی حرکت ساقط کی گئی ہے۔

(۴) حروف مخلوط میں صرف 'د' باقی رہ گئی مثلاً دھے اہ گر بھ سے گرہ وغیرہ۔

مگر ڈاکٹر بھنڈارکر دورِ اول میں صرف رگ وید کی سنگھتا یجر وید کے منتر اور اتھر وید کے قدیم ترین حصوں پر مشتمل مانتے ہیں دوسرے دور میں براہمن سک منی کی لغت وغیرہ شامل ہیں تیسرے دور میں رزمیہ نظمیں سمرتیاں وغیرہ شامل سمجھتے ہیں۔

سنسکرت کے آخری دور میں مشتقات بہ صیغہ فعال بہ کثرت استعمال ہوئے ہیں ہند آریائی زبانوں کا دوسرا دور ۵۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ء تک چلا اس عہد کی زبانیں پراکرت یعنی فطری بولیاں کہلاتی ہیں۔ اس عہد میں سنسکرت کی مخصوص آوازیں زبان سے خارج کی گئیں آخر سے حروف صحیحہ کا اکثر اسقاط عمل میں آیا مخلوط حروف میں تخفیف کی جانے لگی اسنانی حروف ت د ثقیل ہوگئے۔ س زیادہ بولا جانے لگا اسما و افعال کی تصاریف میں تخفیف ہوگئی ان زبانوں کے بھی تین دور ہیں۔

(۱) دورِ اول ۵۰۰ ق م سے ۱ء تک یہ زبان اشوک پراکرت یا پالی کہلاتی تھی اس زبان میں سنگی اور اہنی کتبے دریافت ہوئے ہیں بدھوں اور جینیوں کی مذہبی تصنیفات میں ان کے علاوہ ڈرامے بھی ہیں جن میں اشوگھوش کو اہمیت حاصل ہے۔

(۲) دورِ دوم ۵۰۰ء تک بولیوں میں اختلافات زیادہ ہوگئے ان میں سے چار زبانوں یعنی مہاراشٹری شورسینی ماگدھی پیشاچی نے ادبی حیثیت اختیار کی ان کے علاوہ اردھ ماگدھی وجود میں آئی جس میں ماگدھی اور شورسینی یا مہاراشٹری کی آمیزش تھی۔ مگر مصنف کے نزدیک مہاراشٹری زیادہ صحیح ہے شورسینی غلط ہے مہاراشٹری

ان زبانوں میں سے بہتر سمجھی جاتی تھی جو سنسکرت کے کلمات میں جو درمیانی ت ہوتی ہے وہ شورسینی میں 'د' سے بدلتی ہے اور مہاراشٹری میں حذف ہو جاتی ہے مثلاً شت سد سا اردو میں سو ہے جاناتی جانادی جانائی۔ اردو میں جانے ہے اسی طرح سنسکرت کلمات کے ک پ ، شورسینی میں گ ب سے بدل جاتے ہیں ماگدھی میں 'س' کے بدلے 'ش' اور 'ر' کے بدلے 'ل' بولنے کا عام رجحان ہے سنسکرت کی 'ی'، شورسینی میں 'ج' سے بدل جاتی ہے۔ اردھ ماگدھی میں نظم اور نثر کی زبان میں نمایاں فرق ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردھ ماگدھی شورسینی سے مقدم ہے۔

(۳) دور سوم [illegible] سے [illegible] تک اس دور کی زبانیں اپ بھرنش کہلاتی ہیں ان کی اہم خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) حروف مدہ کے غنہ کا اضافہ مثلاً سنئیں جنیوں وغیرہ۔

(۲) م کا 'ں' یا 'ن' سے مبادلہ مثلاً پران پرمان۔ کنور کمار وغیرہ

(۳) مخلوط حروف صحیح کی تخفیف اور حرکت ماقبل کا اشباع جیسے سہاس ہہس تھا۔

(۴) حرف صحیح کا اسقاط جیسے اندھکار سے اندھار۔

(۵) حرکات کی تخفیف جیسے وانجیہ سے ونج۔

(۶) س اور ش کا ہ سے مبادلہ۔

(۷) حروف مدہ کا حرکات مناسبہ سے بدل جانا

ان کے علاوہ صرفی تغیرات بھی ہوئے کہ اعراب کا اظہار امدادی کلمات

سلہ یہ لفظ غلط ہے صحیح ادغام ہے لہٰذا حرف مدغم کی تخفیف لکھنا چاہیے

ہے اور فعل کی گردان معاون افعال کی مدد سے ہونے لگی۔

اپ بھرنش زبانیں کئی تھیں۔ مارکنڈے نے صرف تین کا ذکر کیا ہے (۱) ناگر (۲) اپ ناگر (۳) دراچڈ ان میں سے "دراچڈ سب سے قدیم ہے اس کا ماخذ تو درج ہے مگر بعد کو سندھ میں رواج پایا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ حرف صحیح کو آخر میں "ر" کا الحاق کردیا جاتا ہے۔ ناگر شستہ زبان تھی اسی کو شورسینی اپ بھرنش کہا جاتا ہے۔ اس کی ایک شاخ "گرجر" تھی جو بعد کو گرجر بھاشا۔ اپ ناگر مغربی راجپوتانے اور جنوبی پنجاب میں بولی جاتی تھی اس میں دراچڈ اور ناگر دونوں کی آمیزش تھی حقیقت یہ ہے کہ ہر دیس کی اپ بھرنش جدا تھی صرف ان اپ بھرنش زبانوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ادبی حیثیت اختیار کرکے کتابوں میں محفوظ ہوئیں۔

آریائی زبانوں کا عہد جدید گیارہویں صدی سے شروع ہوتا ہے ان کا اندرونی اور بیرونی گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے اس کی تفصیل دوسری جگہ لکھی ہے۔ ان میں سے شرقی زبانوں کا عام رجحان یہ ہے کہ سنسکرت کے س کو ش سے بدل دیتے ہیں ماضی صرف استعمال کی جاتی ہے اور فعل کی جنس و عدد فاعل کے مطابق ہوتی ہے مغربی زبانوں میں س ش دونوں کی آواز ہے اور فعل مفعول کے مطابق آتا ہے مثلاً میں نے (پوتھی) کتاب پڑھی (میں پوتھی پڑھیل) مشرقی زبانوں کی خصوصیات یہ ہیں کہ نصف حروف علت اضافی ہوجاتے ہیں ڑ، د سے بدل جاتی ہے ل کبھی "ر" اور کبھی "ن" سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً کالی گاری لنگوٹ لنگوٹ وغیرہ اور ی "ر" د "ڈ" سے کلمات کا آغاز نہیں ہوتا۔ اور دو حروف علت کا اجتماع جائز ہے مثلاً اُ ا انسان وغیرہ۔

لہ غالباً "ڈ" ہے

مغربی زبانیں تین زمروں میں تقسیم کی گئی ہیں ایک پیشاچی دوسرے شورسینی تیسرے ماگدھی
ماگدھی اور شورسینی کے وسط میں مشرقی ہندی ہے ان کی ذیلی قسمیں بیان کی جا چکی ہیں۔ یہ
امر توجہ طلب ہے کہ پنجابی اپنی ساخت اور قواعد کے اعتبار سے ہندوستانی یا اردو سے بہت
قریب ہے اسی لئے پروفیسر شیرانی مرحوم کو یہ شبہ ہوا کہ اردو کی اصل پنجابی ہے ملہ

مغربی ہندی میں فعل کے تمام حالات اور اسما کے تغیرات ظاہر کرنے کیلئے حروف صلات
سے مدد لی جاتی ہے گویا یہ زبان مکمل طور پر تحلیلی ہے فعل متعدی کے فاعل کے ساتھ (نے)
آتا ہے کھڑی اور بڑی بولیاں اس کی شاخیں ہیں برج بھاشا پڑی بولی ہے کیونکہ گھوڑا کو گھوڑو
کہیں گے اس کے اکثر کلمات کے آخر میں (ا) کا اضافہ کر دیا جاتا ہے اور اسمائے موصول
دا ر، غیر فاعلی حالت میں تبدیلی ہوتی ہے مثلاً یا کو (اس کو) وانے (اس نے) جا کی
(جس کی) وغیرہ اور جمع (ان) یا حرف (ن) سے بناتے ہیں مثلاً گھوڑاں اور گھوڑی وغیرہ

بندیلی بھی پڑی زبان ہے جمع ان اے بناتے ہیں اردو میں مونث بنانے کے لئے جہاں
حرف ان لگاتے ہیں بندیلی میں (نی) بڑھاتے ہیں شہ نشین کو نشینی کہیں گے مفعولی اسما
کیا جاتا ہے تو سین وغیرہ اضافی حالت میں تو اور میں کرتو اور مُرتو بستے ہیں ہے کی
ماضی ہتو یا ہتو ہے مستقبل میں تہوں اور ہوں گو دونوں طرح بولتے ہیں۔

ہریانی کو جاٹو بھی کہتے ہیں کیونکہ ہریانہ کے علاقہ میں جاٹ بہ کثرت آباد تھے
یہ کھڑی زبان میں شامل ہے اس کی خصوصیات یہ ہیں کہ اردو ٹ اور ڈھ کی جگہ ڈ اور ڈھ

ملہ اردو زبان کا ارتقا صفحہ ۴۹

بولتے ہیں، نے فاعل اور مفعول دونوں کے ساتھ آتا ہے حرف مشدد کو مخفف کر کے حرکت کا اشباع کر دیا جاتا ہے۔ جیسے مکھن کو ماکھن بولتے ہیں آخر کلمات میں غنہ اور ماضی کے آخر الف سے پہلے ی کا اضافہ کرتے ہیں جیسے لکھیا وغیرہ۔

کھڑی بولی یا ہندوستانی کی خصوصیت یہ ہے۔

(۱) سنسکرت اور پراکرت کی ڈ اور ڈھ، ڑ اور ڑھ سے بدل جاتی ہے۔

(۲) اعرابی حالتیں مخصوص کلمات سے کی جاتی ہیں۔

(۳) یہ وہ وغیرہ غیر فاعلی حالت میں اس اُس سے بدل جاتے ہیں۔

(۴) والا ہارا کے معنی میں خاص ہے۔

(۵) ہے کی ماضی تھا ہے

(۶) فعل مجہول جانا کی مدد سے بنایا جاتا ہے۔

(۷) نے اس زبان سے مخصوص ہے۔

(۸) جمع کے غیر فاعلی حالت ون سے بنائی جاتی ہے جیسے لڑکوں وغیرہ

ان میں سے بعض اور دوسری مغربی زبانوں میں مشترک ہیں مگر وہ ہندوستانی سے مستعار لئے گئے ہیں۔

مشرقی ہندی میں نے کا استعمال نہیں علامت مصدر ب ہے اسمائے صفات کے تین درجے ہوتے ہیں مصغر متوسط مکبر جیسے گھوڑ گھوڑا گھوڑ دل تذکیر و تانیث کا خیال برائے نام ہوتا ہے مستقبل میں دو طرح استعمال ہوتا ہے ایک جو سنسکرت سے ماخوذ ہے مثلاً چلی ہوں دوسرے دیکھوں ال تی سے، اور یہ کوئی مستعمل نہیں۔ ماضی مطلق میں فاعل کی ضمیر مستعمل ہوتی ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب آریا اس سرزمین میں داخل ہوئے تو وہ زبان

جاسوقت وہ لوگ بولتے تھے قدیم ہندی آریائی زبان تھی جس نے ترقی پا کر سنسکرت کا نام پایا۔ اس سنسکرت میں صوتی، دہری تغیرات ہوئے تو پہلی پراکرت پالی وجود میں آئی اس سے ترقی کر کے چار پراکرتیں شورسینی، ماگدھی، مہاراشٹری اور دہ ماگدھی پیدا ہوئیں ان پراکرتوں کے بگڑے ہوئے روپ اپ بھرنش کہلائے ان اپ بھرنش زبانوں سے جدید بولیاں وجود میں آئیں

ڈاکٹر بنرجی نے اس امر پر زور دیا ہے کہ زبانوں کی کثرت میں وحدت کی تلاش صحیح نہیں اور یہ قیاس غلط ہے کہ مختلف زبانوں کا ماخذ ایک زبان ہو سکیں مولر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ زبانیں ایک دوسرے سے ملی جلی تھیں اس لئے ان کا سرچشمہ ایک سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ زبانیں کبھی ایک نہیں ہمسایہ آبادیوں کی وجہ سے مماثلت پائی جاتی تھی۔ یعنی ان تمام اپ بھرنش کا ماخذ ادبی پراکرتوں کو بتانا قیاس اور حقیقت دونوں کے خلاف ہے اپ بھرنش ہر دیس کی جدا جدا تھی لہٰذا اسکا ماخذ بھی جدا جدا ہونا چاہیئے آپ فرماتے ہیں کہ مدھیہ دیس کی بولیوں کا ماخذ شورسینی اپ بھرنش بتائی جاتی ہے یہ بات ہر چند عام مسلمات میں سے ہے اور قریب قریب لسانیات کے ہر طالب علم نے اسے ذکر کیا ہے لیکن مجھے اسکی صحت میں شبہ ہے۔ ان مقامات میں الگ الگ دیس کا دور پراکرت اور اپ بھرنش عہد ہی میں ماننا پڑتا ہے (۱)

آگے چل کر آپ رقم طراز ہیں "دراصل یہ اصل ہی صحیح نہیں کہ زبان کی وحدت کی کثرت یا تفرقے سے پہلے ہے زبان سے پہلے بولیاں ہیں اور بولیوں سے پہلے زبانیں۔ روز و شب کی طرح یہ سلسلہ یونہی جاری ہے (۲)

آپ نے یہ بھی لکھا ہے جن زبانوں یا بولیوں کے درمیان صوتی یا حرفی مشابہتیں پائی جائیں اس میں شبہ نہیں کہ وہ زبانیں ایک خاندان کی ہوں گی لیکن ان میں سے اگر کوئی ایک

---

(۱) اردو زبان کا ارتقا صفحہ ۶۰
(۲) " " صفحہ ۷۲

زبان اتفاق سے ادبی سرمایہ کی مالک بھی ہے تو محض اس وجہ سے اسکو قدیم سمجھ کر دوسری زبانوں
کی اصل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ زبان کی ادبی قدامت اور ہے اور لسانی قدامت اور ادبی قدامت
اسکا ثبوت نہیں کہ زبان اصل کے اعتبار سے قدیم ہے کبھی کبھی گرامر کے لحاظ سے قدیم ہونے
ہونے بھی تاریخی حد پر کوئی زبان اپنی ہمسر بولیوں کی اصل نہیں ہوتی۔

مغربی ہندی جسکو کھڑی بولی اور برج بھاشا میں بانٹا جاتا ہے ایک فرضی اور خیالی زبان ہے
ان دونوں میں کبھی کوئی مشترک زبان رہی نہیں بلکہ پرتھوی راج راسو کی زبان برج بھاشا ہے
قدیم ہندی نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں اردو کی ترقی دکنی کی خصوصیت پر یہ نظر ڈالنے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے
کہ اردو کا ماخذ شورسینی پراکرت یا اپ بھرنش نہیں۔ (۲)

ڈاکٹر صاحب کا نظریہ ہے کہ اردو ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک
ہے جس میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں وہ آج اسکو اردو کہتے ہیں۔ پالی کی کوئی ادبی صورت کی
پالی خواص کی زبان تھی اور اردو عوام کی۔ خواص کی زبان ہونے کی وجہ سے پالی میں تبدیلیاں
نہیں ہوئیں مگر اردو میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہیں اس طرح پالی اور اردو متحد الماخذ ہیں۔

اردو کے مختلف نام ہیں ایک کھڑی جسکے معنی ہیں ٹھیٹ کھری۔ اردو کی برج کے الفاظ
کے مقابل سخت ہونے کی وجہ سے اسکے اسماء و صفات ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اسکو ہندی اور
ہندوی بھی کہا جاتا ہے اسکے مقابلہ میں برج کو عرف بھاکا کہتے ہیں۔

دوسری گجری گوجری دکنی اور ریختہ بھی اسکے نام تھے۔ ریختہ صرف شعر کی زبان تھی مستشرق
گریرسن نے اس صورت بھی کہا ہے کہ اس میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش زیادہ تھی، یہی

---

(۱) زبان اردو کا ارتقا صفحہ ۸۷
(۲) " " صفحہ ۸۳

طرح دکنی زبان کی کچھ خصوصیات تھیں جن کا رواج شمالی ہند میں نہ تھا اسی لئے شاہ حاتم اور ناسخ نے اصلاح زبان کے نام سے ان ناہموار بولیوں کو دور کیا۔

صوتی تبدیلیوں کو سمجھنے کے لئے یہ ذہن میں رہے کہ آوازیں دو طرح پیدا ہوتی ہیں کچھ صرف ہوائی ہوتی ہیں ان کو حرکت یا علت کہتے ہیں دوسرے عضلات نطق کے ٹکرانے سے ان کو حرف صحیح کہتے ہیں (۱) بعض الفاظ کی ادائیگی میں آلات صوت کو گرانی ہوتی ہے یا کسی وجہ سے تلفظ میں سہل انگاری برتی جاتی ہے تو الفاظ کی شکل بدل جاتی ہے اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ کبھی حرکت یا علت کو ساقط کر دیا جاتا ہے کبھی حرکت کو دراز کر دیا جاتا ہے کبھی دوسری زبانوں کے الفاظ مستعار لینے کے لئے نئی آوازوں کا اضافہ کیا جاتا ہے کبھی کوئی حرف صحیح ساقط کر دیا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر قسم کی مثالیں اردو میں موجود ہیں۔ مثلاً ہستی سے ہاتھی لوہار اصل لوہکار تھا وغیرہ۔

اردو زبان میں اخذ و اشتقاق بھی پایا جاتا ہے۔ لفظوں کے اشتقاق کی دو صورتیں ہیں ایک ترکیبی دوسری تالیفی اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ کلمات کی دو صورتیں ہیں ایک اصلی دوسرے تعمیری اگر دونوں قسم کے الفاظ پہلو بہ پہلو رکھے جائیں تو اشتقاق ترکیبی ہے مثلاً آنکھ مچولی اور اگر دونوں کلمے مل کر ایک کلمہ بن جائیں تو اس کو تالیفی کہنا چاہئے۔ مثلاً اچھوت جس میں الف نفی کا ہے تالیفی کلمات میں سابقوں اور لاحقوں سے مدد لی جاتی ہے۔ اس میں مختلف زبانوں کے کلمات سے مدد لی جاتی ہے اسی طرح ترکیب کلمات میں سنسکرت کے تت سم اور تدبھو مرکبات بھی مروج ہیں اور فارسی عربی سے بھی ماخوذ ہیں تدبھو مرکبات کی پانچ قسمیں ہیں (۱) عطفی خواہ حرف عطف

---

(۱) مصوت اور مصامت بہتر اصطلاحیں ہیں۔

موجود یا محذوف ہو جیسے بھول چوک اچھل کود یا شاباش سرد پا وغیرہ۔

ڈاکٹر سبزواری کے دعوے کھٹکتے ہیں مثلاً توافق لسانیں متحدالاصل ہونے کی دلیل نہیں یہ ضرور ہے کہ صرف سطحی مشابہت سے دھوکا نہ کھایا جائے بلکہ اور امور کا بھی تجزیہ کیا جائے اور قوی شہادتوں کے بعد فیصلہ کیا جائے۔

زبانوں کے ارتقا میں سیاسی تبدیلیاں ہمیشہ اہم رہی ہیں جب کسی ملک میں بڑے پیمانہ پر لوگ داخل ہوں گے وہ اگر پناہ گزیں ہیں تو مقامی زبانوں سے متاثر ہوں گے اور ان کی زبان کا اثر کم ہوگا اور اگر وہ فاتح ہیں تو ان کی زبان کا اثر زیادہ ہوگا۔ یہی صورت اردو کے ارتقا میں پیش آئی۔

مصنف کی نگاہ سے جرجی زیدان کی کتاب الفلسفۃ اللغویہ گزری۔ مگر مصنف کے برخلاف جرجی زیدان کا نظریہ ہے کہ دنیا بھر کی زبانوں کا ماخذ و منبع ایک ہی زبان ہے اور مصنف یہ فرماتے ہیں کہ دنیا تو بڑی چیز ہے ایک ملک کے مختلف اور ہمسایہ علاقوں میں بھی کبھی ایک زبان کا رواج نہیں رہا۔ اور زبانوں کی کثرت میں وحدت کی تلاش فعل عبث ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک دوسری کتاب داستان زبان اردو کے نام سے مرتب کی ہے۔ اس میں آپ نے اردو کو صرف دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع کی زبان قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ مشرقی یوپی۔ بہار پنجاب۔ سی پی اور دکن کے شہروں میں بھی رائج ہے۔ لیکن اپنے خاص نکھار کے ساتھ یہ صرف تعلیم یافتہ

طبقہ میں بولی جاتی ہے۔(۱)

مصنف کے نزدیک اردو ایک بنایت محدود طبقہ کی زبان ہے اور اسی طرح ہمارے ان کے درمیان کوئی نقطۂ اشتراک نہیں ہمارے نزدیک اردو برصغیر کے بیشتر حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے مغربی یوپی کے دیہات میں جو زبان بولی جاتی ہے۔ اس کا روپ ہمارے ادبی اردو سے بالکل مختلف ہے اور اسی وجہ سے وہاں کے دیہات سے کوئی قابل ذکر صاحب قلم نہیں اٹھا۔

ڈاکٹر صاحب نے صفحہ ۴۲ پر اردو کا سرمایہ جو قرار دیا ہے ہمیں اس کے قبول کرنے میں بھی کچھ تامل ہے۔

۱۔ دخیل الفاظ صرف عربی فارسی کے علاوہ دراویڈی انگریزی اور پرتگالی وغیرہ زبانوں سے بھی لے گئے ہیں۔

۲۔ سنسکرت کے تت سم الفاظ کا تناسب ندرے قلیل ہے۔

۳۔ تدبھو الفاظ کا سرمایہ زیادہ ہے۔

۴۔ مرکبات صرف بیرونی یا اندرونی ہی نہیں بلکہ مختلف زبانوں میں پیوند لگا کر بھی اخذ کئے ہیں جس کی تفصیل وحیدالدین سلیم کی وضع اصطلاحات میں ملے گی۔

(۵) بنیادی الفاظ کی طرح فارسی عربی الفاظ سے بھی مصدر بنائے گئے ہیں مثلاً

---

(۱) داستان زبان اردو صفحہ ۲

توانا بخشنا اور ان سے افعال کا اشتقاق کیا گیا ہے۔

(۶) تیسری کلمات میں بھی فارسی عربی کلمات شامل ہیں سلیم نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

(۷) ہیرونی ضمائر و اشارات وغیرہ بھی زبان کا جزو بن چکے ہیں مثلاً قبلہ گاہی کعبہ من وغیرہ

(۸) صرفی و نحوی اصول میں بھی دوسری زبانوں کے قواعد کا پرتو نظر آتا ہے۔

غیر شہری باشندے اتنی مدت سے اس سرزمین پر آباد ہیں کہ اب وہ ملکی تسلیم کئے جا چکے ہیں ان سے دست بردار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اردو کو بے رو ح کر دیا جائے۔

صفحہ ۴۱ پر نسبت اور جمع کی جو بحث ہے وہ بھی محل نظر ہے جگہی غلط سہی مگر بجو جیدی۔ ستیاپوری۔ صحیح ہیں اور جس طرح روحانی نفسانی کلمات میں نسبت ظاہر کی گئی ہے بالکل اسی طرح تعاریاتی جسمانی وغیرہ میں اسی کلمہ نسبت ہے عربی میں صرف ایک ہی طریقہ جمع بنانے کا نہیں ہے۔ سجدہ کی جمع سجود اور مسجد کی مساجد۔ سجاد اور مسجود غلط ہیں مسجود ایک دوسرا بامعنی کلمہ ہے۔ اگر اردو کلمات کی جمع عربی نہج پر نہیں بنائی جاتی۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں عربی کلمات کی اردو کے طریق پر مستعمل ہے مثلاً ؎

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
کیڑوں نے ہزار ہا کتب میں کھائیں۔

صفحہ نمبر ۴۳ پر شیرانی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تعزیہ ہجرت

اردو کا منشا یہ خیال ہے کہ اردو مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہند و پاکستان میں کوئی زبان نہ تھی وہ مسلمانوں کے اثر سے وجود میں آئی شیرانی کا منشا یہی ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اردو نہ تھی۔ پنجاب میں پنجابی تھی مغربی یوپی میں شورسینی اپ بھرنش کی شاخ مغربی ہندی تھی مسلمانوں کی آمد سے اس میں تغیرات اس نہج پر ہوئے کہ اب مغربی ہندی سندھی ملکر اردو ہو گئی پنجاب یا سندھ میں مسلمانوں کی آمد سے جو زبانیں بنی تھیں وہ آج سندھی اور پنجابی ہیں اور مغربی یوپی میں جو زبان بنی وہ اردو کہلائی۔ اور سیاسی و مذہبی اثرات کے تحت تمام ملک میں رواج پا گئی۔

اردو زبان کی شناخت کے لئے ان اصولوں کی طرف توجہ دینی چاہیے جنہیں مولانا وحید الدین سلیم نے اپنی کتاب وضع اصطلاحات میں بیان کیا ہے۔ وہ مرکبات امتزاجی ارتباطی اور مستقل اصطلاحی کلمات ہیں (۱)

آخر میں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی رائے کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے جو کیفیہ کے صفحہ ۱۷ سے صفحہ ۵۹ تک ہے

کیفی لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں کے لوگ فارسی جانتے تھے۔ کیونکہ بدھوں کے زمانے کا ایک سنگین کتبہ (ڈ) ڈھیری کے مقام پر کھروشٹی زبان کا ملا ہے اس میں شاہی کا لفظ موجود ہے۔ اس طرح والی جیتپال کرسنگھ کی بیوہ

---

(۱) وضع اصطلاحات انجمن ترقی اردو صفحہ ۱۹ - ۲۰

پدمنا بائی نے ستی ہونے سے پہلے جو خط اپنے بیٹے کو لکھا ہے اس میں حضور اور حرام خوری کے الفاظ موجود ہیں۔

کیفی نے امیر خسرو کو اردو کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔

رگ وید کے حوالے سے آپ نے لکھا ہے کہ بانی (نطق) کے چار حصے ہیں ان کو دانا برہمن جانتے ہیں ان میں سے تین چھپے ہوئے ہیں آسانی سے نہیں جانے جاتے چوتھے حصہ کو انسان بولتے ہیں۔ اس منتر میں جو چوتھی کا لفظ آیا ہے اس سے وہ بولی مراد ہے جس کا رواج اس وقت کے ہندی آریوں میں تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عوام کی زبان نہ رگ وید کی تھی اور نہ وہ زبان تھی جس کے قواعد پانینی نے مدون کئے ہیں (سلہ)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر سبزواری کی رائے اس کے مخالف ہے اب جو لش زبانوں کے جب قواعد منضبط ہو گئے تو تبدیلیاں رک گئیں۔ مگر بولیوں میں تبدیلیاں ہوتی رہیں اس طرح عوام کی زبان خواص کی زبان سے مختلف ہو گئی یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اردو براہ راست سنسکرت سے نہیں بنی سنسکرت کے تمام الفاظ جوں یا تت سم اپ بھرنشوں کے ذریعہ اردو میں پہونچے اسی طرح عربی کے الفاظ بلا واسطہ اردو میں شامل نہیں ہوئے بلکہ وہی الفاظ اردو میں آئے جو فارسی میں شامل ہو چکے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان اور ایران کی زبانیں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں

سلہ کیفیہ انجمن ترقی اردو صفحہ ۲۶

محمد تغلق نے جب دہلی اجاڑ کر دولت آباد کو آباد کیا تو اردو دکن پہونچی پس نصرتی وغیرہ کی زبان دکن والوں کی پیدا کی ہوئی نہیں ہے بلکہ انہی دہلی والوں کی زبان ہے جو وہاں جاکر آباد ہو گئے تھے اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب معراج العاشقین دکن میں لکھی گئی۔ اور دکن میں آج بھی وہ الفاظ رواج پذیر ہیں جو اس زمانے میں اردو میں بولے جاتے تھے اور اب ان کی شکل بدل گئی ہے یا ترک کر دیے گئے ہیں یا بعض مراسم کی نشان دہی ہوتی ہے۔ مثلاً لڑلی اترنا پانچ جمگیوں کی دہن۔ دشمناگی۔ دخت (دقت) کو تیر (کو تھیر)

خلاصہ یہ ہے کہ آغاز اسلام سے پہلے پراکرت میں فارسی الفاظ موجود تھے جو صرف پنجاب تک محدود نہ تھے۔ مگر اردو پنجاب میں پیدا ہوئی اور اس کی تشکیل میں ہندو مسلمان دونوں نے حصہ لیا۔ البتہ اس کو ادبی حیثیت دہلی میں حاصل ہوئی اردو کا پہلا شاعر امیر خسرو ہے مگر پہلی مکمل غزل برہمن کی دستیاب ہوئی ہے اور دہلی سے اردو دکن میں پہونچی

مگر ڈاکٹر سنتی کمار چیٹرجی۔ اور پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کی رائے ہے کہ اردو کا مولد نواح دہلی ہے لیکن ڈاکٹر زور اور دیگر ماہرین لسانیات کی رائے میں اردو کا مولد پنجاب ہے

چھٹا باب

اُردو دکن میں

بہمنی دور (بریدشاہی و عادل شاہی)

اُردو الفاظ زمانہ قبل اسلام۔ سواحلِ دکن میبار کارومنڈل میں عربوں کے قبائل اور تجار کا وجود چوتھی قبل مسیح سے پایا جاتا ہے۔ مولانا سلیمان ندوی نے لکھا ہے، قرآن مجید میں بعض الفاظ ہندوستانی پائے جاتے ہیں جو عرب لوگ یہاں سے لے جایا کرتے تھے۔ مثلاً "زنجبیل" زنجبیر از سنسکرت، کافور، مشک کا لفظ، کرسی، ایک چینی لفظ بیان کیا جاتا ہے۔

بعد طلوع اسلام ۱۵ھ ہجری میں بزمانہ حضرت عمرؓ حضرت عثمان ابن ابی عاص نے بحری راستہ سے تھہر تھانہ، دابھی فتح کیا، اس کے بعد دیبل اور بھروچ پر حملے کئے۔ راجہ بیرول مسلمان ہوا اور اس نے مساجد بنائیں اور اشاعتِ اسلام کی۔ اور اُدھر سندھ پر محمد بن قاسم کے فتوحات اور اسلامی حکومتوں کے قیام کی وجہ

سے ہندوستانی السنہ متاثر ہوئیں۔ دوسری صدی ہجری سے بعض قبائل عرب جن کی مخلوط النسل اولاد موپلا، نوائط، مرکب یار وغیرہ ہیں۔ علاقہ ملیبار اور مدراس میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہاں کی قوموں کے ساتھ ارتباط اور اختلاط کی وجہ سے بہت سے الفاظ تیسری چوتھی صدی ہجری کے عرب مورخین اور سیاحوں کے سفرناموں میں ملتے ہیں۔ مثلاً بیرونی سلیمان تاجر ابن زید صراف۔ ابن خوردادبہ، بزرگ ابن شہریار نے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں۔ مثلاً تانبول، نارِیل، تاڑی، کوڑا، لیموں، صندل، دیپ (جزیرہ) منڈپ (منڈل) طاقن، (دکن) گمر، دگور، (تلنگی، مرہٹی، دکنی)۔ اڈرک، ابرک، طالق،۔ جیرج (زیرہ) ٹوگل، (ٹلگو، مرہٹی، تلنگی، دکنی) کئی صدیوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے۔

بعض ایرانی قبائل بھی دکن میں آباد تھے۔ دکن کے مشہور پلوا یا پالوا خاندان کو بعض مورخین پہلوی ایرانی کہتے ہیں جو دوسری صدی عیسوی میں آگئے تھے اور پانچویں صدی عیسوی میں حکومت قائم کی۔ محمد تغلق کے فتوحاتِ دکن ورنگل، دولت آباد اور تبدیل پایہ تخت اور ہزاروں اولیاء اللہ کی دکن میں آمد، تبلیغ اسلام اور اہل ہنود سے میل جول کی وجہ سے جو اردو بولی شمالی ہند میں رائج تھی۔ دکن میں بھی لاکھوں اسلامی فوجی سپاہیوں کے مستقل قیام کی بدولت رائج ہوئی۔ اس کے بعد محمد تغلق ہی کے زمانہ میں دکن میں ایک نئی بہمنی سلطنت جس کا بانی سلطان حسن گنگو بہمنی تھا۔ قائم ہوئی۔ اور بہمنی سلاطین کے زمانہ میں اس

نئی بولی "اردو" میں جو عوام کی زبان تھی۔ تصنیف و تالیف کو سلسلہ شروع ہوا۔
سلطنت بہمنیہ کا بانی علاؤ الدین حسن گانگو بہمنی محمد تغلق ۷۲۵ / ۷۵۲ھ کے امیران
صدہ سے تھا اس نے ۷۴۸ھ سے قبل شاہی فوج کو شکست دی اور
سب سے پہلے امیر اسمٰعیل مخ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے
بعد اس نے حکومت کے لئے حسن گانگو کا انتخاب کیا۔ جس نے فتوحات
اور قیام سلطنت میں نمایاں حصہ لیا تھا اور دولت آباد میں جشن تاجپوشی
منایا گیا، اور مولانا شیخ سراج الدین جنیدی نے اپنے دست مبارک
سے تو سر سے باندھی۔ بہمنیہ سلطنت میں اٹھارہ سلاطین گذرے اور
یہ سلطنت دکن پر دو سو سال حکمراں رہی۔ مملکت چھ صوبوں پر منقسم تھی۔
گلبرگہ، محمد آباد (بیدر)، بیجاپور، برار، خاندیس، اورنگ آباد،
حیدر آباد، جو دریائے کرشنا سے سمندر تک پھیلی ہوئی تھی جس میں موجودہ
صوبہ آندھرا، میسور، ملیبار، شامل تھے۔ اس مملکت کے باشندے
ایک تو بدیسی، یعنی ایرانی، ترک، حبشی، عرب وغیرہ تھے اور دوسرے
یہاں کی قومیں، کنڑے تلنگے مرہٹے وغیرہ اور یہ اپنی اپنی زبانیں بولتے تھے
اور عام زبان سرکاری فارسی تھی۔ ہزاروں علماء، فضلاء ایرانی و تورانی
دربار بہمنیہ میں موجود تھے۔

دکنی نثر کے سب سے پہلے مصنف حضرت شیخ عین الدین گنج العلم
بیان کئے جاتے ہیں، جو حضرت علاء الدین خوندمیر جیوری دہلوی کے مرید و
خلیفہ تھے اور نسباً حضرت جنید بغدادی کی اولاد سے تھے ان کے اجداد افغانستان

میں فرشور، اس کے بعد لاہور، سامانہ، وہاں سے اترپردیش، یوپی، وغیرہ میں رہے۔ عین الدین گنج العلم ۷۰۲ھ دہلی میں پیدا ہوئے اور سن شعور کے بعد حصولِ تعلیم کے سلسلہ میں راجپوتانہ اور گجرات ہوتے ہوئے دولت آباد تشریف لائے۔ شیخ سراج الدین جنیدی ان کے برادر طریقت نیز برادر نسبتی تھے۔ انھوں نے ابتدائی پانچ سلاطین بہمنیہ کا زمانہ دیکھا اور عہد محمد شاہ ثانی بہمنی (۷۸۰ / ۷۹۹ھ) میں بعمر ۸۹ سال ۷۹۵ھ میں وفات پائی۔ کثیر التصانیف تھے۔ عربی، فارسی کی ۱۳۲ سے زائد کتابوں کے مصنف تھے جس کی تفصیل اور خاندانی حالات ایک قدیم شجرہ میں موجود ہیں۔ ملحقات طبقات ناصری اور اطوار الابرار بہت مشہور ہیں، جن کا اب وجود نہیں، مورخ فرشتہ اور بعض مؤلفین نے ان کے حوالے اور اقتباسات دیے ہیں۔ آپ کی بعض قدیم اردو نثر کے رسالے بھی تھے جس کا ذکر میجر اسٹوارٹ نے کیا تھا۔ جو اب ناپید ہیں۔ گنج العلم، خواجہ برہان الدین غریب ۷۳۸ / ۱۳۳۷ء اور شاہ زین الدین دولت آبادی کے معاصر تھے۔ برہان الدین غریب کے قدیم اردو جملے ملتے ہیں۔ حضرت بابا فرید شکر گنج کی صاحبزادی بی بی عائشہؓ نے آپ سے اپنی لڑکی کی نسبت کے متعلق فرمایا تھا۔

"اے برہان الدین! ساڈی دھیکہ کیہا ہندا ہے"، یعنی اے برہان الدین تو ہماری لڑکی کو دیکھ کر کیوں ہنستا ہے۔ یہ بزرگ مقامی بولی بولتے اور سمجھتے تھے۔ شیخ زین الدین داؤد شیرازی کی تصنیف ہدایت القلوب فارسی میں بابا فرید شکر گنج قدس سرہٗ کے ہندی دوہرے اور قدیم اردو الفاظ، مثلاً

کرپاس (سوتی کپڑا)، جواری (جوار)، تیتری وغیرہ ملتے ہیں۔ جس سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بہ سلسلہ تبلیغ شیخ عین الدین گنج العلوم تشریف لائے جن کا قیام، دولت آباد، گمر (شاہپور) اور گلبرگہ میں برسوں رہا۔ قدیم اردو میں رسالے لکھے تھے۔

سلطان فیروز شاہ بہمنی (۸۲۵ھ) جو گویا سلطان حسن گنگو کے نصف صدی بعد تخت نشین ہوا۔ اُردو زبان بہت ترقی کر چکی تھی۔ چنانچہ اس کے حرم شاہی میں مختلف اقوام کی عورتیں موجود تھیں یعنی ایرانی، ترکمانی، عرب، برہمنی وغیرہ جن سے وہ انہیں زبان میں گفتگو کرتا تھا اور مورخ فرشتہ خاں کہتا ہے کہ جب فیروز بہمنی نے رائے دیجانگر پر فتح پائی تو اس کے فوجی سپاہیوں نے دکنی زبان میں فتح کے گیت گائے تھے۔ شہزادی نغلچیں، اور شہزادی پرتھال جو ایک ہندو زرگر کی لڑکی اور اس کی بہو تھی۔ دونوں ہندی موسیقی کے بڑی ماہر تھیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ جب تک عوام و خواص ہندی زبان سے واقف نہ ہوں ہندی گانے اور موسیقی کا لطف کس طرح اٹھا سکتے ہیں۔ مگر اس دور کے مشہور مصنف خواجہ گیسو دراز تذکرہ دہلوی ثم گلبرگوی ۸۲۵ھ ہیں جن کی قدیم اُردو میں بعض تصانیف معراج العاشقین اور ہندی گیت وغیرہ موجود ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارا موضوع خصوصاً دکن میں اُردو کا دور "تا خواجہ گیسو دراز سے لے کر ولی تا بابائے ریختہ تک" ہے اور تین سو سال تک کی اردو کی ترقی ارتقا کی تاریخ ہے۔

خواجہ سید محمد حسینی گیسو دراز الملقب بہ بندہ نواز قدس سرہٗ

سلطان فیروز شاہ بہمنی (۸۲۵ھ) کے زمانہ کی اہم شخصیت سید محمد حسینی گیسو دراز ہیں جو بعض معتقدین اور فیروز شاہ کی دعوت پر دکن تشریف لائے۔ آپ کی فارسی تصنیف میں اُردو الفاظ جابجا ملتے ہیں مثلاً ڈنڈھ بازی، لنگوٹہ، سمندر سوکھ، چک (بٹا) اور ہندی مقولے ملتے ہیں۔ نیز بعض تصانیف کتاب اسمار الاسرار وغیرہ ہیں۔ ہندی مکالمہ کے فارسی ترجمے موجود ہیں۔ فرماتے ہیں "یک برہمن زنار پوشیدہ لنگوٹہ در تہہ بستہ سر برہنہ در یرجا نشستہ و تبول در دہن کردہ بود درمان ایشان بازی کنند آنرا ڈنڈھ بازی خوانند۔" (سمر ۵۹)

ایک مکتوب میں خواجہ صاحب ——— فرماتے ہیں: "ایک سماع کی محفل میں ایک فقیر کو اس ہندی فقرہ پر وجد آگیا تھا،

"ادھونہ آدیہ کہن شرا ماکر" ہوا" ——— اور حجرہ میں بند ہو کر وجد کرتا رہا اور ایک صندوق کے نوکدار قفل سے خود کو زخمی کر لیا۔

(مکتوبات بندہ نواز مطبوعہ)

حضرت گیسو دراز نے ہندی گانا بھی سنا ہے، مولانا عبدالعزیز ابن شیر ملک اپنی "تاریخ حبیبی" میں لکھتے ہیں کہ آخری سماع میں آپ نے یہ ہندی گیت سنا تھا ؎

پچھلی رات بھئی کے تھکے یار چار لکھ ڈھول برانا توکرہ راہ گھر چلی نار

بھائی کر ٹھمکی ناری چاڑ

"یعنی پچھلی رات ہوئی اور چاروں یار تھک گئے۔ ڈھول بجتے بجتے پھٹ گیا، اور محبوبہ اپنے گھر چلی گئی۔" (ترجمہ تاریخ حبیبی ص۱۸ مطبوعہ)

حضرت خواجہ علیہ الرحمتہ نے اپنے ایک مختصر رسالہ فارسی شرح یک بیت امیر خسرو "بہ زور پائے شہادت چوں نہنگ لا بر آوردہ ہو" میں ایک ہندی دوھرہ اپنا یا کسی اور بزرگ کا نقل فرمایا ہے۔

حیرت حیرت اے سکھی ہوں بل کا حیرائے ٭ بوند جو پڑی سمند میں سو کیوں جیر جائے

(ص۷ مطبوعہ)

جس سے ثابت ہے کہ خواجہ گیسو دراز ہندی جانتے تھے، ہندی راگ سنتے تھے اور خود بھی ہندی میں شعر کہتے تھے چنانچہ آپ نے رام کلی کہی تھی:-

مخفی ناؤں معشوق رکھ ظاہر شہباز کہلائے ٭ عشق کی جیتی چند بند اپنی آپ دکھائے

سوئے عاشق شہباز ہے دوجوں جگ کھلارا ٭ خواجہ نصیر الدین سائیاں پت راکھے ہمارا

خواجہ نصیر الدین جنے سائیاں پیو بتائے ٭ جیو کی گھونگھٹ کھول کر پیا کہ آپ دکھائے

رکے سید محمد حسینی پیو سنگھ کھیاں جائے

دو ایک راگ تبرکاً درج ذیل ہیں[1]:-

راگ حقیقت:- آج بیراگے کی آگ مجھ تن لاگے رے۔ مجھ تن لاگے رے

موکا دیکھلائے کار، موکا دکھلائے یار [1] رادی کرسی لگائے

آج بیراگے کی آگ

---

[1] نقل اشعار بند سماع مرسلہ سجادہ صاحب بزرگ)

معشوق کرسی لگائے تخت پر بیٹھی ہے ۔ آج عشق کی آگ میرے تن بدن میں لگی ہے

سعدی دکھنی

سعدی دکھنی سیر پور خاندیس ، کے رہنے والے اور خواجہ برہان الدین غریبؒ کے مرید تھے ۔ ان کے دکھنی اشعار میر تقی میر نے نکات الشعرا[۱] میں اور فتح علی گردیزیؒ نے اپنے تذکرہ[۲] میں لکھے ہیں حکیم شمس اللہ قادری مؤلف اردوئے قدیمؒ[۳] نے اختلاف کیا ہے اور یہ در اصل سعدی کاکوری (۱۰۰۲ھ) تھے ۔ مگر روایح النفائس ملفوظات حضرت خواجہ عیسیٰ جند اللہؒ (۱۰۳۷ھ) سے ثابت ہے کہ سعدی دکھنی اپنے پیر برہان غریبؒ کے ساتھ خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ سے ملے تھے ، اور حضرت موصوف نے اپنی ردائے مبارک تحفتہً عطا فرمائی تھی اندریں حالات ، سعدی دکنی حضرت امیر خسرو کے معاصر تھے مؤلف طبقات اکبری[۴] اور بدایونی نے ان کے اشعار تو نقل نہیں کئے ہیں ۔ سعدی کاکوری اکبر کے معاصر تھے جب ہندی بھاکا کے بہت سے شاعر موجود تھے ۔

امکان ہے کہ یہ دونوں حضرات قدیم ریختہ میں بطور تفنن[۵] طبع کہا کرتے تھے اور یہ زبان کی تشکیل کا ابتدائی زمانہ تھا ۔ مگر یہ بزرگ سعدی کاکوری

---

[۱] نکات الشعرا مؤلفہ میر تقی میر مطبوعہ [۲] تذکرۂ شعرا فتح علی گردیزی مطبوعہ [۳] اردوئے قدیم ص ۱۲۲ / ۱۲۳ طبع ثانی نولکشور لکھنؤ [۴] طبقات اکبری [۵] ۲۹۵ منتخب التواریخ عبد القادر بدایونی مطبوعہ ۱۸۶۵ء ۔ [۵] مخزن نکات قائم چاند پوری مطبوعہ ۔ حل لغات :۔ رادی ۔ رادھا

نہیں بلکہ سعدی (دکنی) ہیں۔ ان کے مشہور اشعار یہ ہیں ؎

تشنہ چو دیدم بر رخش گفتم کہ یہ کیا ربت ہے
گفتا کہ در اے بادرے اس ملک کا یہ ربت ہے

ہمنا تمن کو دل دیا، تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ ربت ہے

دو نین کے گھر میں پھرول، رو رو کے انجواں دل بھرنے
پیش سگ گویت دھروں پیاسا نجاوے جیت ہے

سعدی بگفتہ ریختہ، در ریختہ، در ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

ہمنا، تمن، "ہم یہ کیا تم وہ کیا" کھڑی بولی ہے۔ انجواں بمعنی آنسو کا لفظ دکن میں زیادہ تر استعمال ہوتا ہے جس سے ہمارے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

نظامی بہمنی

نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا ایک نادر مخطوطہ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو کراچی میں ہے جس کے ایک ورق کا عکس قدیم زبان کراچی ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔ نظامی، سلطان علاؤ الدین احمد بہمنی ثانی (۸۳۸ھ تا ۸۶۲ھ) کا معاصر تھا اور دربار بہمنیہ کا ممتاز شاعر تھا۔ سب سے پہلے نظامی نے ایک عشقیہ مثنوی لکھی جس کا نام تو معلوم نہیں مگر اس کا

ہیرو کوئی ہندو، کدم راؤ پدم راؤ ہے۔ نظامی نے سلطان بہمنی کی تعریف کی ہے۔ آغاز سے

گسائیں تہیں ایک ونہ جگ ادار | بر دیر ونہ جگ تہیں دینہار

نعت سے

امولک نعت سبس سنسار کا | کرے کام نردھار کرتار کا

بڑا شاہ دہ شاہ جس تہ جگ | دہیں سیو تی جرم تسے پلنے تک

انہیں تہ یک، شاہ دکھن دہرن | تئن دل دھرت دل مسخر کرن

عطارد مسخر ہوا ے قلم! | مسخر کیا سو رسے حت علم

علم دہ دکھن سو زحل سرچ ڈ | طبل، دھول، ارغون، ہل توں بجا ڈ

بعض مناظر جنگ سے

چمکنے لگے جب کتے ہتنیہر | چڑ ہیا کیا دھرت آکاس پر

چمک بجلی تیوں علم مجہ جیوں | علم سنگ توں گرج کہن چیوں توں

ہتنیہر، مراد (س) —— آتشدان۔ انگیٹھی۔ دھرت، زمین۔ آکاس، آسمان۔

زمین پر اس قدر آتشدان روشن ہو گئے کہ تاروں کی طرح زمین کو آسمان پر بلندی حاصل ہو گئی۔ علم یعنی جھنڈا بجلی کی طرح چمکنے لگا۔ علم

سه سرزمین دکن سه آسمان پر پرچم گاڑ کر، سر اٹھا کر چلا گیا (بادل کی گڑگڑاہٹ کی طرح) طبل ونقارے بجنے لگے۔

بند ہوتے ہی آسمان بادل کی طرح گرجنے لگا۔

سیّد محمد جونپوری (٨٤٧ھ / ١٤٤٣ء) تا ٩١٠ھ / ١٥٠٤ء

گلبرگہ شریف بھی آئے تھے۔ روایت یہ بھی ہے سید شاہ خوند میر جنیدی
قبل ٨٨٧ (١٤٩٣ء) سے بھی استفادہ کیا تھا اور درس گاہ شیخ سراج الدین جنیدی
میں معتکف بھی رہے۔ اس کے بعد بیدر بھی گئے تھے۔ وہاں بھی آپ کا ایک
حجرہ موجود ہے۔ جو گنبد علی برید کے قریب واقع ہے۔ آپ کی بیدر کے
ایک قاضی علاؤ الدین سے ملاقات ہوئی تھی، اور حسب ذیل ہندی دوہرہ
فرمایا تھا۔

ہیر دنت پکھال توں کان پر دھوئے دھوئے
او جل ہویں نچھوت سی سکھ نندری ناسوئے

اور یہی اپنے وفات سے کچھ پہلے فرمایا تھا۔ اس کا مطلب
یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس جسم کی پکھال کو کب تک ڈھوتے پھریں
اس ناپاک دنیا سے پاک ہو کر۔ امن چین کی نیند کیوں نہ سوئیں۔
(شواہد الولایت)

اشرف بیابانی

مولانا شاہ اشرف بیابانی متوطن نقرآباد جالنہ ضلع اورنگ آباد نے
لکھی ہے۔ چنانچہ قاضی محمد فاضل مؤلف تذکرہ گنج گنج اس طرح رقم طراز ہیں

"حضرت مخدوم اشرف در زبان ہندی نسخہ نوسرہار و قصہ آخر الزمان وغیرہ تصنیف نمود"

مؤلف حیاتِ بیابانی نے لکھا ہے کہ شاہ محمد اشرف بیابانی ابن ضیاالدین بیابانی (۸۱۱/۹۰۸ھ) حضرت سید احمد کبیر رفاعی کی اولاد سے تھے۔ ۸۶۴ھ میں پیدا ہوئے، اپنے والد ماجد کے مرید و خلیفہ اور تربیت یافتہ بڑے صاحبِ اخلاق اور مہمان نواز تھے۔

آپ نے سلطان محمد شاہ بہمنی ۸۶۷/۸۸۷ھ کا زمانہ دیکھا جبکہ سلطنت بہمنیہ انتہائی عروج پر تھی اور بعمر ۷۱ سال ۹۳۵ھ میں واصل بحق ہوئے۔ آپ کی تصنیفات میں مثنوی نوسرہار" تصنیف ۹۰۹ھ ہے۔ دوسری تصنیف میں آخر الزماں وغیرہ بیان کی جاتی ہے۔

اس وقت نظام شاہ احمد نگر کا تسلط تھا۔ جب کہ آپ نے نوسرہار لکھی ہے۔ نوسرہار کے قلمی نسخے کتب خانہ ادارۂ ادبیات حیدرآباد انجمن ترقی اردو کراچی میں محفوظ ہیں۔

مثنوی نوسرہار کا موضوع واقعہ شہادت امام حسینؓ ہے جس کے نو ابواب ہیں۔ اس میں بعض بنیادی اختلافات ہیں، یعنی واقعہ شہادت کی بنا بیعت یزید نہیں بلکہ ناکامی عشق یزید ہے۔ نیز قاسم کی شادی کو جو ایک ضعیف روایت پر مبنی ہے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ نیز حضرت علی اصغر کی شہادت اور حضرت عباس کی شہادت و جانبازی کا ذکر نہیں ہے۔ جس کو میر انیس اور دبیر وغیرہ نے بہت زور و شور سے بیان کیا ہے

اس لحاظ سے اس کا پلاٹ کمزور ہے۔ مگر یہ اردو زبان میں ابتدائی کوشش ہے اس لئے قابلِ قدر ہے۔ زبان سلیس بامحاورہ ہے۔ بعض جگہ شاعرانہ کمالات و انداز خوب ہیں۔

آغاز۔ اللہ واحد حق سبحان۔ جن پہ سرجیا بہو مُیں اسمان

چندر سورج تارے ردک۔ بادل بجلی مینہ اچوک

خاتمہ۔ سلکیوں باہیں رحمت کر | جتے بیٹھے مجلس بھیتر
پھر نیوں سنتوں آمرزیں | آمیں اللہ یا آمیں

نام اور سنہ تصنیف۔

ہجرت نبی نو سو نو | کہیا اشرف نو سر لو
نا نو دھریا اس نو سر بار | لیکن یو سب دکھ کا بار

رزم و بزم کے بیان کرنے میں اشرف کو قدرت حاصل تھی۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا ایک خونیں منظر۔

انبر گرجیا لرزی بہیں | تل کی ماٹی اوپر ہوئی
دیس اندلی رت ساری | جانوں دنیا اندکاری

سورج دو کھنہ پکڑے تاب | چاند گھنے نت چھوڑ چھوڑ آپ
پھولنہ باڑی کملائی | سیونتی، چمپا، جی جائی
کونجی سب تن لوہو بھر | لالا ٹپکا مونھہ پہ دھر
دونگڑ دو کھنہ بنواس لاگ | تتی جیوں کے میں آگ

یوں برہوا حکم خدا　　　روتے رہیں لوگ سدا

دکنی لغات :۔ بُہیُں : زمین ۔ دیس : دن ۔ اندلی : اندھیرا ۔ اندکاری : اندھیرا ۔ ددکھنا سوا نیزے پر ۔ گھنے : گھا گیا ۔ سپھولنہ باڑی : چمن ۔ جی جائی : جوئی ۔ کونچی : کونچے لگائے ۔ ڈونگر ددکھنا : بلند پہاڑ بنواس : جنگل ۔ بیسو آگ : آگ لگ گئی ۔

زینب بی بی کا سراپا :۔

زینب اہے اس کا نام　　　نین سلونے جوں بادام
ازحد ، صاحب حسن جمال　　　زیبا موزوں صورت حال
ماتھا جانو سورج پاٹ　　　پاکے جانو چاند الاٹ
دانت تبیسی ، تیسی جاں　　　جیسے ہیر بنہ کیرے کھان
سرکاں جیسے لمبے بال　　　چندر سورج دو نو گال
چاند پیشانی دانت رتن　　　خنداں رو ہم سیمیں تن
صیبر بنہ کیرے کھاں ہیرے کی کان

دکنی خصوصیات کی حامل ہے ۔ بعض الفاظ مؤنث استعمال کیے ہیں ۔ سنتیوں : سپھرتیوں : سنتی ہوں ۔ پڑھتی ہوں ۔ جمع کے طریقے الف نون کے الحاق سے نر ۔ نراں ۔ ہندی الفاظ بھی کافی ہیں مثلاً : بنواس ۔ بُہیں (بھُنویُں) زمین ۔ انبر :۔ آسمان کاف بیانیہ کا اطلاق کے ، فعل کو نون کے ساتھ جانو کو جانوں ۔

تعجب ہے کہ ایسے محاورے استعمال کیے ہیں جو اس زمانہ میں کم رائج تھے جیسے موک کالا ہونا (منہ کالا ہونا)۔ ہاتھ ملنا۔ جیسا کیا پایا سونے۔ دو کر رونا۔ زہرہ چھوٹنا، زہر پھوٹے جیبت کھائے۔ چھند کھیلنا: فریب دینا۔ دس پکڑنا۔ رس جانا فارسی محاوروں کے ترجمے بھی کوئی ہیں: حیف کرنا۔ تاب پکڑنا۔ جو اس کے معاصرین، نظامی اور میراں جی شمس العشاق کی زبان میں خال خال ہیں اور زبان نسبتاً بہت صاف ہے۔

مشتاق بہمنی

مشتاق نے چونکہ شاہ عبدالقادر عرف سید میاں پیرہ خواجہ ابوالفیض بیدری (۸۷۹ھ) کی مدح میں دکنی قصیدہ لکھا ہے اور ایک سند خاندانی سلطان حکیم اللہ بہمنی سے واضح ہے کہ سید میاں ۹۵۱/۹۵۰ھ تک بقید حیات تھے۔ نیز مشتاق نے اپنی ایک غزل میں کسی سلطان بہمنی کو اس طرح مخاطب کیا ہے:-

اے بہمنی نجہ دار تختاں آتے ہو جاتے
جیوں دار کے پوجن کو بھٹاں آتے ہو جاتے

اس لحاظ سے مشتاق نے آخری سلاطین بہمنیہ سلطان محمود بہمنی (۸۸۷/۹۲۴ھ) اور سلطان کلیم اللہ بہمنی (۹۳۴ھ) کا زمانہ پایا۔

ہے۔ مشتاق اپنے وقت کا ایک باکمال دکنی شاعر تھا۔ اس کا کلام رنگین تشبیہات و تلمیحات، شوخی بیاں اور سوز و گداز اور حسرت و یاس کی تصویر ہے بعض اشعار یہ ہیں ؎

مطلع ؎

اد کسوت کیسری کیر تن چمن میانے چلی ہے آ
ہے ہے کھلانے کوں تیوں دستی او چینپے کی کلی ہے آ

نادر تشبیہ ؎

سورج موجاں میں جیوں دستا نظروں کا بتی تھر تھر
جو لٹ پیچاں بھری سرتے اد رُخ اوپر ڈھلی ہے آ

کوچۂ عشق ؎

کھیا مشتاق ناری سوں رہنتے تم کہاں جو میں آؤں
کہی واں گھر اہے میرا اگن کی جاں لگی ہے ، آ

شوخی ؎

لب کے بساط اوپر رکھیا چوپڑ نظر کا کھیلنے
ہنس کر کہی مشتاق تجھ پھانسہ سو لے بار ادے

مشتاق کے دو قصائد بھی ہیں ایک تو ۲۸ بیت کا اور دوسرا ۲۶ بیت کا ہے ؎

قصیدہ ملہ فیض کا ساقی دیا دل کے تیں جب کا شراب
طبع دیا ہو نسیم فہم کے گل کوں شباب

راز کا شاہد سنور شوق کے زیور ستی
ناز کرشمے سوں آ، غمزے کا کھولیا نقاب
فوج ولایت ستی شاہ شہاں کا ہے او
فہم کے ہمت سوں اب مدحت ہے ہمرکاب
نقد نبی ہور بتول نور ہے عین رسول
جس کا ہے سیدمیاں عالی منور خطاب

قصیدہ ۲ سے

ناز کا اے طرز ہے کھینچے وفا پر قلم
غمزے کا اے طور ہے گود میں پالے ستم

مقطع -

فہم سوں مشتاقیا نقش لیا اخلاص کا
ضرب ارادت ستی دل لیا جیوں دام

محاورے :- چنپے کی کلی کی طرح کھِلنا - نظر سحر کا پنا - ڈھلنا -
فارسی محاورے کے ترجمے :- ہمرکاب ہونا : گود میں ستم پالنا - وفا پر قلم کھینچنا : نقاب کھولنا -
فارسی الفاظ - حب کا شراب - نسیم طبع - فہم کا گل ، راز کا شاہد ، شوق کا زیور ، ناز کا طرز ، لب کی بساط - نقشِ اخلاص - ضرب ارادت
ہندی - ابنا :- ناری - اگن - بچالنہ ، نظر کا چوپڑ -

عہد سلاطین بریدیہ بیدر

قریشی ۔ سلاطین بریدیہ بیدر کے دو شاعروں کا پتہ چلا ہے
ایک تو قریشی دوسرا فیروز ۔ قریشی کا مولد و مسکن بیدر تھا اور وہ
سلطان محمود بہمنی ۸۸۷/۹۲۴ھ اور امیر برید اوّل ۹۲۴/۹۴۹ھ کا معاصر تھا جس
کا اشارہ اس طرح کرتا ہے ۔

بریدشاہ، محمود کے دور بھی — کئی ھندوی لوک کوں فارسی
رہے شہر بیدر سچا تخت گاہ — جو پیدا ہویں شاہزاں نیک خواہ
مدر کیرا زاہدہ نیک فقیر — سو شاعر فقیری لکھیا یو ضمیر

اس نے دکنی زبان میں کوک شاستر الموسوم بہ بھوگ بہل لکھی
ہے جس کے معنی ہیں عیاشی، یا قوتِ باہ۔
قریشی کا ماخذ، کوکا پنڈت کی کوک شاستر وغیرہ سنسکرت کی
تصانیف ہیں، اس میں حمد و نعت اور وجہ تصنیف وغیرہ کے بعد
عورتوں کے اقسام اور معاشرت پر مشتمل ہے باتصویر ہے، پیرایہ
بیان، بلند نہیں، اس کے تین ہزار سے زائد اشعار ہیں۔ حاشیہ پر بحوالہ
آیات و احادیث نکاح کی ترغیب دی ہے ؎

آغاز ؎

محبت ملا نیہ سو ناری دھر — گیا نسل ہو زدق جفتی بہتر

بنایا ہے آدم کی پسلی حوا — تو آدم کی دکھ کوں حوا ہوئی دوا
جگت میں نہیں نار سکتی یہ کہ دکھ — پرکہ تھی ہی ذات حضرت ری کوں سکھ
سبب کر نہر اپنی لگ ئیں سیرا — بڑا میوہ ناری کوں پیدا کیا

خدا میرے نبی کی صفت بعد ہوں — ییوں کوک کیا قول ہے یوں سو بول
ہے یو رسالہ عجیب و غریب — کہوں میں یہاں کس سنے حبیب
بہت بھید بھاری ہیں ناری کیرے — ہنر ہور گن ہے نزاکت بھرے

بعض حاشیے۔

(۱) محبو، ثلاث سم من النساء، الطیب النساء، قرۃ عینی فی الدنیا

فیروز بیدری ۔ قطب الدین نام، فیروز تخلص۔ بیدر قدیم پایۂ تخت بہمنیہ کے باشندے اور مخدوم جی ابراہیم ابن شیخ محمد ملتانی قدس سرہٗ (۹۲۳ھ) کے مرید اور سلطان علی برید اول $\frac{۹۲۹}{۹۷۷}$ھ کے معاصر تھے۔ بقول مؤلف مخزن قادریہ حضرت مخدوم جی نے بعمر ۱۷ سال ۹۴۲ھ میں وفات پائی۔ قطب شاہی سلاطین، بیدر کے ان مشاہیر اولیا کے معتقد تھے، اور فتح و نصرت اور اولاد کے لئے دعا کے متمنی رہا کرتے تھے۔ آپ قادری المشرب تھے شیخ بہاؤ الدین انصاری سے سلسلۂ طریقت وابستہ ہے۔ فیروز کی شاعری کی سلطنت قطب شاہیہ میں بڑی شہرت تھی۔ وجہی نے اپنی مثنوی قطب مشتری تصنیف (۱۰۱۸ھ) میں در فخر امشایخ شیخ

محمد مظہر ابن فخر الدین المعروف بہ ابن نشاطی نے اپنی مشہور [illegible] ل بن
تالیف ۱۰۶۶ھ میں آپ کو استاد مانا ہے۔ وجہی کہتا ہے ؎

کہ فیروز آ خواب میں رات کوں　　دعا دے کے چومے میرے ہات کوں
کیا ہے توں یہ شعر ایسا سرس　　کہ پڑنے کوں عالم کرے سب ہوس

فیروز ؎

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد　　جو دیتے شاعری کا کچھ مرے داد

جس سے پتہ چلتا ہے کہ فیروز کا انتقال ۱۰۶۶ھ سے قبل ہو چکا تھا
ممکن ہے کہ ابن نشاطی کو بچپن میں ان سے تلمذ ہو۔ اور شاید اس کا تعلق
بھی بیدر کے کسی مشایخ خاندان سے ہو۔ جو صوفیاء کرام کا مخزن تھا۔

فی الحال فیروز کی صرف ایک مختصر مثنوی ... ت نامہ بقول ڈاکٹر
زور د توصیف نامہ شیخ عبدالقادر جیلانی دستیاب ہوئی ہے جو ایک
متوسط درجہ کی مثنوی ہے۔ جیسے افضل گوکنڈوی کے معاصر عبداللہ
قطب شاہ کا محی الدین نامہ ہے۔ اس کے بقول مصنف ایک سو اکیس ابیات
جس کے قلمی نسخے ادارۂ ادبیات اور انجمن ترقیٔ اردو کراچی میں محفوظ ہیں
مگر انجمن کا نسخہ مکمل ہے اور مؤلف کا نام بھی ہے

ابتدا ؎

تہیں قطب اقطاب جگ پیر ہے　　تہیں غوث اعظم جہانگیر ہے
تہیں چاند بن دن تارے ہیں　　تو سلطان سردار سیارے ہیں

حسن کے سو دریا کا موتی تہیں
نہ پیتا جو تُوں کس نپاتا کریم
کے سنار دل گال کوندن کیا
کہ جب تجہ رتن جوت ہم دل پڑے
ہمن دل پدک ہیں سو تُوں لال ہے
رتن خاص فیروز جب پا کیا
براہیم مخدوم جی جیو نا
سدا مست تو بادہ نوشی نہ تجہ
تو سلطان جگ کا دجگمی فقیر

حسینا منے جگ جو تیں تہیں
حُسن کوں سو بھی کیوں مناتا کریم
کرت صاف کوندن جڑ سٹ دیا
پدک دل مینے لال میانے جڑے
پدک دل جو تیں سو اجال ہے
پدک دل منے لال لبلائیں
کہ مے صرف وحدت صدا پیونا
دیے تُوں کرامت فرد تھی نہ تجہ
کہ سب بادشاہاں تو نہیں دستگیر

شاعرانہ رنگینی بھی ہے۔ ہندی الفاظ کے ساتھ عربی فارسی گھل مل گئے ہیں: نوشی نہ (نوشینہ)۔ صراحی (صراحی)
ہندی الفاظ۔ آدار (آدھار)، جوتی۔ (ھ) کا املا بجنسہ ہندی ہے۔

۱ اردو ادب جون ۱۹۵۷ء۔ ۲ مخازن قادریہ قلمی آصفیہ و تذکرۃ القادری مؤلفہ قادر خان بیدری قلمی ۳ معدن الجواہر قلمی آصفیہ ۴ ابن نشاطی مجول بن۔ مطبوعہ کراچی ۵ توصیف نامہ فیروز مخطوطہ ادارہ ادبیات حیدرآباد۔

گجرات میں اُردو

سید نور الدین محمد عرف ست گرد، دیلمی ثم گجراتی ابن شاہ اسمٰعیل فاطمی، شیعہ داعی تھے، بہ سلسلہ دعوت ۱۰۹۴ھ / ۱۱۴۲ء مطابق ۴۸۷ھ / ۵۲۸ء تشریف لائے، ہندی سنسکرت زبانیں بھی سیکھیں اور ہندو اوتاروں کو اسلامی زعم کے ساتھ خلط ملط کردیا۔

گجراتی زبان میں ان کے بھجن ست پنتی رسائل سے مشہور ہیں:-

ست گرد کہے رے پیو پیو تو سب جگ کرے

بن پیو پیو نہ پاوے کوئی سکھ جنناں جو پیو ملے

تو تیر ساٹا نہ ہوتے رہے

پیر صدر الدین:- خوجہ جماعت کے امام اور فقہ و حدیث کے عالم تھے ان کا سلسلہ دعوت نہ صرف ملک سندھ بلکہ گجرات تک تھا اور بغرض دعوت انھوں نے گجراتی زبان میں بھجن اور گیان الموسوم بہ جنت نامہ انت اور گیان لکھے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

سکھی بھابد کیری رات کو یک جائے رہے

جینے ست گرد ملیا سار سوجھی بجھائے رہے

کہے گرد ہر جند ہر کیری داڑی

گرد سہد پیو سینچڑ عار

صدرالدین کا ۱۲۹۸ھ میں انتقال ہوا۔ بہاولپور میں دفن ہوئے۔

پیر امام الدین المعروف بہ امام شاہ۔ ابن سید کبیرالدین متوطن اوچہ (مغربی پاکستان) کے رہنے والے تھے۔ امام شاہ ۸۵۲ھ میں الٹوناگا نول گجرات بغرض دعوت تشریف لائے۔ سلطان محمود بیکڑہ کے معاصر تھے۔ فلسفہ یوگ (ویدانت) میں ان کو دخل تھا۔ ان کے گجراتی بھجن الموسوم بہ یوگ دانی اور گوردانی مشہور ہیں ۹۱۹ھ/۱۵۱۳ء میں فوت ہوئے۔

اے جی منگھا جنم تیں دیہی دکھری تیاں سمجھیو ست لناں
بے پیر دیا رنہ پاتی لے تیاں نہ جڑے ست گرشام

گوروانی امام مہدی موعود سے متعلق ہیں مثلاً

اے جی جینے مہندی شاہ نامرم نہ جاپا انے دادے لاگا گیمار
تینے کمائی کھوئی جگ چارنی تینو بھٹ پڑیو ادتا۔

(ص ۵۵-۵۷ نورکے ادب جولائی ۵۷ء)

شیخ بہاؤالدین باجن گجراتی ثم برہانپوری

شیخ بہاؤالدین المتخلص بہ باجن (ابن شیخ معزالدین فاروقی) کی ایک تصنیف گلستان رحمت ہے مؤلف اولیاء دکن نے اس کا نام خزانہ رحمت اللہ لکھا ہے گوجری میں مختلف گیتوں کا مجموعہ ہے۔

شیخ باجن سنہ ۷۹۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ابن شیخ عزیز اللہ متوکل مانڈوی معاصر سلطان احمد گجراتی سے بیعت تھے اس کے بعد شیخ رحمت اللہ (د، ۸۹ھ) کے مرید ہوئے۔ عمر کا زیادہ حصہ سیر و سیاحت میں بسر ہوا۔ ملک سندھ، اور خراسان، اور جنوب میں جزیرہ لنکا تک سیر و سیاحت کی۔ سنہ ۸۹۰ھ میں احمد آباد سے برہانپور آ گئے تھے اور یہیں سنہ ۹۱۲ھ / ۱۵۰۶ء میں بعمر ایک سو بیس سال فوت ہوئے۔ مادۂ تاریخ وصال سہ

شاہ باجن نزد شاہ بے چگوں محبوب شد
سال تاریخ وفاتش از حروف "خوب شد"

شیخ علی متقی جونپوری کو باجن سے بیعت تھی۔ آپ کو سماع کا بیحد شوق تھا۔ شیخ متقی نے قبل بیعت اعتراض کیا کہ سماع میں مزامیر جائز نہیں۔ آلات موسیقی کمرے میں بند تھے۔ دفعتہً آواز آنے لگی۔ سب کو تعجب ہوا پھر کسی نے اعتراض نہ کیا۔ اس روز سے آپ کا لقب ہی "باجن" ہو گیا۔ باجن ریختہ فارسی ہندی آمیز کہا کرتے تھے۔ کلام میں سوز و گداز اور تڑپ ہے، اور واردات قلبی سے مملو ہے۔ آپ کے کلام کا ایک مجموعہ الموسوم بہ "گلستان رحمت" کتب خانہ دانش گاہ پنجاب (پاکستان) محفوظ ہے۔

بعض دوہرے درج ذیل ہیں۔

این کلام زیر پردۂ پوربی، یوں باجن بلجے رہے اسرار جھلجے
مندل من میں دھمکے، رباب رنگ میں جھنکے، مونی اس پر تھکے

یوں باجن باجے رہے اسرار جیا جے رہے
باد اشہ کا گاواں ہر کوں حق حق گاواں آد سن لوکلمہ گواں یوں باجن

عاشقان خدا کی موت:۔ ملک الموت ایک سیب لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا حضرت موسیٰؑ نے سیب کو سونگھا۔ آپ جان بحق ہوئے ۔ دوھرہ سے

جی جیو راکھیں سایئں کارن جب بھاوی تب دینہ (دیں)
جیو دیویں آنہا نیہ سایئں کا لینہ (لیں)
جیو را اہی لوکنہ کارن لوکنہ کا جیو لینہ
دے جو ماتے پرم کی آنہ کا جیو کیوں لینہ
باجن جیو عاشقنہ کا جائے توشہ سوں جائے
جیہ تو پہلوں دے رہے جو را کیلے جلائے

عقدہ سہ بہ جیو دیسوں یہ جیو دلیسوں سبہ پر ہر تمہ سوں بھوگ کریسوں

حاشیہ : ۱؎ اخبار الاخیار ص ۲۹۶ ۲؎ گلستانِ رحمت مطبوعہ جامعہ پنجاب ۳؎ مرات احمد مطبوعہ گلستانِ رحمت درق ۱۲ الف مخطوطہ ۵؎ محبوب الزمن عبدالجبار ملکاپوری مطبوعہ ۶؎ اردو ئے قدیم ص ۳۰ طبع ثانی ۔

بین سہ ادل یہ جیو پیارا آہی منجہ تیری تائیں بہیت تمہاری کردں گسائیں
باجن جیو تمہارے تائیں جیو جیو آحی تو ہی گسائیں

دوہرہ نواز باجن سہ

راول دیول ہم پوجنہ پوجہ سرای ہم نہ پوجنہ
بیٹھے آچھیں ٹھنڈی چھانو جوکوچہ دیوے سوجی کھانو

قاضی محمود دریائی گجراتی

قاضی محمود دریائی ، ابن قاضی حمید عرف شاہ چالندہ ابن قاضی محمود۔ اپنے وطن بیر پور گجرات میں ۸۷۲ھ میں پیدا ہوئے۔ جامع علوم ظاہری و باطنی تھے۔ اور اپنے والد ماجد کے مرید و خلیفہ تھے اور وہ حضرت شاہ عالم گجراتی متوفی ۸۸۰ھ کے، ان کے جد امجد قاضی محمود کو حضرت قطب عالم سید شاہ برہان الدین بخاری سے خلافت حاصل تھی جس کی تصدیق خود ان کے اشعار سے ہوتی ہے سہ

قاضی محمد تم پیر ہمارا بندی محمود اس تمھارا
شاہ چالندھا بیاں لاکھ منا دل یہ دکھ بھال ہمارا

دریائی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ کسی جہاز کو طوفان سے بچایا تھا۔ قاضی محمود زیر تذکرہ بڑے مرتاض تھے بعہد بہادر شاہ گجراتی بعمر ۶۷ سال ۹۴۱ھ ۱۵۳۴ء میں واصل بحق ہوئے۔

تصانیف: دیوان قاضی محمود کے دو مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی میں محفوظ ہیں۔ جو راگ راگنیوں کا مجموعہ ہے کوئی چھ جزو پر مشتمل ہے۔ جو مضافات دہلی میں مروج تھی۔ اور برج بھاشا کے مقابلہ میں غیر شستہ تھی۔ بحریں ہندی ہیں۔

یہ زبان اُردو کی ارتقا کا زمانہ تھا، عربی فارسی اور گجراتی الفاظ موجود ہیں۔ آغاز ے اللہ ہوں تیرا ارتا ادناوں انکھ تل بجادے تیری باتا ملہ

نمونہ۔ ہوں ڈھونڈوں مرے اللہ کوں سینہ کی مرے صاحب کوں
جاری بھوڑ سنوں بن کیسی کہت تل آنکھ مدائی
پوچھت پوچھت ڈھونڈت ڈھونڈت ہیں اس کی سدھ پائی

پیر محمود کی سوجھی جانے جس ساتھی بن لبسیا
کی جانے یہ جیوڑا میرا کی وے میرا رسیا

دکھ جیو کا کس کہوں اللہ   دکھ بھریا سب کوئی ہے
نردکھی جگ میں کو نہیں   میں پڑتی بھر بھر جوئی ہے
میرا میرا کی کروا اپنا کچھ نا نہیں   کاہے کو کرب کرو پنجرا بھی تا ہیں

پانچوں وقت نماز گزاروں دائم پڑھوں قرآن ؛
کھاؤ حلال ، بولو مکھ ساچا ، راکھو راست ایمان

سلہ اللہ منجہ تو نہیں بھاوے ستون تیری سبے جگوں جی
توت

سلہ

نینوں کاجل، سکھ تنبولا ناک موتی، گل ہار
سیر نماوں نیہہ اپاوں اپنے پیر کروں جوہار

سیر نماؤں: سر جھکاؤں۔ نیہہ اپاؤں: محبت کروں۔
جوہار کروں: پیر کو سلام کروں۔

شاہ علی محمد جیو گام دھنی گجراتی

شاہ علی محمد جیو از اولاد سید احمد کبیر رفاعی قدس سرہ۔ جامع علوم ظاہری و باطنی تھے فارسی اور گجراتی زبان پر عبور تھا۔ آپنے ۱۴ ار جمادی الآخر ۹۷۳ھ میں وفات پائی۔ مادۂ وفات "نور ادج بہشت" ۹۷۳ھ

تصنیفات :- آپ کا دیوان "جواہر اسرار اللہ" ہندی گوجری زبان میں یادگار ہے۔ اور یہ بمبئی میں ۱۳۲۵ھ میں طبع ہوا ہے بلحاظ اسرار و معارف و ذوق و وجدان اہل گجرات اس کو دیوان مغربی کے مماثل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مؤلف مراۃ احمدی کہتا ہے "دیوانے دارد بزبان ہندی در روش و معنی برابر دیوان مغربی است" بلکہ ہماری رائے میں اپنے وقت کے شمس تبریز تھے۔

دیوان میں غزلیں نہیں بلکہ یہ قطعات و فردیات کا مجموعہ ہے

عقیدۂ ”وحدت الوجود“ کے زبردست حامی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مکاشفات اس طرح بیان کر رہے گویا کہ ہر چیز نظر کے سامنے ہے دیدار الہٰی میں بیخود اور اپنے میں آپ مست۔ کلام کیا ہے راز دنیا کی باتیں ہیں سچ منم آں شمس تبریز کہ عاشق گشتہ ام بر خود۔“ ـــ

آغاز:۔ آپہیں کھیلوں آپ کھلاؤں آپہیں آپس سے گل لاؤں
گلے لگاؤں

خاتمہ:۔

کہیں سو مجنوں ہو بر لاوے کہیں سو لیلیٰ ہوئے دکھاوے
کہیں سو خسرو شاہ کہاوے کہیں سو شیریں ہو کر آوے

بقول مغربیؔ :۔ گہے در صورت لیلیٰ فرو شد گہے بر صورت مجنوں بر آمد

لطیف تشبیہات اور استعارے :۔

اہر پرؔ والی ، چک رتنالی ، بینی بالک ہو ڑتل کالی
ابھ جیو مانگیں بجوریں دمالی [1]

[1] (حل لغات) :۔ اہر غالباً آدھر ا ہونٹ ، پروال : (مرجان سرخ) ۔ چک (آنکھ) ۔ رتنالی : (رتنادلی ، جواہرات کا مالا) ، بینی وہ چوٹی زلف دمالی ، دنبالہ دار (فارسی) ۔ پروالی کو مولوی عبدالحق نے بزاتی لکھا ہے (لاکھا پان کا) اور چک رتنالی کو سُرخ آنکھ ۔ باسک : بموجب عقیدہ ہندو وہ سانپ بادشاہ جس پہ دنیا قائم ہے۔

نکتہ :۔ داو ، وہی سب وہی وہی ہے ؛ جیتم دیکھو وہی سبھی ہے۔

دیکھے جا کھے بات کہے ہے

ہے سو ہو ہو ہوئی رہی ہے　　جیدھر دیکھوں ایکؔ ہی ہے

چھائیں کو چہ سو کول کہی ہے

تو گھونگھٹ مجاری لیا یا　　دتعین ہو آپ چھپایا

احد واحد منہ تفصیل آیا

حضرت بی بی خوندکارنی

علامہ شیخ وجیہ الدین گجراتی، المتوفی ۹۹۸ھ کی خوشدامن تھیں بڑی متقی اور عارفہ کاملہ تھیں۔ انھوں نے گجری زبان میں اسرار و معارف بیان کئے ہیں۔ سنہ وفات اواخر دسویں صدی یا اوائل گیارھویں صدی قرین قیاس ہے اس لئے کہ یہ شاہ وجیہ الدین کی خوشدامن تھیں ظاہر ہے کہ بہت معمر ہوں گی۔ فرماتی ہیں۔[1]

جیو[2] سکھ سریر[3] منہ میت نہ لاکھ　　نت کنیں باندہ بلایا کوئی نہ آئے ساتھ

جب یو جیوڑا نکلے کوئی نہ آوے پاس

سب سہیلیاں جور کر شہ دس چالے

کانتا بھاگا ہے یکم کا یہ سوتے سوتے جاگے

---

[1] نوائے ادب، حصہ جولائی ۱۹۵۸ء۔ [2] سریر: جسم: میت: محبت مطلب یہ کہ مرنے والے کا کوئی ساتھی نہیں۔

شاہ قطب عالم گجراتی (۷۹۰ھ / ۸۵۷ھ) مخدوم جہانیاں قدس سرہٗ کے پوتے تھے۔ ان کے بعض اُردو مقولے مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ ٹھوکر لگی پیر زخمی ہوگیا تو فرمایا:۔ "لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے۔" ایک مقولہ مشہور ہے۔ "حبشیوں نے پکائی بخاریوں نے کھائی۔ (تحفۃ الکرام ص۱۶)

سراجِ الدین شاہ عالم گجراتی ابنِ قطب عالم قدس سرہٗ (۸۸۰ھ) کے بعض ہندی اقوال مشہور ہیں:۔

مثلاً۔ "ارجن جی کا اونہ بجایا ہوئے تو تجھ سے فقیروں کی برستی جب کناسی کرے"

دلہٗ: تساں رلجے اُساں خواجے ۔۔ تم بادشاہ ہو تو ہم بھی نذادو (درویش)

کاندھی کارا جاتم سرکوئی نہ بوجھے ۔۔ سکیں کارا جاتم سہ دی نہ پوچھے

(جمیعات شاہیہ بحوالہ اُردو کی نشو و نما میں صوفیا کا کام از عبدالحق)

سلطان قطب الدین احمد شاہ گجراتی ۸۵۵ھ / ۸۶۲ھ

مؤلف جمعات شاہی رقم طراز ہے کہ سلطان قطب الدین طاب ثراہٗ اشعار ہندی در مدح آنحضرت دراز ۔ یک ہندی بیت درج ذیل ہے۔

منجمن شاہ جہانیاں جس دتیا بیجان
شاہوں کیرا شاہ توں دونہ جل تیری آن

(نوائے ادب ص۲۳ اکتوبر ۱۹۵۲ء)

سلطان محمود بیگڑہ (۸۶۳-۹۱۷ھ) گجراتی علوم و فنون کا شیدائی تھا خواہ وہ کسی زبان میں ہوں۔ چنانچہ اس کے زمانہ میں مشہور وید واگ بھٹ کا ترجمہ مولانا علی محمد اساولی نے ۸۷۸ھ میں کیا تھا جس میں سینکڑوں دواؤں کے ہندی نام موجود ہیں، مثلاً بیل پھل۔ کدو۔ کلنگڑہ (تربز) خربجت: (خربوزہ)۔ سنگھاڑہ۔ کسیرو، گگر۔ (گوگل) وغیرہ۔ دوسری کتاب فیل نامہ، فن بیطاری میں زین العابدین کربلائی ہاشمی نے ۹۲۶ھ میں سنسکرت کی منظوم کتاب سے جو سولہ ہزار بیت پر مشتمل ہے ترجمہ کیا۔ جو سلطان مظفر شاہ گجراتی ۹۱۷-۹۳۲ھ کے عہد کا کارنامہ ہے۔ اس میں بھی بہت سے ہندی نام ادویہ کے ملتے ہیں مثلاً پلاس پاپڑہ۔ بڑ بڑنگ وغیرہ۔

محمود شاہ ثالث گجراتی ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء تا ۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء کے زمانہ کے ایک سنسکرت کتبہ کا ذکر ڈاکٹر سندیسو راؤ نے کیا ہے۔ اور مولوی عبدالحق نے دکھنی کتبہ مسجد جامع احمد آباد کا رسالہ اردو میں کیا ہے جو ۹۶۱ھ کا ہے جو اسی سلطان کے زمانہ کا ہے، جو یہ ہے سہ

تاریخ اس میت کی ہوئی سوں یوں مشہور
مسجد جامع تھانہ یا بنی نور
میت (مسجد) ۹۶۱ھ

شیخ خوب محمد چشتی

شیخ خوب محمد چشتی متوطن گجرات ۔ آپ شیخ کمال الدین محمد سیستانی خلیفہ وجیہ الدین گجراتی کے خلیفہ تھے ۔ تفصیلی حالات نہیں ملتے ۔ آپ نے اپنی تصنیف خوب ترنگ ۹۸۶ھ میں لکھی ، اور ۱۰۲۳ھ میں وفات پائی ہے ۔ فارسی زبان میں آپ کی دو تصنیفات شرح جام جہاں نما دوسرے امواج خوبی (شرح خوب ترنگ) تیسری گوجری زبان میں خوب ترنگ ہے آخرالذکر میں اپنے پیر کے ارشادات کو نظم میں بیان کیا ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

وارث محمد ہر ہر ٹھاؤں	شیخ کمال محمد ناؤں
ان تھیں میں سنیا دن رات	اس موں یاد رہے کچھ بات
وجیہ منجھوں آئی ترنگ	جمع کئے یہ تس تس ڈھنگ
خوب ترنگ اس دیا خطاب	مدح رسول اللہ باب
نسخہ کی تاریخ اس ٹھانہ	پائے عدد ہر مصرعہ مانہ
دوجا چاند تھا شعبان	دن دو شنبہ کیا بیان

امواج خوبی کا سنہ تالیف ۹۹۹ھ ہے ۔ دونوں کی زبان کو عربی فارسی آمیز گجراتی کہی ہے ۔ کتب خانہ سالار جنگ میں خوب ترنگ کے دو مخطوطات ہیں جن میں سے ایک ۱۰۱۱ھ کا مکتوبہ ہے ۔ اسلوب بیان سیدھا سادا ہے تصوف کے امور و معارف مثالوں اور حکایتوں کے ساتھ بیان کئے ۔

مزے سے بیان فرماتے ہیں۔ یہ ایک ضخیم مثنوی ہے۔ ان حکایتوں کو ڈاکٹر زور حیدر آبادی نے فرانسیسی زبان میں شائع کرایا ہے۔ حکایت شیخ چلی:۔

شیخ چلی کے ستے گھر چار — چڑھے پھرانے اکیس بار
اونچے چڑھے کر لیکھا کیں — گنتی چھیرے ہوئے سوئیں
جس پر بیٹھے آپ پھرائیں — تس کو گنتی مانہ لیایں
اتروں ڈھونڈوں جنہ کہیں یاد — دیکھوں جاؤں منا گر لیا دل
سب کو کہے کرا ے دکھ جائے — دوڑے کہیں نہ جانے پلے
جانے سانس نہ منہ منہ جائے — خوے کے جھرنوں ریل بہلے
بھاگ پڑے آ مسجد مانہ — رہیں قلندر بھی تس ٹھانہ
بات جماعت میں کہی کھول — جواں ملے اد گئے بکول
شیخ چلی کو سوتے بوج — کتر کیے دی داڑھی موچھ الخ

خوب ترنگ کی زبان سے

جیوں دل عرب عجم کی بات — سن لو بے بولی گجرات

حل لغات: چڑھے: چڑھے۔ جنہ: جن کو۔ منہ: میں۔ ریل: رال
بکول: دنگی۔
خوب ترنگ مطبوعہ ۱۳۲۰ھ پٹن گجرات۔ مع امواج خوبی۔
خان محمد:۔ خان محمد ابن ولی محمد بن شیخ خان محمد۔ متوطن گجرات
متوفی ۱۰۲۹ھ۔ "ذکر حق" مادۂ وفات ہے۔ گو شغل حربی و رسمی زبان

میں ہے اور اس کا موضوع تصوف ہے مگر مصنف عربی فارسی کے علاوہ ہندی زبان سے بھی واقف تھے۔ اس رسالہ میں خان محمد کے سترہ ہندی دوہرے ہیں جن پر گجراتی زبان کا اثر زیادہ ہے بلحاظ سن وفات خان محمد شاہ خوب محمد چشتی کے معاصر تھے۔ مگر یہ امر مشتبہ ہے کہ یہ ہندی دوہرے خان محمد ہی کے ہیں۔ نمونہ درج ذیل ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی زبان گیارھویں صدی کے کسی گجراتی شاعر کی ہے :۔

لا اور الا کی تعقین سے بہار نکستا لاسوں : نو ئد الا اللہ سوں بھیتر آ نو
کلمۂ طیبہ ـــــ جی دم شہ بن خالی جاوے ہیں ہاتوں گھر لٹا دیں

یہ سب جند تمہارے منہر دس ہموں سر دیتا
ترن نہالی باج تمہوں بیہ نام ہمارا کیتا

کال کرنتا آج کر آج کری سو اتیال
مورکہ مہلت کے کیتڑی جیسی کرتوت خیال [1]

یعنی آج کا کام کل پر مت ڈال۔ موت سامنے کھڑی ہے۔

منہر: منوہر: دلربا۔ دس، گولی۔ رسالہ نوائے ادب اکتوبر ۱۹۵۵ء)

وفات نامہ شاہ عیسیٰ جند اللہ: $\frac{۹۹۲ھ}{۱۵۵۲ء}$ تا $\frac{۱۰۳۱ھ}{۱۶۲۲ء}$ ۔ شاہ عیسیٰ جند اللہ ابن شیخ قاسم شیخ شکر محمد عارف کے خلیفہ تھے کسی مرید و معتقد نے سنہ ھ کے بعد آپ کا

[1] یہ دو دوہرے ہمیں ہیں ملے تھے:

مرثیہ ہندی۔ گوجری زبان میں لکھا ہے جس کے ۴۴ بند ہیں۔ نام مصنف و سن تصنیف و کتابت وغیرہ موجود نہیں، مخطوطہ کتب خانہ راز الہی بر ہانپور میں ہے۔ ابتدائی بند یہ ہیں [1]

عیسیٰ شاہ مہا گر گیانی ۔۔۔ جا کے گت کنوں نہیں جانے

نینن میں جو بنی ہمارے ۔۔۔ یوں ڈیہن میں عیسیٰ پیارے

جگ نس ماہنی عیسیٰ پیارا ۔۔۔ چودس چاند جیوں اجیارا

ات سندر محبوب الہٰی ۔۔۔ جن سا ہے کوں دیہی ساجی

سندرکھی سبحان پیارے ۔۔۔ پربت ہوں تیں ہیں ات بھارے

حضرت عیسیٰ جند اللہ کے بعض اُردو جملے روائح الانفاس میں ملتے ہیں

ایک مرتبہ ایک سادھو آیا اور پوچھا کہ "پرمیشر ہے" یا پرمیشر بچ ہے "آپ نے فرمایا کہ پرمیشر بچ ہے۔ یعنی" **لاوجود الا اللہ**۔"

تلخیص روائح الانفاس کتب خانہ مولوی عمر یافعی حیدرآباد)

عبدالملک بہروچی :۔ ان کی تین مثنویاں ہیں مولودنامہ (۳۳۸ اشعار) دوسری وفات نامہ، تیسری۔ مدح شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ ۔ پہلی مثنوی۔ وفات نامہ تصنیف ۱۰۰۸ھ دوسری مولود نامہ کا سن تصنیف ۱۰۰۱ھ۔ بقول پروفیسر مدنی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ زبان گجراتی آمیز اُردو۔

[1] نوائے ادب جنوری ۱۹۵۷ء ص ۱۶ تا ص ۲۲۔

مولود نامہ سے

یا نبی شکر تیرا کس زباں سوں بیوں کروں   توں خدا صاحب سبھوں کا حکم تیرے میں ہوں
تیں کیا پیدا محمد جس نبی سوں سب ہوا   عرش کرسی لوح تینوں اور قلم چوتھا کیا
توں خدا خالق زمیں اور آسماں کا بالیقیں   تیں فرشتے آدمی پیدا کیا دنیا و دیں

ہور دیکھا اب فرشتوں کے نبی کا نور آج   جس نبی کوں ہیں دیا جو دین دونیں کا سو راج
یا سبحان یا سلطان شاہ شمس تبریز   جیسا تجہ میں تیز تیسا آنکھ میں تیز
شیخ فرید شکر گنج ذرا نہ رہے رنج

بعض مقولے ضرب المثل ہیں۔   (مخطوطہ ادارۂ ادبیات)

گفتار محمد ملک :۔ متوطن بھڑوچ ان کی ایک نظم گویا تبرۂ شوب (۱۰ بیت) تصنیف ۱۰۶۹ھ ہے جو کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ گجرات احمد آباد میں محفوظ ہے ۔ ملک محمد شاہ جہاں کے معاصر تھے ۔ چنانچہ لکھتے ہے

سے   شاہ جہاں کے راج بھروچ میں ملک محمد میاں یہ دیکھی
ایک ہزار انہتر تھی تب قول نبی کی لیکھی

آغاز   ایسا وقت آیا ہے بھائیو جوں حضرت فرما کر گئے ہیں
اگر دی نہیں اب اس جگ میں ظاہر دیکھو پرکھو من میں
امر نہی کا کریں تفاوت حق کوں باطل کر دکھلا دیں
قاضی مفتی و عالم دیکھ رد پیہ دین پھرا دیں

جو کوئی فریادی آوے بہوج حاکم کوں بناؤ چکادیں
ایسے بے دین ملانے جان بہوج دوزخ میں جادیں
یہ ملک محمد جائسی کے علاوہ کوئی گجراتی بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔

(نوائے ادب بمبئی)

امین گجراتی :۔ میر محمد امین۔ تخلص امین وطن گودھرا د گجرات
عالمگیری آخری دور کا شاعر اور یوسف زلیخا کا مؤلف ہے۔ یوسف زلیخا جامی
اس کا ماخذ ہے جس کے اشعار ۲۱۱۴ مگر جامع مسجد بمبئی کے نسخے میں
۲۲۳۰ لکھے ہیں۔ اپنی زبان کو برخلاف دکنی کے خود شاعر گوجر لکھتا ہے سہ

براک جاگا قصہ ہے فارسی میں
امیں اس کو اتارے گوجری میں

امیں سنی المذھب، قادری المشرب، خداترس اور ملنسار شخص تھ
ساقی نامہ کے اشعار بھی لکھتے ہیں سہ

پلا ساقی شراب ارغوانی
امیں کوں دے کہ پھر کرے جوانی
ضعیفی ذات کی جاوے سو سب ٹل
ترے ہاتوں پگوں میں پھر کرے بل

جس سے ظاہر ہے کہ امین نے یہ مثنوی آخری عمر میں لکھی ہے جب کہ وہ ضعیف
تھا۔ نمونہ زبان درج ذیل ہے :۔

زلیخا اور بت پرستی ہے۔

ہوا اک رات اس کوں عشق کا جوش
پڑی بت کے اگل دے ہوکے بیہوش
سیچیوں پھر ہوس بیچہ آئی سو جب او
لگنے لاگی اپس کے بت کوں تب او
کہ میں تجہ کوں خدا کر کرکے پوجا
تو بھی تیں درد دکھ میرا نہ بوجا

یوسف کے رب نے کیا کیا ہے کتنے کام — بچا لیے یوسف کوں رب نے سب ٹھام
بھی اوس کے رب نے اوس کوں شاہ کیتا — مصر کے ملک جیسا تخت دیتا
تجے لعنت خدا کی ہیچ کارا — کیا تیں کام نہ اتنا ہمارا
تجے یوسف کے رب اوپر سوں داروں — بے عزت کر کے دھرتی پر پچھاڑوں
یوں کہہ کر تب پکڑ دھرتی سوں کوٹا — قدم تا سر دے بند بند سیں چھوٹا

تختۂ تنقید :-

ضمیر ہ وہ ، کو وے ۔ تیں : تونے ؛ ٹھام : جگہ ، (ٹھاؤں) ، جوانی پکڑنا بجلے انیڑنا ۔ کتنے : کتنے ، فارسی :- قدم تا سر ۔ ہیچ کارا ۔ بند بندے چھوٹنا : جوڑ جوڑ ٹوٹ جانا (پرزے پرزے ہونا) ، دھرتی پر پچھاڑنا : زمین پر پٹکنا ۔

ولی گجراتی

اصل نام ولی اللہ، بقول بعض ولی محمد، ابن شریف محمد، علوی نسب شیخ وجیہہ الدین گجراتی وفات ۹۹۸ھ کے خاندان سے تھے[1]۔ ولی کے والد ماجد مولانا شریف محمد نے ۱۰۷۲ھ میں وفات پائی ہے اور ایک سند ثبت خاندانی محررہ ۱۱۰۶ھ میں ولی کا نام بھی درج ہے اس لحاظ سے ولی کا سنہ ولادت قبل ۱۰۶۰ھ قرار پاتا ہے۔ ولی کی تعلیم و تربیت احمد آباد میں ہوئی۔ اساتذہ کا حال معلوم نہیں۔ اس زمانہ میں علامہ شاہ نورالدین

---

[1] معمولات نیری قلمی ۔ رسالہ مصنف علی گڑھ مضمون قاضی احمد میاں جونا گڑھی۔

گجراتی کا مدرسہ بہت مشہور تھا جن کی اس نے مدح کی ہے۔ ولی نے سن شعور
سے پہلے ہی شاعری شروع کر دی تھی، اور حصول معرفت کے شوق اور دیدار
الٰہی کی طلب میں عشق مجازی کی دولت خیزیوں نے عشق حقیقی تک پہنچایا۔ جس
کا اس نے اپنے اشعار میں ذکر کیا ہے یعنی حقیقی نہیں تو مجازی ہی سہی اور بقول
ڈاکٹر سید عبداللہ اس کا ایک ساجن نہیں بلکہ ہزار ساجن تھے۔ اس کا مطلب
ہماری ناقص رائے میں یہ ہے کہ عشق حقیقی میں کامل ہونے کے بعد حسن مستور
کے نظارہ میں محو تھا۔ وہ بقول ایک دکنی شاعر کے ؎

ہے جمال خوبرویاں کا نہایت بے کمال
جو دکھیں تحفہ لختا ب کچھ اور نور

ولی نے آخری سلطان عادل شاہی اور قطب شاہی کا زمانہ پایا ہے۔ جب اس
کے والد ماجد کا انتقال ہوا ہے تو سلطان علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ/۱۰۸۳) عبداللہ
قطب شاہ (۱۰۳۵ھ/۱۰۸۳) سریر آرائے سلطنت تھے اور اس زمانہ میں دکنی شاعری
عروج پر تھی، چونکہ سلاطین مذکور دکنی کے سرپرست اور خود شاعر بھی تھے۔ چونکہ
ولی کے خاندانی تعلقات برہانپور، بیجاپور، اور اورنگ آباد سے تھے اور
اس کے خود برادر نسبتی اورنگ آباد میں موجود تھے۔ اور گجرات میں مرہٹہ سورش
کی وجہ سے عام پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ولی کی سیر و سیاحت
کے لئے وجہ تحریک ہوئی اور بقول السفر وسیلۃ الظفر، اہل کمال سے ملنے
کے لئے بہت سے مواقع ملے۔ چونکہ شاعری کا فطری شوق تھا۔ اس نے بھی،
مشہور دکنی شعراء کے رنگ میں غزلیں کہنی شروع کیں، چنانچہ اس کی غزلیں
غواصی، نصرتی، حسن شوقی، شاہ سلطان کی زمینوں میں ملتی ہیں۔ اور جب

اس نے دہلی کا سفر کیا۔ اس سے قبل شاہ گلشن گجراتی ثم دہلوی سے ملاقات
ہوئی تو ان کے زریں مشورے نے کہ تم اب بجائے دکنی کے دہلی کے روزمرہ
میں کہا کرو۔ یہ ہدایت کام کر گئی۔ ہماری اردو شاعری میں اس نے جان
ڈال دی۔ اور ایک طرف متقدمین شعرا اور شعرائے زبان ہندوستان کے
درمیان برزخ کا کام کیا۔ اور ہماری اردو زبان کو جو اپنی ارتقائی مدارج طے
کر رہی تھی ہمیشہ کے لئے اپنی اعجاز بیانی سے زندہ جاوید بنا دیا۔ ہندوستانی
شعرا جیسے شاہ حاتم، میر تقی میر، سودا نے اس کی تتبع کی اور زبان کو
معراج کمال پر پہنچا دیا۔ اور جدید اردو کا باوا آدم کہہ دیا۔ در حقیقت
بقول میر علیؔ "ایک بات بجز اس کے بزبان دکنی تھی ...." مگر یہ زبان کی صاف و شستہ
زبان کے مدنظر صادق آ سکتی ہے۔ ہر زبان کی ترقی کا یہی حال ہے۔ صدیوں
میں کہیں جا کر یہ شستگی اور دلآویزی پیدا ہوتی ہے۔ اب یہ جھگڑا کہ ولی
گجراتی تھا یا اورنگ آباد کا، ایک وطنی عصبیت کا مسئلہ ہے حقیقت تو یہ
ہے کہ ولی کی شاعری کا نشو و نما بیجاپور یا صوبہ اورنگ آباد میں ہوا ہے
جہاں بڑے بڑے اہل سخن دکنی زبان کے موجود تھے۔ غرض یہ کہ وہ دکنی
شاعر ہے۔ ولی نے گجرات اور سورت کی تعریف کی ہے۔ اور بیجاپور
کے گرد و مشہور قلعہ بیجاپور کی تاریخ سے بھی لطف اٹھایا ہے اور بیجاپور
و احمد نگر و گولکنڈہ کے مشہور شاعر حسن شوقی کے کلام سے متاثر
ہوا ہے جس کا ایک بیت میں ذکر موجود ہے ولی نے ۱۱۱۹ھ میں بمقام احمد آباد
گجرات، عالمگیر کی وفات کے ایک سال بعد وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔

قطعۂ وفات سہ

مطلع دیوان عشق سید ارباب دل — والی ملک سخن، صاحب عرفاں ولی
سال وفاتش خرد از سر الہام گفت — بادپناہ ولی ساقی کوثر علی

اور ولی کا دیوان پہلے تو مشہور مستشرق گارساں تاسی نے پیرس سے ۱۸۳۴ء میں شایع کیا۔ اوس کے بعد بمبئی سے چھپا اور تین اڈیشن انجمن ترقی اردو دہلی، حال کراچی سے شایع ہو چکے ہیں۔ اس کے کلام کو بقول ڈاکٹر گریم بیلی، دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک حصّہ تو وہ ہے جس میں دکنیت نمایاں ہے اور دوسرا وہ جس میں دہلی کا روزمرہ اور محاورے موجود ہیں ولی کے دکنی و گجراتی معاصرین و متبعین ہیں، اشرف اور صالح گجراتی، خوشی گجراتی میں مگر وہاں ان کے بعد تو کچھ سناٹا نظر آتا ہے۔ البتہ قریب تر متبعین جنہوں نے زبان کو ترقی دی سراج اورنگ آبادی، قاسم اورنگ آبادی عاجز اورنگ آبادی، عزلت اورنگ آبادی، داؤد اورنگ آبادی، شاہ صادق اورنگ آبادی، مبتدی وغیرہ اور شمالی ہند کے شعراء میں شاہ حاتم، آبرو، سودا، میر تقی میر۔ وغیرہ ہیں۔ غرض جنوب سے شمال تک ولی ہی کا فیض پہنچا ہے۔

تصنیفات:- کلیات ولی میں ۴۴۹ غزلیں، ۷ قصاید، دو مختصر مثنویاں، ۲۷ فرد، جن کا اشعار بحیثیت مجموعی ساڑھے تین ہزار ہے

خطبات گارساں دتاسی از ۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۹ء مقدمہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صفحہ شایع کردہ انجمن ترقی اردو۔

زاید ہیں۔ (کلیات ولی طبع سوم انجمن ترقی اردو پاکستان)۔ ایک رسالہ
فارسی میں نور المعرفت بھی ہے۔ مگر بعض اکابر کی رائے میں مشتبہ ہے۔

ابتدا ہے

دو صنم جب سوں بادیۂ حیراں میں آ	آتش عشق پڑی عقل کے ساماں میں آ
تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا	جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

قدیم رنگ ہے

تجھ مکھ کی جھلک دیکھ گئی جوت چندر سوں	تجھ مکھ پہ عرق دیکھ گئی آب گہر سوں
اشرف کا یو مصرع ولی مجکوں پسند آیا	الفت ہے دل و جاں کوں مرے سیم بگر سوں

اے نورِ چشم تجھ پہ نامہ لکھا پلک سوں	کیتا ہور تھراس پر انکھیاں کی مردمک سوں

باندھا ہے جب سوں شوخ نے خنجر میان میں	سب گل خاں کے جیو پڑے ہیں خطر میان میں
جو آب و رنگ ترے سخن میں ہے اے سجن	ہرگز وہ آب و رنگ نہیں ہے گہر میان میں

پھول کی پنکھڑی پہ جوں مارا ہے بنگل رنگ	دل نے توں پکڑا ہے تیرا دامن آ اگر چہ من
منہ پہ شیریں، دل میں سنگیں جال معشوقاں کا دیکھ	کیوں نہ مارے غم سوں تیشہ سر پہ اپنے کوہکن

نکل اے دلربا گھر سوں کہ وقت بے حجابی ہے
چمن میں چل بہار نسترن ہے ماہتابی ہے

کسی کی بات سنتا نہیں کسی پر رحم کرتا نئیں — ہٹیلا ہے ستمگر ہے جفا جو ہے شرابی ہے
گلی میں اس ستمگر کے نہ جا اے دل نہ جانے — کہ جانبازی میں آفت ہے قیامت ہے خرابی ہے
کسے طاقت ہے انکھیاں کھول کر دیکھے تری جانب — جھلک تجھ حسن روشن کی شعاعِ آفتابی ہے
بہارِ عاشقی کوں تازہ کرنا اے گلِ رعنا — تلطف ہے، مدارا ہے، کرم ہے بے عتابی ہے

تعریف شمشیر اور جست سے

قبلۂ اہلِ جفا شمشیر ہے — ہادیٔ مشکل کشا شمشیر ہے
نازاں اہلِ سعادت کیوں نہ ہوں — سایۂ بالِ ہما شمشیر ہے
کیوں نہ دشمن کے کرے سینے میں جا — ناخنِ شیرِ خدا شمشیر ہے
اوّلاً ریحاں و آخر لالہ رنگ — ظاہرا برگِ حنا شمشیر ہے
زندۂ جاوید شہیداں کیوں نہ ہوں — موجۂ آبِ بقا شمشیر ہے
کیوں نہ ہووے آب سر سوں تا قدم — جوہرِ کانِ حیا شمشیر ہے
کیوں نہ ہووے قتلِ عاشق دم بدم — شوخ کی بانکی ادا شمشیر ہے

شعلۂ آواز سے

دردمندوں کو صدا ہے تری اطرب دل نواز — گرمیٔ افسردہ طبعاں شعلۂ آواز ہے

ہے کعبہ رو کھڑا تو ہوا جیوں ابرو کے ساتھ — بولے اکابراں کہ قد قامت الصلوٰۃ
دلی حیراں ہے یاراں عجب اپنے تماشے پر — ادھر تیغ کی گالی ہے ادھر پلکوں کی تالی ہے

بعض شمالی ہند کے شعراء اور ولی۔

ولیؔ: مکھ تیرا آفتاب محشر ہے — شور اس کا جہاں میں گھر گھر ہے

شاہ حاتمؔ: یار کا مجھکو اس سبب ڈر ہے — شوخ ظالم ہے اور ستمگر ہے

ولیؔ: جسے عشق کا تیر کاری لگے — اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

فائزؔ: تری گالی مجھ دل کو پیاری لگے — دعا میری تجھ من میں بھاری لگے

ولیؔ: دل کوں لگتی ہے دلربا کی ادا — جی میں بستی ہے خوش ادا کی ادا

میر تقی میرؔ: اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا — کھب گئی جی میں تیری بانکی ادا

ولیؔ: جامے میں غنچے کے نمن رہ نہ سکوں میں — گر پی کی خبر لے کے نسیم سحر آوے

میر تقیؔ: برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے — اللہ کی قدرت کا تماشہ نظر آوے

عادل شاہی دور ۸۹۵ھ تا ۱۰۹۶ھ

میراں جی شمس العشاق

امیر الدین، المعروف بہ میراں جی شمس العشاق ابن حاجی شریف دوام الدین مکی۔ میراں جی کی خود نوشت مختصر سوانح الموسوم بہ نسل نامہ کا خلاصہ یہ ہے: "ہمارا مکان محلہ قریش مکہ معظمہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے پاس تھا۔ میرے والد دوام الدین مکہ سے ہندوستان آئے اور وہاں قوم خفتیہ کی لڑکی سے شادی کی اور لوٹ آئے۔ میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوا ہوں میرا نام امیر الدین رکھا گیا۔ عرفیت میراں جی تھی مجھ کو بائیس سال کی

عمر میں طلب الٰہی کا شوق پیدا ہوا اور مدینہ منورہ جاکر وہاں بارہ سال
تین ماہ پانچ یوم رہا، بالآخر پانچویں روز حضرت رسول کریم کے دیدار
سے مشرف ہوکر قدمبوس ہوا آنحضرت صلعم نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور
حضرت علیؓ کے سپرد فرمایا اور نعمت و برکات سے سرفراز فرمایا، پھر ان
حضرات کا حکم ہوا کہ ہندوستان جاؤ، میں نے عذر کیا کہ وہاں بہت سی
زبانیں بولی جاتی ہیں جن سے میں نابلد ہوں، حکم ہوا کہ نہیں تم جاؤ وہاں
کی زبان سے واقف ہو جاؤ گے اور تم وہاں کمال الدین بیابانی سے فیض حاصل
کرو۔ ایک پرچم دیا گیا اور یہ بھی ارشاد ہوا کہ جس مقام کی مٹی سے ہماری
خوشبو آئے وہاں مستقل قیام کیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں میں ہندوستان
آیا... شاہ کمال الدین سے بیعت کی۔ ہندی زبان سے واقف ہوا
اور پیر کے حکم سے بمقام بھنکار جاکر شادی کی، چند روز بعد پھر پیر
کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسرار و معارف سے مستفید ہوتا رہا۔ اس
کے بعد پیر کا حکم ہوا کہ جہاں آنحضرت رسول کریم صلعم نے مستقل سکونت کا
اشارہ کیا ہے وہاں جاؤ پس میں حسب الحکم اوائل عہد علی عادل شاہ اول
(۹۶۵ھ/۹۸۸) میں بیجاپور آکر سکونت پذیر ہوا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے آپ کا سنہ
وفات بلحاظ قصیدہ وفات دکنی، اور مادۂ تاریخ وفات شمس العشاق مستخرجہ
ذوقی ۱۰۲۰ھ قرار دیا ہے۔[1] مؤلف اولیائے دکن نے آپ کے حالات دو جگہ
میراں جی کے نام سے لکھے ہیں اور سن وفات بالترتیب ۹۲۷ھ و ۹۰۲ھ
لکھا ہے۔ مگر بساتین السلاطین کے ایک نسخہ میں جو خود مؤلف کا مرتبہ ہے

[1] بساتین السلاطین مرتبہ محمد ابراہیم زبیری قلمی مخطوطہ۔ تذکرۃ الاولیائے دکن جلد ۲

یہ الفاظ لکھے ہیں ۔
"ورود میراں جی صاحب در سنہ نہصد و شصت و شش، ع ۱"

اس لحاظ سے میراں جی کے بیان اور روضۃ الاولیا کی تصدیق ہوتی ہے اور مؤلف اولیا دکن کا بینہ سن وفات (۹۰۲ھ) صحیح معلوم ہوتا ہے غرض آپ دور عادل شاہی کے پہلے شاعر اور نثر نگار ہیں ۔ اور یہ خاندان گجرات سے بیجاپور آیا ہے ۔ چنانچہ ان کی زبان میں گوجری زبان کے اثرات ہیں ۔ اور خود ان کے صاحبزادہ شاہ برہان الدین نے اپنی زبان کو گوجری لکھا ہے ۔ مؤلف مجمع الانساب شاہ محی الدین بیجاپوری نے لکھا ہے کہ آپ کا خاندان مغل ترکمان کہلاتا تھا ۔ آپ کے والد دوام الدین کا خطاب دولت خاں تھا جو صحیح نہیں مگر البتہ آپ کی ننھیال مغل چغتائی تھی چنانچہ میراں جی نے اپنی ایک عزیز مرید خوشی کے اجداد کا اس طرح اشارہ کیا ہے "ذات ما کی چغتا جانو باپ ترک اشتقاق ۔" جس سے آپ کو بہت محبت تھی ۔ میراں جی کا مقبرہ بیجاپور میں مشہور ہے ۔

تصنیفات :۔ (۱) بشارت الذکر منظوم ۸۰ بیت ۔ تصوف ۔ ۲ ۔ خوش نغز ، منظوم ۔ بطور سوال و جواب اشعار ۲۲/۲۲ ۔ تصوف و عرفان ۔ نواب عرفان و روح ۔ مراقبہ ۔ عقل و عشق وغیرہ پر مشتمل ہے ۔ ۳ ۔ خوش نامہ منظوم ۔

۱ خوش نامہ قلمی آصفیہ فارسی ۱۶۹۵ ۔

ایک سو ستر دوہوں پر مشتمل ہے۔ ابتدا : ؎

صفت کر دل میں اللہ کیری جے پوری پورن پور

قادر قدرۃ ان کے کارن نیڑے نا دور

سوان دجواب :۔ خوشی دمیراں جی۔

(عقل وعشق کا مناظرہ)

خوشی کہے کہو میرانجی عشق بڑا یا بودہ ‏ پیر کہس میں کہوں بیاں، میں ہر ناسون

خوشی بوجھے موحد کے بکس کہو بیاں پیر ‏ کھولو محمد کیریاں بیاں یک یک بج دھیر

اس کا صحیح نام شہادت التحقیق ہے شہادت الحقیقت نہیں ہے اس میں ۵۶۳ بیت ہیں۔ موضوع تصوف۔ بحر ہندی۔ ہندی اثر زیادہ ہے عربی فارسی بھی ملتے ہیں۔ وجہ تصنیف میں لکھا ہے کہ جو لوگ عربی فارسی نہیں جانتے۔ اس کو پڑھیں۔ ظاہری عبارت کو نہ دیکھو، معنی پر نظر رکھو اور مٹی چھان کے سونا نکال لو :۔

میں عربی بول کیرے ‏ اور فارسی بجھو تیرے

یہ ہندی بولوں سب ‏ اس راتوں کے سبب

یہ بھاکا بھل سو بولی ‏ پن اس کا بھاوت کھولی

لو گرو کا بتہ پایا ‏ تو ایسے بول چلایا

دے عربی بول نہ جانے ‏ نہ فارسی پچھانے

یہ ان کو بچن ہیت ‏ سنت بوجھیں ریت

(پیارا) ‏ (عارف)

؎ یہ مثالیں دوہوں کی نہیں ہیں۔ (مدیر)

یو دیکھت ہندی بول — پن معنی ہیں نیتول
اس کا مغز ذریا — جی دیکھ نت رہے بھریا
جے ہووے گا چھارا — کیا جانے گا بچارا

یعنی ان میرے اسرار کو مچھیرا کیا جانے۔ غواص چاہیئے۔ یہ بظاہر ہندی زبان ہے مگر معنی نپے تلے ہیں۔ شرح مرغوب القلوب نثر ہے (حصہ نثر دیکھو ب رس میرانجی دراصل دجہی کی تاج الحقائق ہے آپ کی نہیں ہے غرض دکھنی زبان میں آپ کے آٹھ سو بیت محفوظ ہیں۔

شاہ برہان الدین جانمؔ بیجاپوری

شاہ برہان الدین ابن میراں جی شمس العشاق رح۔ اپنے والد، جد کے تربیت یافتہ اور مرید و خلیفہ اور جانشین تھے۔ سلطان عادل شاہ اول ۹۶۵/۹۸۸ھ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی ۹۸۸/۱۰۳۷ھ کا زمانہ پایا۔ اور سنہ ۹۹۰ھ میں واصل بحق ہوئے۔ آپ کے اجل خلفاء میں، شیخ محمود چشتی، مولانا حاجی اسحق، شیخ عطاء اللہ جن سے شاہ امین الدینؒ کو بیعت و خلافت تھی مشہور رہیں۔ ایک بزرگ شاہ راول بھی تھے جو ابھی منظر عام پر نہیں آئے ہیں، ان کی متعدد دکھنی تصانیف موجود ہیں، اور شاہ برہان کے مرید ہونے کا اشارہ کیا ہے۔ شاہ برہان بڑے محقق کامل صوفی تھے

(۱) مجمع الانساب قلمی کتب خانہ گچی محل بیجاپور عطا خوش۔

جن کے متعلق حاجی اسحٰق کو حضرت رسول کریم صلعم کا اشارہ ہوا تھا کہ بیجاپور جاؤ اور شاہ برہان سے فیض حاصل کرو، اور ان کو یہ تصور کرو کہ وہ میں ہی ہوں۔ شاہ صاحب نے دکھنی زبان میں اسرار و معارف کا دریا بہادیا ہے شیخ مخدوم عبدالحق ساوی بیجاپوری وفات ۱۱۶۹ھ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے دکھنی زبان سمجھ کر ان کے اقوال سے گریز کیا، بالآخر انھیں کے ارشادات سمجھنے کے بعد تسلی ہوئی۔ مسائل وحدت الوجود، عینیت و غیریت وغیرہ میں آپ کی کتابیں بے مثل ہیں۔

تصانیف:۔ نکتہ واحد کے دو حصے ہیں جو علی الترتیب ۱۲-۲۹ بیت پر مشتمل ہے اور سنین تصنیف ۹۶۷ھ و ۹۷۷ھ ہیں جو غالباً آپ کی پہلی تصنیف ہے۔

۲- ارشاد نامہ:۔ تصنیف ۹۹۰ھ، جو آخری زمانہ کی تصنیف ہے تقریباً ڈھائی ہزار بیت۔ دوسری تصانیف ہیں۔ ۳۔ سکھ سہیلا قریب ۱۱۷ بیت ۴۔ وصیت الہادی تقریباً ۲۰۰ بیت۔ ۵۔ منفعت الایمان ۱۲۰ بیت، ۶۔ بشارت الذکر ۶۰ بیت ۷۔ حجت البقاء ۸۰ بیت۔ ۸۔ رموز الواصلین منظوم ۹۔ نسیم الکلام ۴۵ بیت۔ ۱۰۔ مسافرت شیخ خان میاں۔ آپ کے کسی مرید لاجو کی مرتبہ ہے اس لئے مشہور ہے ۱۱۔ ہندی راگ اور دوہرے وغیرہ بحیثیت مجموعی آپ کے ساڑھے تین ہزار سے زائد ابیات محفوظ ہیں۔ ۱۲۔ کلمۃ الحقائق نثر۔

۱۔ نکتہ واحد:۔ تصنیف ۹۶۷ھ ۹۷۷ھ کا نمونہ:۔

حروف ابجد کے لحاظ سے ہر حرف کا ایک نکتہ بیان فرمایا ہے جس کے نمونے
متاخرین میں بھی ملتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔ پہلا حقہ ؎

نکتہ واحد اپیں احد ہے — الف ذات اللہ صمد ہے
ب بہ روپ کر آپیں — ایکہ ت تمام سے پرگٹ سیکھ

دوسرا ؎ الف ایمان اللہ پہ لیاؤ — ان سب جگ بنایا
ایسی قدرت بہ بھانت رچیا — آپیں آپ چھپایا

پ:۔ پوراجے طالب ہوئے پر نور اس کا دل + پاک ہند شاہ برہان آکھے پیار حق کے واصل

۲۔ سکھ سہیلا:۔ ہندی عربی فارسی الفاظ گھل مل گئے ہیں۔ اور حسب
ذیل شعر تو آپ کے سلسلہ کے صوفیاء کے رسالوں میں اکثر ملتا ہے

؎ گن آدم نہ جات چڑھے اے کیوں کہنا انسان
صورت پر اعتبار نہ راکھیں جیسے ہیں حیوان

یعنی جب انسان میں انسانیت ہی نہ ہو وہ کس طرح انسان کہلا سکتا
ہے صورت قابل اعتبار نہیں۔ بلحاظ صورت انسان حیوان سب برابر
ہیں۔ اس میں الفاظ، اعتبار، حیوان، فرمان، قرآن، عربی فارسی ہیں

ٹھیٹ ہندی ؎

پنتھ اکاس کا ڈنیکم جانے جل کا مارگ مین
سادھو کا انت سادھو جانے، دوجے کو نہیں چین

نیکم (نکامہ، لاطمع) مین: مچھلی۔ یعنی آسمانی راز وہی جانتا ہے جو
لاطمع ہو۔ مچھلی پانی کی حقیقت سے واقف ہوتی ہے۔ فقیر کا بھید فقیر ہی

جانتا ہے۔ دوسرا نہیں۔

۳۔ ارشادنامہ منظوم ؎

سپت سمدر سیاہی بھریں　　سب روکھ تیے قلم بھریں

دھرتی اکاس کئے پتر　　لیکھن بیٹھیں کریں چتر

اس مجنڈ سی بحرمیں۔ آیۂ کریمہ " ولنفد البحر مداد لکلمات ربی " کی تفسیر نہیں تو اور کیا ہے۔

۴۔ وصیت الہادی:۔ احادیث کی تشریح مصقلۃ القلوب ذکراللہ تعالیٰ: ذکر قلب کے آئینہ کا صیقل ہے ؎

محمد جس کا ہیٹ بیٹھیگا اسکوں کیا ہے ڈر ہُوت اُتے سمریٔ سکوں دل میں کلمہ جپی کر

حضرت محمد صلعم جس کے پشت پناہ ہوں اوس کو کیا ڈر ہے، اٹھ اور کلمہ طیبہ جپا کر ــــــ

قولہ تعالیٰ یا امرون بالمعروف وینہون عن المنکر ؎

امر خدا کا لیا بجا توں نہی تھے منکر ہونا　　مقام شیطانی جسکوں کہیا دل تھے سارا دھونا

ذکر جلی خفی۔ اور شریعت وطریقت وحقیقت کی آیات و احادیث کے ساتھ مدلل توضیح فرمائی ہے۔

ہندی راگ اور دوھرے:۔

اب سندیسا مجھ بے شہ کا　　جب کب بھاگوں انتر ملے

پیر پرم کے بیڑے میرے　　نینو مانہ جوں کنکر ملے

نس دن جاگے برہ ماری — نہ نیندا دیکھے نین پڑے
نہ کا پیتا مجہ کوں لاگیا — لوگ دیوانے دیکھ ہنسیں

بعض محاورے: توشہ بھوکٹے کھانا: مفت کی ناسے

ایسے دھندے جگ مے سب جگ اندے پھر بیے ایسے ٹھارا
چلتی سکا تو نیم نہوتے یو توشہ بھوکٹ کھایا

بھاگوں انتر ملنا: قسمت سے

نیبو مانہ جوں کنکر ملے : یعنی آنکھ میں کھٹکنا
نہ نیندا دیکھے نین پڑے : آنکھوں کی نیند اڑ جانا

شاہ راول بیجاپوری

یہ ایک قدیم شاعر ہیں جن کا تعارف یہاں ضروری ہے ان کی تصانیف کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شاہ برہان بیجاپوری (۹۹۰ھ) کے خلیفہ تھے۔ اس لحاظ سے یہ بزرگ ابراہیم عادل شاہ ثانی ۹۸۸ھ/۱۰۳۷ھ کے معاصر تھے شاہ راول کی چار دکنی مثنویاں حسب ذیل ہیں:-

۱۔ کشف وجود ـــ ۲۲۲ ابیات (مخطوطات کتب خانہ روضتین گلبرگہ شریف و بابائے اردو کراچی

۲۔ کشف الانوار۔ ۱۲۶ ابیات (مخطوطہ کتبخانہ خاص بابائے اردو کراچی

۳۔ چار شہادت مختصر نظم ہے: " " " "

۴۔ ناصری نامہ، ۳۵۲ بیت

کشف الوجود:۔ این کتاب کشف الوجود گفتار شیخ اول ہے

اللہ واحد سرجنہار — جو نجک عالم جس تھیں بار
ظاہر باطن اپنا روپ — ذات منزہ ہیچ سروپ
دایم قایم اپیں آپ — جونا ہکری ناما باپ

عقل مقیمی علوی ناؤں — عقل دلالی اس کی چھانوں
علوی قائم تنکی سٹھار — سفلی گھٹ بٹ کرتی پار
آدم نور نبی کا پاک — نیہ کی صورت برخا خاک
آدم کی نا ہو وے صفات — سٹھیں بہتر حیوانات الخ

کشف الانوار:۔ ابتدا سے

ایک تھا طالب صادق مرد — دانا، عاقل، اہل درد
پوچھا مرشد کوں سوال — گذریا آج رات شیخ ہر حال
ذکر فکر میں تھا مشغول — خلوت بیٹھیا حق کوں بھول
اس میں قدرت کوں کمال — زیبا صورت روپ جمال
نینوں پر گٹ دیکھیا نور — بیشک ستا د چندر سور
جھلک مکھ روشن روپ نول — سجو رنگ بھریا خوب شکل
عجب تجلی جلوہ خوب — خوش خو بالا تھا محبوب الخ

شاہ راول کی زبان، اسلوب بیان، بحریں، سب شاہ برہان سے ملتی جلتی ہیں ہندی اثر زیادہ ہے۔ عربی، فارسی الفاظ گھل مل گئے ہیں۔ مثلاً دائم قائم۔ ذات منزہ، حاضر ناظر، ذیا صورت۔ خوش خد۔ قد کا املا خد فہم کا املا فہام۔ اصطلاحات سلسلۂ شاہ برہان۔ عقل مقیمی، عقل دلالی۔ علوی سفلی وغیرہ۔

سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی

ابن سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی ابن طہماسپ نے ۴۸ سال بڑی شان و شوکت سے حکومت کی اور ١٠٣٧ھ میں فوت ہوا۔ جب یہ تخت نشین ہوا تو اس کی عمر دس سال کی تھی۔ ابراہیم عادل شاہ کو ہندی موسیقی سے دلچسپی ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے اس شوق کی خاطر سرسوتی دیوی کی بھی پوجا۔ علماء اس کے مخالف ہو گئے تھے۔ اس نے مذہب حنفی کو رواج دیا اور سرکاری زبان اُردو کو پھر زندہ کیا۔ اس کا اہم کارنامہ ہندی زبان میں کتاب "نورس" ہے جو بقول بعض ١٠٠١ھ کی تصنیف ہے۔ مولوی ہاشمی صاحب نے سن تصنیف ۹۹۰ھ / ١٠١٢ کو فصلی قرار دیا ہے۔ نورس نامہ کو ڈاکٹر نذیر احمد نے تو اب اڈٹ بھی کر دیا ہے۔ گو اس کو ایک ہندی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ مگر اس میں بہت سے قدیم ہندی الفاظ بھی آ گئے ہیں۔ اور اس کتاب کا نام اس نے

"نورس" رکھا تھا۔ جس کے معنی ہیں "آبِ زلال"۔

ابراہیم عادل شاہ کا دکھنی کلام نہیں ملتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک نئی زبان ایجاد کی تھی جو فارسی، برج بھاشا اور مرہٹی زبان پر مشتمل تھی۔ اور اس زبان میں اس نے ایک مرثیہ چاند سلطان (وفات ۱۰۰۹ھ) کا لکھا تھا۔ جس کا مخطوطہ بادشاہ کی مہر کے ساتھ کسی قدیم مسلمان خاندان بیجاپور میں موجود تھا۔ جس کا انگریزی ترجمہ مسٹر ایچ ایف سکاک نے کیا تھا۔ جو بیجاپور گزیٹر میں درج ہے۔

آغاز:۔ نورس سور جگ، جگ جوتی ان سر دکنی
یوسف سرتی ماتا ابراہیم پر ساد تبھی دوانی

خاتمہ ہیں:۔ کدم کستوری چواجیندن لانہہ تو بادل کامنی ہر رنگ رس برسائی
تہرت تیجے شہ منکر چہ تھی کر

کاتب کمترین شاگرداں عبدالرشید ۹۹۰ھ بافضلی؟

مخطوطہ ۲ سالار جنگ :۔ پتی گر دیک دید بار س دید ہو جگ کالی
بادشاہ بڑا۔ دیوا ہی کیمیا، چاند عالم جو گی
یگ چندر، کویت، جل بہی، بہاگرتی، گیچ منڈل
پالو چاند شعر یالی زمین ندی تہی۔ دار

جس سے واضح ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کو ہندی اور سنسکرت زبان پر کس قدر عبور تھا۔

نورس میں حسب ذیل راگ راگنیاں درج ہیں:۔

بھیرو، بھیروں ۔ بھوپالی ۔ دیسی، پوریا، کیدارا ۔ مارووا، اساوری

توڑی، دھناسری، نوروز، کلیان ۔ ملار، گوری، مراری ۔ ہمیر، یا ہمیر۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا خیال ہے کہ اس میں زیادہ ابیات دکنی ہیں

کچھ اشعار برج بھاشا، اودھی ۔ راجستھانی ۔ اور کچھ اثرات پنجابی کے ہیں۔

عمومی طور پر دکھنی رنگ غالب ہے۔ کتاب نورس مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد

شائع ہو چکی ہے۔ اور ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اس سے

اختلاف کیا ہے۔

نورس کے اشعار: دو مصرعوں تین مصرعوں، چار مصرعوں پر مشتمل

ہیں۔ مگر ہمارا بھی خیال ہے کہ ان میں برج بھاشا کا اثر غالب ہے۔ نمونہ

درج ذیل ہے۔

در مقام بھیرو:۔ اپنے ساتھی آتش خاں کی جدائی میں کہتا ہے ~

آتش خاں کی برھی کیسی برسے آگ   قیامت سو منگل کوں آکنب کیری بھاگ

آتش خاں کی جدائی میں دل اس طرح جل رہا ہے کہ قیامت کی گرمی ہیچ ہے۔

تین مصرعے پر گیت :۔

آپیں پاردیں ہو بہورت چتر سیانا   گھنپت نادسنا جگ کیا دیوانا

اب دیپک ہونا سو تج نانو آتش خانا

خود صیاد بہت چالاک ہے، اپنی آواز سے ایک جہاں کو دیوانہ بنا دیا۔

اب اگر چراغ چاہتا ہے تو خود تیرا نام آتش خاں ہے۔

چار مصرعے: بہو روپ کھیلے کھیل کامنی   ہونا جالوں ترکی برھامنی

اپ نرروپ اپ روپ رمنی وس کی بیانی نشانی

وہ کامنی طرح طرح کے کھیل کھیں رہلہے ۔ نہ جانوں کر وہ کوئی ترکن ہے یا برھمنی ہے ۔

آپ وہ نہ معلوم مرد ہے یا عورت ۔ رام کی طرح کی صورت بنائی ہے۔؟

سہ ایک ناری دیکھیا کھڑی منے پونم رات کی ہے کر چاندنی

جھمکی میگہ رت سورامنی

عبدل بیجاپوری

عبدل کا صحیح نام کیا تھا پتہ نہیں چلتا ۔ اس نے ایک شعر میں اپنا نام عبدلگنی لکھا ہے ۔ جو کتابت کی غلطی ہے ۔ بعض ادیبوں نے عبدالغنی تصور کیا ہے یا شاید انکساری دخاکساری کو کام میں لاکر اس نے عبدالگیتی ۔ یعنی دنیا کا بندہ ۔ یا درگیتی لکھا ہے اور اس طرح اپنے نام کو مخفی رکھی ہے

اس نے سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرد (۹۸۸ / ۱۰۳۷ھ) سے ہمارے دکھنی زبان میں سلطان مذکور کے عہد کی تاریخ لکھی ہے ۔ عبدل، ابوالقاسم ہندو شاہ فرشتہ ۔ اور رفیع الدین شہزادے کا معاصر ہے اور اس کا زمانہ اوائل گیارھویں صدی ہجری ہے ۔

زائد حالات پردہ تاریکی میں ہیں ۔ اس کی مشہور تصنیف ابراہیم نامہ ہے جس کے مخطوطات کمیاب ہیں ۔ ایک مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ میں ہے

سن کتابت درج نہیں جو ۶۲ اوراق پر پھیلا ہوا ہے اور سات سو پچاس اشعار پر مشتمل ہے۔

موضوع۔ سلطان ابراہیم عادل شاہ کی سوانح حیات اور اس کے زمانہ کی درباری چہل پہل اور اس کے دربار کے ماہران موسیقی سیر و شکار اس کے محلات، باغات، سلحداران، تقاریب وغیرہ پر مشتمل ہے گویا سلطان مذکور کی خانگی زندگی کو محفوظ کر دیا ہے۔

آغاز:- الہی زباں گنج توں کھول منجہ	امولک بہا کر جکو چہ بول منجہ
کہوں بار ہم اوّل تو اللہ لائے	گگے موکہہ کہلے جیب بکڑے اولائے
خاتمہ:- بچن پھول گوندیوں براہیم نام	کیا ہبس پہ بہ س بارہ تمام (۱۰۱۲ھ)
خدایا تو عبدل بچن پھول کر	حضور عارفاں جیت سو مقبول کر

مدح ابراہیم عادل شاہ ثانی ؎

دیہی عدل سوں ملک سب دان تا	ایسا شاہ عالم جگت جان تا
ادسے عمل تقوی اچھری۔ ناڈہ ری	لجا گو سلا باز آنکھ میں کرسی

«ور تعریف کہ برائے میزبانی جمع شدہ اندبائے کو بان ہر یک وضع»

یعنی طوائفین کے سولہ سنگار ؎

کیا تار زر جیوں سو پاؤں دکھائی	پڑیا تیاں ریشم کے درمیان آئی
کوئی بالوں درمیاں بو مانگ جیر	دسی جیون کسوٹی میں سونے کی تیر
کوئی باندہ جوڑا دس یوں نمائی	سونے سر دپہ بیٹھا مور آئی

کیا بیس کوتل جو شمشا دپر   پکڑ پھول گل لعل مکھ چونچ کر

فرہنگ:۔ دان تا: اشاعت کرتا۔ چڑی: چڑیا۔ گوسلا: گھونسلا۔ باز انگ: باز پرندہ کی آنکھیں۔ بیس: بیٹھ: کوتل غالباً پرندہ۔ شمشاد سے قد پر۔ چونچ میں گلاب کا پھول لیے بیٹھا ہو۔

امین بیجاپوری

امین:۔ سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی ۹۸۸/ ۱۰۳۷ھ کا معاصر تھا۔ اس نے یہ مثنوی محمد عادل شاہ ۱۰۳۷/۱۰۶۷ھ کے زمانہ میں بوجہ وفات ناتمام چھوڑی تھی جو سلطان مذکور کے عہد کا کارنامہ ہے۔

مثنوی بہرام وحسن بانو۔ آغاز سے

الٰہی جگت کو کر نہار توں   غریبان، انسان کا ادھار توں

یکایک مرے دل پر آیا خیال   تھا یک کہوں میں منیمی مثال

زباں پر بچن خوب آتا چلا   یو مضمون خوشتر بنا تا چلا

زباں پر ہے جس کے موتی آبدار   اسی کے بچن کا ہے اکثر دتار

اگرچہ نہیں آدمی زاد ہے   چندر اس کے آگھیں سب بے جہات ہے

کبوتر ہو اس کو چلو دیکھ آئیں   پیچھوں ہے گھر کوں پن سب سدائیں

ودس تھ دواں سیتی آئی بہار   دیکھت تس کی خوبی گیاں سدھ پسار

ترت سیتی مل کر یوں کیتی عرض | کہو تم کون ہم سا تھ کیا ہے عرض
جو کپڑے ہمارے رکھیں ہیں چھپا | جو کچھ دل میں ہووے سو دیو تم بتا
انو ساتھ تب شہ اٹھا بول کر | چھپے راز دل کے سبھی کھول کر
تمہارے جو ہے سات بانو حسن | انے دل میں میرے کیا ہے وطن
مرا جیو اس پر ہوا ہے فدا | خدا اس سیں مجکوں نہ راکھے جدا

بعض الفاظ قابل ذکر ہیں۔ ذی قیاس۔ غزبیوں کی ملی سنئے (مؤنث)

غزبیوں کا ملی، بے عدول سے — سنو میں ہوں کہتا بیاں بے عدول
مبادا ادھر ہووے خاطر ملول

ندمت فاعل۔ نے ۶ ،، — "کہ شاہ من خوب کی تم نے بات"
محاورہ۔ قسمت خدا کے ہاتھ ہونا ۶ — دیکھن ہے تقدیر سو رب کے ہات

کھول کر کہنا سے — نجومی نے دل میں کیا تب فکر
کہوں سب یہ احوال میں کھول کر

رضا کرنا۔ رضا دینا، اجازت دینا۔ — نجومی کو شہ نے کیا تب رضا
فکر۔ — فکر دل میں کرتا رہا اس دفا

حق کو کرنا مثنا نہیں، وسوسہ ہونا، نہ صد مثل، غرض قافیوں کی پابندی نہیں۔ بندش میں چستی نہیں۔ سیدھا سادا بیان ہے۔ عربی فارسی الفاظ کی آمیزش ہے۔ آدمی زاد کا قافیہ بے جہات وغیرہ

فرہنگ :۔ آگھیں = آگے = بے جہات = بے جہت = پچھوں = پیچھے۔

سدائیں : سدھاریں : ترت سیتی : جلدی - بے عدل : بلاکم و بیش

مقیمی بیجاپوری

مرزا محمد مقیم نامی کئی اشخاص گزرے ہیں ۔ مرزا محمد مقیم استرآبادی مرزا محمد مقیم ابن میر محمد رضا مشہدی ۔ مرزا محمد مقیم سلمی ۔ مرزا مقیم گولکنڈوی جو تقریباً اسی کے زمانہ کے ایرانی شعرا و امرا ہیں ۔ ڈاکٹر زور قادری نے اس کا مصنف مرزا مقیم استرآبادی قرار دیا ہے ۔ مولوی اکبرالدین ۔ مرزا مقیم استرآبادی مقیمی اور سلمی کو ایک ہی تسلیم کرتے ہیں مرزا مقیم گولکنڈوی کو ڈاکٹر نذیر احمد شاعر نہیں کہتے ، اس لئے کہ تذکروں میں ذکر نہیں ۔

مقیمی کی مثنوی " چندر بدن مہیار " مشہور ہے ۔ جو ۱۰۵۰ھ میں تصنیف ہوئی ۔ مرزا مقیم استرآبادی کا ایران سے ورود کا زمانہ قبل ۱۰۵۰ھ ثابت ہے ۔ اس لئے اس کا دکھنی زبان میں اس قدر جلد مثنوی لکھ دینا ۔ قرین قیاس نہیں ۔

مرزا محمد مقیم مشہدی کے تعلقات ، بیجاپور ، احمد نگر اور گولکنڈہ سے بسلسلہ کار ہائے سرکاری رہے ہیں ۔ ملا مقیم گولکنڈوی ۱۰۴۸ھ میں بیجاپور آیا تھا ۔ مگر ایک گولکنڈہ کے شاعر کی مثنوی کی تکمیل ، امین بیجاپوری نے کی ۔ کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔ بہرحال جب تک کوئی قوی ثبوت نہو

اس کا مصنف مقیمی نسبت معلوم ہوتا ہے، جس نے دکن میں قبل تصنیف مثنوی سالہا سال گزارے ہیں۔ اور غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال تصنیف ۱۰۳۵ھ کی تتبع میں یہ مثنوی لکھی تھی، اور اس کو چندربدن کا تازہ قصہ ہاتھ ہاتھ آگیا تھا۔

مؤلف اردوئے قدیم کو اس کا ایک مطبوعہ نسخہ ملا تھا جس کا سن تصنیف ۱۰۹۸ھ اور طباعت سنہ ۱۲۹۸ھ ہے اور مقیمی کو کرناٹک کا باشندہ لکھا ہے۔ مگر چونکہ اس مثنوی میں امین نے محمد عادل شاہ کا ذکر کیا ہے اس لئے کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

چندربدن کے مخطوطات، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد، سالار جنگ اور انجمن ترقی اردو وغیرہ میں محفوظ ہیں۔ معاصرین میں آتشی نے فارسی میں اور متاخرین میں، افضل خاں لنتی دہلوی ثم آرکاٹی معاصر نواب سعادت اللہ خاں ۱۱۳۲ھ/۱۱۴۶ نے دکھنی سے فارسی میں منتقل کیا۔ اس کے بعد علامہ باقر آگاہ مدراسی نے (۱۲۲۰ھ) اور بابا حسینی واقف معاصر فیض حیدرآبادی نے اردو میں اور اخگر حیدرآبادی متوفی ۱۳۷۰ھ نے فارسی میں خوب لکھا ہے۔

خدا کوں سزاوار کبر و منی	کہ قادر ہے قدرت کا صاحب دھنی
سنا ہوں کہ یک شہر سند ر پٹن	اتھا راج و ہاں ایک ہندو برن
اتھا بھوت گھر اں میں یک دیں لما	برس اس کوں بشر سر بیتا
کرے راج پوجا، جا اس دیو کا	تماشا عجب دے سیو کا۔ الخ

سندر پٹن۔ سے مراد غالباً کوری ضلع اننت پور ہے۔ جہاں عالی شان مندر ہے اور چندر بدن مہیار کی قبر بھی اسی کے قریب ہے۔ شاعر کہتا ہے اس مندر میں ہر سال دیوتا پر انسانی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔

ایک امیرزادہ۔ مہیار (محی الدین یار) ایک ہندو دوشیزہ پر عاشق ہوگیا تھا۔ جو دیوں میں پوجا کے لئے آیا کرتی تھی۔ ایک روز مہیار اس کے قدموں پر گر پڑا۔ اس نے انکار کر دیا۔ غرض یہ کہ مہیار نے اس کے فراق میں جان دے دی۔ اور جب جنازہ محبوبہ کے مکان کی طرف سے گزرا تو وہاں خود بخود رک گیا ہر چند کوشش کی گئی۔ مگر وہاں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ معشوقہ کو خبر ہوئی تو چونکہ عشق اس کے دل میں جاگزیں ہو گیا تھا وہ نہ بڑھ کر جاں بحق ہو گئی۔ اس کے بعد جنازہ روانہ ہوا۔ جب قبر میں دیکھا گیا تو دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر تھے۔ غرض ایک ہی قبر میں دفن کئے گئے۔ یہ کوئی بلند پایہ مثنوی نہیں ہے۔ اشعار میں زیادہ رنگینی اور چستی نہیں پائی جاتی۔ زبان سلیس ہے اور بعض محاورے خوب استعمال کئے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:-

نزک جا کو پیا کہ سن لے ہری — منجے تجہ لطافت دیوانہ کری
دیوانہ ہوں تیرا دیولے کے تیئں — پس تے نکو دور جانے کے تیئں
سو تجہ بن منجے کوئی ہونا نہیں — کہ بن جل مچھی کا سو جینا نہیں
کتا ہوں سبھے میں کرے گن بھری — توں کرنا ایتا کچ مری دلبری
سو لیلا کہا ادب سوں زور کر ادنے — دھریا سیس اس کے قدم پر ادنے

گلا سن سناکر اسٹی بول یوں — سمجھ کچ اپن کوں اے بیڈول یوں
ہند میں کہاں اور ترک تو کہاں — کہاں رام سیتا ہور ک تو کہاں
کہاں میں چندرماں کہاں تو دیوا — گتا کیا موئے توں دیوانا ہوا
جھڑک بول سو کوں وہیں پھر چلی — اوٹھا دل میں عاشق کے دیں گدگی
خاتمہ جو دیکھے جنازہ میں پیارکوں — اوسے جنت میں گراوسی نازدل
کفن بیچ آکر دو چندر بدل — گلے لگ کے سوئی ہے جوں ایک تن

بعض الفاظ:- جگ راج د شاہ جہاں (اسم فاعل - گوہر د ہرہار - موتی وجواہرات والا - کرنہار - گن بھری؛ چنچل شوخ - گلا سنا کر - شکوہ سن کر - بے ڈول - بد سلیقہ - گنوار -

محاورے:- دیوانہ کرنا بن جل مچھی کا سو جینا نہیں ؛ مچھلی بغیر پانی کے زندہ نہیں رہ سکتی - جھڑکنا - گدگی ہونا - خاص ہندوستانی محاورہ - گتا کیا موئے تو دیوانہ ہوا - کیا بکتا ہے موئے کیا تیری عقل سٹھیا گئی ہے -

ملک خوشنود

ملک خوشنود - سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ تا ۱۰۸۳ھ)

کا حبشی غلام تھا - جب سلطان کی پھوپی شہزادی خدیجہ سلطان کی شادی سلطان محمد عادل شاہ بیجاپور سے ہوئی تو یہ شہزادی کی رفاقت میں بیجاپور بھیج دیا گیا - خدیجہ سلطان کی ادبی دلچسپیوں سے اس نے بھی ذوق اٹھایا بیان

کیا جاتا ہے کہ، سلاطین وقت کی مدح میں قصائد بھی کہے تھے۔ اس کی دو مثنویوں کا پتہ چلا ہے۔ ایک تو یوسف زلیخا ہے دوسری، ہشت بہشت۔ امیر خسروؒ کا ترجمہ ہشت کنشت کے نام سے کیا تھا۔ یوسف زلیخا تو نایاب ہے۔ ہشت بہشت کا مخطوطہ برٹش میوزم میں ہے دوسرا نسخہ انجمن ترقیٔ اردو کے کتب خانہ میں محفوظ ہے خوشنود کی بعض غزلیں اور مرثیے بھی ملتے ہیں۔

انجمن ترقیٔ اردو کراچی کے مخطوطہ میں اس مثنوی کا اصل نام ہشت بہشت نہیں بلکہ "جنت سنگار" ہے خود خوشنود کہتا ہے۔

"امو لک ہے بدل جیوں زر نگار ہے   جم اس کا ناؤں سو جنت سنگار ہے

ڈاکٹر زور صاحب کو اس کا ایک ناقص نسخہ ملا ہے جس کو انھوں نے بازار حسن سے موسوم کیا ہے جس کی اس کے متن سے مطابقت ہوتی ہے۔

آغاز۔ سراؤن تج جو توں ہے پاک معبود   ہوا سب خلق عالم تج سوں موجود

سنوار یا کہن اوپر توں چاند تارے   کیا پیدا عرش کرسی جہارے

ابتدائی صفحات۔ حمد، نعت، مدح صحابہ، معراج نبوی۔ مدح میر مومن، مدح ابوالمظفر، سلطان محمد عادل شاہ غازی ہے۔ اس مخطوطہ میں دس مجالس ہیں درمیان میں کچھ اوراق متروک ہیں۔ عنوانات فارسی ہیں۔ یہ بہرام شاہ کا قصہ ہے جو ہر روز ایک دوشیزہ سے ایک نئے محل میں لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ مثلاً۔

۱۔ روز سہ شنبہ محل گلناری   ۲۔ عیش نمودن با معشوقہ تاتاری

۴۔ محل بنفش معشوقہ دلاویز ۴۔ محل عیش وعشرت دمعشوقہ زیبا روید۔
۵۔ محل کافوری معشوقہ خوارزانی ۶۔ محل سبز ومعشوقہ طرب انگیز
۷۔ محل مشکیں با صنم سیاہ پوش دختر ہند ۸۔ محل زعفرانی باد ختر شاہ نیمروز
۹۔ خاتمہ: رفتن شاہ بہرام شکار و ناپید شدن در پے گوہ۔
۱۰۔ در خاتمہ کتاب جنت سنگار کہ افسانہ اوست چوں شمع مجالس فروزند
و یادگار ملک خوشنود۔

معراج نبوی ؎

محمد سب نبیاں کی سیس کا تاج محمد باج ہے کن نیں ہے معراج
مبارک رات او جس رات میں شاہ گئے ہیں عرش پہ چیو کمن اوپر ماہ

منقبت چار یار ؎

ابابکر صدیق تھے یار جانی عمر تھے یار دو مرت بہوت ایمانی
شرم دھرتے تھے تیسرے یار عثمان سو چوتھے یار علی تھے شاہ مردان

مدح میر مومن ؎

محمد مومن ہے انتم شرمناک ادن کی سیر کا میدان افلاک
منجم مجتہد شاعر بچن میں کہ تھے ہشیار سارے علم فن میں
فلاطوں بوعلی کی سیمیا کا ہنر شاگرد کرتے کیمیا کا۔ الخ

مدح سلطان محمد عادل شاہ ؎

ذل سلطان محمد شاہ غازی جہاں کوں شاہ سوں ہے سرفرازی
سخی عادل بہادر نوجواں ہے قوی طالع سو یکہن تیر کماں ہے

مجلس آراستن شاہ بہرام روز جمعہ در محل کافوری۔

عجب کچھ روز جمعہ تھا نورانی — کیا بہرام اس دن شادمانی
تجل اس مند کا تھا نور جیوں سور — اچھنبا بے بدل جیوں صانع کا نور
بہت بہرام میں تھا جو دل پرتی کا — کیا کسوت عجائب مشتری کا
کیا کافور مندھر میں تول شاہ — اچنبا کھو ادپر کا بے بدل ماہ
چتر جا دیدمہ۔ دھن حور آئی — ددس جیوں سور سارا جگ جگائی
کرتی خدمت چتر شہ دھور کا یوں — کرے پوجا برہمن سور کا جیوں
بہت دھن کا کیا من میں ادلالی — لگیا شہ جھپکنے مد کی پیالی
بھالا مست، پیاری مست، بہرام — بھاری لک نہ تھا بن عشق بھی کام
ہوا جب رین زہرہ جگمگا — کرن کی کہیں جب چندر دکھایا
کہیا تب شاہ اس چندر بدن کوں — چتر چنچل سکی محبوب دھن کوں
اول بولیاں کہانیاں جیوں جو ناریاں — سہیلیاں بے بدل منجہ جیو کیاں پیاریاں
کہانی بول منجہ توں بھی سگھر نار — جہ ہوتی بخت سوتے تج ہشیار
اہی دو نین میں دھن کی خماری — گھر جاگے ہیں پیو سنگ رین ساری
کرتی تسلیم شہ کوں دھول سو جانی — دھری شہ کی قدم اوپر پشانی
کہی توں بادشہ جگ کا جہاں گیر — سدا تجہ دھاک سوں دشمن ہیں دلگیر
عجب توں جگ پتی پردیت دانی — سدا تجہ بادشہ کر شادمانی

جدھا لک سورج ہور چاند تارا — اچھو تجہ بخت کا روشن ستارا
اہی ادکاں جو جیوٹی آپ لیا دے — تجھس تخت سلیماں کوں میلاد

رے ہے دست تجھ شہ کا عطا کا ۔۔۔ وہی سرپوش ہے میری خطا کا

نول تو سور میں زرد رتی ہوں ۔۔۔ جلکچہ معلوم ہے سو سب کتی ہوں۔ الخ

شدھور : شاہ۔ دھر۔ اولالی : جوش دستی۔ سنجارے : شام۔ کیں : کیسو

الحے : رہے۔

نوٹ :۔ ہشت گنشت کا اردو نثر میں ترجمہ فارسی سے غلام احمد شاہجہاں آبادی نے بایماء ولیم ہیم ماہین کلکتہ میں قبل ۱۲۴۶ھ کیا تھا مخطوطہ آصفیہ۔"

رستمی

کمال خاں المتخلص بہ رستمی ۔ ابن اسمعیل خاں المخاطب بہ خطاط خاں دارالانشا سلاطین عادل شاہی کا افسر تھا ۔ اس نے بایمار خدیجہ سلطان شہربانو بیگم ملکہ محمد عادل شاہ جو قلی قطب شاہ کی برادر زادی تھی ایران کے ایک مشہور شاعر محمد بن حسام الدین خوانی (متوفی ۸۰۵ھ) کی مشہور مثنوی خاورنامہ تالیف ۸۳۸ھ کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا ۔ جس کے چوبیس ہزار ابیات ہیں ۔ باوجود اس کے رستمی کہتا ہے کہ میں نے کوئی قابل قدر یادگار نہیں چھوڑی ۔ یہ ترجمہ ۱۰۵۹ھ میں بعرصہ ڈیڑھ سال کیا گیا تھا جو زیادہ تر لفظی معلوم ہوتا ہے ۔ اور خاورنامہ فارسی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے ؎

خاتمہ :۔ خاورنامہ دکنی ہیں کیتا ہوں نام ۔۔۔ ہوا خاور اس پر قصہ سب تمام

کیا ترجمہ دکھنی ہور دلپذیر — بولیا معجزہ یو کمال خاں دبیر
خلق کہتی ہے معجزہ کر کمال خاں دبیر — تخلص سو ہے رستمی بے نظیر

سنہ تصنیف ۱۰۵۹ھ سے

نبی کی جو ہجرت سے کیتا خیال — ہزار پر پچاس اور نو کے تھے سال

نمونہ سے

بولائے چھپیا دو لوں کوں شاہ کن — ستارے بمن گئے دونوں ماہ کن
جسے بھیجیا تھا شہ سو آنگے ہوا — دونوں کو بی دربار سو...
دیکھے اس کے دربار میدان کوں — محلاں گئے ہیں بی اسمان کوں
محل کوں رنگایا ہے سب زر رنگات — محل اس کے اسمان سوں بولیں بات
دیکھے بہوت گھر کوں سنوار یا اچھے — اسے چار صفہ بنایا اچھے
کیا تھا اسے فرش بی سات رنگ — ساتو رنگ کے بی بچھایا تھا سنگ
الیاالمعجن ہور سعد بھی واں گئے — گئے ہور جا کر سلام اس کئے
سلام ایسا جو اد سلامت اچھے — جو اس آشنائی علامت اچھے
اتھا بادشہ بہوت عدل و داد — جو عالم کا خاطر اتھا اس سوں شاد
دو چوکیاں رکھایا تخت کیرے انگے — دونوں کوں دیا بیٹھنے پیش کے

خاور نامہ مروجہ دکھنی میں ہے۔ محاورے بھی استعمال کئے گئے ہیں مثلاً
محل آسمان تک بلندی میں گئے تھے: آسمان سے باتیں کرنا۔ قافیہ اور وزن
کی پابندی نہیں۔ فارسی الفاظ اور ترکیبیں بھی کافی ہیں مثلاً
عمر نے نظر کیتا از زیر تخت ہو سوار یا اپس کوں بجد گونہ نخت تیغ
آئینہ فام۔ موج مارے بکوں۔

ابراہیم صنعتی بیجاپوری

ابراہیم نام صنعتی تخلص، بعض اُس کو صبعی بھی پڑھا ہے۔ صنعتی بمعنی نیکوکار، اور صیقی ہو تو بمعنی شمشیر آبدار ہو سکتے ہیں۔ مولف بساتین السلاطین نے ان کے علم و فضل کی بڑی تعریف کی ہے۔ صنعتی نے قصہ تمیم انصاری ۱۰۵۵ھ میں لکھا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

ہزار ایک سال پنجاہ و پنج ہوئے تب ہوا یہ جواہر پو گنج

حضرت تمیم انصاری مشہور صحابی تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے میں حضرت تمیم انصاری غائب ہو گئے تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ نے حضرت عمرؓ سے کئی سال انتظار کے بعد نکاح ثانی کی اجازت چاہی بالآخر اجازت دی گئی۔ عین عقد کی رات دفعتہً حضرت تمیم انصاری واپس آ گئے۔ اس ہیئت کے ساتھ کہ کوئی پہچان نہ سکا۔ محفل درہم برہم ہو گئی بہت دن کے بچھڑے ہوئے ملے۔ اس میں دیو اور پریوں سے ملاقات اور سیر دلپذیر کے قصے ہیں۔ یہ باد جہازی کے قصہ سے مشابہ ہے صنعتی نے اپنے شاعرانہ کمال کا ثبوت دیا ہے ہے بعض حصے نہایت دلچسپ اور ڈرامائی ہیں۔ واقعہ نگاری، تشبیہات و استعارات، مناظر، بزم و رزم سب کچھ سلیقہ سے بیان کئے ہیں۔

صنعتی بیجاپوری کی مثنوی کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں۔

باغ کا منظر ؎

اتھے بوند شبنم کے لالے پو یوں | جھلکتے ستارے شفق میں تے جوں
مے ناب شبنم اتھی جوں گلاب | چھکے میں نرگس کے پی پی شراب
نباں کیوڑیاں کے تھے جو اس پاس | کئے تھے ایس دھامناں کا لباس
بجتے مرغ رنگاں سوں خوش رنگ تھے | ادا میں گلے سب کے جوں چنگ تھے
سو مینا ہٹڑری دکبک دری | بھی لوری سو مل نافتے حزخری
سو بھوراں لگے ناچنے دیک مور | پپیہا کرے پیو پیو اس سمیر الخ

جنگ کا سماں ؎

ہر یک ہات میں کہکشاں سی سمال | ہر یک پاس محور سی تیر رواں
پیاں کے ترنگ جب ہواتے اُٹھے | کہے توں گگن تے شہاباں چھوٹے
دسیں لہو سوں یوں لال تیراں کے بھال | کہ تنبول کھائے ہیں جوں جیب لال الخ
جہاز :- بیک سیر تھا اس گرانبار سات | چلے جاں کہے مومیں کی مو میں بات
ادک جلد تھا گرچہ بے پلئے تھا | سو بے پلئے نت آب پیائے تھا

دکھنی خصوصیات :- جمع کا طریقہ الف نون کے الحاق سے جیسے بن سے بناں بمعنی جنگل۔ کیوڑے سے کیوڑیاں (کیوڑا)۔ دھامن کی جمع : دھ مناں یہ ناگ سانپ، سانپن، (سانپن)

محاورے۔ مغز کھانا۔ طاقت طاق ہو جانا۔ شہاباں چھوٹنا۔ شہاب ثاقب کا ٹوٹنا۔ دھادھم دھادھم دھادھمی دھادھمی) کڑاکڑ۔ دھڑا دھڑ۔ ہات کی پیٹ جا بنا، افسوس کرنا۔ رحمت حق ہونا: جاں بحق تسلیم ہو جانا۔ گویا

فارسی محاوروں کے ترجمے ہیں

بعض الفاظ:۔ خوش آوازگی: خوش آوازی، کھیلا ہیں (نبھانا) ذوذرنہ:
ذور پا: (ذ: ظرف) وغیرہ۔

شاہ ملک بیجاپوری

شاہ ملک معاصر علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ / ۱۰۸۱ھ) کی مشہور تصنیف فقہ
میں شریعت نامہ یا احکام الصلوٰۃ ہے اسی کے دوسرے نام توفیق نامہ
اور کفایت الاسلام بھی ہیں، جس کا ماخذ مقدمۃ الصلوٰۃ مولفہ شرف الدین
بخاری ہے۔

احکام الصلوٰۃ ۱۰۷۷ھ کی تالیف ہے جس کے ۴۲۵ اشعار ہیں۔ قطعہ
تاریخ اور نام مصنف سے

کرلیو شاہ ملک ہیا جو دکھنی کلام ۔۔۔ کیا ہے جو سارا نظم ہیں تمام
سو ہو شین، الف، ہے، و میم، لام تمام ۔۔۔ فرس کو دو دکھنی میں بولیا ہے صاف
(شاہ ملک)

سنہ یکہزار ہور ستر پہ سات ۔۔۔ کیا تھا یہ اس سال میں یو نکات
اڑی سو پہ بیتاں زیادہ ہیں چار ۔۔۔ تو کوشش تے دل سجا کو کریا دیار
(ڈھائی سو)

اس میں عقاید اور فقہ کے مسائل مدون ہیں، مثلاً احکام ایمان، شروط ایمان
واجبات ایمان، فرائض شریعت، واجبات شریعت، فرائض وضو،
مستحبات وضو، نماز وغیرہ مثلاً سے

خدا ایک دوجا شریک نہیں اسے — بے مثل اس کی صفت، نیں کیے

نماز لک کے ٹٹنے کے ہیں بیست و تیخ — نمازی نے کرنا ہے لو باد گنج

نماز میں کرے بات یا کھائے تول — بھرائے جو نیلے تے سینہ دھول

اس کی زبان معمولی اردو روزانہ بولی جاتی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں۔ اس کے مخطوطات کتب خانہ جات آصفیہ و سالار جنگ حیدرآباد میں موجود ہیں۔

شاہ ہاشم علوی گجراتی رحمہ بیجاپوری

شاہ ہاشم علوی ابن شیخ برہان الدین بزمانہ سلطان ابراہیم عادل شاہ جگت گرو ۹۸۶ھ/۱۰۳ گجرات سے بیجاپور تشریف لائے۔ اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اپنے چچا زاد بھائی شاہ عبداللہ ابن وجیہہ الدین گجراتی سے بیعت تھے۔ بیجاپور میں ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں وفات پائی۔ آپ کے مرید شاہ مراد نے آپ کے ملفوظات الموسوم بہ مقصود المراد مرتب کئے ہیں جس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے جس میں آپ کے ہندی اقوال اور گیت موجود ہیں۔ بعض یہ ہیں:-

نکتہ:- اے دنیا کے لوگ گیرٹے مکوڑے ہو گھیو شہد پر دوڑاتے گھوڑے
ڈوبتے بہت نکلتے تھوڑے

نکتہ:- نا منج زن، نا منج فرزند — نا منج بھائی، نا منج بند
ہاشمی ہیوسول فرزند

جکری :- جائے کہو یک تل آئے پیا
سنت جیوٗ دھسکت جیا

لا الٰہ نفی الا اللہ اثبات
محمد برحق بد میم احمد ذات

جائے کہو یک تل آئے پیا

نفی کل جدا مالوں تو
کل اثبات ہووے جو

ہاشمی رخسار بھڑ کتے
علوی زہر کتا ہے جیو

اب آنے کی ہے بدھلا تر جیو
جبے کہو یک تل آئے پیا

زبان صاف ہے اسرار و معارف سے مملو ہے۔

سلطان علی عادل شاہ ثانی ۱۰۶۷/۱۰۸۳ھ

سلطان علی عادل شاہ ثانی تخلص شاہی ابن محمد عادل شاہ اس کا دکنی دیوان کتب خانہ ریکارڈ آفس حیدرآباد دکن اور کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں محفوظ ہے۔ اس کے دربار میں سینکڑوں علماء و فضلاء اور شعراء فارسی و دکنی جمع تھے اور وہ اپنی ہردل عزیزی و مقبولیت کی وجہ سے جگت استاد و عالم مشہور تھا۔ باوجود اس کے کہ اس زمانہ میں سلطنت عادل شاہیہ شاہجہاں کے حملوں اور مرہٹوں کی شورش کی وجہ سے روبہ زوال تھی تاہم اس کا دربار اساتذہ شعر و سخن سے خالی نہ رہا۔ اس نے سترہ سال حکومت کی۔ ۱۰۸۳ھ میں وفات پائی۔

انتخاب کلام مسلسل غزل۔

رہے جاں کے پاس کی پرکھوں تن کیونکر ہو دیو قت بدم جان ہے۔ کو بہ تن کیونکر کہو[1]

[1] مطلع میں ایسا ہے (مدیر)

بولے جہاں کے یار کبھی حمنا نہ آدے بولنا تمنا بہا تا بولنا اے شاہ بحر دبر کہو
بولیا ہوں تب ... یا فکر تے یو دو رتن کا نرخ بنا گر کچھ اچھے انصاف تو اس بول کوں خوشتر کہو
مرجان میں صافی نہیں یاقوت میں صافی اچھے جن ذات میں صافی دسے اس ذات کوں بہتر کہو
یاقوت ہور مرجان کے شاہی لکھیا سارے غزل سکر جگت کے شاعراں اس شعر کوں انتر کہو

چال مستانہ ہاتھی سد ہوئے ہیں تال عالم سیں تمارے چال سوں اکثر
لٹک چلنا تمن جیسا کتی منگل نہیں دیکھیا
گھونگھٹ کے انٹ سد تمارے منہ سلونی کوں گھونگھٹ کے اوٹ دیکھیا جو
چندر یہ ... س نزاکت سوں کہیں بادل نہیں دیکھیا

کرم کر یار کی پیاری کبھی مج سوں آ لگیں آ تو
ہوئی تقریب ساری یو ہماری کار سازی کا
بھنوں ہوں ... ت خوشی سوں ، ہوں باغ باغ من میں
ملکی تشبیہات سد جب صحت میں ملا کر پھرتے چمن میں جم جم

چیا خوش سہادے کماں کے اوپر کماں پدمنی سے چلا ہے الگ
مظفر علی شاہ کے حات کا آ ایک تیر لاگیا نشان کے پلک

میز مرچی - دھن مرچی (دولتی) دھان کے کھیت ۔ قصیدہ چاند رباردسہ
تہاں کا مالی ہر دم کا پانی نین مریاں میں سدا بھر ادے
جتے عروساں چمن کے اوپر کھلے پھلے ہو کریں جھکارا
قصیدہ بہ طرح لطفی دلفرتی سد

کسوٹی پرکھ ہے عقل کسوٹی ہوئی طبع کے کسنے بدل
بوجھ رکھیا یہ صرف قلب دکھراحیوں کنچن

جھاڑ جھڑ دلی سا جھاڑ جھڑ دلی بنا سایہ زمیں پہ مٹا
باج کی تختی الکھنڈ باغ کی ستی تبن

نُصرتی

ملک الشعرا نصرتی ۔ بیجاپور کا بڑا مشہور باکمال شاعر تھا اس کا صیح نام شیخ نصرت تھا ۔ باپ سپاہی پیشہ در الملداد خان ۔ سلطان علی عادل شاہ ثانی سے عالم شہزادگی ہی سے اس کے تعلقات تھے جس سے پتہ چلتا ہے کہ نصرتی محمد عادل شاہ (۱۰۳۵ھ) کے عہد میں پیدا ہوا جب اس کی شہزادہ علی کے پاس رسائی ہوئی تھی تو اس وقت اس کی کافی عمر ہوگی ۔

نصرتی کی تعلیم وتربیت اس کے باپ نے کی ، خود ، نصرتی نے اس کا ذکر کیا ہے مگر مولوی نصیرالدین ہاشمی نے معلوم نہیں کس سند پر لکھا ہے کہ اس کی تعلیم وتربیت شاہی محل میں شہزادہ علی عادل کے ساتھ ہوئی اگر ایسا ہوتا تو نصرتی خود اس کا ذکر کرتا ۔ اور دکنی شاعری کا ذوق اس کو سلاطین عادل شاہی کی علم پروری اور سرپرستی کی وجہ ہوا ۔

نصرتی کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے ۔ مؤلف شعراء دکن نے سنہ وفات ۱۰۷۵ھ اور مؤلف ریاض حسنی نسخۂ ت نے لکھا ہے کہ عالم گیر نے

نصرتی کو بعد فتح بیجاپور (۱۰۹۷ھ) ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا۔ جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ اس کو تو یہ خطاب دربار عادل شاہی سے مل گیا ہوگا گلشن عشق نصرتی کے دو نسخوں میں جو سالار جنگ کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں ایک کا سنہ کتابت ۱۱۸۹ھ ہے اور دوسرے نسخہ میں سنہ کتابت درج نہیں البتہ یہ نسخہ مطلا و مذہب ہے۔
ان دونوں نسخوں میں قطعۂ وفات یہ ہے

شربت شمشیر سوں یہ دنیا چھوڑ کو　　جا کے جنت کے گھر میں خوش ہو رہا ہے
سال تاریخ آ ملایک نے　　یو کہی نصرتی شہید ا ہے
۱۰۸۵ھ

نصرتی کی موت مفلسی و ناداری، اولاد کی ناخلفی، رشتہ داروں سے چپقلش معلوم ہوتی ہے جس کا اشارہ نصرتی نے کیا ہے۔

تصانیف:۔

(۱) مثنوی گلشن عشق، قصہ مدمالتی و منوہر تصنیف ۱۰۶۸ھ
(۲) علی نامہ رزمیہ مثنوی۔ واقعات جنگ علی عادل شاہ تصنیف ۱۰۷۶ھ اشعار تقریباً پانچہزار۔
(۳) تاریخ، سکندری منظوم مختصر ہے۔
(۴) قصائد و غزلیات و رباعیات جن کے منجملہ بعض غزلیں و رباعیات کتاب "نصرتی" مولفہ مولوی عبدالحق مطبوعہ میں درج ہیں، اور ایک طویل

قصیدہ (ایک سو اکتیس) بیت الموسوم بہ "چرخیات نصرتی" انجمن ترقی اردو کراچی میں محفوظ ہے۔

گلشن عشق میں منوہر و مدمالتی کا افسانہ عشق نظم کیا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ راجہ بکرم کو اولاد نہ تھی ایک فقیر کی دعا سے منوہر پیدا ہوا۔ بقول منجمین چودہ سال بھاری تھے۔ نجومیوں کی ہدایت تھی کہ ایک بند مقام میں رکھا جائے کہ آسمان تک نظر نہ آسکے۔ ایک چاندنی رات میں پریاں آئیں کسی کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گیا اور اپنے جوڑے کی تلاش میں نو کھنڈ نو ملکوں کی سیاحت بالآخر مہارس نگر کے راجہ دھرم راج کی بیٹی مدمالتی سے عشق ہو گیا اور تلاش میں نکلا بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں جہاز تباہ ہو گیا۔ صحرائے آتشیں سے گذرنا پڑا۔ ہ فقیر نے راستہ میں ایک چکر دیا جس کی وجہ سے مصائب سے محفوظ رہا اور مدمالتی کی ایک سہیلی چنپاوتی کے ذریعہ مدمالتی سے ملاقات ہوئی باغ کی سیر اور ایک دیو کا چنپاوتی کو اٹھائے جانا، منوہر کا دیو کو ہلاک کرنا اپنے ساتھ مدمالتی کو کنچن نگر لے جانا باپ سے ملاقات مسرت کے شادیانے مدمالتی کی ماں کا آنا مدمالتی کو منوہر کے ساتھ دیکھ کر غصہ اور افسوں پڑھکر طوطی کی شکل میں اڑا دینا۔ چندر سین کا طوطی کو زندہ پکڑنا جادو اتارنا، اور اس کا پھر انسان بن جانا بالآخر ملاقات اور شادی۔

اردو فارسی مثنویوں کی طرح دیو پری سحر طلسم کا ذکر ہے۔

ہر باب کے ابتدا میں تشبیب یعنی قدرتی مناظر مثلاً باغ اور پرندوں کی کیفیت جہاز کا سفر کشتی کی حالت گھٹاؤں کی تفصیل۔ طلوع و غروب آفتاب کا بیان انسانی جذبات کی کیفیت وغیرہ ہے۔

نعت۔ منقبت خواجہ بندہ نواز قدس سرہ۔ عقل کی تعریف۔ فقیری اور اس کے لوازمات۔ محنت کی گدڑی۔ توکل کا کچکول۔ قناعت کی راکھ۔ آہ کا سنکھ وغیرہ سب کچھ ہے جس کا ایک خاکہ جوگن کے کردار میں میر حسن نے سحر البیان میں پیش کیا ہے۔

صبح کا سماں ؎

بجے مشرق کے پال کے پٹ تے ٹھوک — لگالیا جو کنچن کے جب تم تے کوک

ابلتا نکل نور کا نیمہ تب۔ — ہوا نیر عالم میں چوندھیر جب

چاندنی ؎

ہوا اُتھا چاند سیماب کا — کٹورے بھرا پارہ آسمان کا

سکا تھا سو یوں جگ کا حوض غدیر — بھریا شش جہت بیچ کنچن کا نیر

کواڑاں کھولے خلق کے نین کے — دھرے سدھ جو مخمور تھے رین کے

ہجر و فراق۔ ؏ زباں بند آنکھیں کھلی کی کھلی۔

کشتی کی روانی ؎

چلیاں جل پہ کشتیاں ڈھل اس حال میں

ڈھلاتے ہیں پارے کو جوں کتھال میں

فرہنگ۔ پال۔ کنارہ۔ ٹھوک ٹھک کنچن۔ کندن۔ سونا۔ تم۔ پشتہ۔ کوک۔ کر۔ نیر۔ پانی۔ چوندھیر۔ چو طرف۔ سکا۔ ڈھون۔ غلطاں۔ کتا۔ کہنا۔ پلک۔ پلک۔

عربی فقروں کی تضمین اور عقل کی تعریف سے

بزرگاں کی یو عقل حجت اہے ۔ کہ العقل نصف الکرامت اہے

گنا بک فرق الکرامت سدا ۔ کہ اس عقل سوں ہم پچھانے خدا

چاندنی میں باغ کا سماں سے

سہلنے تھے یوں پھول پھل ڈال پر پیالے ہیں چینی کے جوں دودھ بھر

عنوان ۔ سے

بیاں ہے زخم تے بچھڑے کی تلکیں ہوئی سو منہ پر

یو دکھ ما باپ سن پیش آدوا کی، ہوئی پشیمانی۔

ہجر فراق کی تصویر ۔ سے

صبا دشمن عاشقاں سوز جوں ادچانے منگیا ہیرق روز جوں

فلک ہے سوات سرکش و تند خو سورج اپنی ستتا چلیا آب رو

سو کیا چشمہ مہ صفا نیر کا سمن بن گیا جل کے جوں دھبر کا

خزاں پھر گیا بن میں اس دھات سوں رہیا نہیں اوک زردیک پات سوں

سو من بن میں آتش کے دریا منجھار لگے اانے سب سراباں کی بہار

گر بیچ کے برتے ہے تیغ فراق جنے جنت کوں پل میں کرتا ہے تاق[1]

غزل کا رنگ یہ ہے سے

چندر بدن کھیا تو کہی موں سنبال بول

سورج کمی کھیا تو کہیں یوں نہ کہاں بول

---

[1] طاق کا دکھنی املا مدیر

دونوں بھی تجھ نکھوں تو سکی تجکو کیا گتا
کبھی اس بہشت حسن کون جم جگ ادچال بول

مغرور بے خبر ہے مدسوں مدن کی بالی
عالم کے جیو لینے لوجنا میں ہے سوالی :

قصیدہ گوئی میں بلحاظ بلندی مضامین ۔ زور بیان ۔ شوکت الفاظ کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ غواصی نے بھی بہت زور دکھایا ہے ۔ مگر نصرتی کے کلام میں غضب کی قوت بیان ہے ۔ علی نامہ وغیرہ میں بارہ قصاید موجود ہیں ۔ وہ رزم م کا مالک تھا ۔ چرخیات نصرتی کے نام سے ایک قصیدہ ۱۲۱ بیت کا علی عادل شاہ ثانی ، لطفی (بہمنی) خواجو کرمانی، کے رنگ میں ہے ۔ بعض اشعار یہ ہیں[۵]

دن کے سلیمان نے مُہر کے کھولے ہیں مہر (پر) ؟
سند سیمین بسیار رین کیرا اھرمن
باج کے تختے اوپر بازی میش دبیر
ماندقضا اور قدر دقت گما دیا اپن
کونڈ کر یک باگ کوں حد میں جو بکریاں رکھیں ۔
شیر گوی کا دو جا چھٹ کرے سب بہن
شام سکے عطار تے پاتے جب آرام جگ
طبلہ کا فوریں جب دو دھرے مشک ختن[۱]
بدر ہو غواص اپین ڈوب نکل بحر سوں جگ کون دیا دے بکھیر چرخ پہ در عدن الخ

---

[۱] ختن کا دکھنی املا (مدیر)

فرہنگ — ردک = زیادہ۔ گھال = پھسلانا۔
جگ = دوجال = نیاکا نور۔ نوجہاں) مد = شراب۔ لوچن = آنکھ؟۔ مُہر = مور۔ بسار۔
بھول کر پاچ = زمرد۔ ماند = تھک جانا۔ کونڈکر = بند کرکے۔ بھنجن یا بھجن: نکل جانا
دہاوے = سن کرے۔

نمونہ علی نامہ نصرتی

فتح وہی کہ قزل باش ہور ازبک کوں ڈربا
ستی رجپوت دمہراٹیاں کوں کہندا نوج کی تل۔

کنہار یو فتح کے داستاں | کہی کھول یوں ہمت راستاں
کہ جس وقت بھاری علی شہ کا دل | بیٹھا آکہ سرحد پہ سینہ چپکل
مغل پر جو اول پڑیا تھا سو داب | نہ شمشیر کی آنچ تی لیا کر تاب
نہ آسکے سنمک جو کاتا نظر | پھیرے اسراد ہونڈتا ہر کیدر
دہیں نامور خاں دیے شان سوں | خصوصاً خواصانچ کی خان سوں
کہیا خان شرزا کہ ناہم سوں لوج | تی خواب خرگوش دو جان بوجھ
رہیں بھاتا جاکہ جنپلاکی باج | نکلنی کی میدان میں نہیں ہو آج
بچن کر دو بار یک دل دہیں | ادتہی سو کمر باندکر حل دہیں
ظفر بخش سبنے منگاں خوش ترنگ | چلی دہر فرنگ نوج سوں بیدرنگ

بہادر وزیراں بڑے بول کے — چلی دہم سوں یک توں یک جول کے
چلی ہیں تنک دہونڈنے سب شکار — یکایک خبراں پہ ہوئے آشکار
کہ فوج یک مغل آج خوش دہات بچ — کیا ہی اودرے کہی کاج کچ
قزلباش وازبک کامل یکے بہار — دوجا یک مہراٹی لی ہی فوجدار
مہراٹیاں ہیں پن یک ہور اجپوت ہیں — قزلباش وازبک اور ہوت ہیں
یکس دل میں برچھیا دہیانے کرے — دوجی فوج تیر و تفنگ سو بہرے

کہ ہر مرد چوں کوہ اسیر رہے — تبر کسکی بہت، کسکی گرز ہے
کتیاں کا تو تیر و کماں اصل ساز — کمنداز کوئی نیزہ کوئی تیغ باز
دہرنہار ہر مرد کوں تہ امید — دل رستمی دل جسم سے دیو سفید
نہ آتش کدہ تے شکم ان کے کم — جو نگہ میں پڑیا سو گیا ہو بہم
تراش اپنی داڑی سو چہیاں دیکھ پھوڑ — کریں سوں بچھو ڈانک ڈالی سو توڑ
شراب زن کوں شک ہتھوڑا اے — سبنج نقل دنبی کا جوڑا دے

(علی نامہ ورق ۵۳ آصفیہ)

ایاغی بیجاپوری

محمد امین نام ایاغی تخلص۔ معاصر سلطان علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷/ ۱۰۸۳) ھ چنانچہ ایاغی نے اپنی تالیف نجات نامہ میں سلطان مذکور کی مدح

کی ہے۔

کروں ہر گھڑی شکر پروردگار　　کہ اس دور میں ہے علی شہ سوار

زہے شاہ عادل زہے بادشاہ　　کہ سنت کو جو فرض کیتا ردا۔

تصنیفات:۔ ایاغی کی ایک مذہبی مثنوی نجات نامہ بہت مشہور ہے جس کے (۲۷)

ابیات ہیں حمد و نعت و مدح سلطان وقت کی بعد آیات قرآنی کی تعداد اور

احوال قیامت وغیرہ پر مبنی ہے۔

آغاز:۔ اول کچھ نتھا اور نرنکھار تھا　　دونو جگ کو پیدا کرنہ رکھا۔

تو قدرت نے پیدا کیا ایک تن　　کہ جس سے لیا روپ تر بھون

عنوانات فارسی میں۔ مثلاً "در عرصہ محشر آرند و درکف دوزخ سپارند" اصل

مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے۔

ایاغی کدھر توں چلیا باٹ چھوڑ　　سر رشتہ کو اس بند کون توں نہ چھوڑ

جو کچھ بولنا تھا سو آبول سب　　قیامت کا احوال کچھ کھول سب

کتب خانہ آصفیہ کے نسخہ میں سنہ تصنیف بھی ہے مگر مشکوک ہے۔

سنہ بود یک الف و دو صد چہار　　کہ این گنج بر خلق شد آشکار

۱۲۰۴ھ

مگر چونکہ ایاغی نے علی عادل شاہ ثانی کی تعریف کی ہے اسلئے یہ سنہ غالباً سنہ

کتابت ہوگا۔ جو کسی کاتب کی جدت ہے۔ ایاغی کی ایک اور مثنوی محی الدین

نامہ بھی ہے نیز ایاغی ایک غزل گو اور نازک خیال شاعر تھے۔ کلام۔ شوخی و سوز

و گداز سے مملو ہے۔ ایک نایاب غزل کے بعض اشعار یہ ہیں۔

غزل ایاغی

دیکھنے پر کیا ہیں خیال انکھیاں — کیا کہوں کیوں رکھو سمال انکھیاں
جمع اتھا دل ہوا پریشاں آج — کلتے دیکھیا وُزلف وگال انکھیاں
پارسائی تمام گئی میری — جب تے دیکھیا ہوں اوجال انکھیاں
آج دیدار ہویگا شک نین — مجھ پھڑک بولتیاں ہیں ڈال انکھیاں
دیکھ بے طاقتی ایاغی آج — مجھ دیا وعدہ وصال انکھیاں

ایاغی نے مرثیے بھی کہے ہیں۔ ایک غزل نما مرثیہ سات بیتی ہم کو ملا ہے جسکے چند شعر یہ ہیں ؎

عنوان۔ مرثیہ حضرت امام حسین من کلام ایاغی۔

مطلع ؎ حسین ابن علی کا دل میں منجہ گر یاد نا ہوتا۔
نگر میرے بدن کا روح تے آباد نا ہوتا

نہ پاتا غم کی شیریں جیو ہمیشہ آکاہ کا سے کر
گڑدنی بے شوقی دل اگر فرھاد نا ہوتا

اگر سینے کے صحرا میں نہ چلتے قافلے غم کے
جرس میں آہ منجہ دل کے تو اشنانؔاد نا ہوتا

انجو کے کالوے اس چشم کے چشمیلتے نا چلتے
اگر دل کے چمن میں آہ کا شمشاد نہ ہوتا

---

(۱) ناد۔ آواز (۲) انجو کے کالوے۔ آنسوں کا نلے۔

رسالت کا اگر گلشن خزانا دیکھتا غم کا
محباں کے دلاں نے عیش یوں برباد نہ ہوتا

نپجتا[۳] نا اگر بد نسل گنژدم طبع موری او
اماماں کے اوپر یو ظلم یو بیداد نا ہوتا

نہ ہوتا مرثیہ مشہور سرور جگ میں جیوں سورج
ایاغی گر سخن کے فن میں تجہ استاد نا ہوتا

تشبیہات و استعارات خوب ہیں ۔ املا ۔ خزاں کا خزا ۔ موذی کو موزی اور چشمیان (جمع) (چشموں) کو چشمیا یعنی نون حذف کردی ۔ فارسی الفاظ جیسے نسل گنژدم ۔ طبع موذی وغیرہ ۔

شیخ حسن شوقی بیجاپوری

شیخ حسن نام شوقی تخلص وطن بیجاپور ۔ شاہ حبیب اللہ بیجاپوری المتوفی ۱۰۴۱ھ کے مرید تھے جن کا مادہ وصال "قطب آخر الزمان ۱۰۴۱ھ" انہیں کا مستخرجہ ہے ۔ جو شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے مقبرہ پر کندہ ہے ۔ اس کے کلام سے واضح ہے کہ شوقی ذی علم اور صوفی منش تھے ۔ ان کا تعلق مختلف سلاطین دکن یعنی سلطان ابراہیم عادل شاہ و محمد شاہ ۔

---

(۳) نپجنا ۔ پیدا ہونا ۔

نظام شاہ احمد نگر اور قطب شاہی سے بھی رہا ہے۔ اور کچھ سفارت کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔

مولانا مظہر الدین ابن نشاطی نے اپنی مشہور مثنوی پھول بن تالیف ۱۰۶۶ھ میں شرقی کا ذکر کیا ہے کہ اگر وہ بقید حیات ہوتے تو میری شاعری کی تعریف کرتے نیز دلی دکنی ۔۔ بھی اس کے کلام سے متاثر تھے اور ان سے داد لینا چاہتے تھے شرقی نے ۱۰۶۵ھ میں وفات پائی جس کا اشارہ بزبان عادل شاہ پھول بن میں ابن نشاطی نے کیا ہے۔

(۱) تصنیفات۔ مثنوی فتح نامہ نظام شاہ۔ مشہور جنگ تالیکوٹہ کے واقعات پر مبنی ہے اور رزم کے مناظر خوب لکھے ہیں۔

(۲) میزبانی نامہ۔ بزمیہ مثنوی ہے۔ جس میں سلطان محمد شا عادل کی جشن شادی کے مناظر ہیں۔ جس کی شادی نواب مصطفےٰ خاں کی دختر سے ہوئی تھی۔

شرقی۔ رزم و بزم کا استاد تھا۔ غزل بھی شوخی اور رنگینی، لطیف تشبیہات کی آئینہ بردار ہے۔ غزل مسلسل کے۔ بعض اشعار یہ ہیں۔ ؎

دلبر سلونی نین پر کھینچی سو کاخوب تر
خطاط جیون ماریا رقم پہندون ثلث کے صاد پر

یا نین موتی ڈھال ہے سو کا سونا گا نیل کا
موتی پر کر کھینچی تھوڑا ر صیاں جیون ٹوٹے کر

مطلب۔ دلبر نے آنکھ میں اس طرح سرمہ لگایا ہے جس طرح خطاط عیاری

ہوشیاری سے حفاظت میں صاد بنا تا ہے۔ آنکھ گویا ایک مروارید غلطاں ہے
اور سرمہ کا خط نیلگوں تاگا ہے جس طرح موتی پروئی ہوئی رہ ٹوٹ کر عقیدہ کی
رہ جاتی ہے۔ ع

یا چک دوات ہے سیم کی لیکی سیاہی بھر سکے
سو کا قلم جیوں واسطی کاتب گیا امریز پسر

مطلب۔ یا آنکھ گویا چاندی کی دوات ہے جس میں سیاہی بھری ہوئی ہو
اور سرمہ کا خط گویا قلم واسطی کا ہے اور خط لکھنے میں ایسا تیز ہوتا ہے کہ
اس کو خود کی خبر نہیں رہتی۔

یا ہے نگہ نرمل بدن ہو کشن جیوں چنچل نین
سو کالے باوا در دمن دستا گوڑا جیوں بے خبر

یا جسم تو صاف ستھرا صاف شفاف ہے اور اس پر آنکھ ایسی معلوم
ہوتی ہے جیسے چلبلا شوخ سری کشن۔ سرمہ کے خط کی ڈوری منہ پر لگا کر
مستی و مدہوشی میں جھوم رہا ہو۔

بہر حال صرف آنکھ کی کیفیت مستی میں سات بیت لاجواب ہے۔
حسب ذیل صوفیانہ نظم کے اشعار سلاست و روانی سے خالی نہیں جو
شرقی کے واردات قلبی کے مظہر ہیں جس کے بائیس اشعار ہیں۔

ہمیں ہیں برہنی باولے پیتے ہیں اسے محبت کا
نہ کہہ ناصح نصیحت مجھ نہیں حاجت نصیحت کا

ہمارا طور یکساں نہیں کہیں خنداں کہیں گریاں
کہیں دل کیاں کریں سیخاں کہیں جیو پو کریں بریاں
کہیں منصور ہو سرمست کہلا دیں آپ انا الحق
کہیں مفتی ہو دیں فتوی سوا قتل کا فر مطلق
کہیں ہو بن ہم کہا دیں کہیں تو کی لی رد کھی
کہیں بھاجی کہیں پالا کہیں ونجار کی بھوکی
کہیں مکھ تے رتن جھڑتے کہیں لعل در آمیزی
کہیں کرتے شکر افشاں کہیں کرتے نمک ریزی

نصیحت (ذکر) - الا - انا الحق کا (انا الحق) ہندی الفاظ ونجار کے بھوگی
فارسی الفاظ وترکیبیں۔ لعل در آمیزی۔ شکر افشاں۔ نمک ریزی۔
محاورے:- دل کی سیخ کرنا۔ جیو کو بریاں کرنا۔ فتوی دینا۔ منہ سے رتن جھڑنا۔
(در افشاندن)

میر ہاتی نامہ شوقی۔ جلوس برات کا ایک منظر۔

سدا دار پر تجھ منگل گڑ گڑیں
منگل گڑ گڑ بہں جیون بدل گڑ گڑیں
ہتی مست پر پیلباں مست ہے
زبردست پر کیا زبردست ہے
سدا دار پر تجھ طبل باجتے۔
طبل باجتے ہو مندل گاجتے
بہت دیس تے شہ کے گھر کاج ہے
شہر گشت کی رات سو آج ہے
شہر گشت کا ساز دہ ماں ہوا
نقیرہاں ترای دماماں ہوا۔ الخ

فرہنگ۔ گھر، محل۔ دمنگل۔ ہاتھی کی چنگھاڑ۔ بدل۔ بادل۔ دیس۔
دن۔ ترّی۔ دمامے۔

فتح نامہ نظام شاہ رزمیہ مثنوی:- جنگ تالیکوٹ میں ابراہیم عادل شاہ، ابراہیم قطب شاہ اور نظام شاہ احمد نگر تینوں نے متفق ہو کر رام راج۔ راجہ وجیانگر کا مقابلہ کیا تھا۔ اور فتح ان سلاطین کے ہاتھ رہی۔ رام راج مارا گیا چونکہ اس وقت شوقی، شاہ احمد نگر سے وابستہ تھا اس لئے اس نے نظام شاہ کے سر فتح کا سہرا باندھا ہے۔ حالانکہ تینوں سلاطین شریک تھے۔ باہمی صلح جوئی اور رفاقت۔ بقول سعدی۔
دو دل یک شود بشکند کوہ را۔ کی مظہر ہے!

شوقی ؎

اپس میں اپین دوست سب مل ہوے
محبت سوں اخلاص یک دل ہوئے

یو سب مل کے ایسا کئے یک پنا
جو اس کفر کو مار کرنا فنا ۔ الخ

سفید گھوڑے پر حبشی سوار کا مرقع ملاحظہ ہو ؎

بیٹھا ناگ کالا اوتھ یا راج ہنس
اوٹھی سیام سندر دو تاراج نس

سفید پھول پر کالا بھنور نمایاں نظر آتا ہے۔ ؎
پڑیا پھول پر جب بھنور چنک پیار چھپا ترک زنگی کھڑا آشکار۔

ہوا گرم تر خر تپ ریے کا ۔۔۔ سنا جب یو آواز ترنا ئے کا
کرتے رام اپنے ترک زدر کی ۔۔۔ سمندر اپنے حوض کوں شور کیا ۔ الخ

رام راج نے بڑی تعلی کی مگر ناکام رہا۔

امین الدین علی بیجاپوری

عوام آپکو شاہ امین اعلی کہتے ہیں۔ شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری کے صاحبزادے تھے تقریباً ۹۹۰ھ میں پیدا ہوئے۔ مادرزاد ولی اور مجذوب سالک تھے، علوم ظاہری و باطنی میں کامل تھے۔ سینکڑوں کرامات مشہور ہیں۔ سب سے بڑی کرامت اردو زبان میں تبلیغ تصوف ہے۔ بلحاظ شجرہ شاہ عطاء اللہ سے ارادت اور خلافت تھی، شیخ راج محمد سے بھی فیض پایا ہے۔ ۲۴ رمضان ۱۰۸۶ھ میں وفات پائی۔

"ختم ولی" مادہ وفات ہے۔

تصانیف:۔ تصوف میں آپ کے مختصر رسالے ہیں۔ قربیہ۔ وجودیہ۔ محبت نامہ (محب نامہ) قصیدہ در مدح شاہ برہان۔ عرفان العشاق۔ رمزالسالکین (رموز السالکین) دوہرے بھی کہے ہیں، غزل قدیم ریختہ میں کہی ہے۔ سیدھی سادی زبان میں عرفان کا دریا بہا دیا ہے۔ نثر میں ایک کتاب گفتار میں مختصر ہے۔

مدحیہ قصیدہ کا رنگ یہ ہے ؎

برہان حجت نام ہے در دین پیش قدم ہے ۔۔۔ اسرار حق با نام ہے برہان بن میراں اُپر

علم لدن مقدوستج، نکتے خفی کشوف تج　　اشکال مشکل حل تج برھان جن میراں اپ

(۲) محب نامہ یا محبت نامہ رنگ عاشقانہ ہے ـ

قرین نین تیرے ساحر، تدئے تمن کوں
گمراہ کر بھلا دے قوس قزح بھنون کوں

پیچوں بھریاں زلف تج موں دے بحر ٹیں
ہر لہر پر کرشمہ عشاق کے ۔یجن کوں

راہ صراط پل جوں سرانگ جوں چھپی ہے
کاہے کشاں کا پر۔ محب بلا دئے کوں

سیما عرش علامت کرسی مکٹ سہادے
روشن شمع منور پروانے جلانے کوں ۔ ا۔

(۳) رموز السالکین ۔ موضوع ، وحدۃ ، نور ، روح ۔ دل ۔ نفس ۔

اللہ پاک منزہ ذات　　اسوں سفتاں قایم ست
علم ارادت قدرت بار　　سنتا دیکھیاں یو نہار
ہے صفت یہ جان حیات　　بس کو ناہیں کدگھات
ایسا صفتاں سوں ہے ذات　　جوں نکے چنونا چاند سنگھات

یعنی صفت ذات سے جدا نہیں، اور نہ صفات عین ذات ہیں۔

دوھرہ۔ مرنا ہار، جیونا بسا　　جیونا ہار، مرنا بسا
سوہ سو ریجن کی دیکھ بچار

لال سوریجن دیکھن پادے　　آپس میں دیکھ آپ گنوادے

من رائی حضرت قول بھوادے

جانم حال سوز بھرادے   حق کے توں حق ڈھلادے

آگھے شاہ امین علی گیاں ھرادے

ریختہ قدیم اسے ضمیرم زارکاں دل یارسنج سوں بات کرتا ہیں

بہ بینم راہ شاہنشاہ یک تل آکے جاتا نہیں

بلا قافیہ غزل سے

دل بحر میں غواص ہو روح صدف کے کاچیں ایں

بے باہ ذرلتس صدف میں نور جاں توں سچیں ایں

"گیان کے عرفاں سوں سنبھال سینے چیر کر   موتی مزین بات لیا عرفاں انگوٹھی لگا ایں

آپ کا اہم کارنامہ "گفتار امین" یہ بھی مختصر مگر مرصع ہے ۔

"ہاشمی بیجاپوری ریختی گو"

ہاشمی کا نام مولف اردوئے قدیم نے سید میران اور بعض نے میاں خاں ۔ اور اسکو سید ہاشم علوی گجراتی کا مرید لکھا ہے ۔ سید میران نام تخلص ہاشمی ، اور میاں خاں عرف ہوگا ۔

ہاشمی مہدوی مذہب کا پیرو تھا اور اس کے پیر سید ہاشم مہدوی تھے ۔ اس کا وطن اصل برہانپور معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ ایک امیر ذوالفقار خاں کے قصیدہ میں اس نے برہان پور کا اشارہ کیا ہے ۔ سے

ہاتی رُپے کے ہودے سوں کئی گاؤں لکھکر لیوں گا

آیا ہوں برہان پورتے یوں دل میں اپنے کر اقرار

ہاشمی سلطان علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ تا ۱۰۸۳ھ) بیجاپور کا درباری اور محبوب شاعر تھا۔ حرم شاہی میں بھی اس کی رسائی تھی۔

مادرزاد نابینا تھا۔ عمیت کم تھی مگر بہت ذہین تھا شوخ اور فطری شاعر تھا کہتا ہے ؎

دونوں انکھیاں معذور ہوں تس پر پڑھیا نہیں یک حرف

کیوں شعر یو بولتا پختہ سو پاکیزہ ھنوار

امرائے عادل شاہی اور عالمگیری میں سدی مسعود حاکم ادہونی و وزیر عادل شاہ اور ذوالفقار خاں سپہ سالار عالمگیر سے اس کے بے حد تعلقات تھے۔ ذوالفقار خاں کی مدح میں اس نے کئی قصیدے ریختی میں لکھے ہیں

کبھی ذوالفقار خاں نے گھاٹی سدم کے اوترے

ارکاٹ میں گھرے گھر گل سوں ہوا اپکارا

نواب چاند سا سوں دکھلائیں کن تو دیکھوں

سکھ کا پڑے گا چندنا ہوئے دوکھ کا دور اندھارا

ذوالفقار خاں ہاشمی کی ریختی بڑے شوق سے سنا کرتے تھے ایک مرتبہ کسی محفل رقص و سرود میں مہ جبینوں کے درمیان اپنی غزل سنا رہا تھا، نواب صاحب بھی اتفاق سے پہنچ گئے طرح تھی۔ ؏

عجب خوش وقت کے مہاتے دیکھی یک بال کی چنچل

۵ عجب خوش وقت کے میانے دیکھی یک بال کی چنچل
سو بادے نوجوانی میں سو چودا سال کی چنچل
چنچل چنچلائی کی چالی سو کئی دھات کرتی ہے
چنچل انکھیاں، چنچل باتاں، چنچل ہے چال کی چنچل
کھڑے نواب کوں پاکر نگر اے ہاشمی بولیا
عجب وقت کے میانے دیکھی یک بال کی چنچل
(نوٹ) (یک بال کی چنچل سے مراد خوب صورت بال والی ماہ پارہ)

وفات:۔ ہاشمی کا سنہ وفات مولف گل رعنا نے سنہ ۱۰۹۰ھ اور مولف تاریخ شعراء دکن نے سنہ ۱۱۹۰ھ لکھی ہے۔ مگر اس کی صحیح تاریخ وفات ۱۱۰۹ھ ہے۔ جس کی تائید مولف کتاب الاعراس سے (نیز ایک قصیدہ مدحیہ نواب ذوالفقار خاں سے ہوتی ہے جبکہ ۱۱۰۹ھ میں نواب مذکور نے ارکاٹ پر حملہ کیا تھا۔ اور قلعہ جنجی فتح ہوا تھا۔ چنانچہ ہاشمی اس سنہ میں ارکاٹ میں موجود تھا۔
تصنیفات:۔ مثنوی یوسف زلیخا۔ بہت مشہور ہے جس کے پانچ ہزار ایک سو سات اشعار ہیں۔
یوسف زلیخا اور احسن القصص ایک ہی ہے۔ علیحدہ علیحدہ تصانیف نہیں ہیں بعض ادیبوں کو مغالطہ ہوا ہے۔ وہ خود یوسف زلیخا کو احسن القصص

فرہنگ : منور، صورا، ستھرا: سکرم گھاٹ کا نام۔ میانے: درمیان۔ دھات: طرح طرح۔

کہتا ہے ؎

کہا احسن القصہ جس کوں خدا　　کہتا ہوں کہ میں اس کا اب ابتدا
یو نام القصہ ہے تن ن کا تمام　　پڑھو ہور دل سوں منو سب تمام

یوسف زلیخا کا سنہ تصنیف ۹۹۰ھ ہے ؎

مرتب کیا میں یو قصے کو تو　　ہزار ایک برس تھے نو دو پہ نو
اگر کوئی بیتوں کا پوچھے شمار　　کہے بیت ہزار ے ست ہے پنج ہزار

یوسف زلیخا کے مخطوطات کتب خانہ آصفیہ، سالار جنگ کتب خانہ انجمن ترقی اردو (کراچی) پاکستان میں موجود ہیں۔ موخرالذکر نسخہ (۹۹۰ھ) مصنف کے زمانہ کتابت شدہ ہے۔ بعض نسخے مہدوی فرقہ کے کاتبوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔

۲ ۔ مثنوی پند ونصائح نعمان" ایک مختصر مثنوی ۔ ۱۴۸ بیت کی ہے۔ جس میں عورتوں کے مشہور حضرت شاہ دادل گجراتی کی نذر و نیاز کے خلاف اس طرح سخت تہدید کی ہے ؎

شاہ دادل کی چوکی کو جو جائے گی
دغا پائے گی اور خطا پائے گی

شاہ دادل (عبداللطیف داد الملک) گجرات کے بڑے اولیا اللہ سے تھے۔ اور دکن کے سالار مسعود غازی مشہور ہیں۔

۳ ۔ دیوان ہاشمی ۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ حیدر آباد کا ایک نایاب نسخہ ہے جو دوسو بائیس صفحات پر مشتمل ہے مگر ناقص الاول ہے ؎

ہر صفحہ پر بارہ تیرہ اشعار ہیں۔ جس میں ۳۴۲ غزلیں اور تقریباً ۴۶۶ ۲ اشعار ہیں۔ ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں بھی ہے۔ جس پر کسی امیر۔ اعتبار جنگ کی مہریں ہیں۔ بعض مختلف بیاضوں میں بھی اس کا کلام ملتا ہے۔ سالار جنگ کے کتب خانہ کی ایک بیاض میں ایک مخمس ریختی بھی سات بند کا موجود ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

خدا کی سوں تمہاری سوں اجی میں جان سین جاتی ہوں
ٹک یک تم چھوڑ دیو ساجن بیڑا کر پان کھاتی ہوں الخ

لفظ سوں بمعنی قسم، شعراء اہل زبان نے بھی استعمال کیا ہے۔ غرض ہاشمی موجد ریختی ہے۔ اکثر خصوصیات کلام میں موجود ہیں ـــــ میاں رنگین انشار اور جان صاحب کا اسکے متاخرین میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

یوسف زلیخا ہاشمی

مخطوطہ آصفیہ مکتوبہ ۱۱۶۹ھ

آغاز:۔ ثنا حمد او سکوں سزا وار ہے سگل عشق کا جیکے بستار ہے

خاتمہ:۔ کہ الحمد اللہ یہ قصہ تمام ہوا سو محمد پو ہے نت سلام

بعض اقتباسات:۔ **زلیخا کا سہیلیوں سے کھیلنا**

زلیخا اتھی بادشا بے نظیر سہیلیاں دسین گرد جانو وزیر

سہیلیاں ست ریاں سیاں تھا سربسر　　　محل آسماں جوں زلیخا چندر

زلیخا تھی گو یا تجل آفتاب　　　سہیلیاں دسیں گرد روشن ہو تاب

کہ پارے کا حرکیں سے نیں گیا　　　لول سر نو سیماب کا کیوں ہوا

دسیں سیل چندنی میں سب دھات سوں　　　جو گہنی گجری گجرات سوں

بندی تھی سہیلیاں کی جوں میل سوں　　　عراقی نہ تھی دکھن کھیل سوں

کدھیں تیتے جھونتے سواد دُہن　　　کدھیں کھیل کھوئی اسے انگن

کدھیں جہان جو نتے دُکھیلے ڈھنگ　　　کدھیں بہائی کدنتے نبیہ سونگ

کدھیں کھیلے چکا سونے ہت میں حات　　　پنچم کھیر کری کھیلے سہیلیاں سے رات

کدھیں لے لمپ کے سہیلیاں سے میل　　　کوڑیاں ہور گولیاں کدھیں کھیل کھیل

چاندنی رات کا سماں سہ

صفائی سو چندنی کے ہو ٹہار ٹہار　　　جھلکتے تھے کاندان سو ھیرے کے تھار

ہو بالو دیسی ہر کیناں بے حساب　　　شب صاف چندنی تھے ہوئی تھی شفاف

تو چندنی سوں لیکر دے کچھ ثمن　　　ہوا تھا اگر ک ف ت ا ب ک ثمن

دریا دیکھ چندنی میں کہیں دودتیں　　　کمند رھوئے سب روپے ن زیں

ندیاں دودکیاں ہے بہشتاں میں سب　　　جیٹھیاں کو یو دنیاں میں آکر عجب

ندیاں دیکھ چندنی میں گہیں جگ سکل　　　بلیا دودکا کاں تے دریا او بل -

بو حوضاں دسیں صاف یوں چندنا پہ　　　حباب جوں حباب جہ مسکہ چکہ

ان دیکھ چندنی میں پانی سو پور　　　کہیں یوں صفائی سوں آ اہل حور

فرہنگ :- ستاریاں سیاں = ستاروں کی طرح۔ جراتی = ہاں نہتی۔ کدھیں = کبھی۔ آپے بھونتے = جھومتی ہوئی آئی۔ پھوڑی پھو (دھاچھی) ایک کھیل لڑکیوں کا۔ بھای کدن = بھای بندوں کے ساتھ رنگ کھیلتی۔ کبھی کوڑیوں سے اور گولیوں سے کھیلتی۔ کانداں = دیواریں۔ بالو دیت پھر کنیاں = ہیرے کی کنی۔ کچھ نمن = کنچن کی طرح طلائی۔ کھرڈل = سخت پتھر۔ ددیں = دودھ کی طرح۔ یکیندرہ ایک = روپے کی = نقرئی۔ جگ سگل = دنیا والے۔ لڑاں = لہریں۔ ڈاکنواں = سیل = سیلابی۔ دسیں = دکھادیں۔

مختار بیجاپوری

اس کا نام محمد مختار[1] اور مختار تخلص ہے۔ ایک گوشہ نشین متوکل بزرگ تھے۔ چونکہ اپنے پیر طریقت شاہ حضرت حسینی بیجاپوری کی مدح کی ہے۔ مرشد کے متعلق فرماتے ہیں ؎

رتن کا محمد حسینی ہے نادن	میرے سرپہ اس کی ہمیشہ ہے چھادن
کہ اد شاہ حضرت سون مشہور ہے	کہ فیض اس کا دو جگ میں معمور ہے
اسے پیر ہے شیخ عبدالصمد	سو پایا نہایت ولایت کا حد
میرے پیر کا جد ہے او سرفراز	محمد حسینی سو گیسو دراز۔

مختار ایک غیر معروف شاعر ہے جس کا کسی تذکرہ میں ذکر نہیں۔

---

[1] مراد المریدین مولفہ شاہ حضرت حسینی قلمی آصفیہ۔

مختار نے کب وفات پائی پتہ نہیں چلتا۔
مختار نے اپنی مثنوی معراج نامہ ۱۰۹۴ھ میں لکھی جس کا اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

سنہ تھا یہ ہجرت کا اس دن قرار　　تھے گذرے نوزچار پر یک ہزار
۱۰۹۴ھ

گویا یہ مثنوی بلاقی کے معراج نامہ ۱۰۶۵ھ کے ۲۸ سال بعد لکھی گئی۔ جس کے اشعار بلاقی کے معراج نامہ سے دگنے یعنی تقریباً ڈھائی ہزار ہیں۔ غرض مختار کے معاصرین، بلاقی، نصرتی۔ ہاشمی اور ذوقی بیجاپوری تھے۔ گو یہ ایک مذہبی مثنوی ہے۔ مگر اس کا اسلوب بیان دلچسپ اور رنگین ہے۔ باغ و بہار، پرندوں اور مختلف قسم کے کہانوں کے بیان میں نصرتی کا رنگ جھلکتا ہے۔ مثنوی کے عنوانات فارسی ہیں۔ اور یہ گیارہ ابواب اور دو سو بیالیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

مختار کو زبان پر کمال قدرت حاصل تھی زبان صاف اور رواں ہے روزمرہ اور محاورات بھی خوب باندھے ہیں بعض نمونے درج ذیل ہیں:۔

حمد میں کہتا ہے ؎

اگر کوئی سمجھنے کیاں باتاں کرے　　ہمو کا خالی بھانڈے میں ہاتاں کرے
ڈھونڈے بہوت اس کو نہ سپڑے خبر　　سبھے سپڑے اس کی نہ انپڑے خبر

جو حیرت منٹ لات کون ٹہار نہیں — جو کوئی لات زن ہے اسے بار نین

جو لافیاں میں انکیا اسے ہے اٹک — اسے بات نیں ہے تو اسکون پٹک

مدح حضرت عثمانؓ

حیائے گھونگٹ میں عجب لاجتا — گھونگٹ یو دیکھو اس کو کیا ساجتا

تیا کے اسے چپ سر نستے ہوئے — تو شرمندہ اس تے فرشتے ہوئے

مختار سنی المذہب تھے۔ حضرت علیؓ اور حسنینؓ کی خاص انداز میں مدح کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کی تعریف میں مبالغہ سے یہ نہ سمجھ لینا کہ میں رافضی ہوں۔ حضرت حسنین رضی اللہ عنہما کو باغ نبوت کے ایک بڑے سایہ دار درخت سے تشبیہ دی ہے۔ جس کے سایہ تلے حیوان انسان سب ہی سکون واطمینان حاصل کرتے ہیں۔ لکھتا ہے ؎

سو اِتےؔ انگےؔ میں بیان کیوں کروں — سو ہے تہمت رفض تے میں دروں

علیؓ نام حیدر سو کرار ہے — کہ سب حیدران پر او سردار ہے

بزان میں تماشے کوں سب دیکھ کر — گیا ہوں بچپن میں سو یک باغ پر

سو باغ نبوت اسے ناؤں تھا — نبوت کا سب فیض اسے تھا دن تھا

بچھانا بچھانے زمین پر ہریا — سو ایسا بچھانا نہیں کوئی کریا

سو تسبیح کرتیاں اچھیاں بلبلاں — لگیاں تھیاں کلیاں ہور کھلے تھے پھولاں

؎ا اِتے، اس نے۔ ؎۲ انگے، آگے۔

دونوں جھاڑ کا ناؤں پوچھا ہوں میں ۔۔۔ کہ کیا ناؤں ہے دونوں جھاڑاں کے تیں
دیا ہاتف آ کر یو آواز عین ۔ ۔۔۔ کہ یک سمت حسنؑ اور دیگر ہے حسین
مرا نے لگیا آ کہ دو نو کوں یوں نا ۔۔۔ صفت ان کی لیاؤں بیاں میں سو کیوں
دو موتی ورج نبوت کے ہیں ۔۔۔ دو دیوے یو فیض نبوت کے ہیں
نبی کی انکھیاں کے دو نو نور یو ۔۔۔ کریں کفر کے ظلم کو دور یو ۔

حوران بہشت کا ایک منظر

جیوں کرتے جاتی تبسم منے ۔۔۔ سو یاں کوں جیلاتی ترنم سے
جھلکتا اتھا یوں سو مکھڑے کا تاب ۔۔۔ سٹے تاب اس کے سنگے آفتاب
عجب زلف کے پیچ میں حل تھا ۔۔۔ کہ عاشق کے جیو کا بڑا کال تھا
سو خونی انکھیاں میں ادخونی خیال ۔۔۔ کہ کرتا تھا جیو کوں پامال ۔
جو پلکاں کوں اپنے ادر ہم کرے ۔۔۔ جیواں کا سو بازار برہم کرے
پلک تیر بھوں کی کماں کوں جوڑ ۔۔۔ جیواں سے ہدف مارے سٹنے کچھوڑ

نگار نے عربی فارسی سنسکرت ہندی الفاظ بہت کم استعمال کئے ہیں۔

اسلوب بیان سادہ مگر رنگین ہے۔ مثنوی میں روزمرہ محاورہ بندی کا خیال رکھا ہے

مومن

عبدالمومن۔ مومن مہدوی متوطن سنیا پٹن سنہ ۱۰۸۱ھ میں پیدا ہوا۔ " الہی ایمان بخش " مادہ تاریخ ولادت ہے[۱] اس نے ایک مثنوی اسرار عشق حضرت سید محمد جونپوری (۸۴۷/۹۱۰)ھ کے حالات میں سنہ ۱۰۹۳ھ میں لکھی۔ چنانچہ مادہ تاریخ کہا ہے

ہوا جب مبارک ختم مجھ قال　　　ہزار ایک ہور نو در پر تین تھے سال۔

فارسی مادہ ہے

ز تاریخ ختمش خرد مژدہ داد　　　کہ گنجینۂ پاک اسرار عشق (۱۰۹۳)

مومن ایک مہدوی بزرگ شاہ ابراہیم کا معتقد اور مرید تھا اور تعلیم و تربیت بھی انہیں سے پائی تھی۔ جس کا اشارہ اس طرح کرتا ہے ہے

نہ میں کچھ طبع تھے میری پایا　　　براہیم شہ تھے یو تعلیم پایا
براہیم شہ تے باتعلیم مومن　　　بجھانے تجھ دمادم یا مبین
کہ تجھ معشوق کا خوش جلوہ پایا　　　سہیلی شاعری کے فن میں گایا
تاکر رقص ایک تازہ بناتا　　　تنن نا، تن تنانا، تن تنانا

---

[۱] اسرار عشق مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ

مومن نے باغ و بہار اور رزم کے مناظر بھی خوب لکھے ہیں۔ اپنی کتاب کی تعریف سے

نزل یک عشق کے پھولاں جو پھولے	بھنور عاشق ہو تس پھولاں پو پھولے
لطافت کا چنبیلا ارغواں کھیل	مقرب کار کھیا اٹکا کہ کھا دل
فصاحت کا جو سوسن راز بولے	عوارف کون رجھیا ناں دیں کھولے
عبارت عشق کا بیجا ہور نگین	سٹیا عاشق کوں لیا پنچاں میں سنگین الخ

وحدت الوجود سے

درخت تو آپیچ تون آپیچ ہے بار	سو پھول آپیچ تون آپیچ گلزار
اپس پر آپ چاد سون پھولنہار	اپس پر آپ پیرت سین ڈھولنہار

مناجات سے

جلک تو آسمان کا ھست چہلتا	جلگ سورج پھرے قاصد ہوڈتا
جلگ چندر قلندر نت نویلا	پھرے تاریا کیرلے سات میلا
تلک اے شاہ جگ سکھ سوں جی تون	پیلے عشق کے بھر بھر کے پی توں

بحر العرفان شاہ حسین ذوقی

شاہ حسین ذوقی ۔ الملقب بہ بحر العرفان بیجاپوری ۔ شاہ محمد خاں کے مرید بیان کئے جاتے ہیں) مگر ذوقی نے اپنی ایک دوسری تصنیف وسائل نقہ دکھنی منظیم میں لکھا ہے کہ میں شاہ امام الدین کا مرید ہوں۔ فرماتے

وہیں کہ سہ شاہ امام الدین ہیں افضل پیر دین و دنیا میں ہیں دستگیر

اونکے صدقے ہو جا سب امر کہتا ہے جو کچھ اب

حسین ذوقی کمتر داس شہ کے چرن کی دھر کر آس

محمد عارف لکھن ہارا رکھ با ایمان لے پروردگارہ

ذوقی ۔ بڑے اہل دل اور متوکل بزرگ تھے ۔ باوجود ناقدردانی کے سلطان عالمگیر کی تعریف بھی کی ہے سہ

ہے اسوقت اورنگ زیب غالی نبی کی شرع کے گلشن کا مالی

سُہادے نام عالمگیر اس کوں گنا لازم ہے جگ کا پیر اس کوں

رسالہ فقہ دکھنی مولفہ ذوقی ۔ اس میں ایک سو تیس مسائل مدون ہیں ۔

ابتدا ۔ کرسیاں چہار بولوں تجھ محمدؐ بن عبداللہ بوجھ

عبداللہ بن مطلب جان مطلب بن ہاشم مان

ہاشم بن سو عبدالمناف چار و کرسیاں سیکے صاف

اب چاروں مذہب گیانی سن بچن رتن لے میرے چین

سنی مذہب ہے زمل امام اعظم سو اول ۔

پادن سر کا مسح کرسے چل کھونیاں لگ دھو دو پگ مل

فرض غسل کے چیت دھرسن گیان رتن لے میرے چین

خاتمہ :۔ شاہ امام الدین ہیں افضل پیر دین دنیا میں ہیں دست گیر

ان کی دیگر تصانیف میں وفات نامہ ، ماں باپ نامہ ، دیوان دکھنی بھی

بیان کیا جاتا ہے مرثیے بھی کہے ہیں۔ غوث نامہ اور منصور نامہ بھی بیان کیا جاتا ہے۔ آخرالذکر تصنیف اہم ہے جس کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی میں محفوظ ہے انجمن کے نسخہ میں نزہت العاشقین لکھا ہوا ہے۔ نیز مسائل نقہ کا مخطوطہ بھی ہے۔

حسین ذوقی کی بعض غزلیں انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں ہیں چند شعر درج ذیل ہیں ؎

ہے سرو قد سکی کا جون پھول ڈال نازک

مکھ پھول بھی رہیا ہے جیسا گلال نازک

پن کھا کے نازکی سون لٹکے سکی اگن میں

گویا لبان شفق میں دستے بلال نازک

نزہت العاشقین: صفحات (۴۳ تا ۱۱۵) ۸۲ صفحہ سطر ۱۱ ناقص الاول ہے۔ اس لحاظ سے اس ناقص نسخہ کے اشعار تقریباً ایک ہزار ہیں۔ آغاز ؎

کہا ملک میتے کوئی جھوپاے مدن   گواہی کوئی تیس کی دیوے نین

خاتمہ۔ سو اس رات ذوقی نے کریو تمام   درود بر نبی پر کہو والسلام

حضرت منصور حلاج کے جملہ واقعات عشق اور واردات قلبی اور قتل منظوم کئے گئے ہیں۔ ذوقی منصور کے رموز و اسرار کے متعلق لکھتے ہیں ؎

ہر یک کوئی رکھتے ہر تین چھولاں کو بھانت

دلے باس کیوں رکھ سکے تس کے ڈھانپ

چڑے معرفت سے جو کوئی کس پو سور | تو کیوں کر چھوپے جگ میں تس کا ظہور
نہ چھوپے لطافت سے کیں بیداغ | کدھیں اوٹ باڑی کے چھوپے نہ باغ
جنے مٹے پیان کتے پنجاہ سال | تو کیوں دل سوں ناقص کے آدیں وبال
جنم سے پرستی سوں ہم مست تھا | جو فیاض ساقی سوں ہمدست تھا
چڑنے گلیان استخوان ہو کو جل | حرارت میں سب تن گیا تھا سو گل
دردنے کے آسب بھٹی کیوں سو جوش | ادپٹنے اتھی اک نلان سو خروش

شیخ محمود بحری

شیخ محمود، تخلص بحری، ابن قاضی شیخ بحر الدین وطن، وطنا سری علاقہ مدراس تھا، ان کے والد نے کبر گوگی (ضلع بیجاپور) میں مستقل سکونت اختیار فرمائی۔ بحری کی تاریخ ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کے مرشد کا انتقال ۱۰۸۹ھ میں ہوا۔ بحری بیس سال ان کی صحبت میں رہے۔ اس لحاظ سے بحری کی تاریخ وفات تقریباً ۱۱۲۰ھ قرار پاتی ہے، ان کی تعلیم و تربیت علم ظاہری و باطنی، ان کے پیر محمد باقر کے ہاتھوں ہوئی فرماتے ہیں ؎

این را نجدانہ شاعری داں | این علم عطائے باقری داں

غرض بحری کو عربی فارسی، ہندی، سنسکرت، فلسفہ و حکمت ویدانت اور طب میں کافی دستگاہ تھی، آپ کی فارسی و اردو تصنیفات اس کے شاہد ہیں۔

سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے آخری زمانے میں حیدرآباد آئے اسی

رہزنوں نے لوٹ لیا۔ جس میں آپ کا سرمایۂ شاعری بھی ضائع ہو گیا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے پچاس ہزار شعر کہے تھے اس کے بعد سنہ ۱۱۱۱ھ میں آپ گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ سجادگان درگاہ شیخ جلال الدین جنہ آمر شدیوسف عادل شاہ، سے بے حد روابط تھے چنانچہ مولانا سید احمد سجادہ وقت کی فرمائش سے اپنی مشہور مثنوی من لگن لکھی۔ بحری نے طویل عمر پائی زمانے کے بہت سے نشیب و فراز اور انقلاب ملاحظہ فرمائے دکن کی عظیم الشان سلطنتوں یعنی عادل شاہیہ و قطب شاہیہ کا خاتمہ بھی دیکھا اور سنہ ۱۱۳۰ھ میں واصل بحق ہوئے۔ اور گوگی ہی میں مدفون ہوئے "داخل مجلس رسول اللہ" تاریخ مادہ وفات ہے۔ ۱۱۳۰ھ

تصنیفات:۔ مختصر مثنویاں دکنی اور فارسی کئی ایک ہیں جس میں عروس عرفان فارسی نثر، مثنوی من لگن دکنی، ۱۸۳۰ بیت مثنوی بنگاب نامہ ۱۴۴ بیت، اور دیوان دکنی بحری تقریباً ایک ہزار بیت محفوظ ہے اور متفرق فارسی کلام بھی ہے۔ بحری، لڑکپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے، اور طویل عمر پائی۔ اس لحاظ سے ان کی مدت شاعری تقریباً اسّی سال قرار پاتی ہے۔ ان کا کلام قدیم رنگ کا ہے۔ آخری زمانے میں شاعری ترک کر دی تھی، چنانچہ فرماتے ہیں۔

بحری وہ خوش قماش بچپن بولتا گیا — اس بڈھنے طبع کیا مضمحل مرا

شمالی ہند کے اثرات سے

کچھ بھی لے جاتا تو ہے، پن ہم نگوڑے کیا لجائیں
اوتے لیاتے تو لے جلتے، اپس سنگات کچھ

دور نگاہ سے منجہ دو رنگی سوں نہ کھے، دولت کیوں کر دوستی

دیہ کچھ، دل کچھ، نین کچھ، پرت کچھ ہور بات کچھ

بحری کی غزل کا ایک شعر ابوالحسن تانا شاہ سے منسوب ہے سے

اب جاؤں کاں پوچھوں کسے منج پر بکل بچھراٹ ہے

یک باٹ گئے ہوں گے سجن پن جیو بارا باٹ ہے

سے بوں بانکا ہے گرچہ بحری کا پن اوسیدا ہے اے سجن تجھ سات

نادر تشبیہ سے لٹ کوں لٹ پٹ ہو رخ پہ ریج نکو

سوت کاتنے کوں پھر کپاس نہ کر

صورت چندر بدن کی لیی آرسی منے

سو دیکھ سب کے کہ سسی آرسی منے

مثنوی من لگن سے آغاز تصنیف سنہ ۱۱۱۲ھ

اے روپ ترا رتی رتی ہے	پربت پربت پتی پتی ہے
پربت میں ادک نہ کم پتی ہیں	یکسا رہے راس ہور رتی ہیں

وحدۃ الوجود سے

یک آب تے ابدار ہیں یو	یک تاب تے تابدار ہیں یو
بوجے یو تمام موم ہے موم	فرزیں، یو شتر، ترنگ معلوم
بن موم یو نقش نادر سب جھوٹ	بن شور یو دھوپ چھاؤں سب جھوٹ
جبر و اختیار سے تجھے ذات میں حسن کے ان گنت گن	ہر یک کوں دیا ظہور جن جن

منگل جو مچھر کے ٹن میں اپچتا　　ادکس ادکلوں کیوں اپچتا

صورت سرمدی سے

اے یار ایک آدمی ہے آواز　　پن کان کہاں جو ادسنے ساز

فضیلت علم یعنی گیان سے

چنچل بی ہے گیان چک بھی گیان　　ادپوتلی، اوپلک بی ہے گیان
آدم کے انگے نہ سر دھرے او　　اس گیان کوں سب نمن کرے او
ناسو، نہ پوسبی ٹریا ـــــ　　یو گیان ہے گیان، گیان بھیا
آدم ہے حقیقی آج یو گیان　　سلطان کوں دل کے تاج یو گیان

فلسفۂ موت بقول اقبال سے

سمجھتا ہے ناداں اسے بے ثبات　　ابھرتا ہے بن بن کے نقش حیات
جن مرگ مرم سوں ہے محرم　　مرنا نہیں جیونا ہے جم جم
یو مرگ نہیں کرم خدا کا　　ات لطف ہے خاص مصطفےٰ کا
ہے بیچ منے ندی نگوڑی　　نہ ناؤ نہ ٹوکرا نہ ہوڑی۔

فلسفۂ خودی سے

جن خاص خودی سو آشنا ہے　　تس پاس خودی نہیں خدا ہے

جھوٹ اور ظلم سے

یک جھوٹ سوں دو جہاں لرزتا　　دھرتی سوں آسماں لرزتا

انصاف سے صاف گدگرا ظلم　　انصاف کو چھوڑنا بڑا ظلم

اخوت باہمی سے

جو غیر کوں آپ کر پچھانے　　ادکیوں کرے دشمنی دوانے

اعتدال اخلاق سے

سب کھائے جو نرم پانے تجکوں　　جوں کاٹ گوں گھن بڑاے تجکوں

انسان روٹی کے لئے ذلیل وخوار ہوتا ہے سے

بھوتوں سی نظر کئے ہیں نیچے　　یوکاک کباب ہوا کلیجے

ادب سے

ہے یوادب آدمی اُپر فرض　　گرنیں ہے ادب تو دابۃ الارض

غیر کا سہارا سے

ہے دل میں سدا جو آس جس کی　　یوآس ہے آس پاس جس کی

اسکوں نہ خدا ہے نہ نبی ہے　　مردار، ملول مطلبی ہے

غرض من لگن نہ صرف اسرار ومعارف کا گنجینہ ہے بلکہ سماجی داخلاقی سبق کا بھی مجموعہ ہے ۔ فرماتے ہیں کہ حقیقی مسلمانی خدا کا عشق و سوز، عرفان، راستی اور نیک نیتی کا نام ہے ۔

الفاظ سازی:۔ عربی فارسی ترکیبیں، امرکن۔ خمرکن۔ علیکی۔ نقیر لاموت، ریاضتی رنگ۔ ہزارہ کاتب۔ ہزار بات، یک حرف لک حرکات، برق دار، ایک بات لک چمن ودیلی۔ دورنگی، دوراہی وغیرہ۔

ہندی۔ گیان گھر۔ سگھڑ سلچھن۔ تیرٹے گن۔

جنتر کار، سلون سنگھار۔ کوڑی کے تمن، تحشر تمن ۔ کارن، مہا کارن، شاہ کارن، من ٹھن، وغیرہ۔

محاورے :۔ چاول چبانا، تیرنا ڈوبنا۔ چار کی تیوری ۔ خاک پھانکنا۔ سوت کو کپاس کرنا۔ دھک بننا۔ اسم تصغیر، غریب ٹا۔ نیک سے نیکے نیکے۔ نیند ڑی، خاص ہندوستانی الفاظ :۔ لتاڑنا ۔ لاڈنے جوڑتے ۔ اتاولا۔ نگوڑی، پُچھب۔ وغیرہ۔ ان کے کلام میں خصوصاً اس مثنوی میں بہ نسبت دکنی ہندی کا عنصر غالب ہے

شاہ طاہر کرنولی

کرنول (دکن میں) ایک بزرگ شاہ طاہر کرنولی ثم ادھونی (ضلع رائچور) گزرے ہیں، جو سید شاہ عبداللطیف لاابالی حموی المتوفی ۱۰۵۹ھ / ۱۶۴۹ء کے صاحبزادے اور حضرت غوث اعظم کی اولاد سے تھے۔ شاہ طاہر تقریباً ۱۰۳۱ھ / ۱۶۲۱ء میں عہد محمد عادل شاہ بیجاپور پیدا ہوئے اور ۱۱۱۵ھ / ۱۷۰۳ء میں وفات پائی۔ باخدا پیوستہ شد، شہر خدا، سال وفات ہے۔ آپ فاضل اجل تھے، روحانی کمالات میں ۱۱۱۵ھ
فرد الفرید۔ بڑے قانع، متوکل اور بے باک اور حق گو سدی مسعود خاں حاکم ادھونی، اور وزیر عادل شاہیہ آپ کا مرید باخلاص تھا۔ جس کی وجہ سے آپ ادھونی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ نواب غازی الدین خاں، شہزادۂ اعظم، وبرخوردار خاں عالمگیری سے خط کتابت رہی، شہزادہ اعظم سے

سخت اصرار کے سبب بحالت مجبوری کہ وہ سخت بیمار تھا ملاقات کی مہمان رکھا، اور بعد صحبت رخصت کیا۔

آپ کی تصنیفات میں کنز اللطائف (فارسی) فقہ میں دوسرے خوان نعما یعنی نصاب الصبیان، بغرض تعلیم فرزند سیدی مسعود خاں لکھا تھا[1] نیز مکتوبات منظوم اور کلام فارسی بھی ہے۔

---

[1] فارسی زبان میں نصاب ابو نصر فراہی نہایت مشہور ہے جس کے تتبع میں بیسیوں نصاب بغرض سہولت طلبا تدوین ہوئے۔

اردو زبان میں خالق باری یا حفظ اللسان مولفہ ضیاالدین خسرو تالیف ۱۰۳۱ھ سوا ھدیاری تالیف ۱۰۴۱ھ اور فرح صبیان مولفہ مولانا اسحق لاہوری تالیف ۱۰۵۷ھ وغیرہ ہیں۔

مگر سب سے قدیم نصاب نصاب اجے چند ہے (۹۹۶ھ)۔

آصف خاں خاں ثالث المتوفی ۱۲۰۱ھ نے بھی ایک نصاب قلیۃ الغتیان لکھا تھا، جس میں ہندی الفاظ بھی ملتے ہیں۔

ہم کو یہاں صرف "خوان نعما" یعنی نصاب صبیان سے بحث ہے۔ یہ نصاب بزمانہ سلطان سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳ تا ۱۰۹۷ھ) اور سلطان ابوالحسن تانا شاہ ۱۰۸۳-۱۰۹۸ھ مدون ہوا جن کا ذکر موٴلف نے اس نصاب میں کیا ہے۔

اس میں جملہ چھ قصائد ہیں، جنکے عنوانات یہ ہیں۔

۱ - بحر فرات - ۴۷۱ بیت
۲ - بحر نیل - ۲۹۷ "
۳ - بحر ذخار - ۱۱۵ "
۴ - بحر اتور - ۱۰۱ بیت
۵ - بحر عمیق - ۱۳۲ "
۶ - بحر زلال - ۲۲۷ " جملہ ۱۳۷۶ ت۔

ابتدا ــــ

از بعد اسم خالق و نام رسول گفت — ایں طاہر شکستہ دل شکر و لساں
ایں جامۂ شکستہ دسر داد رختہ — ہندی ز فارسی پئے اطفال و کودکاں
دیدم نصاب دانش خود گوھر دری — دادم پئے زکوۃ چنیں بود رایگاں
ہیچو اک عربیے لغت از تازی و دری — از نطق، اہل ہند نشیتم ترجماں
تا اہل طبع پاک دل و صاف سینہ را — آساں بود چہ کانہ و معنی و لفظ آں

وجہ تالیف ــــ

دیں خوان را بگاں پئے معانہادہ ام — نے بہر منعلیئے تاراج مفلساں
نے نے برائے خوش خلف خان اعظم است — درویش شہ نشان و گدا لیش تونگراں
ہر بیت و مصرعیت شکر رگ دگلشکر — کاب آید از خودی و بانش درد باں

حال دلا بر گز مدہ دل وست ایں شہندہ زال
سر د گر و پیے گماں بالفور دو دن کا ابال

گینی دو دن کا مدن بازیگراں کا کھیل ہے — کار عقبیٰ پیش گیر دچھوڑ دے جو پھیر چال
شک دنیا کے عیش کا مجز کی میٹھی نیند ہے — غافل اس ڈھلکی بدل دوزخ میں اپنے نین جال
سایہ دولت سے مٹ کا دوپہر کی چھاؤں ہے — عمر کا سورج ڈھلیا تب آپڑے گی ہو زوال

شاہ صاحب کو عربی، فارسی، ترکی، اور قدیم اردو مروجہ الفاظ پر عبور تھا مرادفات نام اجناس۔ ترکاریاں، مصالحے، سامان آرایش۔ عورت۔ موسیقی، نقایص جسمانی، اخلاقی کمزوریاں، اخلاق حمیدہ تحریر کئے ہیں۔

شاہ عبدالقادر المعروف بہ قادر لنگا کوتال رح

حضرت قادر لنگا، خواجہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری کے خلفاء میں سے تھے۔ ہندو لنگایت قوم آپ کی اب تک بے حد معتقد ہے۔ آپ نے ۱۱۲۶ھ میں عمر طبعی کو پہنچکر وفات پائی۔ آپ کا مزار قصبہ کوتال ضلع ادھونی میں ہے۔

بیاض قلمی آغا حیدر حسن میں آپ کے بعض اشعار درج ہیں — منقبت پیر امین الدین اعلیٰ ؎

شاہ امین علی پیلے مجھے تیری آس — حب محبوب ہے تیرے چرن پاس
تو سائیں میرا میں تیرا داس

بولے قادر میں تیرا کمین بندہ — تس دن لاگیا ہے مجھے تیرا دھندا
میں تیرا چکور توں میرا چندا

شیخ داؤد ضعیفی

شیخ صاحب بیجاپور کے مشہور شاہ حضرت حسینی المتوفی ۱۱۰۷ھ کے مرید تھے
کہتے ہیں۔ بڑے بخت میرے جہانگیر ہیں ۔ کہ حضرت حسینی میرے پیر ہیں۔۔
فقہ میں آپ کی کتاب ہدایت ہندی ضخیم ہے جسکے بائیس باب ہیں اور عالمگیر کی
مدح بھی کی ہے۔ سال تصنیف ۱۱۰۱ھ ہے۔ ایک قصہ عشق صادق بھی مختصر لکھا ہے
ان کی بعض غزلیں بھی ہیں ہدایت ہندی کا مخطوطہ آصفیہ میں موجود ہے جس کا رنگ ناصحانہ
و صوفیانہ ہے۔ مگر ان کی ایک خاص تصنیف نقل نامہ یا نصیحت مدن ہے۔ جس میں
عورتوں کے معاشرہ کے متعلق انمول نصیحتیں درج ہیں۔ شاہ راجو گولکنڈوی کے
سہاگن نامہ کے بعد گویا یہ دوسری تصنیف عورتوں کے لئے ضعیفی نے لکھی جس کے
ساڑھے تین سو ابواب ہیں۔ ایک مختصر قصہ منظوم کفن چور کا بھی لکھا ہے۔ جس کا
ایک مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ میں ہے ۔

نصیحت مدن کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

اتیا میں کروں نیک ناری کو پند — ہے بی بی جو کوئی ست کی ساری گوں بند
بولیا بول سن رے سہاگن سکی — اگر تو ہے گنونت بھاگن سکی
کہوں میں سبے تجے نیک بی بیاں کے گن — تو دل جیو کے کاں سوں خوب سن

ضعیفی کی کچھ غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ دو ایک اشعار یہ ہیں ؎

سیئا سدا سبحان کا جینا ہے لک کر ناچ ہے
بندا ہو بالغ ہوتے پر بندگی میں پک دھر ناچ ہے

ادن گن زبان کا سن گن بھری — سنگی تو بی بیاں میں ہو کنگی کھری
بی بیاں میں جو کوئی پاک بی بیاں امیل — بزا ادن کے سوں میں نہیں قال قیل

سنی بھاگ دنتی بچن کی توں بات — اپنا کوں تجے سن نین کا نکات
جو کوئی جم ہے نیک زنیاں منے — حیا شرم ہے ادن کے نیناں منے

عورتوں کے سرنا صحانہ انداز پر اثر ہے سہاگن۔ گنونت۔ بھاگن۔ ست کی ساری۔ گن بھری
زن کی جمع زنیاں۔ نیناں منے کا حیا شرم ہے اون کے نینا منے۔ دلکش اور
منتخب الفاظ ہیں۔ زبان قابل فہم ہے۔ بعض عربی ترکیبیں بھی استعمال کی ہیں [1]

شاہ معظم بیجاپوری

شاہ معظم، معظم تخلص، آخری، دور عالمگیر کے دکنی شاعر تھے، اور حضرت
قادر لنگا کو تال خلیفہ حضرت امین الدین اعلیٰ بیجاپوری (۱۰۸۶ھ) کے مرید تھے۔
معظم کی تاریخ ولادت اور وفات نہ مل سکی۔ ان کی تصوف میں کئی مثنویاں ہیں۔
گنج مخفی تقریباً ایک جزو، رسالہ وجودیہ ڈیڑھ جزو، شجرۃ الاتقیا، تقریباً ڈھائی جزو۔
اور گلزار چشت، ایک منظوم تذکرۂ اولیا ہے۔ اس میں مشاہیر اولیا، خلد آباد اور
اورنگ آباد گلبرگہ شریف و بیجاپور کے مختصر مختصر حالات قلمبند کئے ہیں۔ شاہ معظم
کا ایک مختصر اردو دیوان بھی ہے جس میں تقریباً چھپن غزلیں ہیں بلحاظ زبان و طرز ادا

---

[1] مخطوطہ ۲۲۷ آصفیہ

محمود بحری اور ولی گجراتی کے معاصر ہیں۔ بہ نسبت بحری کے زبان صاف ہے گئی ہیں

بعض اشعار یہ ہیں ؎

عجایب آج کی شب مجتے سجن چو سار آیا تھا۔ میرے دل کے دلاسے کو ہیں دلدار آیا تھا

صراحی مے سوں پر کر لیا تھا ہات میں اپنے مجھے بھی مست کرنے کو نپٹ سرشار آیا تھا

نعت ؎

یوں اپنا اوس کو معراج دیا لولاک کیسا سر تلج دیا

سب امت نی رد لاج دیا یوں حق نے اوس پر پیار کیا

ہے نازیک بلا اور سرلی لا آنکھاں میں ــــ

غمزہ تو یک بلا تھا تس پر نظر بلا

اتا سینے کے صفحے پر سدا تصویر لکھتا ہوں

دنیا کے مکر کرنے سوں مجھے لو کام خوش لگتا

مرشد قادر کی تلمیح ؎

بزرگی اسم اعظم کی کہا قرآن میں لیکن

معظم کوں ورد کرنے، سو قادر نام خوش لگتا

معظم کا ایک قلندر نامہ انجمن ترقی اُردو (کراچی) کے کتب خانے میں ہے۔

ساتواں باب

اردو نظم دکن میں ـــ قطب شاہی

ملا حسین طبسی گولکنڈوی۔ سلطان قلی قطب شاہ (۹۲۴/۹۵۰ھ) کے دربار کا ایرانی عالم اور سلطنت قطب شاہیہ کا قاضی القضاۃ الملقب بہ صدر جہاں تھا، سلطان قلی کے حضور میں اس کو بے حد رسوخ حاصل تھا، بادشاہ اپنی زندگی کے گذشتہ واقعات اس سے بیان کیا کرتا تھا، جس کو سن کر اس نے اپنی ایک تالیف مرغوب القلوب میں قلمبند کیا تھا جو اب نایاب ہے۔ اس کے اقتباسات تاریخ قطب شاہی میں جو سلطان محمد قطب شاہ (۱۰۲۰/۱۰۳۵ھ) کے حکم سے لکھی گئی تھی موجود ہیں۔

طبسی کی ایک اہم کتاب صیدیہ یا شکار نامہ قطب شاہی جس میں، حلال و حرام جانور، ذبیحہ، کے احکام ازروئے شرع

وفقہ حنفی و حنبلی، شافعی، اور شیعی مستند کتب سے مدون کئے گئے ہیں
اور ہمارے نقطہ نظر سے اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں، پرندوں
اور جانوروں کے عربی، فارسی ترکی کے علاوہ دکھنی نام بھی ہیں اور بعض
ایسے جانوروں کے نام دیئے ہیں جو خاص دکن تلنگانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔
طبسی بادشاہ کے ساتھ سیر و شکار میں ہمرکاب رہا کرتا تھا۔ اس خشک
کتاب کو دلچسپ بنانے میں اس نے، شکار اور جانوروں اور پرندوں
سے متعلق دلچسپ قصے بھی بیان کئے ہیں جس سے اس بات کا
تو پتہ چلتا ہے کہ قطب شاہ بانی سلطنت قطب شاہیہ اور ابراہیم
قطب شاہ کے زمانہ میں قدیم اُردو رائج تھی اور یہ عوام کی بولی تھی
اور ایرانی علماء و فضلاء بھی اس سے روشناس تھے۔ چند نام درج
ذیل ہیں۔ کہتا ہے :۔

باشہ :۔

" باشق را بفارسی و دکھنی، " باشہ گویند و ترکی
ترقو خوانند (ورق ۷) باز در ولایت دکن و گجرات
و تلنگ و بیجانگر نیست ا۔" باشہ " بسیار است
و باشہ کہ در شکار خانہ نواب کامیاب بود یک روز
ہشتاد دراج گرفت "۔

بنارس :۔ (بنارسی)

" لفظے است دکنی و نام جانورے ست پرندہ

بزرگ محبل ماہی خوار۔ منقار و سر و گردن و ہر دو
بال و دم، نیمہ پشت رو سیاہ ہی است و پا یہاے سرخ
و باقی اعضار سفید در ولایت تلنگ بسیار است
و از جانوران شکار شکارے غیر بجری اوراً نمی تواں
گرفت و ہر بجری کہ بنارسی گرفت در میان بجریہا
امتیازے تمام دارد۔"

ترم تی:۔ فارسی و ترکی، (دکنی) مادہ، تونہ، مادہ ترمتی (دکنی)
روباہ :۔ (فارسی)، تلکی (ترکی) (لومڑی دکنی)
جاموس:۔ فارسی و ترکی، گاؤمیش، دکنی میں کلگہ۔ یعنی (کھلگا)
بزاز :۔ بلغ (فارسی)۔ جرد وک (ترکی)، تیدہ (دکنی)، (بنڈا)
حمار :۔ خر (فارسی)، ترکی میں اشک، گدہ (دکنی) گدھا
حمام (۶) کبوتر (فارسی) کارکاجی (ترکی)۔ کوتر و کبوتر (دکنی)
ذباب: (۶) مگس (فارسی) جبن (ترکی) مکی (دکنی) (مکھی)
ذیب (۶) خبر جنگ (فارسی) ایلاں کنج (ترکی)، لانڈگ (دکنی) بھیڑیا
چنت (۶)، سوسمار (فارسی)، کجی امل (ترکی) گھورنپڑ (دکنی) گھوڑپھوڑا

غرض صدر جہاں طبسی نے اس قسم کے تقریباً پچہتر نام کئی لکھے ہیں۔
صدر جہاں طبسی، شیخ بدرالدین ملتانی وفات (۹۸۱ھ) کا معاصر تھا
آخر الذکر سے ایک مذہبی مباحثہ ہوا تھا اور وہ آپ کا معتقد
ہو گیا تھا۔

محمد قلی قطب شہ

سلطان محمد قلی قطب شہ ابن ابراہیم قطب شہ ۹۷۳ھ میں پیدا ہوا۔ وہ تاریخ ولادت "باعث روزی اہل عالم" ہے۔ تعلیم و تربیت ۹۷۳ھ
اچھی پائی محمد قلی بعمر ۱۶ سال ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوا۔

محمد قلی کا زمانہ سلطنت قطب شاہی کے عروج کا زمانہ ہے۔ جہاں بڑے بڑے علماء فضلاء اور مدبر سلطنت مثلاً میر مومن استرآبادی مرزا محمد امین المخاطب بہ جملۃ الملک وغیرہ جمع تھے۔

غرض سلطان کی تدبر اور فراست اور باہمی رواداری سے دکن کے تمدن میں بڑی ترقی ہوئی۔ عالیشان عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ جن میں چارمینار۔ چارکمان۔ جامع مسجد (مکہ مسجد) عاشور خانہ۔ حیدر محل دارالشفاء (جنرل اسپتال) وغیرہ یادگار ہیں، اور چارمینار تو ہندو مسلم کلچر، اور اتحاد کا نشان امتیاز ہے جس میں مسجد و مندر دونوں موجود ہیں۔

اس نے بعمر ۴۹ سال ۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۰۲۰ھ میں وفات پائی۔ مدفن مقبرہ قطب شہ لنگر حوض حیدرآباد۔ محمد قلی قطب شہ کے درباری شعراء میں وجہی نے اس کے عشق و محبت کی داستان بھاگ متی کا قصہ "قطب مشتری" کے نام سے لکھا تھا۔

محمد قلی قطب شہ قدیم اُردو کا زبردست شاعر تھا۔ اور وہ سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر ہے اس کے قبل کسی شاعر کے دیوان کا پتہ نہیں چلا۔ البتہ چیدہ چیدہ غزلیں دستیاب ہوتی ہیں۔ اور مسٹر سکسینہ کی رائے بھی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ محمد قلی قطب شہ کے قبل بہت سے شاعر گذرے، ورنہ محمد علی قطب شہ کے کلام میں وہ سلاست وروانی پیدا نہ ہوتی۔

دیوان محمد قلی قطب شہ کی ترتیب فارسی دواوین کی طرح بلحاظ حروف تہجی نہایت سلیقہ سے کی گئی ہے جس میں جملہ اصناف سخن موجود ہیں۔ غزل، قطعہ، رباعی، قصیدہ۔ مثنوی۔ مرثیے۔ جن کا موضوع ہندوستانی، ملکی میوے ترکاریاں، پرندے، رسم ورواج ہندومسلم رسومات شادی وغیرہ ہے

محمد قلی قطب شاہ کا کلیات چھپ چکا ہے۔

خصوصیات کلام:۔

عاشقانہ وصوفیانہ رنگ، سادگی، شیرینی اور گھلاوٹ حافظ شیرازی کی غزل کا ترجمہ ہے ؎

یوسف گم سو کہ آ گا اب بکنعاں غم نکھا
گھر ترا امید کا ہوگا، گلستاں غم نکھا

محمد قلی قطب شہ کی مشہور غزل ہے ؎

پیا باج پیالا پیا جائے نا ۔۔۔ پیا باج یک تل جیا جائے نا

مگر یہ غزل غواصی کے دیوان میں موجود ہے۔ اگر محمد قطب شہ اس کے بھتیجے نے اس کا دیوان اپنی خاص نگرانی میں احتیاط سے مرتب کیا ہے تو یہ غواصی کی نہیں ہو سکتی۔

حافظ شیرازی کے رنگ میں کہتا ہے ؎

پلا ساقیا مج کوں مستانہ مے
کیا ہے بجوت گرم چنگ ہور نے
جکے عشق کوچے میں ہے سلطنت
نہیں دیکھیا ہے کد ہیں اکو کے
سدا بھولیں اور مد سے مجے
نہیں ہے خماری کبھیں ہور مے

۳

میرے خیال کھیل پر ہنستے ہیں نا قلاں سدا
جانو نہ جانو کھیل گج کھیل پیا کے سور کر
بیہوش میرے دل کوں میٹھے ادھر جلاۓ
گلزار ہے عجب او دو لعل شکرستاں

۴

سمدور ہے یک ہور ندیاں ہیں سو ہزاراں
باتاں سو کروڑاں ہیں دلے نیک رسن ہے

سنج عشق کیری آگ کا یک چنگی ہے سورج
اس آگ کے شعلہ کا دھواں سات گگن ہے

کونلی ڈالی کوں لگے پھل رنگ رنگ
اس پھلاں سیتی طرہ گند نا ہوس

مدن مست، بدل مست، کنجن مست پری ست
ہوئے مست، پون مست، لگن مست پری مست

نادر تشبیہ :

نین دریا میں ابلے ہیں موتی
عشق گرڈی بکاوے ہات ہات

سندر کے اُدھریں شکر تھے اَلَذ
ترے بوسے نابات ترتے الذ [1]

عہد بہمنیہ کا ایک قدیم شاعر مشتاق تھا۔ اس کی طرح میں محمد قلی قطب شہ ($\frac{۹۸۸}{۱۰۲۰}$) ھ کا بھی قصیدہ ہے۔ مشتاق کا مطلع یہ ہے

قیض کا ساقی دیا دل کے تیں حب کا شراب
طبع دیا ہو نسیم فہم کے گل کوں شباب

---

[1] : لذیذ سے الذ افعل التفضیل

محمد قلی شاہ ؎

آج شہ چیں چلیا، شرق نگر تھے شتاب
ڈھال فلک کی اچا اوشہ عالی جناب

مشتاق ؎

راز کا شاہد سنور شوق کے زیور ستی
ناز و کرشمے سوں آ غمزے کا کھولیا نقاب

محمد قلی ؎

ذرے جو فراش شب چلے شہ چیں آگے
دیتے سراچے شفق، لاامے زریں نقاب

بعض دوسرے شعراء کی محفل میں۔ محمد قلی قطب شاہ ملاحظہ ہو۔

نطقی بہمنی کہتا ہے ؎

چار پہر با نزاع لو بچہ رہیا تھا مسا
ماہ ختن بر خطا ترک خطا بر ختن

خواجو کرمانی ؎

زد شب زنگی نژاد از پے تسخیر ملک
خیمہ مہراج زنگ برد شاہ ختن

محمد قلی ؎

شاہ ختن سن چلیا، غرب نگر تھے لے فوج
تنکے تناریں رنگ جیسے اہے مشک ناب

جس سے پتہ چلتا ہے کہ محمد قلی قطب شہ نے اپنے متقدم شعرا
مشتاق، لطفی اور فیروز (۹۷۲ھ) کی پیروی کی ہے۔
چنانچہ آخر الذکر کی تعریف میں تو وجہی، رطب اللسان
ہے، اور اُس کو استاد مانتا ہے۔
محمد قلی کی نیچرل شاعری کا رنگ یہ ہے:۔

برسات:۔

پلا ساقی مے ہور خوش سیتی ناچ
ہور سبز و خرم ہور جیسا پاچ
تمن شوق کا نین سے میگھ چوے
لے باتاں نہیں جھوٹ تم دیکھ ساچ
معانی علی دم تھے خوش ہے ہو
کہو سطریاں کوں بجاؤ کماچ

٭

کونلی پیاری ؎

تازگی تھے تازہ چنچل آئی میرے در منے
بیل کونلی، سبز انچل، پھول جیغہ بر منے
کونلی پیاری، پہلی باری داد سباری، داد سول
نین ناری رنگ دھاری مدخاری بر منے

نیہہ رہن کا، نار ٹھن کا، پاؤں جھنکا یوں سہی
آس من کا عیش تن کا ذوق گن کا برمنے
اے معانی تیری مانی سب میں سیانی نار ہے
بھید جانی نہ پچھانی تخت رانی گھر منے

۳

احمد۔ گولکنڈوی

شیخ احمد نام، احمد تخلص، ابن نشاطی نے اپنی مثنوی '' پھولبن '' تصنیف ۱۰۶۶ھ میں اس کی تعریف کی ہے اور استاد سخن مانا ہے۔

احمد قلی قطب، شاہ کا درباری شاعر تھا، جس کا اشارہ اس نے حسب ذیل اشعار میں کیا ہے۔

محمد قلی قطب، شاہ شہاں
جسے چرن سیوک ستہاں جہاں

اور سلطان مذکور ہی کے اشارہ سے مثنوی لیلیٰ مجنوںؐ لکھی ؎

جو منج بخت کوں فتح یاور ہوا
سو منج بخت کا سیوک انبر ہوا

جو شہ آپ تھے آپ منج یاد کر
منج غم کی بندگی تھے آزاد کر

دسیۓ امر علی کی یہ باغ لاؤں !
جو پاؤں اسے شہ امریت ناؤں

جو میں شہ کا امر سر پہ لیتا،
ترت باغ لانے شتابی کیتا

جو احمد کرے اس دِھر، بن سنگار
سو اب شہ تھے پلئے ستیں سنگار

؁

اس مثنوی کا ایک نامکمل مخطوطہ دانش گاہ پنجاب میں محفوظ ہے جس میں (۵۴۰) پانسو چالیس ابیات ہیں۔

اسلوب بیان:-

مجنوں کو اُس کے باپ کی نصیحت ؎

کیا پوت کا اُسکر دِکھن آس مو
رہیا پوت سے دکھ سوں نراس ہو

تری آگ تھے جیو میرا جلے
(دیے)
تری آہ تھے موم ہو تن جلے

کیتا توں جلے ہور جانے منجے
تیا کیا گلے ہور گالے منجے

جو توں ہے پیارا تیہا منج کوں
ہنسوں (تا) کیوں جو روتے دیکھتیں کوں (مجھ)

میرا جیو ہے توں مرے لاڈے
جلے جیوں جس کا سر کیوں نہ جلے

رکھیا آس جو توں بساوے تل
نجانیں کہ تیرا یو رہتا وسے جنگل

جو گھر چھوڑ جنگل میں نے لیا
سو تج تھے جنگل ہور جنگل بھی ہیا

٭

وجہی، گولکنڈوی

وجیہہ الدین محمد، وجہی، قطب شاہی دور کا باکمال شاعر اور نثر نگار، نیز موجودہ تحقیقات کی رو سے فارسی کا بھی خوش گو شاعر تھا۔ اس کا فارسی دیوان بھی موجود ہے۔
وجہی نے سلطان ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ۔ چار سلاطین قطب شاہیہ کا زمانہ دیکھا ہے۔ اور آخرالذکر سلطان کے زمانہ میں وفات پائی۔ تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔ وجہی کو

عربی، فارسی اور قدیم اُردو پر کامل عبور تھا، تصوف کے بھی بڑے ماہر تھے۔ قصۂ حسن و دل "سبرس" میں اور "تاج الحقایق" میں عرفان کا دریا بہا دیا ہے۔

جدید معلومات یہ ہیں کہ وجہی کو دربار قطب شاہی سے وظیفہ سالیانہ مقرر تھا جو اس کی بسر برد کے لئے کافی نہ تھا اور وقت پر ایصال نہ ہوتا تھا۔

ایک قصیدہ میں بادشاہ کی علما نوازی و ہنر پروری کی اس طرح تعریف کی ہے ؎

بادشاہ جہاں، جہاں پرور
ظل سبحان و ذات پیغمبر
تیر اسلام را نشاں بخشد
تیغ دیں را بود عطا گوہر
تو سراپا تمام آئینہ
خوش تماشا شدی بخود بنگر
دوستدار تمام اہل علوم
دستگیر جمیع اہل ہنر

وجہی نے اپنا تخلص وجہی اور وجیہی دونوں طرح استعمال کیا ہے، جس کی تصدیق مقدمہ مولوی عبدالحق

متعلق مثنوی قطب مشتری اور غواصی کے حسب ذیل
شعر سے ہوتی ہے ؎ ۔

ہے غواصی ہور وجہی شاعر جانز جناب

وجہی کے ایک فارسی شعر سے جو اس کے فارسی دیوان میں ہے
اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس کا نام اسد اللہ تھا ؎

اسم اسد اللہ و وجیہہ است تخلص
آرایش دکانچہ بازار کلام است

مگر بعض کاتبوں نے اس کا نام وجیہہ الدین محمد لکھا ہے۔
ممکن ہے کہ اس کا اصلی نام اسد اللہ لقب وجیہہ الدین
محمد ہو اور تخلص وجہی (وجیہی) اور وجیہ تھا۔

فارسی شاعری میں بھی اس کا پایہ بلند تھا خود کو خاقانی
سے برتر سمجھتا ہے۔ اور کہتا ہے ع

وجیہہ جائے تو بالائے دست خاقانی ست

اور یہ وجیہہ یا وجیہی دکن (ہندوستان) کا باشندہ ہے ؎

شرمندہ بتانم ازیں بے زری وجیہہ
کس حال من بشاہ دکن گفت یا نگفت

عالمی را می کنم شاگرد از اعجاز طبع
وجیہیا استاد اگر روح آلایں باشد مرا

یہاں وجہی کے صرف اردو کلام اور کارناموں سے بحث ہے۔

تصنیفات :-

وجہی کا پہلا کارنامہ دکنی زبان میں مثنوی قطب مشتری ہے۔ جو شاہزادہ یعنی اواخر عہد محمد قلی قطب شاہ میں تصنیف ہوئی جو سلطان محمد قلی قطب شاہ کی داستان عشق ہے۔ اور یہ خود اس کی دماغی پیداوار ہے۔

شہزادہ خواب میں ایک حسین جمیل دوشیزہ کو دیکھ کر باجازت والدین عطارد نقاش کو لے کر تلاش محبوب میں نکل جاتا ہے۔ شہزادہ اور عطارد بنگال جاتے ہیں جہاں مشتری ایک باغ میں رہتی ہے۔ عطارد وہاں محل میں نقاشی کے جوہر دکھاتا ہے اور چالاکی سے شہزادہ کی تصویر کھینچ دیتا ہے جس کو دیکھ کر مشتری عاشق ہوجاتی ہے۔ اور عطارد مشتری کو شہزادہ سے ملا دیتا ہے۔ اور دونوں گولکنڈہ آتے ہیں۔ جہاں دھوم دھام سے شادی ہوجاتی ہے۔ مریخ خاں کی اس کی بہن سے شادی ہوئی ہے اور بنگالہ کی حکومت مریخ خاں کو دے دی جاتی ہے۔ قصہ قدیم طرز کا ہے۔ وجہی نے اس میں بعض جدتیں پیدا کی ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں در پردہ محمد قلی۔ اور بھاگ متی طوائف کی عشقیہ داستان ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کی رائے ہے کہ بلحاظ واقعات بھاگ متی سے اس کا

کوئی تعلق نہیں، گویا ایک فرضی قصہ ہے۔ وجہی کا مقصد "بادشاہ کے حسن و جمال، شجاعت اور لیاقت کی تعریف کرنا ہے اور بس"۔ جس کی تائید پروفیسر تاریخ ہارون خاں شیروانی نے بھی کی ہے۔

وجہی کا پایہ خصوصاً نثر نگاری میں بہت بلند ہے۔ غزل گوئی اور مثنوی نگاری میں بھی کچھ کم نہیں۔ مگر قطب مشتری اعلیٰ پایہ کی نہیں۔ ڈھائی ہزار بیت صرف بارہ دن میں لکھے ہیں۔

باغ کی تعریف :-

یکایک دسیا ایک نزدیک باغ
ہوا اس کے باساں (خوشبو) تے تر سب دماغ
کہ پاتاں کے پردیاں کو سب پھاڑ کر
پھلاں جھانکتے تھے سراں کاڑ کر
سروداں سو مرغاں کے نالے تھے دار
صریاں کلیاں، چو پیالے تھے ڈال
سو رنگ سانولے خوب پاتاں بھرے
ندیم ہو کے بلبل جو چالے کرے
سو طاوس، پنکھی، طوطی، کبک ہنس
پکڑ پیٹ لڑنے لگے ہنس ہنس

دایہ کی نصیحت مشتری کو

تو چنچل چت نارا تنی سی ہے۔
بڑی چھند بھری بھوت فتنی سی ہے
یو کیا اب عشق جو توں کری
بھلی ہے توں شاباش جو نیں ڈری
پرت پنت میں تو لوی آئی ہے
اجھوں نیہ کے چڑکے نہیں پائی ہے

جو عاجز ہو دکھلائے عاشق نیاز
تو معشوق کرتا ہے تیر تیج ناز
کہ خوباں میں عادت سوا اس دھات ہے
چھپی نیں سب مشہور یہ بات ہے

مشتری کی بیتابی اور فریاد

کہاں ہے وہ لالن میٹھی چال کا
کہاں ہے وہ ساجن سلینے بال کا
کہاں وہ جتہر چھیلا من ہرن
کہاں ہے وہ سگھرا چیلا ہے جن
رتن تھے سو تن پر انگارے ہوئے
(جواہرات)
کہ مکھ چاند انجھو ستارے ہوئے

بعض نادر تشبیہات :-

ہوئی سار شب انگ ہر دو بار
دھویں میں اچھیں جیوں چمکتا انگار

پدم جگمگے جوت سوں ناگ پر
کہ طاؤس بیٹھا ئمر کاگ پر

اچھلتیاں ہیں بجلیاں تلیں
کہ نیناں چمکتے ہیں بالاں تلیں

روزمرے دکنی محاورے :-

یو کاں کا سگا ہور وہ کاں کی سگی
کدھر کی کدھر دستی آلگی

پیالا نہ واں آپ بھاتے پیے
ضرورت کوں شہ انمنا تے پیے

وجہی کی کئی غزلیں نایاب ہیں، ایک نایاب غزل جو ہم کو دستیاب ہوئی ہے درج ذیل ہے[1]

وجہی سہ :

ہوا ہوں بے خبر میں یوں، خبر نیں منجہ منیں دھڑ کا
برہ کے آگ سلگا نا اوٹھیا ہے من سنے بجھڑ کا

---

[1] مخطوطہ دیوان شاہی - انجمن ترقی اردو - کراچی -

جفا سوں پھر موا ہوں میں ترے در بار کن آکر
کفن دے ہنج کوں اپنا انچلی کا پھاڑ کر پھڑکا
رگے رگ میں کیا جاگا ترے غم سے جو یوں آکر
زمیں میں جو سچل ہو تا سو چوندھر جھاڑ کے چڑکا
سکی تجہ برہ سے رو رو لکیاں رخسار پر میرے
کہ یوں جوں آب پر دیکھ ندی کا کاٹ کر کڑکا
وجہی یو عشق بازی تو لگے ہے اک بیکساں سوں
نکو کر توں ہوس اس کا کہ تیرے پاس تیں اڑکا

وزن شعر کی پابندی نہیں، حالانکہ دکھنی اور اردو شاعری فارسی کا چربہ ہے، بحر اور اوزان ردیف قافیے سب میں فارسی کی تقلید ہے، اور شعراء عربی و فارسی صرف و نحو اور عروض کے ماہر تھے۔ شاید دکنی لہجہ واضح طور پر ادا کرنے میں دقت ہوتی ہو۔ چنانچہ دکنی املا، مخرج کے لحاظ سے عقل کو اکل خارج کو خیر نز۔ عطارد کو عطارید۔ بغیر کو بغیر وغیرہ — کہنے کو کے۔ جکو، اہل زبان بھی بولتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی وجہی باکمال شاعر ہے۔
مثنوی قطب مشتری کے دو اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ

عبداللہ مرزا۔ المخاطب بہ عبداللہ قطب شاہ ابن محمد قطب شاہ ۱۰۲۳ھ میں پیدا ہوا
نظام الدین احمد نے قطعہ تہنیت لکھا آخری مصرع تاریخی یہ ہے۔ باحسن آمد و شان سکندری (۱۰۲۳ھ)
قطب الدین نعمت اللہ، مرزا شریف شہرستانی اور خواجہ مظفر علی نے تربیت کی۔
بارہ سال کی عمر میں ۱۰۳۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ بوجہ کم سنی اس کی ماں حیات بخش بیگم نے نظم و نسق سلطنت سنبھالا۔
عبداللہ قطب شاہ کو امور سلطنت میں زیادہ دلچسپی نہ تھی، جنگ کے نام سے نفرت تھی۔ ہمیشہ عیش و عشرت اور سیر و تفریح میں گزری۔ وزرا قابل اعتماد نہ تھے نتیجہ یہ کہ مغلوں سے دب کر صلح کرنی پڑی اور معقول پیشکش مقرر تھی۔ سلطان تمام مذہبی رسوم میں شریک رہتا تھا۔ اور محرم میں مجالس عزا زور شور سے منعقد ہوا کرتی تھیں۔ عبداللہ قطب شہ نے بتاریخ ۱۳ محرم ۱۰۸۳ھ بعمر ۵۹ سال وفات پائی۔ تقریباً اڑتالیس سال حکومت کی۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ نہایت علم دوست اور علمار فضلا اور شعرا کا قدر دان تھا۔ علامہ ابن خاتون، تلمیذ شیخ بہاز الدین آملی۔ مترجم اربعین۔ ومحشی جامع عباسی، علی بن طیفور، ملا فتح اللہ سمنانی، مترجم روض الریاضین امام یافعی، ملا نظام الدین احمد مولف تاریخ حدیقۃ السلاطین۔ دکنی شعرا میں وجہی و غواصی و افضل گولکنڈوی، ابن نشاطی۔ میراں جی، خدا نما وغیرہ اس کے درباری علمار شعرا تھے۔ سہ شنبہ عام تعطیل کے دن مجلس مشاعرہ بھی منعقد ہوا کرتی تھی۔

سلطان عبداللہ بھی زبان اُردو کا صاحب دیوان شاعر تھا۔ جس کا ایک مخطوطہ سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے۔ اور "مجلس اُردو مخطوطات" نے شائع کردیا ہے۔ جس کے تقریباً آٹھ سو بیت ہیں۔ اور صرف غزلیں ہیں، بعض رباعیات بھی ایک بیاض قلمی میں نظر سے گزری تھیں۔

مطلع دیوان عبداللہ قطب شہ ؎

دلا حق کی طرف ہو کر حق آرام دیوے گا
سعادت کی ترے بات سو انجام دیوے گا

؎

اثر عشق کا آ میرے سر چڑیا
تو میں وصل سوں برسوں لڑیا

ہوا ہوں ترے روپ پر مبتلا
تو تج سوں منجے کام آکر پڑیا

بنی صدقے عبداللہ سلطان کے
ہر اک بول کوں میں سُنتے میں مڑیا

۵

مجبوب کا سراپا:۔

گوری تنگٹ کی کسوت بھر تن گئی ہے آلا
یا سور، آ زمیں پر پایا ہے یوں اجالا

یا پھول ہیں پتیاں میں یا رات میں ہیں جگنے
یا جو ہراں کے دریا کوں آئیا اجالا

یا مکھ کمل کھلیا ہے یا چاند ہے یہم کا
یا نور کا نھسا ہے دستا عجب جمالا

یا قدسروپ ہے دو یا زلف کا الف سے
یا روپ لے لبشر کا پنجیا ہے پھول ڈالا

یا دو دسن اہیں یا یاقوت ہیں جھلکتے
یا ہیں انار دانے ایروپ بے مثالا

جو بن ہیں یا کسی سو گینداں ہیں یا جرت کے
یا پھل سنگار بن میں بارا میں ہیں اتالا

صدقے نبی کے ایسی صاحب جمال بالی
شاہ عبداللہ کو بھر بھر دیتی ہے خوش پیالا

۲

ہجر و فراق کی ایک تصویر ہے

مجھ سوں بچھڑ پیا کیوں دو تن کے آج گھر گئے
کیتے سو قول شرطاں یک بار گی بسر گئے
شیریں پیا کیاں باتاں جب یاد کر مروں گی
مجھ برھنی کوں کیونکر پیرت میں گھاں کر گئے
رو رو کے رات ساری بے سدھ ہو کر سُتی تھی
سونے میں پیو کوں دیکھی دیدے میرے اپر گئے
ایسے نصیب میرے کس کے ہنو سے جالؤ
پیو بن تمام یو دن میرے عبث گزر گئے
کیسے یو بخت میرے فریاد کس کروں میں
مجھ برھنی کے دل پہ بچھڑے کے داغ دھر گئے
سلطان عبداز کوں اے موہنیاں خبر دیؤ
درشن دکھاؤ اپنا مکھ پر قرن گزر گئے

مقام کیدار ہے

پیاری مد بھر دینا مجکوں
کھڑی کرتی ہوں منت تجکوں

ہات میں تیرے جیڈت صراحی
پیسالا بیاچ کا زنگاری
(قدیم بیاض قلمی)

۸

ملک الشعرا، غواصی گولکنڈوی

غواصی اس کا تخلص تھا، نام کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ 'انضاب الاحتساب' عربی جامعہ عثمانیہ مکتوب سنہ ۱۰۸۹ھ کا کاتب شیخ حسین بہاؤ الدین الملقب بہ غواصی ہے۔ غواصی لقب کے کسی اور شاعر کے وجود کا دکن میں پتہ نہیں چلتا۔ ممکن ہے کہ اسی غواصی کا نام شیخ حسین، لقب، بہاؤ الدین اور غواصی تخلص ہو۔

مثنوی قطب مشتری تالیف ۱۰۱۸ھ میں اس کے معاصر وجہی نے اشارۃً وکنایتۃً اس پر چوٹ کی ہے اس سے اس کی ولادت کا زمانہ قبل ۱۰۱۰ھ۔ تقریباً ۹۸۶ھ معلوم ہوتا ہے۔ جس کا اسی کی غزل میں اشارہ ہے۔

دیوان کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ غواصی

سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵/۱۰۸۳ھ) کا شاہی ملازم تھا۔
اس کے تفویض قصر شاہی کی نگرانی تھی جو اس پر شاق
گزرتی تھی۔ سلطان عبداللہ قطب شہ کے قصیدہ میں
کہتا ہے ؎

پہرے تھے نیں بہرا مجے ترتجے نیٹ زہرا منجے
کرماف یو پہرا منجے جم راج کرلے راج توں

اور استدعا کی ہے کہ مجھ کو ایک گاؤں انعام دیا جائے
تاکہ میں سکھ چین سے بسر کروں ؎

معمور ہو ایک گانوں میں جو شہ کی دولت پاؤں میں
تو سک سوں روٹی کھانوں میں جم راج کرلے راج توں

غرض اس نے رفتہ رفتہ تقرب سلطانی حاصل کیا۔
اور معتمد علیہ ہونے کی وجہ سے بطور سفارت دربار عادل
شاہی میں بھیجا گیا تھا۔ مؤلف حدیقۃ السلاطین کہتا ہے

" بعد از یک چندے ملا غواصی شاعر دکنی را
رفیق او (ملک خوشنود) ساختہ با تحفہ و یادگار
روانہ بیجاپور ساختند ... الخ

چنانچہ دربار عادل شاہی میں اس کی بڑی آؤ بھگت
ہوئی۔ دوسرے یہ کہ اس کو اس قدر تقرب حاصل تھا۔ کہ
میر محمد سعید اردستانی المعروف بہ میر جملہ کے عروج کا باعث

خود غواصی ہے۔ جب اس نے غداری کی تو غواصی بہت برہم ہوا۔ اور نمک حرامی سے اس کو موصوف کیا۔

حیران ہوں سعید کوا کیوں شقی ہو آج
حق تے پڑیا یو دور منم کا حجاب کر
ایسے حرام خور کی یارب نہ رکھ بنیاد
سنج شاہ عبدلا کی دعا مستجاب کر

غواصی نے، اپنے قصیدہ میں برہمنوں کے مظالم کے خلاف بھی سخت صدائے احتجاج بلند کی تھی۔

غواصی چشتی اور قادری المشرب اور ایک بزرگ شاہ حیدر ثانی چشتی کا (۱۰۸۹ھ) مرید بھی تھا۔ چنانچہ حضرت غوث اعظمؓ اور خواجہ سید محمد گیسو دراز کی مدح بھی کی ہے۔ بلحاظ کردار، غواصی خود دار، متوکل، خلیق، بے باک اور آزاد منش تھا۔ کہتا ہے۔ ۵

ہمن سر کوں چندوئی بس، بالش بھریک لنگوٹی بس
سُکھی کھانے کو روٹی بس، جیتو لیاں نعمتاں کیا کام

قلندر منشی سے

غواصی کے بن ہو توں قلندر آج اے عابد
بڑی اس لڑکری ایسی تجے دستار تے کیا خط

غواصی کی تاریخ وفات معلوم نہیں البتہ اس نے عمر طبعی پائی ہے اور ضعیف العمری میں اس کا انتقال ہوا ہے۔ کہتا ہے:

دبلا ضعیف سب تے غواصی تو ہے دلے
دھرتا ہے آب ہیو کی محبت کے مال کا

غالباً غواصی نے آخر عشرہ گیارھویں صدی ہجری میں وفات پائی ہے[1]

تصانیف:

مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال۔ تصنیف ۱۰۳۵ھ صرف ایک ماہ میں لکھی۔

۲۔ طوطی نامہ تصنیف ۱۰۴۵ھ اس کا ماخذ طوطی نامہ نخشبی ہے۔

۳۔ کلیات غواصی :۔ مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد کا نادر و نایاب نسخہ ہے۔ مگر ناقص الطرفین ہے۔ جو ردیف وار ہے۔ اور ۲۷۲ غزلیات، ۳۵ قصاید، اور ۲۹ رباعیات پر مشتمل ہے۔ بخط نسخ قدیم۔

---

[1] :۔ غواصی پر ہمارا ایک تفصیلی مقالہ اردو (کراچی) میں اکتوبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا ہے۔

غواصی قطب شاہی دور کا باکمال شاعر ہے۔ اور شعرائے معاصرین میں کسی کو اپنا ہمسر نہیں مانتا۔ اور فارسی باکمال شعراء میں خود کو اپنے وقت کا ظہیر فاریابی، کمال خجند، اور امیر خسرو سمجھتا ہے۔ اور کہتا ہے ـــ

قصیدہ ہور غزل کہنے کے فن میں دیکھتا ہوں تو
غواصی میں ظہیر فاریابی کی نشانی ہے

ـــ

غواصی یو شیریں غزل بے مثل جو بولیا ہے لڑن
مطلع تے ہے مقطع تلک اول شکر پر تے نمک

سلطان عبداللہ قطب شاہ کو استاد مانتا ہے یہ اس کی انکساری ہے۔

دریا گن گیان کا ہے توں کدھیں اصلاح دیتا جا
اگر کیں کچ غلط ہووے غواصی کے بچن میانے

فرشتے عرش کے جھکتے ہیں مست ہو آج غواصی
نجہ نو نو غزل تیری کنے جاواں سناتے ہیں

بقول حافظ ؒ

کہ بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریا را

ایک شعر میں اشارہ کرتا ہے سلطان مجھ کو "فصاحت آثار" کے الفاظ سے مخاطبت کرتا ہے۔

غواصی کے کلام میں عربی و فارسی اقوال اور محاوروں کے ترجمے۔ فارسی و ہندی ترکیبیں، کافی ہیں، نیز بعض خالص مروجہ اردو الفاظ بھی ہیں مثلاً۔ عربی فقرے، الدنیا جیفة و طالبہا کلاب۔ انجس الانجاس۔ ظل لہ الناس۔ عجلوا فی الصلوٰة۔
فارسی :۔ خسرو مالک رقاب۔ سات وخط (ہفت اقلیم)
قبلۂ روحانیاں۔ محفل دبستانی۔ گرگ پروری۔ جمشید فرغز۔
ہندی فارسی مخلوط ترکیبیں، گوری خراسانی جلوا عرد تسانی
سندر آرسی۔ اسکندر آرسی۔ ہنس مکھی۔ وغیرہ
ہندی :۔ چک من ہرن کھنجن نین۔ پھول پھاسے۔ چلبلا لٹ
جھل جلا۔ وغیرہ۔
مروجہ اردو محاورے دل والی۔ بنگالی نارنگی منہ سے پھوڑ لو،
(منہ کھول کر کہنا) پیٹ پکڑ کر ہنسنا۔ اونچی سیڑھی چڑھنا۔
مولکے پھٹنا۔ کچھ کا کچھ ہونا۔
ضرب الامثال :۔ کاچ پاچ نا ہوے (کانچ زمرد نہیں ہو سکتی)
جنگل میں انگارے (بھوبل میں انگارے)، گل پھانس
(گلے کی پھانسی) اس زمانہ کے زیورات۔ لباس، سامان
آرائش سب کچھ لکھا ہے ــــــ غواصی زبان کا معمار
تھا۔

لطیف تشبیہات و استعارے :۔ جوبن اور قد :۔

اعضائے بدنی مثلاً: رسیلی رنگ بھری، مرگ کی اچھری۔ رس بھرے ہونٹ ۔ دربائی دیدے۔ کنچن نین، وغیرہ — گلمری گنگن۔ کوتری، پیالا۔ شربت کی تری

ترا قد ہور دو جوبن دیکھ میں حیران ہوتا ہوں!
کہ اس چندن کی رگ کوں کیچے کندن کے پھل پکڑے

انجھو تیٹے دکھت پلکیاں تھے میرے
ستارے تملاتے ہیں گگن میں

چار قل کے بول منج بس ہے
ترے ہت کی صراحی کا قُل قُل

شوخی:۔

دلاکوں اپنے چھپا لیو نیں تو کھائنگے دغا دکھائیں گے،
کہ دل چرانے کی عادت ہے اس سلونی میں

چاندنی رات:۔

دھن چلبلی، من چلبلا ہور دو نَیَن دو چلبلے
چند نی چلبلتی خوشی جیوں آ ہوئے تا تار رات
گنبھیر پدمن سندری، چھندوں بھری اس دھات کی
دیکھیا نہ روشن دیس کیں پائی نہ جھمکنہار رات

بر طرح محمد قلی قطب شاہ:۔

غواصی

خوشی کا سمدا ابلیا دیکھ شہ کے رنگ ہور سنگ تھے
چندن سر خوش، ہے تن سر خوش، بنجن سرخوش، پیکن سر خوش
سرو کی ڈال سے قد، ہور گلابی گال سکتے دھن کے
پلون سرخوش، ہے بن سرخوش، چمن سرخوشی، سمن سرخوش

٭

آسان بحر :-

نیند تھی آنک جو کھلی ناگاہ
گود میں آفتاب دیکھی منیں
شد بسرجا، تمام ہوئی بیتاب
جب ترا آب و تاب دیکھی میں

٭

درس دے درس منج دکھیاری کوں
دور کر دل کی بے قراری کوں
توں کتی ہے کہ تجکوں بسریا میں
کوئی بسرتا ہے؟ جیو کی پیاری کوں

٭

غواصی (برطرح محمد قلی) سے

پچھلی گھڑی میں رات کے دکھلا درس و دستہ پری
منج نین کے اسمان میں جیوں چاند آجا گا کری

دسری گھڑی آ ذوق یں موں کھول ہنس پڑ ناز سوں
تاریاں سو میرا گود بھر لیدائی دو نازاں بھری الخ

قصیدہ (بر طرح محمد قلی) ؎
جگ میں جو پرگٹ ہوا فیض بھریا نو بہار
دھرت کوں رنگیں کیا پھول کھلا تھار تھار

٭

قصیدہ فتح ؎
پنجہ سو تیرے ہاتھ کا اللہ کا ہے نقش عین
جوہر سو تیری تیغ کا ہے محض زیور فتح کا
طرا تری دستار پر چھب سوں سہاتا دیکھ کر
روح الامیں آوے گیا تج ہات شہپر فتح کا

٭

غواصی اور ظہیر فاریابی سے مقابل ؎ :-
قصیدہ غواصی ؎
دریا میں تجے جو نکلے بچار لے نگار موتی
سکھ پاوے دیکھ تیرا مکھ آبدار موتی

قصیدہ۔ ظہیر فاریابی :-
سحر چو تافت ز دریائے خاوراں گوہر
زمانہ کرد بہ برج فلک نہاں گوہر

غواصی سے

تاریاں سوں چاند کھن کا بے شک ہوئے دوانہ
چندنی میں جو توں نکلے سب تن سنوار موتی

ظہیر سے

نگار بخت چو لعل دُرر فشاں گوھر
شکستہ درج درد شد سبک گراں گوھر

غواصی سے

جنہ سور کے گلے کے کنٹال جب کتے ہیں
سو یں مرے بچن کے ہو تی ہنوار موتی

ظہیر سے

یمن بخت چو گیرد قلم بدست شود
بصورت شبہ از نوک او رواں گوھر

۴

اگرچہ نصرتی کے قصیدے بلاغت سے خالی نہیں
مگر غواصی کے قصیدوں میں فصاحت وسلاست اور شیرینی
زیادہ ہے گو طویل نہیں ۔

اس وقت اُردو کے شعرا نے اس قدر ترقی کر لی تھی
کہ فارسی کے مستند شعرا کا مقابلہ کرتے تھے ۔ جبکہ سودا
اور ذوق کا وجود نہ تھا ۔

۱۰- غواصی نے دو مثنویاں لکھی ہیں۔ ایک توسیف الملوک و بدیع الجمال ہے۔ بقول بعض الف لیلہ کا مشہور افسانہ ہے ہے۔ جس کو مرزا بدیع اصفہانی نے بزمانہ عالمگیر فارسی میں گلدستۂ عشق کے نام سے لکھا تھا۔ مگر وہ بہت بعد کی تصنیف ہے یہ قصہ حسب خواہش محمود غزنوی۔ حسن میمندی وزیر نے سلطان دمشق سے حاصل کیا تھا۔ اور معقول انعام پایا تھا۔

عاصم نوں شاہ مصر کو اولاد نہ تھی، حسب ہدایت اہل نجوم ... یمن کی لڑکی سے شادی کی شہزادہ سیف الملوک پیدا ہوا۔ صالح نامی وزیر کے لڑکے ساعد کے ساتھ تعلیم و تربیت ہوئی۔ ہر فن میں کمال حاصل کیا۔ بادشاہ نے شہزادہ سیف الملوک کو چند تحائف دیئے جن میں ایک انگوٹھی حضرت سلیمان کے دور کی۔ ایک خوبصورت تصویر ایک مہ جبیں بدیع الجمال کی تھی۔ جو شاہ اجن شہپال کی لڑکی تھی۔ شہزادہ اس کی تصویر کو دیکھ کر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اور بڑے مصائب جھیلنے کے بعد سراندیل کی شہزادی سے بدیع الجمال کا پتہ چلا جس نے اس کے تجسّ تاج الملوک سے تعارف کرا دیا۔ اور بدیع الجمال کی دادی شہربانو نے شہپال کو رضامند کیا، سیف الملوک کو دریائے قلزم کے بادشاہ نے گرفتار کر لیا۔ جس سے لڑکر شہپال نے سیف الملوک کو چھڑا لیا۔ اور سیف الملوک اور بدیع الجمال کی شادی ہو گئی۔

وہاں سے سراندیپ پہنچے۔ جہاں کے بادشاہ کی لڑکی سے ساعد
وزیرزادہ کی شادی ہو جاتی ہے۔ اور اپنے وطن واپس ہو جاتے
ہیں۔ اور مبارک بادی کا جشن منایا جاتا ہے۔
مثنوی سیف الملوک کے اشعار کم و بیش (۲۱۲۶)
ہیں۔ غواصی کا ماخذ فارسی قصہ ہے۔ مگر وہ اس کو اپنی دماغی
پیداوار سمجھتا ہے۔ البتہ بعض حصے اور نام بدل دیئے ہیں۔
اور ترجمہ میں اصل کی شان پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے
اس کا سنہ تصنیف ۱۰۳۵ ہے اور مثنوی پہلی مرتبہ سنہ ۱۲۹۰ھ
میں بمبئی میں چھپی؛ اس کے بعد مجلس اردو مخطوطات سالار جنگ
نے شائع کیا۔ اس کا فارسی ترجمہ منظوم جسونت راؤ منشی
سعادت اللہ خاں ناظم آرکاٹ نے قبل ۱۱۴۶ھ کیا تھا۔

طوطی نامہ غواصی :۔

طوطی نامہ کا قدیم ماخذ شکاسب تتی بالینی "طوطے کی
زبانی ستر کہانیاں" جس کی باون کہانیوں کا ترجمہ علامہ نخشبی نے
سنہ ۷۳۰ھ میں کیا تھا جو مقبول ہوا۔ شیخ ابوالفضل نے شہنشاہ
اکبر کی ایما سے اس کا خلاصہ کیا۔ اس کے بعد سید محمد قادری
نے ان باون کہانیوں میں سے پینتیس کہانیوں کا خلاصہ سنہ ۱۰۹۳ھ
میں کیا تھا۔ مگر غواصی کا ماخذ نخشبی کا طوطی نامہ ہے۔ اور اس
نے باون کے منجملہ پینتالیس منتخب کہانیوں کو دکھنی زبان میں

سنہ ۱۷۹۰ء میں منتقل کیا۔ نفس مضمون میں کچھ جدتیں کی ہیں۔
طوطی نامے کے ترجمے نہ صرف ہندوستان بلکہ یوروپی زبانوں
میں، انگریزی اور جرمنی، ترکی، بنگالی۔ ہندی، جاوی زبان
میں بھی ملتے ہیں۔

قصہ کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ:-

" ایک ملک التجار تھا جوہری، اس کے اولاد نہ تھی
ایک مہ جبیں سے شادی کی ایک لڑکا تولد ہوا، سن
شعور کو پہنچا۔ اس نے ایک فصیح اللسان طوطا بازار ہی
میں خریدا جو غیب کی باتیں بتاتا تھا۔ طوطے کے
اشارہ سے عنبر خریدا جس سے اس کو بہت فائدہ
ہوا، تاجر بہ سلسلہ تجارت چلا گیا، طوطے کی صحبت
کے لئے ایک مینا بھی خریدی۔ اتفاق سے ایک
نوجوان راہ گیر سے تاجر کی بیوی کو عشق ہو گیا۔
مینا نے تو اس واقعہ کو راز میں رکھنے سے انکار
کر دیا۔ طوطے نے اجازت دے دی مگر ہر روز
نئی کہانی کہہ کر اس کو باز رکھتا رہا تاجر کی سفر سے واپسی۔
افشائے راز۔ اور بیوی کا قتل۔ اور تاجر مال و اسباب
لٹا کر فقیری اختیار کر لیتا ہے "

سیف الملوک و بدیع الجمال کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

الہٰی کا جگت الٰہی سو توں

کرنہار جم بادشاہی سو توں

خاتمہ :-

برس یک ہزار ہور پنج تیس میں

کیا ختم یو نظم دن تیس میں

واقعہ نگاری، تسلسلِ بیان، روزمرہ اور محاورات مروجہ، خوب باندھے ہیں۔ جس سے تاریخ زبان و محاورات پر روشنی پڑتی ہے۔ زبان میں دکنی خصوصیات موجود ہیں۔ املا صوتی لحاظ سے ہے۔ جمع کے وہی طریقے۔ ماؤں کی مایاں، بھائی کی جمع بایاں۔ فارسی ترکیبیں جیسے۔ تنگ تر۔ باریک تر ہندی۔ الفاظ آکار، نزکار، نبوت کے گن۔ نہیں کا املا نئے۔

غصہ میں رنگ بدلنا ؎

غصے بے سُدی ہو جو کھانے لگی

سو حیرت میں پڑ رنگ پھرانے لگی

گدگدی چھوٹنا ؎ جیوں اس بات پر چھتے چھوٹی گدگلی

سو راضی ہوئی وو چنچل چلبلی

مرے من کوں سنتوس سوں پور کر

یو شرمندگی مج تے توں دور کر

شہپال سے جنگ: ؎

دیکھت سلح سنجوت کا لک لکاٹ
گیا سور کیرا سینا پھاٹ پھاٹ

سو دریائے قلزم کوں ہیبت چھوٹی
زمیں کے تلے گائے اڑرا اٹھی

بشارن پڑیا سخت رگڑا ہوا
کہیں نے سو نادر لو جھگڑا ہوا

غنچہ دہنی، اور زلف مشکین، مانگ

دہن تنگ تر مانگ باریک تر
شب قدر تے بال باریک تر

تن اس کا پھول مکھ مکاتا اچھے
عنبر مشک کا باس آتا اچھے

بدیع الجمال اور لباس عروسی:

بدیع الجمال اچپلی نار کوں
ڈوبایاں زر سینے میں جھلکار سوں

فراق فرزند ؎

جو ماصم لزل شہ دد کھی جھوک جھوک
ہوا تھا جو کاڑی نمن سوک سوک

ملیاں خوش ہو مایاں دبایاں تمام
شو، آر دس کے پاس آیاں تمام
ادتم ڈومنیاں مل پلانے لگیاں
سہیلے شہانے سوگانے لگیاں

انتہائی خوشی کی تشبیہ:
جو پردے میتے ہات ملنے لگے
سو لک دھات پھولاں اچھلنے لگے

شب زفاف:۔
چڑی خوب محبوب دیکھ ہات میں
ریجا نے لگیا بات کر بات میں

۴

طوطی نامہ کے بعض اشعار یہ ہیں :۔
حمد:۔ نہ آکار رنج ہے نرنکار توں
نہ چون و چرا سوں دھرے کار توں
ترے راز تے کوئی آگاہ نیں
تصور کوں تیری طرف راہ نیں

لغت:۔
ہوئے ختم اس پر نبوت کے گن
بجے طبل اس کا قیامت لگن

نھنی ایک محبوب مہتاب سی
لطافت میں نرمل نخیل آب سی

محاورے : ـ

ترے موں کو دیکھ کیقبادی کوں دیک
ہتی سات گانڈے نکو کمانے جا
نکو سنگ توں سانپ سوں بیلنے جا
ہوا جھیج پنجرا مراتن تمام
گلے پرہ کے آگ تے جوبن تمام
کیا توں مرے جیو کوں باراباٹ
لگے کیوں نہ تجکوں مراکل کلاٹ

جنیدی

جنیدی کا نام بقول مؤلف "اردو شہ پارے" علی اکبر، اور مؤلفِ "اردوئے قدیم" شیخ احمد تھا۔ اور خود شاعر نے بھی اپنا نام احمد جنیدی لکھا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

کہ احمد جنیدی پہ کریوں کرم
دھرے نانوں لب پر محمد جرم ؟

اس نے اپنی مثنوی ماہ پیکر ۱۰۴۲ھ میں بعہد سلطان عبداللہ قطب شاہ مرتب کی ہے

رکھیا ماہ پیکر سو اس نیک نام
الٰہی توں کر اس نظم کوں تمام

جس کے مخطوطات امپریل لائبریری کلکتہ، اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں موجود ہیں۔

نمونہ:۔ سینا صاف انبوت ہے نار کا
کہ جا گا ہے مقبول پتہ کار کا

یا آنار کس ڈال ہے نار او
دو جو بن کلیاں نار اس کیتا اد

کر نیہ باغ میں پھل دد او تار ہے
کہ یا حسن کیاں نارنگیاں بار ہے

اناراں کے جھاڑاں کلیاں بار تھے
کہ لالی میں یاقوت کے سار تھے

کا آئے تھے جھاڑاں کوں اتار بار
رسیلے نکالے تھے جوبن کے سار

سو چولی من بات ان کے ادپر
رکھے تھے چھپا کر سوان کے بھتر

نار۔عورت۔ آنار، انار۔ (انار۔ نیہ باغ۔ محبت کا باغ
ادتار پھل (جوبن) مقدس پھل سے تشبیہہ دی ہے۔

۶

ابن نشاطی

شیخ محمد مظہر الدین ابن شیخ فخر الدین معروف بہ ابن نشاطی
المتخلص بہ نشاطی کے حالات تاریکی میں ہیں۔ مدتوں بعد نام
کا پتہ چلا ہے۔ یہ کسی مشائخ خاندان سے ہے۔
قطب الدین فیروز قادری، مصنف پرت نامہ کو اپنا استاد
لکھا ہے۔ ابن نشاطی، سلطان عبداللہ قطب شاہ ($\frac{۱۰۳۵}{۱۰۸۱}$ھ)
کا معاصر ہے۔ اس نے اپنی مثنوی "پھول بن" بقول بعض مخطوطات
"پھول بن" کے لحاظ سے ۱۰۶۶ھ اور مخطوطہ ملوکہ اکبر خاں کے
لحاظ سے ۱۰۷۶ھ میں لکھی۔ مگر اس دکنی شعر میں۔

اتھا تاریخ لایا تو یہ گلزار
اکیارہ سوکوں کم تھے بست پر چار

قدیم اردو اعداد میں فارسی لفظ "بست" کچھ کھٹکتا ہے۔ سنہ
ولادت و وفات سے ہم نابلد ہیں قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ
ابن نشاطی اوایل گیارھویں صدی ہجری میں بزمانہ محمد قلی قطب شاہ

پیدا ہوا، اس لئے کہ وہ فیروز کو اپنا استاد لکھتا ہے۔ جس کا انتقال قبل تصنیف قطب مشتری وجہی ۱۰۱۸ھ ہو چکا تھا۔ یہ اس کا بچپن ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اس کو فن انشا پردازی سے زیادہ دلچسپی تھی، جس کا ذکر اس نے اسی اپنی مثنوی میں کیا ہے۔ اور غزل گوئی سے بھی لگاؤ نہ تھا اس لئے اس کی شہرت نہ ہو سکی، تیسرے یہ کہ ایک متوکل اور خاموش پسند معلوم ہوتا ہے جس کو نام و نمود کی خواہش نہ تھی۔

"دیدن بیقراری بلبل و پرسیدن احوال او و اظہار آں"

غواصی — پوچھا پنجرے میں شہ اوسکوں تو کیے جو کچھ چتا ہے
ہوا ہے کس بدل تو یوں نپٹ بیہوش نادانی

٭

دیکھیا بلبل جو او دیساں نہیں ا ہے
نپٹ درشن کے دروازے بندے گئے
منڈی پنکھاں میں اپنی گھال لے کر
لگیا رونے کوں نیکھیں ڈھال لے کر
تیا نت یار کوں کر یاد اپنے
لگیا تھا یوں بلکنے ہور تڑپنے
کنے بولے گا ادس گل سوں مرا حال
ہوا سوں حال میرا غم سوں پائمال

بچھڑنے سوں ہوا ہے تلخ جینا
کمر بیٹھی ہے اور پھوٹیا ہے سینا
پڑیا سو دور میں اوس گل بدن سوں
ہو کر سکتے ہیں کاٹے تن پوروں رؤں
دنیا دوزخ ہے منجہ اس حور کے باج
دسے دن رات ہو اوس سورکے باج
پون بن نیں ہے میرا کوئی محرم
جو بولے پھول سوں جا کر مرا غم
پون کوں کے کر اے خوش باش یارے
میرا دکھ پھول سوں ٹک بول بارے
اگر اچھتا تو بارے کا میرا تن!
میں اڈ کر یاں تے جاتا کر ہر یک فن
کہاں او پاؤں جو اس ملک جاؤں
او انکھیاں کاں جو میرا وس کل دیکھ پاؤں
صبح اوٹھ یوں لگیا کرنے کوں زاری
دیکھ یکدن شاہ اوس کی بیقراری
لے کر بلبل کے پنجرے کوں اپس ہات
لگیا شہ بولنے بلبل کوں اس دھات

ہوا ہے کے تیرا خاطر پریشاں
پریشاں جیوں ہے ہور سر پریشاں
ہے تجھ میں کیا بدل باریکی عادت
توں کے پکڑ یا ہے باریکی خصلت
تو کس کی نین کے خاطر ہے بے خواب
توں کس کی زلف کے بدلے ہے بیتاب
میری ادھر بول توں کس کا ہے مجنوں
ہے کس لیلیٰ کی خاطر دل ترا خوں
لیا ہے کوہ کن کا توں جو پیشہ
لگیا ہے کس کی نیہ کا تجھ کوں تیشہ
بھتور توں یوں منجہ کس پھول کا ہے
توں بلبل بول کس مقبول کا ہے

۴

عرض عنوان بلبل پیش پادشہ:—
دریا تے نین کے موتیاں کے تیئں رول
دیا بلبل جواب اس دھات موں کھول
بھلا ہے دو کھ میرا کوئی نا سنے تو
اگن کے پھول میرے نا چونے تو

کسی کے درد یو دل میں جو ہے پور
زمیں ہے سخت ہور اسماں ہے دور

وہی جانے یو دو کھ جس پر کھڑیا ہے
جکوئی برہے کے پھاندے میں پڑیا ہے

بچھاڑیاں غم سوں کیوں کھاتا ہے سوں دل
وہی بوجے کھڑیا ہے جس پو مشکل

نہ کے جاتا نہ آتا ہے سکنے میں
نہ کہے میں فائدہ نا چپ رہنے میں

ہر اک تلتل ہو کر جاتا ہوں پیلا !
پریت میں نیں مرا چلتا ہے حیلا

کہوں وو بات کیا میں جیب پر لیا
دو دو کھ کس سوں کہے تو فایدہ کیا

نین بلبل کے غم سوں شاہ کریم
الپس کے دو کنول تے کاڑ شبنم

گیا اے غم کے پنکھی درد کوں جھاڑ
درنگ پر کام اپنا توں نکو باڑ

شکر بن کھلائے ہوتا نیں میٹھا کام
نہیں پڑتا ہے ہیچ بے مشورت کام

میرے دھیر بول اپنے جیو کی بات
کہ شاید کام تیرا ہووے منجہ بات
دلاسا شاہ سوں بلبل جو پایا
زباں مطلب کے باتاں سوں ادچایا
لگیا کہنے رہل گزری سوں باتاں
برہ خوں نیں جو کہتا ہے سو گھاتاں

قطبی۔ رازی

خود کو رازی لکھا ہے۔ اور رازی تخلص اختیار کیا ہے۔
قطب نے ایک مشہور کتاب "تحفۃ النصائح" فارسی منظوم تالیف ۷۹۵ھ کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ جو حضرت شاہ راجو قتال قدس سرہٗ۔ پدر بزرگوار سید محمد حسینی گیسو دراز نور اللہ مرقدہٗ متوفی ۷۳۱ھ سے منسوب ہے۔ اور اپنے مرشد شاہ ابو الحسن کا بھی اشارہ کیا ہے۔ جن کا حال نہیں ملتا۔
ممکن ہے کہ قطبی شاہ ابو الحسن خاموش مرید و خلیفہ شاہ

حیدر ثانی چشتی سلسلہ گیسو دراز قدس سرہ سے بیعت ہو۔ یہ ترجمہ ۱۰۴۵ھ کا ہے۔ اور اسی بحر اور ردیف میں ہے جو فارسی "تحفۃ النصائح" کا ہے۔ بلحاظ سنہ تصنیف رازی۔ سلطان عبد اللہ قطب شاہ اور غواصی کا معاصر ہے۔

آغاز:۔

بولوں صفت میں بے گنت اس خالقِ جن و بشر
نردھار کر اسماں رکھیا سورج ستارے ہور چندر
جو دی بزرگی عرش کوں پنچھی اڑے یک پاسے تے
جوں بیچ برساں چار سو نپڑے بزاں پائے ڈگر

تخلص اور سنہ تصنیف:

بندیاں میں سب کمتر بندہ رازی تخلص قطب کا
تحفہ کیا دکنی زباں شہ کی رضا سے سیں دھر
تحفہ اصل اسے فارسی سب ترجمہ دکنی کیا
صاحب سود یتا۔ جس کے شاہ بو الحسن فرمائے پر
ہجرت تھے دس سو سال ہور چالیس پر بھی پانچ اتھے
تب یہ مرتب سب ہوا تحفہ (۱۰۴۵ھ) سو دکنی نا مور

ترجمہ بلحاظ قدامت اچھا ہے۔ ہندی، فارسی الفاظ، اور ترکیبیں بھی ہیں۔ مثلاً بے گنت۔ بزاں۔ (بعد ازاں) یک پاسے تے۔ ایک پاؤں سے۔

طبعؔی گولکنڈوی

سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ / ۱۰۸۳ھ) اور ابو الحسن تانا شاہ (۱۰۸۳ / ۱۰۹۸ھ) کا معاصر تھا۔ حضرت شاہ راجو گولکنڈوی (۱۰۹۳ھ) سے بھی اس کو عقیدت تھی۔

مدح تانا شاہ :۔

شہ بوالحسن سچ توں شاہ دکن
تجے شاہ راجو مدد، بوالحسن
ملاحت میں جیوں سور چندر ہے توں
صلابت منے جیوں سکندر ہے توں

طبعؔی نے کب وفات پائی پتہ نہیں چلتا۔ اس نے ایک مثنوی بہرام و گل اندام دکنی میں لکھی ہے۔ بہرام ساسانی خاندان ایران کا ایک بادشاہ تھا۔ جس کے قصوں کو نظامؔی نے ہفت پیکر میں، اور ہاتفی نے ہفت منظر میں قلمبند کیا تھا، بہرام کی سات حرم تھیں جو الگ الگ باغات میں رہا کرتی تھیں، طبعی کا ماخذ نظامؔی کی ہفت پیکر ہے طبعؔی سے سالہا سال قبل دکنی زبان میں، "ملک خوشنود" نے جنت سنگار کے نام سے اور امین بیجاپوری نے "بہرام و بانو"

حسن کے نام سے بہرام کے قصوں کو لکھا ہے۔ طبعی نے مثنوی بہرام و گل اندام
۱۰۸۱ھ میں چالیس دن میں لکھی ہے۔ کہتا ہے ؎

اتھا سال تاریخ کا خوب نیک
سنہ یک ہزار و ہشتاد و یک

گنا بیت بیتاں کو میں ایک دل
ہزار اور ہے تین سو پر چہل

یعنی اس کے ایک ہزار تین سو چالیس ابیات ہیں۔ اس
کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

الٰہی بچن کا مجھے تاب دے
میری جیب کی تیغ کوں آب دے

(زبان)

روایت کیا راوئ نیک نام
بہوت فکر سوں یو حکایت تمام

اتھا روم کے شہر میں بادشاہ
کہ سردار ویسے بہوت تھے ہور سپاہ

طبعی کا انداز بیان دل کش ہے۔ بعض جدتیں بھی کی ہیں،
مافوق الفطرت قصوں کو اس نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اور فطرت
انسانی کو مدنظر رکھا ہے۔ شعرا معاصرین پر بے باکانہ تنقید کی
ہے۔ مگر وجہی کو استاد مانتا ہے۔ جس کے متعلق حسرت کا اظہار

کرتا ہے ؎

وجہی کیا جو یو مثنوی بولنے   یو موتیاں نچھل ڈھال یوں رولنے

یو وجہی میرے خواب میں آے کر   مکھ اپنا سورج نادو کھلاے کر

معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی شعرا ر شاعری میں اس قدر غرق سمجھے کہ ان کی سابقہ شاعروں سے خواب میں بھی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ طبعی کی اس مثنوی کے مخطوطات لندن اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ہے۔

کلام و زبان کا نمونہ یہ ہے :۔

او زلفاں دلاں لو ہنڈولے اہیں

غلط میں کہا دو سنپولے اہیں

معشوق کا سراپا :۔

او گالاں کی سرخی سولالے ہیں نیں

او بالاں کی خوشبوی بالے ہیں نیں

دسے پھولاں دو سینوتی کے دوکاں

چنپے کی کلی ناک ہے درمیاں

عجایب او چاہ زنخداں ہے!

کہ غرق اس میں دین ایمان ہے

وہ جو بن سو تیزلی کے دو ہات میں

جو امریت پھل چھپ رہے پات میں

فایز گولکنڈوی

فایز گولکنڈوی، سلطان ابوالحسن تاناشاہ (۱۰۸۳ھ / ۱۰۹۸)
کا معاصر تھا، صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ اس نے ایک
مثنوی قصۂ رضوان شاہ و روح افزا دکنی زبان میں سنہ ۱۰۹۴ء
میں لکھی تھی۔ اس کے ڈھائی ہزار ابیات ہیں۔ اور یہ کسی
فارسی قصہ سے ماخوذ ہے۔

اس میں نسبتہً عربی اور فارسی الفاظ زیادہ کئے گئے ہیں
احاطہ مدراس کے ایک یوروپین مستشرق مسٹر میجر ایم۔ ڈبلیو کارنی
اس کو معہ فرہنگ مرتب کیا تھا، اور طباعت بھی شروع ہو چکی
تھی۔ مگر میجر موصوف کے بے وقت انتقال کی وجہ سے یہ
کام ادھورا رہ گیا، مدراس کے جید شاعر علامہ محمد باقر آگاہ تخلص
نے اسی قصہ کو بعض اضافوں کے ساتھ (۱۷۹۶ء) مدون کیا۔
ہے جس کا نام "گلزار عشق" ہے

قصہ مختصر یہ کہ رضوان شاہ نامی چین کا شہزادہ شکار کے
لئے نکلتا ہے: اور روح افزا ایک پری پر عاشق ہو جاتا ہے
اور وہ ہرن کی شکل میں تبدیل ہو کر ایک چشمہ میں غائب ہو جاتی
ہے۔ اور شہزادہ ہاتھ ملتا ہوا رہ جاتا ہے۔ ہر چند اس کی تلاش

اور حوض سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس کے باہر آنے کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔ بالآخر ایک درویش کی دعا سے کامیاب ہوتا ہے۔ اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے اور شہزادہ اپنے ملک چین واپس ہو جاتا ہے۔

مثنوی روح افزا کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے ؎

اول نام حق کا لے بالوں سخن
بندوں اس کی توحید کھولوں دہن

۱۰۹۴ھ سنہ تصنیف ہے۔

اتھا جس وقت سال ہجرت ہزار
اس اوپر نود اس کے اوپر چہار

خاتمہ :-

ہوا قصہ رضوان شہ کا تمام
نبی اور ولی پر ہزاروں سلام

فائز کا املا، ڈاکٹر اسپرنگر نے ضاد سے فایض لکھا ہے۔

ہجر و فراق کے بعض اشعار ؎

اوپر خوش ہوں پکتی ہوں باطن ہیں میں
بہوت دوکھ دیکھی اس ننھے پن ہیں میں
مجے رتت گمتا نہیں ایک ٹھار
پکڑتا نہیں ٹک مرا دل قرار

دیکھیا نیں ہے اجنوں مرا روپ دد
تو پکڑے جنگل پہاڑ مجنون ہو
اگر ٹک دکھا دوں مرے سور کوں
تو باطل کروں سور کے نور کوں
پھرے چاند ہر رین مرے آس پاس
کرے نور مکھ سوں مرے اقتباس

قدرتی

قدرتی کا نام، اور وطن کا پتہ نہیں چلتا، اور نہ اس کی مثنوی کی داخلی شہادتوں سے کچھ حال معلوم ہو سکتا ہے۔ بلحاظ زبان، قدرتی ایک دکنی شاعر ہے۔ اور سنہ ۱۱۰۰ھ سے قبل کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ غالباً اس کا ماخذ قصص الانبیاء فارسی ہے۔ جو دس ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ اس میں اکیس انبیاء علیہم السلام کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک نسخہ ہے جو ناقص الآخر ہے صرف ہجرت حبشہ تک کے حالات ہیں۔
آغاز:۔

کہ الحمد للہ و پروردگار
کیا جگ اپس نورتی آشکار
سراؤں اول میں جو سبحان کوں
جیکوئی جیو دیا ہی سو سلطان کوں
خلیفہ ہے اس کا نبی مصطفیٰ
کیا جسکتیں لیل ہور والضحیٰ
محباں نبی کی ولیاں انبیا
اسی سلسلے کا یو قصہ کیا الخ
دنیا دین کی سروری یو لیا
اوسی ناؤں ہی قصص الانبیا
کیا قدرتی قصۂ بے ملا،
اچھی سب کوں معلوم یو سلسلہ
کہی یوں محمد سنو یا علی
وہی ذات کا نور تھا اولی
کریں آپ میں آپ طواف اد
پھرے سیر اپس میں اپی شاد
جو قدرت کیرا قدر دو پائی کر
و سجدہ کیا نور ہو آئی کر

...

قصہ آفرینش عناصر اربع و آسمانہا و ملایکہ سے

بزاں نور سوں ایک موتی کیا
غضب کی نظر سوں اسے دیکھیا

و ہیبت ستی گل کو پانی ہوا
دسیا نیر موجاں ستی ہو جیوا

بزاں وانتی پیدا کیا باؤ کوں
کہ چار و اُپر لیا دھر پچاؤ سوں

اول باؤ کیتا سو باد صبا
دوجا باؤ کیتا جو پورب کا

جو تسرا جنوب ہور چوتھا شمال
کہ اُس کی حکم سوں رہے ایک حال

کیا حکم چاروں کوں چار و کدھن
جو پانی کوں چو پھیر موجاں زدن

لطیف گولکنڈوی

لطیف، ابو الحسن تانا شاہ (۱۰۹۸-۱۰۸۳ھ) کا معاصر تھا
اس لئے کہ اس نے اپنی مثنوی ظفر نامہ ۱۰۹۵ھ میں لکھی ہے

جس کے اشعار ۵۳۰۰ پانچہزار تین سو ہیں۔ یہ ایک مذہبی مثنوی ہے۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے حالات نظم کئے ہیں اور تعلی یہ کی ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ میں فرضی قصے بیان کئے ہیں۔ اور میری مثنوی اس سے پاک ہے۔ میں نے حضرت علیؓ کے خاندانی کارنامے قلمبند کئے ہیں۔ ادبی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں، اسلوب بیان دلچسپ نہیں۔ اور فارسی عبارتوں کی بھرمار بھی ہے:۔

مضمون نامہ ماہیار کا خط عمر علی کے نام سے

سیادت پناہ صاحب و قبلہ گاہ

مددگار تمنا اچھوں نت الٰہ

کہ مخفی نماند تمن پہ یو راز !

کتا ہوں سنو سر بسر کھول باز

ازیں جانب اے فدوی ماہیار

دعائے فراواں اگل استوار

کہ میں وہ محب ہوں تمارا سدا

یوں بولیا سنا یزید تیں ابتدا

محمد حنیفہ نہ تنہا رہے

ہنوز ان سکے بھائی بہتارہے

علی کے سپوتاں سو خونخوار ہیں
اتن دل سے ان کے مسل یار ہیں
یوسن کر صلابت و لرزیا اتھا
کیا تھا اسے ہتی یوں بتا
کروں کیا کہ دنیا بدل ہوا اسیر
یو مردود کن ہور ہیا ہوں وزیر
ولیکن محب دین و ایمان تے
شریک ہوں تمارا دل و جان تے
کرنی الجملہ کر بولیا ہوں بیاں
تمن سو مخفی ہووے تیوں عیاں
یو مطلب سو اتناچ تما جان لیو
سو کر مشورت سیتے پہچان لیو
ہیا ہوں کرا انجہا، مخفی کلام
زیادہ یہ کیا لیکھنا والسلام
(ورق ۹۵ ب ۹۶ الف) ص۲۵ لشہ پارے

سیلوک

جنگ نامہ حنیف شاہ کا مؤلف ہے جو ۱۰۹۲ھ کی

تصنیف ہے۔ اس میں تقریباً ڈھائی ہزار اشعار ہیں۔ یہ رزمیہ مثنوی دکنی میں لکھی گئی۔ غالباً۔ اسی کا ترجمہ سندھی زبان میں بھی ہوا ہے۔ اور بمبئی میں طبع ہوئی ہے۔ یہ قصہ محمد بن حنیف برادر امام حسین علیہ السلام سے متعلق ہے۔ جنہوں نے یزید سے انتقامی جنگ لڑی تھی۔

آغاز:۔

الٰہی تو دانا بینا غیب کا
تو ستار ہے سب کے ہر عیب کا

ترے حکم بن پات ہلتا نہیں
ترے حکم بن دودھ ابلتا نہیں

تخلص ؎

ترا مدح سیوک کے تن کا لباس
مروں تو وہی مجھ کفن کا لباس

سنہ تصنیف ؎

یو سیوک تو ہجری کرے سال تھے
ہزار ایک نو دو کے اپرال تھے

اے سیوک بنام رسوم عجم (۱۱۹۲)
محمد حنیف شہ کا کر جنگ ختم

اس کے مخطوطات. کتب خانہ آصفیہ، ادارہ ادبیات اردو، اور جامعہ عثمانیہ اور سالار جنگ میں موجود ہیں۔

۴

مرتضیٰ

وصل نامہ کے مصنف اور گیارہویں صدی ہجری کے شاعر ہیں۔ چنانچہ مرتضیٰ نے اپنے مرشد شاہ سلطان کی تعریف کی ہے۔ اس لئے یہ بزرگ گولکنڈہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور افضل کے برادر طریقت تھے۔ فرماتے ہیں:-

کہ سلطان مرشد ہے روشن ضمیر
کیا عاشقاں میں سو مجکوں امیر
اول تو اتھا گنج عشق کے کھینچ!
لیا صفت ساتوں الس منے کھینچ
گھریوں رہیا ہے خودی کے اندر
سمندر کی سیپیاں میں ہے جوں گہر

موضوع تصوف ہے۔ بعض اشعار نمونۃً درج ذیل ہیں:-

سنو مرتضیٰ تے تمیں اب سخن
بچن کے سو در جک نے کاڑیا تن

اسی میں رتن کا پرویا ہوں مال
رکھیں گے سو عاشق گلے اپنے گھال

خاتمہ:-

ہوئے بیت پورے یہ تین سو انیس
ہواں تھے کی سو بانی کا گنج بیس
ہوا وصل نامہ مرتب تمام
بحق محمد علیہ السلام

(مخطوطات ادارہ ادبیات اردو - حیدرآباد)

۴

شاہ راجو قتال حسینی گولکنڈوی

سید یوسف المعروف بہ سید شاہ راجو قتال ابن ابوجعفر موسیٰ سید شاہ سفیر اللہ حسینی، آپ حضرت سید محمد حسینی گیسودراز قدس سرہٗ کے آٹھویں پشت میں تھے۔ آپ کے جد امجد سید شاہ راجو حسینی کلاں بیجاپوری اپنے برادر سید حسین شاہ ولی قدس سرہ کے ہمراہ بزمانہ سلطان ابراہیم قطب شاہ گولکنڈہ آگئے تھے۔ مگر کچھ سیاسی کش مکش میں شبہ کی بنیاد پہ گولکنڈہ کو خیرباد کہا۔ اور بیجاپور چلے آئے سلطان ابراہیم عادل شاہ

ثانی الملقب بہ جگت گرو ۹۸۸ھ/۱۰۳۷ھ آپ کا معاصر تھا۔

صاحب زیر ترجمہ بیجاپور میں پیدا ہوئے" اور وہیں پر نشو و نما پائی۔ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل اپنے پدر بزرگوار سے کی، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ/۱۰۸۳ھ) کے وسط عہد میں قبل ۱۰۶۰ھ گولکنڈہ تشریف لائے۔ اس وقت آپ کی عمر کافی تھی۔۔۔ سلطان مذکور آپ کا بے حد معتقد تھا۔ میر محمود نعمت اللہی (متوفی، ۱۱۰۰ھ) آپ کے معاصر تھے۔

شاہ راجو قتال نے بقول مؤلف اردوئے قدیم، ۱۰۹۳ھ میں، وفات پائی ہے۔ مدفن، فتح دروازہ حیدرآباد[۲] دکن ہے۔

شاہ راجو قتال قدس سرہ بڑے عارف باللہ تھے۔ آپ کا ملفوظ زبدۃ الموحدین فارسی میں ہے جس کو آپ کے ایک مرید نے مرتب کیا ہے قدیم اردو زبان میں آپ کے دو رسالے ایک تو سہاگن نامہ نظم میں اور دوسرا رسالہ نثر دکنی میں موجود ہے۔

سہاگن نامہ مختصر ۹ صفحات مسطر ۱۲ پر مشتمل ہے۔ اس کا موضوع عورتوں کی شرک و بدعات پر گویا ایک تازیانہ ہے۔ جو ہندو رسومات میں مبتلا تھیں۔ اسلوب بیان، ناصحانہ

۷۔ زبان قدیم دکھنی ہے۔

آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

سن ری سہاگن سن ری سن

یک یک بول چپ دھر سن

ٹوٹکا ٹوتا کر نکو ــــــ

کن فال تو کیں پھیر نکو

چھوتنک نر سویا کر موجا

سو ہے کافر جنس پوجا

نیت کر کچھ ناند نکو!

مشرک کے یہاں شان نکو

ــــ

وہ وہ دوزخ کا ہے عذاب

کوئی نا لیا وی اس میں تاب

جو کوئی کلنتر لیویں گی

سخت شکنجے کھینچیں گی

آگ کی مونگس کترینگی

دوزخ میانے چترینگی

آگ کے بیچھو آگ کے سانپ

آگ کے تختے اوس اپر ڈھانپ

وصیت میری سید کی بوجھ
جو کچھ کہیا کارن بوجھ

۶۴

سنو سکیاں جیو کے کان
جیو نینو دیکھ پچھان

۶۵

سید راجو عابد ہے
بخش ہمارا معبود ہے
بیتاں کہیا چھے اگلے ساٹ
سن کر ہو بہشت کے باٹ

۶۶

گویا اس کے جملہ ۶۶ ابیات ہیں۔ صفحہ اول کے حاشیہ پر لکھا ہے
"نسخہ سہاگن نامہ من تصنیف شاہ راجو قتال" قدس سرہٗ العزیز اور متن میں آخری ابیات میں تخلص راجو آیا ہے۔
گویا یہ تصنیف عورتوں کے لٹریچر سے متعلق ہے۔ جو قدیم اردو میں لکھے گئے ہیں۔

اولیار

اولیار، شاہ راجو گولکنڈوی: ابوالحسن تاناشاہ کے معاصر تھے۔ شاہ اولیار حسینی الحسنی جعفری الجیلانی غالباً یہ وہی اولیار ہیں جو فیاض مصنف منصور نامہ (۱۱۸۵ھ) مرید سید شاہ منصور حسینی کے دادا پیر تھے۔ شاہ منصور کی ایک تصنیف فارسی مطلوب العاشقین کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔ ان کے والد کا نام، ... حیدر حسینی اور ان کے مرشد کا نام شاہ اولیار لکھا ہے شاہ اولیار نے ابوشحمہ کے قصہ کو جس کو نعمت اللہ نامی نے بزبان فارسی سو برس کی عمر میں لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ اولیار نے کیا ہے۔ جس کے چھ سو ساٹھ ابیات ہیں۔ اولیار محض مذہبی شخص نہیں بلکہ سخن سنج اور سخن فہم تھا۔

حمد و نعت، مدح صحابہ مدح گیسو دراز اور تعریف سخن مدح سلطان ابوالحسن کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے:

آغاز:۔

الٰہی مرے دل میں توں گیان دے
ہمیشہ جو مجھ میں ترا دھیان دے

تعریف سخن:۔

سخن تے ہوئے ہیں جو عاقل بشر
جتے جو حیراں ہیں یو کامل بشر

سخن یوں ہوا ہے سبھوں میں امام
سخن سوں ہوا ہے درود ہور سلام

بزرگی جو پایا تد ہاں تے سخن
سخن سوں ہوا ہے دُر دُنا رتن

سخن خوب ہے سب جواہر تے
کہ بہتر ہوا ہے اچھے کھن سے

عبداللہ ہاشمی!

مصنف کے حالات تاریکی میں ہیں، اپنی تالیف دور مجلس میں اس نے اپنا نام عبداللہ لکھا ہے اور یہ بھی اس کے دو تخلص تھے۔ یعنی ہاشمی اور عبداللہ۔ اس کے باپ کا نام حافظ علی اور تخلص مطلبی تھا۔ بلحاظ زبان عبداللہ دکھنی شاعر تھا، غالباً اسی کے والد ماجد کی ایک غزل ہم کو مدراس کے کتب خانہ سعیدیہ واقع حیدرآباد سے ملی تھی۔ جس کے دو شعر یہ ہیں :-

مطلع :-

دل میں مجھ یار یوں رہے پنہاں
گل میں مہکار جوں رہے پنہاں

مستالبی کی زباں میں یو فن ہے
سار میں وار جوں رہے پنہاں

عبداللہ نے درالمجالس مولفۂ سیف ظفر نوبہاری کا ترجمہ کیا ہے۔ جس کا ایک قدیم نسخہ مکتوبہ ۹۷۸ھ کتب خانہ بانکی پور پٹنہ میں ہے۔

آغاز :-

کہوں میں باب نادر تین اوپر بیس
کیا ہوں ترجمۂ در مجالیس

عدن سوں فارسی در عجایب
پرو دیا نظم دکھنی کے غرایب

مرا ہے نام عبداللہ کمینہ
نظم کے بحر پر دل ہے سفینہ

الہٰی کر منجے غواص البحار!
سخن مجلس میں لیاؤں درِ شہوار

مرے دل کے صدف کے کاڑ موتی
نظم کے در بندوں گا میں زباں تی

وزن لیا پھول بند کا خوب خالص
کہوں گا بعد ازاں در مجالس

اول باب آدم کا لطافت!
دیا یک فیض مانی کوں شرافت

خاتمہ کہ در مجالس ہوئی ہے تمام
بحق محمد علیہ السلام

حکایت یوسف علیہ السلام کے بعض دلچسپ اشعار
یہ ہیں۔

زلیخا جب دیکھی یوسف کا سپنا
شروع اس دن سے ہے رونا و تپنا

یوسف کے عشق میں جانے جلائی
بوڑھی پن کا اپس کے داغ کھائی

گنواں نیناں ہوئی تھی کو بڑی زال
مصر کا ملک کھو کر سب گنواں مال

زلیخا نے سو یک دن ہانک ماری
یوسف کے میں لگن کی ہوئی بھکاری

قسم نیناں بجتر پانی جاپیا تھا!
زلیخا کا درد ناکیوں جلا تھا!

اپس میں بولتی تھی میں بوڑھی زال
ولیکن عشق سے دل ہیں مرے لال

سید میراں حسینی

مترجم کوک شاستر جامی تصنیف: ۱۰۳۵ھ

مولف اردوئے قدیم نے اس کو ایک مقدس بزرگ سید میراں حسین ابدال حموی قادری سے منسوب کیا ہے۔ جو سخت غلطی ہے۔

میراں حسین، حضرت غوث اعظمؓ کی اولاد سے تھے اور بزمانہ ابراہیم قطب شاہ وارد گولکنڈہ ہوئے سنہ ۱۰۴۹ھ میں وفات پائی، مزار شریف لنگر حوض۔

مگر آپ کی کسی دکنی تصنیف کا ذکر نہیں ملتا۔ اگر صاحب موصوف ترجمہ بھی کرتے تو کیا ایسی فحش کتاب کا۔ جو آپ کی شان اقدس کے شایان شان نہیں۔ یہ کوئی دوسرا شخص میراں حسینی ہے۔ پھر مترجم کا یہ بیان ہے کہ عبداللہ قطب شہ کے زمانہ میں سید حسین الملقب بہ لاڈلے حسینی کی فرمائش سے اس نے کوک شاستر کا ترجمہ کیا ہے۔ اور تحفۃ العاشقین نام رکھا —— اس کتاب فارسی کا ایک اور ترجمہ متاخرین میں عاصی تخلص نے کیا ہے۔ جس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

ابتدا

خدا نام کرتا ہوں میں ابتدا
کہ قدرت سوں اس کے ہوئے دوسرا

بہوت مہوشاں اس نے پیدا کیا
خط دل پسند رنگ زیبا دیا

ہر اک صورت گل کوں دی رنگ و بو
ہر یک کوں دی اخلاقِ پاکیزہ خو

خاتمہ :-

ہزار دسی د پنج میں یہ کتاب
ہے ہندی زباں سوں ہوئی انتخاب

کہ میراں حسینی مرا نام ہے
مخلف مسمّٰی سنے عام ہے

مترجم غواصی کا معاصر ہے ۱۰۳۵ھ کے زمانے میں ایسی صاف اردو کچھ مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔ الخ

*

سیّد بلاقی

قدیم اُردو میں معراج نامے :-

عادل شاہی دور میں قدیم اردو میں تین معراج نامے لکھے گئے، بلاقی، مختار، اور فتاحی - بلاقی کا معراج نامہ ایک ہزار بیت پر

مشتمل ہے۔

بلاقی کے بعد، دوسرا معراج نامہ بیجاپور کے دوسرے شاعر محمد مختار نے لکھا، جو ۱۰۹۴ھ کی تصنیف ہے۔ اس نے واقعات معراج کو بڑے لطافت سے بیان کیا ہے تیسرا معراج نامہ فتاحی کا ہے جس نے مختار کے ایک ہی سال بعد ۱۰۹۵ھ میں لکھا ہے۔ جس کے بارہ سو ابیات ہیں۔

بلاقی کا وطن بعض نے گولکنڈہ، اور کسی نے حیدرآباد لکھا ہے۔ مگر اس کے متعلق کوئی سند پیش نہیں کی گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کا تعلق بیجاپور سے تھا، اور یہ دھرآر فانی کا معاصر تھا جس نے فارسی میں ایک معراج نامہ لکھا تھا، اسی کی تقلید میں بلاقی نے معراج نامہ لکھا ہے اس کا صحیح تصنیف بقول مولف ۱۰۶۵ھ ہے۔ فہرست ادارۂ ادبیات میں ۱۰۸۰ھ درج ہے۔ جو صحیح نہیں ہے سے

ہزار ایک پنج شصت تھے سال میں
۱۰۶۵
سو اتوار کے روز خوش حال میں

یہ معراج نامہ بڑا مقبول رہا ہے۔ اس کے بیشتر نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ یہ معراج نامہ مدراس میں بھی مقبول رہا ہے۔

بلاقی نے معراج کے ثبوت میں ایک یہودی کا معجزے

انکار اور اس کا عجیب قصہ اس کا دریا میں غوطہ لگانا،
اور کسی دوسرے شہر میں برآمد ہونا، اور وہاں سالہا سال رہنا
حتیٰ کہ شادی کرنا اور اہل و عیال سے بہرہ ور ہونا۔ پھر دریا
میں غوطہ لگانا اور اسی مقام پر اور اسی سابقہ وقت میں پہنچ
جانا گویا زبان کی قید سے وہ آزاد تھا۔

معراج نامہ بلاقی:

ابتدا:

اول نام اللہ بولوں ابد　　ثنا ہو صفت میں کروں بے عدد

در صفت رفتن معراج گوید:

سو اس وقت محمد مدینے بھتر
سوتے تھے سو اپنے بچھانے اوپر
بی بی عائشہ کے سو گھر کے بھتر
سوتے تھے محمدؐ سو حجرے بھتر
محمدؐ کی تھی عمر اس وقت پر
یکاون برس کی نبی کی عمر
کہ ہجرت سے ان کے برس بار کوں
چلے تھے محمد سو معراج کوں
خدا نے نبی کوں سو دیکھن بدل
جتا عرش و کرسی بنایا سگل

لہ واقعہ معراج ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں پیش آیا اور حضرت رسالت مآبؐ حضرت ام ہانی
کے مکان میں محو استراحت تھے (مدیر)

اٹھانا دا از غیب رب الجلیل
کہ اس وقت حاضر اتھا جبرئیل

کھڑا اتھا فرشتہ بڑے بار کا
حکم یوں ہوا اس کرنہار کا

نبی کن چلیا جا ادھرات ہے
بلا لیا نبی کوں جو کچھ بات ہے

سٹیا او فرشتے نے سات آسماں
کر آیا نبی کن سوا وبے گماں

دیکھا کیا محمد مو سک خواب میں
ستے تھے خوشی سات مہتاب میں[1]

ادب سوں کھڑا رہ کیا فکر یوں
ستے ہیں نبی میں جگاؤں سو کیوں[2]

کہ جبریل آہستہ پگ لاگ کر
چومی جب انگوٹھا اُٹھے جاگ کر

انکھیاں کھول دیکھے تو جبریل ہے
کر آیا ادھرات کیا کام[1] ہے

جو کچھ حق کیرا اس کو فرمان تھا
بیان واں او سب نبی کن کہیا الخ

[1] ستائیسویں رجب کو مہتاب کہاں تھا؟ (مدیر)
[2] قافیہ غلط ہے (مدیر)

محی الدین فتاحی

محی الدین، فتاحی یا فتحی، دو طرح تخلص کرتا ہے۔ اس کا وطن بیجاپور تھا یا گولکنڈہ، کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ بلحاظ زبان اور سنہ تصنیف مولود نامہ ۱۰۵۵ھ قطب شاہی دور کا شاعر ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیری زمانہ بھی دیکھا ہے۔

ان کی کئی تصانیف ہیں:۔ مولود نامہ فتاحی جس کا ایک نسخہ سب سے پہلے عبدالوہاب مسلم ضیائی نے اُردو کانگریس، منعقدہ حیدرآباد ۱۹۵۳ء میں پیش کیا تھا۔ اور اسی کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے، دوسرا کتب خانہ مفید الیقین کے نام سے سالار جنگ میں ہے۔ نیز فقہ میں ایک اور تصنیف خاصۃ الفقہ بھی کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ نیز ایک اور رسالہ معجزات نبی کے عنوان سے کتب خانہ سالار جنگ میں ہے۔ جس میں معراج نامہ، مولود نامہ، عقد خدیجہ رض، قصہ غار حرا، وغیرہ ہیں۔

مولود نامہ:۔ کروں وضو سوں در فشانی تجے
دھروں عجز تیچ سنانی تجے

معراج نامہ :۔

آ جبریل لب سوں ان کو بلا
سو تم تم حبیب یو تجھے آبلا

جو لیائے تھے براق جیوں برق بہار
تو سلطاں چڑا اس پہ ہے شہسوار

کے سوں چلیا بیت مقدس کتیں
او لنگ کر چڑیا سات اسمان دیں

قصہ عقد از خدیجہ رض :۔

نبی نے عمامہ بندی سر دری
پنے تن پہ جامہ سو پیغمبری

بلند قدر تھی لیلتہ القدر سوں
جھملتا اچھے موں پہ مہ بدر سوں

سیہ زلف واللیل لغیشیٰ کی جوں
منور جبیں والضحیٰ کی سو تیوں

سو خوش موں اتھا نور پہ نور جوں
ہزاراں سوں شرمندے ہوئے نور سوں

عجائب بھواں دونو کا دور ریک
یو دو جگ سو اس کا چہ نقطا ہے ایک

دو جدول سو دو لب دریا قوت تھے
دو عالم کے تب روح کا قوت تھے

ﷺ

چھوڑے زلف مشکیں تھے خام او
سگل عاشقاں کے مگر دام او
پون ہو کر فراش آیا شتاب
لے آیا سقا ہو کر شبنم نے آب
خدیجہ کے دروازے انپڑے جدال
انگے ہوی لوگ ان کے آئے تداں
لے آئے ہزاروں طبق ہات میں
محمدؐ پہ وارے ہیں اس سات میں الخ
(مخطوطہ ۱۲۹ سالار جنگ)

فتحی کی ایک دکنی غزل بطرح بابائے ریختہ ولیؔ بھی ایک بیاض میں ہے جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

کیا ہے عشق مجھ دل میں اثر آہستہ آہستہ
کہ جوں پانی ستی گلتی شکر آہستہ آہستہ
شراب حسن دلبر نے کیا تھا سیر دل اندر
ہوا رگ رگ منے ظاہر اثر آہستہ آہستہ

ﷺ

شاہ سلطان ثانی قدس سرہٗ

شاہ سلطان ثانی، ایک قدیم دکھنی شاعر ہیں، جن کے صحیح حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ بعض اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ سلطان، میراں معروف کے خلیفہ اور شاہ من عرف کے معاصر تھے۔

افضل گولکنڈوی محی الدین نامہ میں اس طرح لکھتا ہے۔

ڈٹیے است پنجہ بھرے سات میں
دئے منج کوں سلطان کے ہات میں
کہ افضل خلیفاں میں معروف شاہ
لیوے نانوں اس کا تو جاوے گناہ
کہ سلطان مرشد ہے روشن منیر!
کیا عاشقاں میں سو منج کوں امیر

آپ کی ایک فارسی تصنیف "کشف الطریقین" سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب ایک متبحر عالم اور ایک محقق صوفی تھے۔ جنہوں نے ریاضت و مجاہدہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی،

لہ:۔ محی الدین نامہ مملوکہ احقر قلمی

اور اسی طرح پنیتیس سال گزارے۔

شاہ صاحبؒ کا زمانہ وفات آخر گیارہویں صدی ہجری معلوم ہوتا ہے

معاصرین شعرا میں شغلی بیجاپوری دو جہی و غواصی اور شاہ افضل گو لکنڈوی قابل ذکر ہیں۔ جن کی زمینوں میں آپ کی بعض غزلیں موجود ہیں۔

تصنیفات :۔

(۱) دیوان سلطان (دکنی) کا ایک مخطوط کتب خانہ آصفیہ میں ہے، دوسرا کتب خانہ انجمن ترقی کراچی میں موجود ہے

(۲) زنجیرہ شاہ سلطان (نثر دکنی) کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔

(۳) کشف الوجود۔۔ تصنیف قبل ۱۱۰۰ھ

(۴) رسالہ درالاسرار، نثر دکنی۔ کتب خانہ وادا زادیات میں موجود ہے۔

(۵) معراج نامہ شاہ سلطان کتب خانہ (انجمن ترقی اردو علیگڑھ) میں ہے (تالیف ۱۰۸۰ھ)

(۶) کشف الطریقین فارسی۔ مخطوطہ کتب خانہ شیخ علاءالدین صاحب گلبرگہ شریف۔ تاج الامرا (والاجاہ) کے کتب خانہ کی مہر ثبت ہے۔

مخطوطہ دیوان شاہ سلطان کتب خانہ آصفیہ میں جملہ
۷۸۴ غزلیں ردیف دار ہیں۔
انتخاب کلام شاہ سلطان سے

اوس پاک عشق باز کوں جب نہ اثر ہوا
تب نور ذات جوش ہوا ز گنج بر ہوا
تس نور ذات نام رکھیا احمد وصفات
سو وصف کی زباں ستی کن کا اچھر ہوا
سلطان تر جگت کا ہوا ہے نزول آج
او کچھ ہنر کیا سو ہنر ییں ہنر ہوا

کد کی آکا برخند مد | پینے کوں گھر خالا نہیں
لیکن یو نہہ مدپیو نے | مج خانہ خالا ہوا

ہوا ہے عشق تو پرگٹ اتا اسکوں چھپا نا کیا
قدم لیا عشق میں راکھے تو پھر پیچھے ہٹانا کیا
اتھا سلطان سو شاہی جو لٹ معشوق کی خاطر
لئے وتیاگ تو پھر کر خوشی سوں دل لگانا کیا
معشوق کے رخسار پہ عاشق ہوئے قربان دسلے
نت زلف کے چو منچ میں اب جیو کوں لٹکانا بھلا

حافظ شیرازی کے رنگ میں ریختہ قدیم سے

نیناں بھنور ہو گم رہے بر بوئے مستانِ شما
گویا کہ چک کر اریتاں کر دیم قربان شما
سنہ پڑا ئیا مجھ جیو کوں تجہ زلف کی زنجیر نے
ہور دل کتیں غوطہ دیا در چاہ زنخدان شما

فارسی ترکیبیں :-

مج عاجز کے اوپر دل غضب انگیز نکو کر
تج زلف کے پھاندے میں دلآویز نکو کر
قصاب نمن مج دلِ مسکیں کے اوپر توں
تج ناز کے چھنداں کی چھوری تیز نکو کر

میخانہ میں تج زلف کے تسبیح آکر گل پڑی
میخوار تھا اول ایتا اس کے سبب زاہد ہوا

تجہ حسن کے خورشید کا تر لوک میں تابش پڑے
ہور شام کوں بھرنے خیا تج رخ کا یک جھنکار بس
اگر ہونا مسلمانی تو ہو ایمان سوں فارغ
ہوس ہے عشقبازی کا تو ہو تن جان سوں فارغ

امیر خسرو کی طرح :۔

سنگار کر اب گھر ستی نکلیا ہے خوباں یک طرف
ہر ڈگ میں جھمکے یک طرف کر چل کے ناز یک طرف
یوں قتل کیتا تیر جا سد یک طرف بد یک طرف
سر یک طرف، پا یکطرف تن یک طرف جاں یک طرف
او تیر میرے تن منے ٹکڑے ہوا یوں جا بجا
سوفار اس کی یک طرف ہور چوب پیکاں یک طرف
سنتیچ لوگاں یو بیاں گم ہو رہے ہیں طرف
بن تاب ہو بے خود ہوا سلطان حیراں یک طرف

؎

حافظ شیرازی کے رنگ میں عجب سوز و گداز کی غزل کہی ہے۔
سوال و جواب راز و نیاز :۔

گفتم ترا قربان ہوں، گفتا کہ کئی قربان ہیں
گفتم کہ تیرا رحم کن، گفتا کہ چندے جان ہیں
گفتم بہ سوز عشق تو جلتا ہوں نت تندور ہو
گفتا کہ کئی جل راک ہیں، ہور بے گنت بریان ہیں
گفتم کہ از تیرے ترا چلنی ہوا ہے مج جگر
گفتا ہزاراں عاشقاں تج سار خوش ہنساں ہیں

گفتم کہ از بہرِ بت سلطان سو گشتم گدا !
گفتار کہ عاجز ہو کتے ہم دار ادبِ سلطان ہیں

ضرب الامثال :-

چونہ صاف کیئے تو کچھ نہ بنے
صد چمکنا تے اندلا عاجب نظر ہوئے

چونا صاف کرنے سے کہیں کچھ ہو سکتی ہے !
سو گنا چمک ہو تو کیا اندھا ، بینا ہو سکتا ہے ؟

فارسی عربی تشبیہات میں تصرف -
زلف ظلمانی - مژگ یکانی - نیاز سحرانی - (سحرنما پرندہ پرفن)
تک اضافت :- تل بھنور - قدم نرگس - ند بلبل ، رخت گل گل -

ہندی ترکیبیں :
نین محل - نین منگل - کنج نین - نین جھاری - بہری کے لڑے -
(بحری پرندہ) پلک جھجر - (پلک کا چھجہ) تک کاڈل - (ڈولا)

محاورے :-
دوا چھر بڑانا - (دو بول بڑھا دینا) جھجر کرنا - چھلنی کرنا
قصیدہ کرنا - بدگانا - (سکہ مضروب کرنا) سدا رانبا
(ہمیشہ رانبا) - ہوس کی پوٹ - منگل گاتا -
اضداد :- دوھاگن ، سوھاگن - پیا ملیں جن سوہے سہاگن جیسے
پیا نین ملے ووے دوھاگن وغیرہ لسانی نقطے سے بھی دیوان سلطان
اہمیت کا حامل ہے -

ترجمہ "پدماوت"
از
غلام علی گولکنڈوی

غلام علی نام تھا، سلطان ابوالحسن تاناشاہ (۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۸ھ) کا معاصر تھا۔ اور سنی المذہب تھا۔ ہندی زبان پر عبور رکھتا۔ چونکہ ہندی عام زبان نہ تھی اس لئے اس نے ملک محمد جائسی کی ہندی مثنوی "پدماوت" کو دکنی زبان میں منتقل کیا۔ اور ہندی الفاظ کے بجائے دکنی مروجہ الفاظ استعمال کئے۔ اور بعض جگہ خیالات میں بھی تصرف کیا ہے۔ اور اپنی ذاتی رائے اور اخلاقی نتائج کا بھی اظہار کیا ہے۔ گو اس کا ترجمہ معیاری نہیں کہا جا سکتا، مگر اس کی شاعرانہ قابلیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

چلیا اوڑ کے سات دریا گزر
تماشے جو دیکھتا ہر یک ٹھار ٹھار
بنگالے میں یک خوش بدغ تھا
جو جنت کی دل رشک سوں داغ تھا
اتر واں لگیا سیر کرنے کیتیں
جو میوے کے جھاڑاں پہ پٹنے کیتیں

وہاں کی قدیمی جو رالوی اتھی
ہیرامن کوں دیک آئی ملنے وتی

دیکھی جوں یہ ہے بھوت شیریں کلام
ہوئی بھوت خوشحال رالوں تمام

منگا کر ہیرامن کوں پوچھیا یہ بات
کہیا سر بسر سب مہاراج سات

کہیا میں یہ مطلب کتیں پائیا
بجو میاں کہے سو بجا آئیا

کہانی کا نتیجہ :-

غلام علی جس کے تیں ہے حیات
جیئے حق کی توفیق سوں کرئی دھات

اگر جاوے گا باگ کن دھیٹ کر
کھڑا ہوں پھرا اس طرف پیٹ کر

پڑے جا اگر آگ میں ناگہاں
ہووے او اگن اس اوپر گلستاں

(یعنی انسان کو ہمت کی ضرورت ہے)

پ

داؤد شاہ خاکی

داؤد شاہ نام تھا۔ خاکیؔ اور فناؔحی دو تخلص کرتے تھے۔
چونکہ ان کی دکنی تصنیف قصۂ "زلیقوم بادشاہ"، سنہ ۱۰۹۲ھ
کی تصنیف ہے اس لحاظ سے یہ ابوالحسن تانا شاہ کے معاصر ہیں۔
حیدرآباد میں دو بزرگ ہیں ایک خاکیؔ شاہ مرید قادر لنگا،
جن کا وصال سنہ ۱۱۳۰ھ میں ہوا۔ مدفن کنارہ تالاب الموسوم
بہ سین ساگر، عرس ہوتا ہے۔ یہ شاہ معظم کے پیر بھائی تھے۔
جن کی دکنی میں کئی تصانیف ہیں۔

دوسرے داؤد بادشاہ معاصر آصفجاہ اول، وفات
تقریباً سنہ ۱۱۵۰ھ۔ بہرحال کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکتی
ممکن ہے یہ خاکی شاہ حیدرآبادی (المتوفی ۱۱۳۰ھ) مذکورالصدر
ہوں۔ بلحاظ سنہ وفات کچھ تائید ہوتی ہے۔

قصۂ زلیقوم کے تقریباً ایک ہزار بیت ہیں۔ اس میں
ایک بادشاہ زلیقوم نامی سے جو کسی جزیرہ پر حکومت کرتا تھا۔
جہاد اور تبلیغِ اسلام کے واقعات درج ہیں۔ متن میں نام
اور تخلص بھی درج ہے۔

میرا ناوں داؤد شاہ ہے اگرچہ لیک   تخلص ہے خاکیؔ کا غزلاں میں دیک

مثنوی میں فتاحی تخلص تھا۔ کہتا ہے ؎

شفا فتاحی کوں دے بقا سوں
سدا دیوے اس اپنا لقا سوں
ہزار اوپر نود دو اگل تھے سال
شمار اتنا رہے ہجرت کا حال

خاتمہ :-

کیا اتمام فتاحی خلاصہ
اچھوتے عشق فتاحی کا خاصہ

محمد امین

محمد امین نے بھی زلیخا نامہ لکھا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۰۹۲ھ ہے۔ یہ بھی قطب شاہی آخری دور کی پیداوار ہے۔ اپنے نام کے متعلق کہیں تو اس نے دو جگہ ولی بن محمد امین لکھا ہے۔ اس مثنوی کے تقریباً بارہ سو اشعار ہیں۔

آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

کہوں حمد اول میں سبحان کا
جو پیدا کرنہار رحمان کا

تخلص سے

ذکر بن محمد آمین تو فکر

مجھے اولیا سب کئے ہیں نظر

جنگ کے نقشے اوسط درجے کے ہیں۔ اشعار یہ ہیں۔

حضرت علیؓ زیقوم کو مغلوب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

پکڑ ٹانگ کھینچے اوسے زین سو

کہے بول کلمہ اے بے دین تو

کہاں ہے او زیقوم سلطان او

کہاں ہے خراساں ملک مال او

سو یوں بول اوس کو پچھاڑے مگر

چڑھے تب شہنشاہ سینے اوپر

لئے تیغ کو ہات میں ہو غضب

دیئے حلق پر طعون کے یے ضرب

ہوا گھابرا ہور اتکھاں بیسار

کہا یا علی تم سنو شہسوار

مسلمان ہوتا ہوں اب باشرف

ذبح منجہ نکرنا بے اے باشرف

الخ

بیجنی

قاسم علی

تیسرا ذلیقوم نامہ، قاسم علی کا ہے۔ سنہ تصنیف نہیں ہے اس لئے کہ نسخہ ناقص الآخر ہے۔ تب بھی اس کے تقریباً سات سو بیت ہیں۔ بلحاظ زبان آخر گیارہویں صدی کا معلوم ہوتا ہے۔

ابتدائی شعر یہ ہے ؎

کروں وصف اول سو پروردگار
جکچہ تھا سو پنہاں کیا آشکار

خاتمہ :۔

بھی تینوں پسر کو مسلماں کئے
جکچہ حق اتھا سو دکھلا دیئے

ڈ

آٹھواں باب

قدیم اردو نثر

خواجہ گیسودراز

ان کی اہم تصنیف قدیم اردو نثر میں معراج العاشقین ہے جو طبع اور شائع ہو چکی ہے۔ اس کا سب سے قدیم نسخہ سنہ [illegible]ھ کا لکھا ہوا ہے۔ چونکہ اس کے حوالے آپ کے ایک مرید شاہ عبداللہ ابن عبدالرحمن چشتی کی فارسی تصنیف وجود العاشقین میں ملتے ہیں اس سے حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ کے تصنیف ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔

دوسری ایک خاص چیز یہ ہے کہ معراج العاشقین میں جو اصطلاحات، واجب الوجود، ممکن الوجود و ممتنع الوجود اور عارف الوجود اور متوکل جبرائیل و میکائیل و اسرافیل و عزرائیل ملتی ہیں وہ خواجہ بندہ نواز قدس سرہ کے سلسلہ کی خاص تعلیم ہے۔ اور اس کی تعلیم و تربیت کی اشاعت کرنے والے حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم تھے جن کی تعلیم کو شیخ محمود چشتی،

خلیفہ شاہ برہان نے، اپنی تصنیف معرفت السلوک میں قلمبند کیا جس کا دکنی ترجمہ شاہ ولی اللہ ابن شاہ حبیب اللہ نے کیا تھا اور اس سلسلہ کی اکثر کتابوں میں اس قسم کی اصطلاحات ملتی ہیں۔ حضرت شیخ محمود چشتی المعروف شیخ محمود خوش دہاں نے تالیف مذکور کا بار بار اشارہ کیا ہے کہ یہ اصطلاحات ہمارے شیخ کی وضع کردہ ہیں :-

(پیر طریقت، قدس اللہ سرہٗ العزیز در اصطلاح خود)

ایں جسم خاکی را واجب الوجود نام نہادہ اند۔

واجب الوجود: تن جسمانی خاکی و روح نباتی و موکل میکائیل

ممکن الوجود، تن روحانی و روح متحرک و موکل اسرافیل و بعضے صدّاد

ممتنع الوجود، تن ظلمانی، و روح ناطقہ و موکل عزرائیل " "

عارف الوجود، تن نورانی و روح قدسی و موکل جبرئیل " "

سید شاہ کلیم اللہ نے اپنے والد ماجد ابو الفیض بیدری متوفی (۸۷۹ھ) کے ملفوظات الموسوم بہ شوائل الجمل (۸۲۴ - ۸۷۹ھ) میں بعض ہندی الفاظ اور فقرے خواجہ بندہ نواز کے لکھے ہوئے ہیں :-

خواجہ صاحب رح نے فرمایا۔ بہ خواجہ بہاؤ الدین بزبان ہندی گفتند تبسم کناں بہاؤ الدین' جو لہائے کوں پانچ پتیں بھائی' یعنی ہر کس را کار خود و کسب خودش شیریں آمد" آں در خانہ او آمدند کندوری مرتب شدہ بود صوفیاں سماع شنید ند۔

ملفوظ ۹ محرم جمعہ :۔ ایک اخی جمشید قنوج میں وزیر کے ملازم تھے۔

برائے کندوری لشکریان خویش را طلب نمود اخی نیز میرفت دربان منع کردہ دھکہ زد" چوب ہم زد..... آپ اس سے بہت متاثر ہوئے نوکری چھوڑ کر فقیر ہوئے۔

ایک مرتبہ اخی نے کہا:۔ اخی گفت بزبان خویش " نہ بہد رو جونہ مو وجو" یعنی کسے را زن بچہ باشد بدہ؛ اور را فرمودند آں تھانہ دار خواجہ را بود نہ زن و بچہ نداشت بازم زاحم شد و گفت کہ چیزے قبول کنید اخی گفت "جس کا ہوں ہو کر رہوں" صہ۲

شکار نامہ مصنفہ خواجہ بندہ نواز قدس سرہ (۸۲۵ھ)

حضرت خواجہ صاحب قدس سرہٗ نے ایک شکار نامہ فارسی زبان میں ضرور لکھا ہے۔ اور معمہ میں اسرار و معارف کے دریا بہا دیئے ہیں۔ جس کی کئی شرحیں، مختلف اکابر صوفیا، اور محققین نے لکھی ہیں۔ جو طبع اور شائع ہو چکی ہیں۔ اس کا قدیم اردو ترجمہ بھی آپ کی طرف منسوب ہے۔ قطعی طور پر نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا ترجمہ خود حضرت خواجہ صاحب علیہ الرحمہ نے کیا تھا، کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ زبان قدیم ہے۔

نمونہ:۔ یو رسالہ بات کی بات کرامات ہوئے۔ کاننے پر تین تالاؤ اس میں دو سوکے، ایک میں پانی نہیں۔ وہاں بسائے تین گاواں، دو اوجاڑ ایک بستا نہیں، وہاں بستے تین کمہار دو لولے، ایک کا ہات نہیں۔ گھڑے تین ہانڈی، دو پھوٹے یک کا تلا نہیں، اس میں پکائے تین چاول، دو کچے ایک پکیا نہیں۔ الخ

اس کی شرح بھی کسی دکنی بزرگ محمد وفا نے بایماء سید بنود (چنو)
الموسوم بہ "جنونیت کی سنہ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا یہ خواجہ محمد وفا،
میر ابوالعلا اکبر آبادی کے خلیفہ تھے جو اورنگ آباد آگئے تھے۔

تمہید: این کلام ہندی خواندند و تکلیف کردند کہ معانی
کلام بگویند۔
بات کی بات کرامات کی کرامات ایک کانٹے کی انی پر تین تلاؤ
"سہ حوض"

تیسری کتاب :۔ تلاوۃ الوجود (نثر دکھنی) بھی خواجہ گیسو دراز قدس سرہٗ سے
منسوب ہے۔ اور مشتبہ ہے۔ ہماری نظر سے اس کے کئی نسخے، مختلف نام
کے گزرے ہیں۔ مثلاً: سوال نامہ، مخدوم شاہ حسینی بلکانوری، دوسرا
نسخہ تلاوت الوجود مصنفہ شاہ حسین لاہوری رہنما۔ تیسرا نسخہ، مراۃ العارفین
مصنفہ مخدوم شاہ حسین رہنما لاہوری۔ جن کے مضامین، وہی ہیں، جو خواجہ
صاحب کی منسوبہ تلاوۃ الوجود کے ہیں۔

سوال نامہ کا ترجمہ ہے :۔

"این رسالہ تلاوۃ الوجود و تحقیقت المعراج المحبوب"
"لم یلد ولم یولد تصنیف مخدوم شاہ رہنما خانوادہ چشت
اہل بہشت وطن درد کھن"
"دار الظفر بیجاپور، جانشین محل رائچور، پرگنہ کوتال ساکن
قصبہ بلکانور"

آغاز :۔ بعد تسمیہ وحمد :۔ "ولا اللہ الخلق والامر" اس کا معنیٰ
خدا لکھیا تھے مجے بوجھو، میں تمنا پیدا کیا پراے امر تمھارے پو ہوا
اد امر خدا کا ہوا ۔ الخ

خاتمہ :۔ قولہ تعالیٰ کل شیئ ھالک
الاوجھہ ، اس کا معنیٰ جو کچھ لو دیکھا سو اوچہ جائیگا
تو تیری ہلا کی سریکا ۔

مخطوطات سالارجنگ ۲۱۳, ۲۷۸, ۶۳

مخدوم شاہ حسین رہنما، لاہور کے باشندے تھے جو بیجاپور آگئے
تھے، اور حضرت امین الدین اعلیٰ بیجاپوری (۱۰۸۶ھ) کے صاحبزادے
شاہ بابا حسینی کے مرید تھے ۔ اور تلاوۃ الوجود مراۃ السالکین مخطوطات
آصفیہ میں مصنف کے مرشد کا نام، اس طرح لکھا ہے ۔

"مخدوم شاہ حسینی رہنما لاہوری مرید شاہ پیر اندر حسینی کرنولی
خلیفہ میراں جی خدا نما"

مگر تلاوۃ الوجود کا ایک مکمل مخطوطہ ۔ مجھے بمقام بیدر شریف قدیم پایۂ تخت
سلطنت بہمنیہ ملا تھا۔ جس کا نام اس رسم الخط میں ہے، "تلاوتِل وُجُودْ"

ابتدا، " ھول اول ھول آخر ھول ظاھر ھول باطن"
فرمایا اللہ تعالیٰ :۔ مینچہ ہوں اول مینچہ ہوں آخر اور ظاہر بھی مینچہ
ہوں اور باطن بھی مینچہ ہوں ۔ الخ

خاتمہ : حدیث نبوی ۔ قلب المومن من حاضرۃ من ذکر

المخفی فھو حُسینی۔۔۔

"نبی صاحب کہے اس تن کی نسبت چھوڑ کر دل کو اینٹر کر دل میں خدا کو یاد کرتا سو وہ جیتا ہے۔"

ترجمہ۔ از تصنیف خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی عفی اللہ تعالیٰ۔

"نسخہ مولوی اسمٰعیل شریف صاحب ساکن رکن گاؤں تعلقہ نلنگہ شریف" (بیدر)

کسی کی ایک مہر "بقا و بقا نور"

۴

سید شاہ اکبر حسینی عرف میاں بڑے

سید شاہ اکبر حسینی عرف میاں بڑے۔ ابن خواجہ سید محمد گیسو دراز قدس سرہٗ۔ (ولادت ۷۶۳/۷۶۴ھ وفات سنہ ۸۱۲ھ) بڑے صاحب وجد و حال اور عالم متبحر تھے، ۸۰۲/۸۰۴ھ میں والد بزرگوار کے ملفوظات الموسوم بہ جوامع الکلم ترتیب دیئے۔ فارسی میں آپ کے تصنیفات عقیدہ۔ شرح تفسیر ملتقط، تبصرۃ الخوارقات، رسالہ اذکار (عربی) مشہور ہیں۔

تبصرۃ الخوارقات میں بعض الفاظ اردو مثلاً، ڈنڈے باژی، سمندر سوکھ، اور رسالہ اذکار میں بعض ہندی اذکار، حضرت بابا فرید گنج شکر قدس سرہ۔ درج کئے ہیں مثلاً :۔

اذکار ہندی سہ رکنی: اوہی ہے ، اسے ہی ہے - اے ہیں ہے .

(وہی ہے ، یہی ہے - یہیں ہے)

ذکر بزبان ہندی پنج رکنی :-

ایتھاں توں ، اینھاں توں ، ادھناں توں ، ادھناں توں

(یہاں تو ، یہاں تو ، وھاں تو ، وھاں تو)

اورنٹیل کالج لائبریری مدراس میں ایک قدیم بیاض (کرم خوردہ) شاہ اکبر حسینی کے نام سے بعض غزلیں موجود ہیں۔ بیاض کرم خوردہ و بوسیدہ ہونے کی وجہ سے پڑھے نہیں جاتے۔ بعض اشعار اور مصرعے یہ ہیں :-

سے حقیقت کی لگا عالم سوں تن من

چراغ معرفت کیتین روشن

ع لگا چوطرف قندیلاں ثنا کے

ع نین مہتاب ہو پائے اوجالا

سے عجب یہ رمز بوجھو راز کا یہ !

خیالاں کے پھنساخاں ایک چودھر

سے حسینی بادشاہ کر فضل و اکرام

کئے اکبر پو سب نعمت کوں اتمام

بعض مورخین نے خواجہ بندہ نوازؒ کی عرفیت "حسینی بادشاہ" لکھی ہے۔ (حدیقۃ الاولیاء قلمی)

مولوی ابو محمد عمر یافعی صاحب نے رسالہ مکتبہ میں کچھ کلام نظم و نثر

قدیم اردو، حضرت اکبر حسینیؒ کا شائع کیا تھا۔ بعض اشعار یہ ہیں :-

سو رنگ ستی جو کہنہ، تو یو سخن عبس ہے

عاقل کے تیں اشارت آشنائی یو سو بس ہے

بے پیرہیاں گے وارد کھانا اگر مرا تو!

ایمان سلب ہو تس مرتا ہے بے اہل سو

÷

شاہ اصغر حسینی عرف میاں لُہرہ

خواجہ بندہ نواز قدس سرہ کے صاحبزادے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ جامع علوم ظاہری و باطنی، اپنے والد بزرگوار کے مرید خلیفہ تھے۔ بمقام گجرات حضرت خواجہؒ نے مجلس عرس وسماع میں ان کو نذریں دلوائیں۔ اشارہ یہ تھا کہ یہی میرا جانشین ہوگا۔ مولانا علاء الدین دہلوی آپ کے خسر تھے۔ حضرت شاہ اصغر حسینی پر حالت استغراق کا غلبہ رہتا تھا۔ آپ نے ۸۳۲ھ میں وفات پائی۔ آپ کا گنبد مقدس روضہ خورد سے مشہور ہے۔

آپ کے ملفوظات الموسوم بہ محبت نامہ مرتبہ شاہ محمود فضل اللہ خلیفہ و داماد حضرت موصوف ہیں۔ شاہ اصغر قدس سرہٗ کی زبانی بابا فرید شکر گنج کے ہندی دوہرے منقول ہیں، الفاظ یہ ہیں :-

شیخ فرید الدین وقت بازگشتن ایں دوہرہ گفتند۔

لہ محمود فضل اللہ شاہ۔ محبت نامہ ملفوظات شاہ اصغر حسینیؒ قلمی آصفیہ۔

کہر کیتی سنگ مری میل سے ملیا کنتہ

سبا ویں کھنڈی چاہی جس بھاوے تس پنتہ

یعنی جو شخص بھی دوڑا، اس کے پیچھے پیچھے میں بھی دوڑنے لگا۔ اور جو شخص چلنے لگا تو اس کے ساتھ میں بھی چلنے لگا۔ پیر تھک کے چور ہو گئے۔ سر چکرانے لگا اور بیٹھ گیا۔ اس زمانہ میں ولایت کا بوجھ جس کو مناسب سمجھو دے دو۔ اور ولایت کا گھنٹہ جس کی گردن میں چاہو باندھ دو۔ میرا کام تو تمام ہو گیا۔

(ورق ۲۹۲ محبت نامہ قلمی۔ سنہ ابتدار تالیف ۸۴۳ھ)

غرض یہ کہ شاہ اصغر حسینی المتوفی ۱۲ر محرم سنہ ۸۳۲ھ کے ہندی دوسرے نوک زبان تھے۔

شاہ ندیم اللہ غالب کرامات: ابن شاہ ید اللہ عرف شاہ یدوؒ کے بیٹے تھے۔ ان کی وفات کا قصہ یہ ہے کہ ایک روز ان کے جد امجد شاہ محمد اصغر قدس سرہٗ، خربوزہ کھا رہے تھے۔ اس وقت آپ بھی پہنچ گئے، حضرت نے معلوم ہوتا ہے کہ مزاحاً نہیں دیا، تو بہت برافروختہ ہوئے اور زبان سے نکلا "اے جد میں مر گیا" اصل ہندی فقرہ یہ ہے:

"دادا موا ہمی ھاں موا۔ ئی مار یا شاہ"

لہ رفیع الدین شیرازی: تذکرۃ الملوک قلمی آصفیہ

یعنی دادا نے ہمیں مار ڈالا، مار ڈالا۔ اسی ملال سے بخار آگیا،
اور اسی میں انتقال ہوگیا۔

"۲۱ر شعبان ۱۲۳۱ھ سنہ وفات اور شہنشاہ ندیم اللہ"
(تذکرۃ الملوک قلمی)

جس سے ظاہر ہے کہ خواجہ صاحب قدس سرہٗ کے گھر میں بچہ بچہ
اردوئے قدیم میں گفتگو کیا کرتا تھا۔

سید شاہ عبداللہ حسینیؒ

بیان کیا جاتا ہے کہ سید عبداللہ حسینی نبیرۂ خواجہ گیسو دراز
قدس سرہٗ نے حضرت غوث الاعظم رضی کے ایک رسالہ "نشاط العشق"
کا دکھنی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ جس کا ایک نسخہ ٹیپو سلطان کے
کتب خانہ میں موجود تھا ـــــ مگر اب وہ ناپید ہے۔

ہماری تحقیق میں شاہ عبداللہ حسینیؒ خواجہ گیسو درازؒ کے کوئی
نبیرہ نہ تھے۔ البتہ حضرت خواجہؒ صاحب کے برادر نسبتی مولانا ابوالمعالی
ابن سید احمد مغربی کے صاحبزادہ سید شاہ عبداللہ حسینی مغربی مشہور ہیں۔
جن کو حضرت خواجہ صاحبؒ قدس سرہ سے خلافت حاصل تھی۔ جن کا
خاندان بیدر شریف میں اب بھی موجود ہے۔ اور مقبرہ بھی ہے ـــــ
"نشاط العشق" کے مترجم یہی معلوم ہوتے ہیں۔ "نشاط العشق" فارسی مؤلفہ

مولانا عبداللہ بن حسن بن علی المکی الحسینی کے مخطوطات کتب خانہ آصفیہ و ادارہ ادبیات و جامعہ پنجاب وغیرہ میں موجود ہیں۔ جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کے حالات اور ملفوظات پر مشتمل ہے۔

متن:- قال لی یا غوث الاعظم نم عندی لا کنوم من العوام ترای فقلت یارب کیف انام عندک۔ قال الی۔ خمود الجسم عن اللذات وخمود النفس عن الشہوات۔

ترجمہ:- کہا منجکوں اے غوث الاعظم سو میرے نزدیک مت سو عام کتے سوتے سری کا نکو دیکھ تو مجکوں، کہا میں اے پروردگار کیوں سوں نزدیک تیرے۔ کہا مجکو چھوڑ تیرے تن کی لذت ہور یعنی گزر نفس کی شہوت سے۔ ہور گذر دل کے خطریاں سے ہور گذر روح کی حرص سے ہور فنا ہونا ذات تیری ذات میں میری۔"

شاہ برہان الدین بیجاپوری

کلمۃ الحقایق: صفحات ۹۱ سطر ۱۶-۱۴

آغاز:- اللہ کرے سو وی کہ قادر توانا قوی کہ قدیم القدیم اس قدیم کا بھی کرنہار۔ ہنچ ہنچ سو تیرا اکتارا ادسیع ہور بھی تج تجنے

تجے بار! جدھاں کچ نہیں تھی تھی تھیں۔ دو جا شریک کوئی
نہیں ایسا حال سمج نا خدا اتی خدا کوں، جس پر کرم خدا ہدی
سبب ای زبان گجری نام ایں کلمۃ الحقایق خلاصہ بیان
تجہ عیاں روشن شود کہ انشاء اللہ تعالی خدا یتعالی تبارک
کیوں تھی و ذات و صفات و کل مخلوقات ابتدا و انتہا باقی
فانی و قدیم و جدید با ہمہ دیب ہمہ بدین سبب سوال و جواب
روشن کر دیکھلایا ہری۔

سوال: خدا یتعالی اول تھی، اول کیوں تھا۔

جواب: قدیم تھی قدیم اول تھی اول ایہیں تھا۔

سوال: کیوں تھا و کھاں تھا۔

جواب: بیچوں و بیچگوں تھا، چون وچرا نباید گفتن ولیکن ہستی باقی،
لاشک و لاشبہ۔

سوال: کھاں تھا کھیں تو تعلقات جا گا سول دھرتا۔

جواب: تبری بھی وقت سوں تعلق دھرتا تو ہر شے کا آفریدگا (دیچ بال
اور سب کا آفریدگا) استھی اول کا ہی اول اوہی پچھان، اول
آخر قدیم و جدید سب استھی بھی زبان ہوتا استھی بولنی بین آیا کہ اول تھی
ہی جملہ مخلوقات تھی لامکان ہی، چنانچہ خواجہ روم از خواجہ شبلی
پرسید۔ قال ما التوحید لمن اجاب عن التوحید فہو ملحد۔
من عرف التوحید فہو مشرک من لم یعرف ذات فہو کافر و من
سئل عنہ فہو جاہل :۔

شیخ محمود خوش دہاں

ابوالحسن قادری ابن بدرالدین حبیب اللہ قادری بیدری کے بھانجے تھے۔ قادریہ طریقہ میں مولانا ابوالحسن کے اور چشتیہ طریقہ میں شیخ برہان الدین جانم بیجاپوری کے مرید و خلیفہ اور بڑے اہل حال و قال بزرگ تھے۔ آپ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس سلسلہ شیخ برہان جانم بیجاپوری کی تعلیم کو اپنی معرکۃ الآرا تصنیف معرفت السلوک فارسی میں قلمبند کیا۔ جو آپ کے بعد صدیوں سے اس سلسلہ میں متداول ہے اور دکن کے صوفیا نے اردو زبان میں بیسیوں رسالے جو تصوف میں لکھے ہیں وہ اسی تعلیم کا نچوڑ ہے۔

آپ علی عادل شاہ اول اور ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو ۹۸۸ھ-۱۰۳۶ھ کے معاصر تھے۔ مولف اولیاء دکن نے تاریخ وفات ۹۶۵ھ بیان کی ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ ۱۰۰۰ھ کے بعد تک زندہ تھے۔ اور نثر دکنی میں اس کا اشارہ کیا ہے (حصہ نثر دیکھو)

معرفت السلوک فارسی کے علاوہ آپ نے قدیم دکنی زبان میں بھی ایک رسالہ منظوم تصوف میں لکھا ہے۔ جس کا مخطوطہ علی گڑھ میں موجود ہے۔ کتب فروش نے غلطی سے اس کا نام "لولو نامہ دایم" لکھ دیا ہے مگر دراصل یہ شیخ محمود چشتی، متذکرہ صدر کی تصنیف ہے۔ شیخ صاحب نے اپنی تصانیف میں اپنے نام کی قافیہ آرائی کی ہے۔ اس کی ابتداء اس طرح ہے:۔

ابتدا: اللہ واحد ذات قدیم　　مطلق مخفی گنج مقیم

شاہ برہان کی مدح سے

کامل حضرت شاہ برہان　　برہان محبوب السبحان

شاہ برہان الدین ولی　　جیسے مرتضیٰ علی

فرزند حضرت قطب آفاق　　شاہ میراں جی شمس عشاق الخ

چڑتے دم سوں اللہ بول　　اترے تیں بھی اللہ بول

ہر دم اللہ سوں مشغول　　ہر دم اللہ کرے قبول

پلکھاں لگتیاں کھولتیاں ہیں　　وو بھی اللہ بولتیاں ہیں

اس سوں توں بھی ہو مشغول　　تی وو پلکھیاں پڑے قبول

رسالہ نثر دکنی، اس کا عنوان "کلام شیخ محمود خوش دہان - مگر اصل نام تنبیہ الخلایق ہے - تمہید میں فرماتے ہیں:-

امابعد چنیں گوید مرید و طالب کامل الاول والاخر بندہ حضرت شاہ برہان الحق (والدین) فقیر حقیر شیخ محمود کہ ایں رسالہ ایست تنبیہ الخلایق بر عارفاں صاحب بصیرت پوشیدہ نماند کہ ایں زمانہ متاخر بعد از ہجرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ یکہزار و چند سال بالا گزشتہ اندریں زمانہ علامات آخرت وشدہ اند الخ

غاز نثر دکنی:- اگر کوئی تجہ کوں پوچھے کہ نفس سو کیا، دل سو کیا، روح سو کیا، نور سو کیا ہے۔

جواب، نفس سو منگتا پنا، خطرہ دل سو جانتا پنا و حمانی
فعلاں، و روح سو بینائی یعنی دیکھتا پنا، نور سو شاہدی
یعنی سمجھتا پنا۔

سوال: نفس کا، دل کا، روح کا فعل سو کیا وصفت سو کیا، ذات سو کیا
جواب: نفس کا فعل سو برے عملاں؛ صفت سو خدا کوں نہ سمجھ کرے
اوس کا ذات سوں خدا سوں موں پھیرانا۔ و دل کا عمل سو
خوب عملاں کرنا، وصفت سوں خدا کوں سمجھنا، و ذات سو
خدا طرف رخ و توجہ کرنا ور روح کا فعل سو خدا کوں دیکھنا،
صفت سو ذوق شوق دھرنا و ذات سو خدا دیکھنا۔[۲۱]

زبان سلیس صاف اور مدلل ہے۔ اصطلاحات کے ترجمے
قابل نوٹ ہیں۔ منگتا پنا۔ جانتا پنا۔ دیکھتا پنا۔ سمجھتا پنا۔
فارسی حرف ربط "و" استعمال کیا ہے۔

امین الدین

گفتار امین۔ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

اول حمد اکھو اللہ ایکہ نام کردں تیرے سوں نس دن کام
کنت کنزاً مخفیاً کر مخفی آپ اظہار،
برگشت ہو شوجلوا دیتا آپیں بھنڈ بھار

من کان فی ہٰذہٖ اعمیٰ فہو فی آلاخرۃ اعمیٰ یو مخفی ہے گفتار
یاں جن آندھی واں کیا دیکھیں یو آپیں کُھنّار
من عرف کوں کر سوں پوچھیں تہیں توا ندے یار
ظاہر باطن علم کدونی کہے مکہ لیو بچار
فناسوں جینا، بقاسوں کھونا نفاقوں اپناں جان
دلیل خدا کا نبی بولے کُلُّ مَنْ علیہا فان
کفر اندھارا منج میں میرا کیوں منجہ بیجے راہ
توں جس لورہے آپ دیکھاوے یجدی مَنْ یشاء
پیو پیارا منجہ میرا پیو کا ہمیشہ مرید!
یشہ رگ نیری شاہد میری الیہ من حبل الورید
پتو سوں جو رہی کھیل ہنو بری ساعت راکہ یقین
دلیل خدا کا نبی بولے مَکَرُوا و مَکَرَ اللہُ و اللہُ خیر الماکرین۔

..

محمد شریف

مصنف کے حالات تاریکی میں ہیں۔ محمد شریف۔ گنج مخفی ۱۱۳۱ھ
میں تالیف کی[1]۔ چنانچہ کہتا ہے :-

---

[1] کتابت ۱۴ شعبان ۱۲۳۲ھ، ۵ صفحات، سطر ۱۳، کاغذ بادامی، مخطوطات کتب خانہ آصفیہ ۲۰۳۱

ہزار شکر بلکہ لاک شکر بلکہ بے حد بے نہایت شکر کہ اس
کام لطیف بے کسیف کوں جھیناں میں کا سب جھینا
رمضان المبارک کے گیارویں تاریخ ھور اور گیارویں
ماس ھور ایک ہزار ایک سو ایکیارا برس کے ہجرت
نبوی سنہ ۱۱۱۱ھ میں ھور دکھنی زبان سوں پنجشنبہ کے
روز شروع ھور مرتب کیا یو کتاب گنج مخفی آئینہ
جمال نما کوں تمت

خاتمہ: شریف خاک میں ملکوتوں جائے گا
اسم زدہ اس کتب میں پائے گا
ہے لازم بھی ہونا تجہ یک دن لگا
رہے ناوں تیرا حشر لگ بقا [1]

بہرحال مصنف، غالباً گلبرگہ شریف کا باشندہ اور سلسلہ جنیدی
شیخ سراج سے وابستہ اور عالمگیر کا معاصر تھا۔
نمونہ ملاحظہ ہو۔

مرید سوال کیئے، دم کیوں ہے، ھور دم کیا ہوتا ہے
دم کوں کیوں پچھاننا۔ پیر فرمائے کہ پیغمبر صلعم کیا فرماتے
ہیں۔ کہ جو کوئی پچھانا دم کوں، بس تحقیق پچھانیا اللہ
کوں، جو کوئی دیکھیا دم کوں پس تحقیق دیکھیا حق کوں،
جو کچھ ہے سو دم ہے، دم صاحب ہے۔ دم مولا ہے۔

[1] سنہ کتاب ۴ شعبان ۱۲۲۳ھ صفحات ۴۵ سطر ۱۳ کاغذ بادامی مخطوطہ آصفیہ ۲۰۳

دم فاعل ہے، پس جو کوئی دیکھیا دم او ہوا بے غم،
جو کوئی پچھانیا دم او ہوا بے غم، جو کوئی نہیں دیکھیا دم
او ہوا بدگم، جو کچھ ہے سو دم ہے۔ دم زندہ ہے
دم جیو ہے۔ دم دل ہے، دم نفس ہے، دم روح ہے
دم کو نور ہے دم تو اگلی نور صفت دھرتا ہے۔ دم
نو ڈنہ نام دھرتا ہے۔ بلکہ دم ہزار صفت دھرتا ہے
دم ہزار ناداں دھرتا ہے۔

محمد مخدوم عبدالحق ساوی:

عرف دستگیر صاحب گیان بھنڈاری ابن عبدالنبی آغا (وفات قبل ۱۱۰۸ھ) بیجاپور میں تقریباً ۱۰۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد کے زیر عاطفت تربیت پائی، ابتدائے جوانی میں شوق الٰہی دامنگیر ہوا، شیخ ناصرالدین بیجاپوری، خلیفہ دریا محمد چشتی کے مرید ہوئے۔ بعد تکمیل سلوک و علوم ظاہری دنیائے اسلام مکہ معظمہ، مدینہ منورہ شمالی ہند، دہلی لاہور، بنگال، اور جزائر زیر باد، سماترہ اور جاوہ وغیرہ کی سیاحت کی۔ بڑے کامل با تحقیق صوفی تھے۔ بعد وفات پیر آرکاٹ آ گئے، خواجہ رحمت اللہ خان اور نواب عبداللہ خان صوبیدار صوبہ ہرا مرید تھے۔ ۱۱۶۵ھ میں بمقام حیدرآباد دکن داعی اجل کو لبیک کہی اور میلاپور (شہر طاؤس) مدراس میں آپ کا مقبرہ ہے

تصوف میں آپ کے بیسیوں رسالے محققہ ہیں۔ غایت التمثیل
شہر قدرح (سماتیا) میں لکھی تھی۔ قدیم دکھنی میں بعض رسائل ہیں، مگر
مفتح الکل، پنج گنج نئے انداز میں لکھی، جو اسرار و معارف سے مملو ہے۔
شاعرانہ مذاق بھی رکھتے تھے، حمد و نعت و منقبت پیر، اور کتاب کی تعریف
میں ایک غزل بھی اسی پنج گنج میں موجود ہے۔

مفتح الکل یا پنج گنج سنہ ۱۱۲۹ھ کی تصنیف ہے۔ آغاز احمد و نعت
و منقبت پیر، وغیرہ سب نظم میں ہیں۔ اس کے بعد نثر شروع ہوتی
ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"تمہید نام کتاب:۔ اے عزیز وافر تمیز اس پچھانت کے
پانچ گنجاں کی تفصیل ہور ابواب کا ناوں کتاب "مفتح الکل"
رکھیا ہوں ہور ہر یک گنج میں پانچ باب ہیں، ہور ہر یک
باب میں پانچ فصل ہیں، ولیکن اس کتاب کوں سمجنا ہور
اس کی حقیقت جیوں ہے تیوں پانا بھوت مشکل ہے!"

مختصر یہ کہ اس میں جدت یہ کی ہے کہ شریعت طریقت، حقیقت
معرفت، اور مراتب عالم ناسوت، ملکوت، جبروت، لاہوت کو، بلحاظ
مراتب جمادات، حیوانات، و نباتات کی اسفل و اعلیٰ چیزوں سے
تمثیل بیان کی ہے۔ مثلاً:۔

گنج اول: باب اول:۔ گنج مخفی میں کا حقایق عالم ناسوت و
نام بتاتی ہے اس باب میں بھی پانچ فصل ہیں فصل

اول سو حقایق علف ہور درختان بھنگ ہور سیندی
ہور درختاں پوست ہور درختاں شرابی ہور درختاں کلتے
کے جو یہ زہر ہیں ۔ ہور ہر یک بیل بوٹہ زہر دار پیدا کیلا
او فصل نباتی ہیں کا مقام مظہر نفس، ہور ناسوت ۔ ہور
شریعت ہے۔الخ

طریقہ تفہیم:۔ عالم نباتی کوں عقل قیاس۔ ہور حیوانی کوں عقل و
فہم ہور طیاری کوں عقل گمان، ہور انسان کوں عقل آگاہ
ہور بھی سن ۔عالم نباتی ہیں روح مثال خاک، ہور حیوانی
ہیں روح مثال آب، ہور طیاری ہیں روح مثال اگ ہے
ہور عالم انسانی ہیں سو مثال باد ہے الخ

غرض تمام اصطلاحات سلسلۂ برہان الدین جانم کی نئے طرز سے
تفہیم فرمائی ہے ۔زبان اور املا وہی دکھنی، عربی فارسی الفاظ کا امتزاج
بھی ہے ۔ ہندی الفاظ خال خال ہیں ۔ عربی الفاظ ۔ طیار کو طیاری،
اڑنے والے پرندے ۔ حواس کو ہواس ۔ اور یائے نسبتی کے لاحقے
"ہواسی" (حواس سے متعلق) ۔ پر زہر= زہردار ۔ درختان شراب کو درختاں
شرابی وغیرہ ۔ فارسیت غالب معلوم ہوتی ہے ۔ اس کے مخطوطات
کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہیں۔

⁂

شاہ حضرت حسینی بیجاپوریؒ

شاہ حضرت حسینی ابن شاہ ابوالحسن حسینی محزآبادی (بیجاپور) (۱۱۰۷) میں انتقال ہوا۔ مختار بیجاپوری اور ضعیفی مصنف ہدایت ہندی کے مرشد تھے۔

فارسی میں شاہ حضرت رحمۃ کی کتاب مراد المریدین۔ تصوف میں پیری مریدی پر خوب لکھی ہے۔ جس میں اپنے ایک سو اکہتر شیوخ کے شجرے بھی لکھے ہیں جن سے آپ نے فیض حاصل کیا تھا۔

دکھنی نثر میں آپ کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ جس کا نام ——— "محبوب الاسرار"[1] یا ارشاد نامہ ہے۔ جس کے چار صفحات یا ۴۳ سطور ہیں۔ نمونہ یہ ہے :۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ارشاد بندہ نواز گیسو دراز کو عطا کرے سو گیسو دراز نے شاہ محمد حسینی پر عطا کئے کیا واسطہ جو کوئی طالب خدا کا اوس راز پر آوے اپنے مطلب کوں پونچے، دیدار پاوے اگر کوئی فقیر کوں پوچھے ذات سوں صفات کیوں ہوا ہے

---

[1] محبوب الاسرار کے دو مخطوطات کتب خانہ آصفیہ میں اور ایک جامعہ عثمانیہ میں ہے (۵۲/۱۲۱ جامعہ عثمانیہ)

ہور صفات سوں ذات کیوں ہوا ہے ہور عارف جواب
دیوے کہ اول کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف
چھپیا تھا گنج مخفی میں بعد چاہا کہ اپنے تیں ظاہر کردں
جسدہٗ دم بیتٌ وقلبہٗ سراجٌ منیرٌ د
انفاسہ فتنیت العشق اللہ ناز د
مرشد نورٌ۔

اول گنج مخفی روح تھا، روح نے آپ کوں
آپ نگاہ کیا، او نگاہ عشق ہوا، او عشق تھا سو
احمد ہوا۔ فقیر ہوا او فقیر اوپر آپ شاہد ہو نفس
ہوا نفس سے پانچہ صفتاں ہویاں، سر، نور، روح
دل، نفس نور، انا، احمدؐ ہوا، احمد نے خواہش کیا
سو عزرائیل فرشتہ ہوا اور فرشتہ سے پانچہ صفتاں
ہویاں، خواہش وسواس۔ غضب، لطف، ترس۔

مخدوم شاہ حسینیؒ بلکانوری

"سوال نامہ خواجہ سید محمد گیسو دراز قدس سرہ سے منسوب ہے۔
اس رسالہ کا دوسرا نام "تلادۃ الوجود" ہے۔ اور بعض ادیبوں نے بار بار
اس کا ذکر کیا ہے کہ یہ خواجہ صاحبؒ موصوف کی تصنیف ہے۔
سوال نامہ کے اصل مصنف مخدوم شاہ حسینی رہتما، لاہور کے رہنے والے

تھے۔ جو بیجاپور آ گئے تھے۔ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری (وفات ۱۰۸۶ھ) کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کی تصنیف کا زمانہ آخر گیارھویں صدی ہجری معلوم ہوتا ہے۔ اس رسالہ میں کئی اہم سرخیاں ہیں:۔

سرخی نمبر ۱ سوال نامہ این رسالہ تصنیف حضرت مخدوم شاہ حسینی ساکن بلکانور :۔

سرخی نمبر ۲ خاتمہ :۔ این رسالہ تلاوۃ الوجود حقیقت المعراج المحبوب لم یلد ولم یولد۔ تصنیف مخدوم شاہ رہنما خانوادہ چشت اہل بہشت، وطن در دکنی دار الظفر بیجاپور، جانشین محل رائی چور پرگنہ کوتال ساکن قصبہ بلکانور است۔

آغاز:۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ وآلہ واصحابہ علی خیر خلقہ اجمعین قولہ تعالیٰ، ولا الذالخلق والامر، اس کا معنی خدا کہیا تجے مجے بوجھو یں تما پیدا کیا پر اے امر تمہارے پو ہوا او امر خدا کا ہوا اس وقت قالوا بلیٰ کہے تہیں میرے سوں وعدہ کیے اس تن میں اچھکر ہمیں تجے تحقیق کرنا ہے، اگر کوئی اس وعدے کوں پونچی تو میرا یگاہ دوست ہوئے گا اگر نہیں تو یو میرا دیدار نا دیکھ سکے گا۔ الخ

شیخ فریدؒ۔ بیجاپوری

شیخ فرید بیجاپوری شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری المتوفی (۱۰۸۶ھ) کے بزرگ واسطہ مرید تھے۔ جنہوں نے خواجہ امین الدین اعلیٰؒ کے بطور خود جو اقوال سنے تھے۔ ان کو اس رسالہ میں قلمبند کیا ہے۔ کہتا ہے کہ حضرت نے اپنے فرزند میراں جی کو سجادگی سے سرفراز کیا تھا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس رسالہ کا مصنف شاہ امین الدینؒ کی وفات کے وقت یعنی ۱۰۸۶ھ میں بقید حیات تھا۔ نثر کا نمونہ یہ ہے۔ درمیان میں بعض جملے فارسی کے بھی آگئے ہیں:۔

حضرت داماد پیر شاہ صاحب ماہ شوال کی بادیسویں

تاریخ کوں حضرت شاہ امین الدین سوں سوال

کئے یک شاہ پور میں بات سن کر آیا ہوں۔ کہتے ہیں

نور ہور ذات میانے روح کیوں ہے۔

جواب:۔ تب حضرت امین الدین علی صاحب

داماد کوں جواب دیئے، تمہیں روح کو نچہ نور

ہووے تمہیں روح کوں نور کے پیلار نکو لیجاؤ

بعد از چند روز حضرت امین الدین علی صاحب وصال

شدند اوس لبعد حضرت شاہ میراں جی صاحب کو بھلوگی
کے وقت میں ہور شاہ خلیل اللہ صاحب تھے ماہ
ذوالحج کی چوتھی تاریخ فقیر شیخ فرید، اوس بات
کوں قوت پکڑا کر در مجلس ..... یوں کہے کہ آج
لگ نور کے اور ذات کے درمیان روح ہے بنا
کیے معلوم نتھا، سو ہمیں تحقیق کردم کہ شماں قبول
بکنید، یعنی جوں ہے تیوں بنا رکھ دیو کہ آں وقت
بابا خلیل اللہ یوں جواب دادن کہ پیغمبر معراج
نہایت کوں انپڑے ہور جبرائیل کوں انگے ہو کہے
تب جبرائیل کوں کہے کہ انگی ہو ‌ نگا تو جل مرونگا
تو وہاں روح کوں نور ہیں جاگا نہیں کر یوں کہے ملے

۲

مولانا عبداللہ

'احکام الصلوٰۃ' کے مترجم ہیں، یہ ترجمہ ۱۰۳۲ھ میں فارسی
سے کیا ہے۔

ملے: مجموعہ رسائل تصوف جامعہ عثمانیہ رسالہ ۷
۱ ق - ۲۹۷۶۷۱
۳-ل-۱

اول کلمہ طیب پہلا کلمہ بولتا ہوں میں پاکی کا، نیکی پاکی
ایمان کی، کفر تی، شرک تی لاالہ الا اللہ۔ نہیں کوئی معبود
برحق۔ الااللہ مگر اللہ تعالیٰ معبود برحق ہے۔

محمد رسول اللہ۔ محمد رسول خدا کے برحق ہیں، دوم
کلمہ شہادت دوسرا کلمہ بولتا ہوں میں شہادت کا۔
یعنی گواہی دیتا ہوں اس خدائے تعالیٰ کی ایک نبی پہ
اشہد اور گواہی دیتا ہوں میں ان لا الہ کہ نہیں کوئی
معبود برحق۔

نمونہ مفتاح الخیرات:۔

ایمان کی کلماں کا معرفت ہور نماز احکام ہور ارکان
پچھاننا تمام مسلمان پر فرض ہے کہ سب کوں اس کی
پچھان نے چھٹکار رہے۔ ہور آخرت میں خدا کے
عذابوں گرفتار نا ہوے گا۔

وجہی گولکنڈوی

وجہی گولکنڈوی کی تصنیف "تاج الحقایق" ہے۔ بعض ادیبوں
نے اس کا نام سبرس میراجی شمس العشاق لکھا ہے جو غلط ہے
"تاج الحقایق" کا موضوع تصوف ہے۔ مگر اس میں بعض مضامین
ایسے لطیف و دلچسپ ہیں کہ اس کو ایک معیاری انشا پردازی

کہاجا سکتا ہے۔ اور یہ گویا اردو زبان میں ابتدائی کوشش ہے
ہم یہاں دو ایک اقتباس درج ذیل کرتے ہیں:۔
(تاج الحقایق :۔ وجہی)

فکر وغم :۔

تو کاہے کو فکر کرتا ہے، فکر کرنے تے کیا مقدر
مبدل ہوتا ہے، نصیباں جلکچہ لکھا ہے سوا نپڑیگا،
خدا بی دنیا میں یک تدبیر لا دیا ہے وو تدبیر کرباقی
خدا پر چھوڑ، کڑ لکن محنت یں سراٹے گا۔ غم آئے
توتوں غم کو کھا ہور نگل ختم کر، مرد ہوا چہ اگر مرد ہے
اگر تو غم کوں نا کھائے گا تو غم تجے کھائے گا۔
ہوشیار رہجو۔

(سبرس وجہی :۔)

زلف کہی غم نکو کرہمت کم نکو کر ہر ایک بلا ہے
سو مرد انچہ پر ہے۔ صاحب درد انچہ پر ہے،
فرد ؎

ہمت دینا مرد نے عاجز ہو کر اڑے کوں
رکھنا نظر وقت پر ہر یک وقت پڑے کوں

مرد انچہ پر ہے قناعت ہور فاقہ، مرد انچہ پر گزرتا
ہے، یک آدھے وقت واقا، جسے دنیا میں

غم نیں دو نادرہے ، خوشی غم سب مرد انچہ کے
سرہے ، چلتا سوچہ اڑتا ہے ، چلتا سوچہ پڑتا
ہے ۔ لہوار کا کھیل جو آگ سوں ہے تو یکادی
وقت جلتا بھی ہے ۔

چاندنی رات :۔

عام لوگاں کوں پہلی چاند ۔ چاند کی رات ہے
ہور عاشق لوگاں کوں چودویں چاند ، چاند کی رات
ہے ، چاند وہچہ ہے کہ جس رات سب راتاں
تے چندنا زیاست ، نیری چندنانیں ۔ لوگاں
کی چاند رات ، چاند کی رات ، یو کیا بات ہے
چاند ایا سوں دکھلاؤ ، بی چاند کی رات نیں ، اے
چاند کی رات ہور عالم میں اندھارا یو کیسی چاند
رات ، اے بھائی جو کیف خوش لگے سو کیف
کھاؤ ، پھول بھوت خوشبوی لگاؤ ۔

میراں جی حسین خدانما؟

میراں حسین عرف میراں جی لقب خدا نما ، ساکن گولکنڈہ
شاہ امین الدین کے مرید تھے ۔

کچھ دنوں ان کی صحبت میں رہ کر خلافت سے ممتاز ہوئے اور حیدرآباد آکر ملازمت ترک کر دی اور رشد وہدایت میں مشغول ہوئے، بقول اولیاء دکن ۱۰۷۰ھ میں اور یا ۱۰۶۸ھ میں بعہد عبداللہ قطب شاہ واصل بحق ہوئے۔ مستعد پورہ حیدرآباد مدفون ہیں۔ آپ کا گنبد قمرتی گنبد کے نام سے مشہور ہے۔ ایک صاحب زادے جن کا نام آپ نے اپنے مرشد کا رکھا تھا، سید شاہ امین الدین ثانیؒ جو سجادہ اور جانشین ہوئے۔

تصنیفات :۔ قدیم اردو میں آپ کا کارنامہ تصوف کی ایک معرکۃ الآرا کتاب اصل تمہیدات ہمدانی، الموسوم بہ "زبدۃ الحقایق" مصنفہ حضرت قاضی عین القضاۃ ہمدانی (متوفی ۵۳۳ھ) ہے۔ حضرت خواجہ گیسودراز کی شرح کا ترجمہ نہیں ہے۔

"تمہیدات ہمدانی" جملہ دس باب یا اصل پر مشتمل ہے[۱]

نمونہ :۔ "اے عزیزاں لے بات نہیں سنیاں، بادشاہاں گھوڑا مستعد کئے باج"

---

[۱] کتب خانہ سالارجنگ، ۲۱۴ صفحات مسطر ۱۱-۱۷۔
"۶×۸" مکتوبہ ۱۰۶۶ھ

"نہیں سوار ہوتے، ہور گھوڑے میں کچ گھوڑ
اچھے تو بھی قبول کرتے"۔

"یعنی پیر کے عشق میں پختا ہوئے باج خدا
کے عشق میں نہ آسکے، ہور دیکہ نا سکے"!

"اگر عشق خالق نداری بارے عشق مخلوقے
مہیاکن، اس کا معنا خدا کی پچھانت کا بل نہیں تو اول
اپنی پچھانت کر سوا ے بات یوں ہے کہ آفتاب کا
ذات نواز نہارا ہے، ہور اس کا اجالا جیانہارا
ہے، یعنی دوست سو نواز نہارا ہور خوبیاں بنہارا
وے اس کا محبت اسے دگداتا ہے۔ یعنی معشوق
کا محبت عاشق کو گالتا ہے۔ اس کے فراق میں اسے
مقام ایسا ہے جو عاشق معشوق باج جی نہ سکے
باج دیکھے معشوق کا صورت عاشق کیاں انکھیاں
کوں جالتا ہے۔ ہور اپنا رنگ کرتا ہے"۔

گویا یہ ترجمہ ملا وجہی کی "سب رس" سے ۲۴ سال قبل کا
ہے۔ زبان سادہ و سہل قابل فہم ہے بعض فقرے فارسی
کے درمیان میں آگئے ہیں۔

شاہ سلطان ثانی گولکنڈوی

آپ عام طور پر شاہ سلطان ثانی مشہور ہیں، رسالہ نجیبہ میں آپ کا پورا نام "خواجہ شاہ سلطان حسینی" لکھا ہے:۔

آغاز:۔

حدیث قدسی من عرف نفسہ، فقد عرف ربہٗ
یعنی نبی صاحب کہے جو کوئی اپسکو بوجہا پس او تحقیق
خداکوں بوجہا، دلے اے سالک تو اس کو کس
وضا (وضع) تے (سے) بوجہا، یہ تو وجود آدم
کا برقہ (برقع) ہے اور یو وجود کس تے (سے)
قایم ہے؟ پانچ چیزوں سے قایم ہے اینا اپس
میں او پانچ چیزوں سے قایم ہے اینا اپس میں
او پانچ چیزاں کون سے! نفس، دل، روح
نور، سر، ذات۔

خاتمہ:۔

عاشق کا معاینہ صورت روشنای باچون
کی ہے، معاینہ غایب خبر اسم ذات کا ہے[1]

---

[1] مخطوطات کتب خانہ خاص بابائے اردو۔

میراں یعقوب گولکنڈوی

"شمائل الاتقیاء" کے مترجم ہیں۔ یہ کتاب تصوف کی ہدیت جامع ار مستند کتاب ہے۔ شمائل الاتقیاء کے مولف شیخ رکن الدین عماد کاشانی ہیں۔ ترجمہ شمایل الاتقیا، کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ میراں یعقوب، حضرت میراں ابن سید حسین کے مرید تھے۔ اس کا ترجمہ سلیس عام فہم قدیم اردو میں میراں یعقوب رح نے کیا ہے۔ اور یہ آج سے تین سو برس قبل کی زبان ہے۔ نمونہ :-

(بات کی نیکی)

اخلاق :- بات کا حمیدہ : یعنی خوب صفت سو پکڑنا
مصحف، ہور کتاب ہور قلم، سید تے ہات سوں
ہور دست بوسی کرنا مشائخ ہور۔ ندیدہ ر رمان
سوں، ہور عصا پکڑنا چالیس برس کی عمر ہوے
تو تھیں۔ ہور اندھے کا ہات اپنے ہات میں لینا۔ الخ

نظم :- جو ایسی دولت آوے بات جس کوں
ہوے ہمدست اصحاب الیمیں کا

ہمات کی برائی :-

ہات کا ذمیمہ :- یعنی بد صفت سو جوا کھیلنا، ہور

چوری کرنا، ہور کسی موں پر طمزاق (تمانچہ) مارنا کہ موں
خدا کے ہات سوں سنوار یا گیا ہے الخ

از رسالہ کشف اسرار۔ حقیقت التوحید الفنار
فی التوحید۔ یعنی توحید کا حقیقت سو توحید میں
فنا ہونا ہے۔ یعنی اپنی ہستی کوں خدا کی ہستی میں فانی
جانے کہ ایک پنے میں دو پنا نہیں ہے۔ نظم ؎

جب لگ تو ئی ہے میانے تب لگ یو دو پنا
او ہور توں ہوے دو یک پنا نہ ہووے
تو محو ہو اپس تھے تا ہووے ایک اس سوں
باقی رہے وہی سب تیرا پنا توں کھووے

سیّد شاہ عابد حسینی الحسنی

گولکنڈہ کے رہنے والے اور سید یوسف روحانی، المعروف بہ شاہ راجو قتال، گولکنڈوی المتوفی ۱۰۹۲ھ کے معتقد و مرید تھے۔
آپ کی اہم تصنیف فقہ حنفیہ میں ایک ضخیم اور مستند تالیف کنز المومنین ہے[1]۔ جو آخر گیارہویں صدی ہجری میں تدوین

---

[1] کنز المومنین کے کتب خانہ آصفیہ (سنٹرل لائبریری) میں دو نسخے ہیں۔
جو (۱۵۳) اوراق فلسکیپ سائز سطر ۱۵ (مکتوبہ ۱۲۳۹ھ) کاتب غلام علی؛

ہوئی نہ کسی کتاب کا ترجمہ نہیں۔ تقریباً ڈیڑھ سو کتب سے زیادہ اس کے ماخذ ہیں۔

عابد شاہ کی دوسری تصنیف تصوف میں "گلزار السالکین" ایک مختصر رسالہ ہے۔

کنز المومنین کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

کدو دکبھی، کوئی پوچھا کہ توں مسلمان ہے تو
بول شکر الحمد للہ، یعنی، سرانا ہور تعریف کرنا سزاوار
ہے اللہ تعالیٰ کوں کہ ہمکوں یہ درجہ نصیب کیا ہو، (۲۶)

حدیث قدسی :۔

مرکب الانسان علیٰ ثلثتہ عشر
متشیاء فاربعہ من الآباء واربعہ من
الامتہ وخمسۃ من اللہ، یعنی اللہ
فرماتا ہے کہ انسان کا پیدائش تیرا (۱۳) چیزاں
سیں ہیں، چار ماں کی طرف ہور چار باپ کی طرف
ہور پانچہ چیز اللہ تعالیٰ کے خزانہ سیں، یعنی
عناصر خمسہ، خاک، پانی، باد۔ آگ، خالی وغیرہ الخ

صلاۃ المسعودی میں بولا کہ زخم جاری والا
دضو کر کر نماز ایک رکعت پڑھے کے بعد وضو،
حدث سیں لوٹا تو پھر وضو کر کر باقی کا تین رکعت

کرے دو رکعت کا نیت باندیا تو ایک رکعت کرے (۹۶؎)

مسئلہ :۔ امام شافعی کیاں (کے پاس) ناک ہور موں میں پانی لینا فرض نیں، او نکیاں (ان کے پاس) دو فرض ہے اور نیت دوسرا تمام تن بھگانا۔

خاتمہ :۔

خدا کے بیٹے ہیں کہنا کفر ہے ہور قرآن راگ سیں پڑھنا کلمۂ کفر ہے۔

کنز المومنین آخری دور قطب شاہی کی تصنیف ہے۔ زبان صاف سلیس، طرز بیان مدلل، افعال، بولا کو بولیا حرف عطف سوں کو سیں، جو شمالی ہند میں بھی رائج تھے۔ البتہ تذکیر و تانیث میں بے قاعدگی ہے۔ الفاظ پیدائش اور عبارات مذکر استعمال کرتے ہیں :۔

❖

شاہ راجو گولکنڈوی
(۱۰۹۳ھ)

رسالہ تصوف دکن کے مؤلف ہیں جو نثر میں ہے۔

نمونہ ملاحظہ ہو :۔

سوال : نفس کوں کیوں فنا کرنا۔

جواب :۔ "محققاں یو بولتے ہیں کہ عقل سوں علم الیقین
حاصل ہوتا ہے، ہور کشف سوں عین الیقین۔
ہور حق الیقین و حقیقت حق الیقین سے مرتبہ
میں حاصل ہوتا ہے، ایسا تک سمجھ اعتقاد کرنا
کسے معتبر کے بولنے پر کہ فلانے گھر میں آگ ہے
یو ایمان کی مثال ہے، ہور دھویں پر سمجھنا
کہ اس گھر میں آگ ہے یو مثال علم الیقین کے
اور گھر میں جاکر آگ کوں دیکھنا یو مثال ہے عین
الیقین کی، ہور آگ کے نزدیک جاکر گرمی لینا
یو مثال ہے حق الیقین کی۔ ہور آگ میں جلنا
پروانہ کے نمار، یو مثال ہے، حقیقت حق الیقین
کی یو رتبہ اگرچہ بعض اولیا، کوں دنیا میں ہوتا
ہے۔ اماکمال اوس کا آخرت.. ہوسے گا
فاتحہ الہٰی حضرت خاتم النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم"

ذکا حسن بیگ شاہجہاں آبادی ثم گولکنڈوی

فضلی دہلوی کی "کربل کتھا" تصنیف ۱۱۲۵ھ بہت مشہور
ہے مگر اس کا تو صرف نام ہی نام ہے۔ دیباچہ کے سوا اس کے

وجود نہیں، مگر حسن بیگ نے یہ کربل کتھا، فضلی سے بھی تیس سال قبل لکھی تھی، اس کتاب سے ابھی علمی دنیا بے خبر ہے۔ اور دکنی زبان کے محقق مولوی نصیر الدین ہاشمی نے روضۃ الشہداء ولی ویلوری کو اس سے مقدم سمجھا ہے۔ اور تاریخ تصنیف وکتابت سنہ ۱۱۵۱ء کو غلط قرار دیا ہے جو درست نہیں ہے۔ اس کا صحیح سنہ تصنیف ۱۱۱۴ھ ہے۔ چنانچہ مصنف نے اسی کتاب کے صفحہ ۸۰، پر لکھا ہے:۔

• اس سال لگ کر سن یک ہزار دیک صدو چہارده سنہ ہجری سوں ہے، جب محرم آتا ہے اہل ایمان کو غم ہور درد اس مظلوماں کا تازه ہوتا ہے۔الخ

اس لحاظ سے یہ عہد عالمگیر کی آخری تصنیف ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

اما حر بن یزید ریاحی کوفہ کے شکر سوں انگے کھڑا تھا۔ جب یو حال دیکھیا، عمر سعد کوں بولا کہ اے عمر توں امام حسین سوں لڑے گا، عمر نے کہیا لڑوں گا۔ ہور اس لڑائی میں بہوت تن بے سر ہو دیں گے۔ جیسے کہ مرزا علیہ الرحمۃ اس کے قصہ میں بولیا ہے کہ بعد ازاں حر عمر بن سعد کوں

پوچھا ہے، یعنی کاے عمر اب اس لڑائی پر مجھے
نیت ہے کیوں، تب کہا حر کوں عمر آج بو لڑائی
سخت ہے۔ کے مراں ہو وے تناسوں دور!
بو وو وقت ہے۔ حر کیا ظلم ان شہاں سوں توں
کرے گا اس وزا تو خدا کے خدمت محشر کوں
پاوے گا سزا۔ مصطفےٰ ہور مرتضےٰ منگی گے اپنا
یو نصاحب (حساب) ہور تب اس دعوے پہ
دیویںگے گواہی عام وخاص۔ تب توں کیا اس واحد
القہار کوں دے کا جواب" (ص ۱۰۲)

سید شاہ علی اکبرؒ

سید شاہ علی اکبر رحمہ کے حالات تو معلوم نہیں، البتہ
ان کی تصنیف چھد سر عار کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے
کہ آپ شاہ امین الدین ثانی المتوفی ۱۱۴۰ھ ابن میراں جی
خدا نما گولکنڈوی (م ۱۰۷۴ھ) کے مرید، اور سلطان ابوالحسن
تانا شاہ کے معاصر تھے یہ کتاب سنہ ۱۰۹۰ھ میں لکھی گئی۔
علی اکبرؒ کو نثر و نظم دونوں پر قدرت حاصل تھی
چنانچہ "چھد سر عار" دونوں کی جامع ہے، نظم کم ہے، نثر

زیادہ ہے۔ اس کا موضوع تصوف ہے۔

آغاز:۔

بسم اللہ نانوں کرتار
مہرباں بخشے بخشنہار
ذات قدیم سبحان اللہ
محمد نور خاص اللہ

اصل نثر کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:۔

عرفاں یوں ہیں حدیث انزل القرآن علی سبعۃ احرف کلہا۔ شان و کان، یعنی تن ہے، دل ہے فواد ہے، روح ہے۔ سر ہے۔ نور میں خدا کی ذات چھپی ہے۔ اس کا بیان ابتدا میں تھوڑا ہوا ہے۔ ہور آخر میں سب ہوئے گا:

نواں باب

اردو نظم شمالی ہند میں

ابتدائی اردو کے نمونے جسے ہم اردو زبان و ادب کے بچپن کی بولی کہہ سکتے ہیں۔ صوفیوں کے اقوال و اشعار کی صورت میں دستیاب ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی صوفیائے کرام کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ اس سلسلہ میں شمالی ہند میں سب سے پہلے آنے والے صوفی داتا گنج بخش ہجویری ہیں۔ آپ غزنوی حکمرانوں کے عہد میں لاہور تشریف لائے۔ ۱۰۶۳ء (۴۵۶ھ) میں[1] وفات پائی۔ مزار لاہور میں ہے۔

مسعود سعد سلمان لاہور میں پیدا ہوئے۔ سن ولادت نامعلوم ہے ۱۱۲۵ھ اور ۱۱۳۰ھ کے درمیان وفات پائی۔ مسعود فارسی۔ عربی۔ اور ترکی زبانوں میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ عربی۔ فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ہندوی (ابتدائی اردو) میں بھی شعر کہتے تھے

---

[1] بزم صوفیہ میں ۴۶۵ھ ہے۔

اور انہوں نے ہندی دیوان بھی ترتیب دیا تھا۔ جس کی شہادت قدیم تذکرہ نگار عوفی سے ملتی ہے۔

" واو راسہ دیوان است یکے بہ تازی یکے بہ پارسی ویکے ہندی [1] "

اس کی تائید امیر خسرو کا یہ بیان بھی کرتا ہے۔

"پیش ازیں از شاہانِ سخن کسے راسہ دیوان نہ بود مگر مرا کہ خسرو ملک کلامم۔ خواجہ مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست آقا آں سہ دیوان در عبارت عربی و فارسی و ہندوی است در پارسی مجرد کسے سخن را سہ نم نہ کردہ جز من کہ دریں کار قسام و عادلم۔" [2]

حضرت خواجہ معین الدین چشتی (۱۱۴۲ء / ۵۳۷ھ تا ۱۲۳۵ء / ۶۳۳ھ) [3]

راجہ پرتھی راج والیٔ اجمیر کے عہد میں ہندوستان تشریف لائے۔ اجمیر شریف میں مقیم ہوئے۔ اور اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ ظاہر ہے کہ عام لوگوں تک آپ انھیں کی زبان میں اپنے خیالات پہنچاتے ہوں گے۔

ہندی زبان میں آپ کے اقوال تو دستیاب نہیں ہو سکے۔ مگر ہندی زبان میں تکلم کرنے کی ایک شہادت ملتی ہے۔ ملک محمد جائسی کی نظم "اکھروٹ" کا شارح تمہید میں لکھتا ہے۔

"گمان نکنند کہ ہیچ اولیاء اللہ بزبان ہندی تکلم نکردہ زیرا کہ اول از

---

[1] لباب الالباب محمد عوفی بحوالہ نقوش سلیمانی از سید سلیمان ندوی ص ۲۲۹ [2] دیباچہ غرۃ الکمال میر خسرو بحوالہ پنجاب میں اردو ص ۳۵ [3] بزم صوفیہ (ص ۲۵) میں ۶۳۲ھ ہے۔

جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملۃ والدین قدس اللہ سرہ بدیں زبانی سخن فرمودہ بعد ازاں حضرت خواجہ گنج شکر در زبان ہندی و پنجابی بعضے از اشعار نظم فرمودہ۔ چنانکہ در مردم مشہور اند اشعار از دوہرہ وسورٹہ........................ واشال آں نظم نمودہ [1]

چندر بردائی

چندبردائی ۱۱۵۹ء تا ۱۱۹۲ء ، ہندوستان کے آخری ہندو سمراٹ مہاراجہ پرتھوی راج کا راج کوی (بھاٹ) تھا۔ اس کا واحد شعری کارنامہ پرتھوی راج راسو" مورخوں اور محققوں کے لئے ایک نہایت اہم موضوع رہا ہے۔ راسو میں چندر نے پرتھوی راج کے حالاتِ زندگی نظم کئے ہیں۔ جو ۵۸۸ھ میں سلطان شہاب الدین غوری سے ترائین کے میدان میں شکست کھا کر مارا گیا۔

راسو ڈھائی ہزار صفحات اور ۶۹ ابواب پر مشتمل ہے۔ تمام بحریں اس میں استعمال کی گئی ہیں۔ گریرسن نے اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتلائی ہے [2] اس کتاب میں عہد بعہد اضافہ ہوتا رہا ہے جس کے باعث اصل تصنیف اور الحاقی کلام دونوں میں امتیاز مشکل ہو گیا ہے۔ اس کی قدامت کے بارے میں محققین میں زبردست اختلاف آراء ہے۔ کیونکہ اس میں بیان کئے گئے واقعوں کی کوئی تاریخی سند موجود نہیں

---

[1] اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، از ڈاکٹر مولوی عبدالحق

[2] ماڈرن ورناکلر لٹریچر آف ہندوستان مع بحوالہ تاریخ زبان اردو، از ڈاکٹر مسعود حسین

ہے گریرسن۔ پنڈت موہن لال وشنولال اور پنڈت ہرپرشاد شاستری اس کی قدامت کے قایل ہیں۔ مگر ڈاکٹر بولر، مراری دھن، شیامل داس اور پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا نہایت مضبوط دلایل کے ساتھ اس کو سولھویں صدی عیسوی کی تصنیف ثابت کرتے ہیں۔ مسلمان محققین میں محمود شیرانی بھی اس تصنیف کو مشکوک اور فرضی مانتے ہیں۔ [1]

راسو میں بارہویں صدی کے بعد کے بعض حالات آئے ہیں۔ جو اُسے فرضی ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً چنگیز خاں اور تیمور کا ذکر۔

راسو کے تاریخی واقعات غیر مستند اور فرضی ہیں۔ وہ پرتھوی راج کے درباری شاعر جیانک کی سنسکرت کی کتاب "پرتھوی راج وجے" سے بالکل مختلف ہیں۔

راسو میں دس فیصدی عربی فارسی الفاظ کا ہونا بھی اُسے مشتبہ تصنیف قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اس عہد میں فارسی عربی کا اس قدر رائج ہونا خلافِ واقعہ ہے۔ مثلاً گلاب۔ اناس۔ زنگی۔ جلیبی آتش۔ گرز۔ شہنائی۔ نفیری۔ دمامہ۔ زرکشتی۔ کسادہ وغیرہ الفاظ ــــ ۶؟

راسا میں آتشیں اسلحہ کا ذکر بھی اُسے جعلی کتاب ثابت کرتا ہے۔ کیونکہ یہ مغلوں کے ہمراہ ہندوستان آئے۔

---

[1] اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۴ء۔ اگست ۱۹۳۵ء۔ نومبر ۱۹۳۵ء۔ اگست ۱۹۳۶ء بعنوان پرتھی راج راسا محمود شیرانی۔ اور پنجاب میں اردو۔ محمود شیرانی۔ ص۱۲۰ تا ص۱۲۲

راسا میں سلطان معزالدین محمد بن سام کے بجائے جگہ جگہ شہاب الدین غوری کا نام لیا گیا ہے۔ جبکہ اس عہد میں پہلا نام مروج تھا اور اکبری عہد کے مورخوں نے اسے شہاب الدین غوری لکھا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اکبری عہد کی تصنیف ہے۔

راسو کے خلاف تاریخی اور لسانی شواہد اسے سولہویں صدی کی تصنیف ثابت کرتے ہیں۔ مگر آج تک کوئی مورخ اس بات سے منکر نہیں ہوا کہ چندر بردائی بارہویں صدی کا شاعر نہیں ہے اس کے علاوہ بعض داخلی اور خارجی شہادتیں اُسے سولہویں صدی سے پہلے کی تصنیف ثابت کرتی ہیں۔ ایک بات ضرور ہے اور وہ یہ کہ اس میں زیادہ تر کلام الحاقی ہے۔ کیونکہ راسو کی حیثیت ایک قومی رزمیہ کی تھی۔ اور ہر شاعر اس میں اپنا کچھ کلام شامل کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا تھا۔ اس طرح اصل تصنیف الحاقی حصّوں میں غائب ہو گئی۔ مگر لسانیاتی تجزیہ کے ذریعہ قدیم اور اصلی کلام کو الحاقی حصہ سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ الحاق کی تصدیق اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ راسو کے آخری حصّے کو اس کے بیٹے جلہن نے باپ کی ہدایت کے مطابق پورا کیا تھا۔ پنڈت شیام سندر داس کے خیال کے مطابق ہمیں یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ لسانی اعتبار سے راسو کا بیشتر حصّہ بعد کی تصنیف ہے۔ مگر اس کے اکثر ٹکڑے بارہویں صدی کی زبان سے متعلق ہیں یہ

لے ہندی بھاشا اور ساہتیہ از پنڈت شیام سندر داس صہ ۹۴

اس طرح راسو کو کلیتاً جعلی تصنیف ٹھرانا مناسب نہیں ہے۔ کوشش اور تلاش سے اصل تصنیف کو موجودہ تصنیف سے الگ کیا جاسکتا ہے۔"

مولانا محمد حسین آزاد نے راسو کے مختلف فقرے نقل کر کے ذیل کے عربی فارسی الفاظ کی جانب اشارہ کیا ہے۔

محل۔ پروردگار۔ پگام (پیغام)۔ کریم۔ سرطان (سلطان) بات شاہ (بادشاہ) دیوان خلک (خلق)، عالم۔ حجرت (حضرت) ملک۔ پھرمان (فرمان)۔ سلام [1]

شیخ فرید شکر گنج

شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر ساتویں صدی ہجری کے مشہور صوفی ہیں۔ ملتان کے کوتوال نامی (کھوتوال) قصبہ میں ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء میں [2] پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی۔ مشہور صوفیہ اور مشائخ سے ملاقات کی۔ اور دہلی جاکر خواجہ بختیار کاکیؒ کے مرید اور خلیفہ ہوئے۔ پاک پٹن شریف میں مقیم ہوئے اور وہیں ۶۶۴ھ میں

---

[1] آب حیات۔ محمد حسین آزاد ص۱۵ بار یازدہم

[2] بزم صوفیہ میں خزینۃ الاصفیا کے حوالے سے ۵۶۹ھ ہے مگر اسی کتاب کے حوالے سے مولانا حامد حسن قادری داستان تاریخ میں (ص۱) ۵۸۴ھ لکھتے ہیں۔

انتقال ہوا[1] آپ کے خلیفہ خواجہ بدرالدین الحق صاحب کا بیان ہے کہ آپ اپنے ایک دوست کو "بھیا" کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ آپ سے ایک دفعہ کسی شخص نے دریافت کیا کہ جسم میں عقل کا کس جگہ مقام ہے

آپ نے کہا۔ "بیچ سر کے"

شیخ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ پنجابی اور فارسی کے شاعر تھے۔ ان کو کلام کا کچھ حصہ اب بھی ملتا ہے۔

جب آپ کے مرید شیخ جمال الدین ہانسوی کا انتقال ہوا۔ تو مرحوم کی بیوی "مادر مومناں" ان کے خورد سال لڑکے خواجہ برہان الدین صوفی کو لیکر حضرت گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ شیخ نے ان کی خورد سالی کو نظر انداز کرتے ہوئے انھیں اپنی بیعت میں لے لیا۔ اس پر مادر مومناں نے بزبان ہندی کہا۔ "خواجہ برہان الدین بالا ہے۔"

شیخ فریدالدین نے جواب دیا۔

"مادر مومناں پونوں کا چاند بالا ہے۔"[2]

ایک روز شیخ فریدالدین اپنے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو

---

[1] شہزادہ دارا شکوہ نے ۶۶۴ھ قرار دی ہے دیکھئے سفینۃ الاولیا اردو ترجمہ ص۱۳۳ مگر آئین اکبری جلد سوم ص۴۰۹ میں ۶۶۸ھ لکھا ہے۔ بزم صوفیہ کے مولف نے مختلف حوالوں سے ۶۶۴ھ ۶۶۹ھ اور ۶۷۰ھ صحیح کہا ہے۔

[2] سیر الاولیا بحوالہ "پنجاب میں اردو" حافظ محمود شیرانی

وضو کرا رہے تھے۔ آنکھ آنے کی وجہ سے آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ،
حضرت نے پٹی باندھنے کا سبب پوچھا۔
بابا فرید نے کہا۔ " آنکھ آئی ہے۔"
شیخ نے کہا۔ اگر آئی ہے۔ " ایں راچرا لبستہ آید"[1]
بابا صاحب خواجہ عبدالشکور سرسوی کے مزار پر جایا کرتے تھے۔
سرسہ کے لوگ یہ دیکھنے کے لئے کہ بابا صاحب وہاں جا کر کیا کرتے ہیں۔
ایک دن راستہ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب بابا صاحب کو علم ہوا
تو آپ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا۔
" سرسہ سرسہ۔ کبھی سرسہ کبھی نرسہ"[2]
ذیل کی نظم بھی بابا صاحب کی طرف منسوب ہے۔
یہ محمد شمیم صاحب دیوبند کو کتب خانۂ دلسینہ میں گنج شکر کے
چند فارسی اقوال کے ساتھ بوسیدہ اوراق میں دستیاب ہوئی ہے۔

وقت سحر وقت مناجات ہے	خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا :	خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
بادم خود ہمدم ہشیار باش	صحبت اغیار بُری بات ہے
با تن تنہا چہ روی زیں زمیں	نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
پند شکر گنج بدل جاں شنو	ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

---

[1] جواہر فریدی ص۲۵۵ [2] جواہر فریدی ص۲۵۵

تن دھونے سے دل جو ہوتا پاک — پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک
ریش سبلت سے گر بڑے ہوتے ! — بوکڑ واں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لانے سے گر خدا پائیں — گائے بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں
گوشہ گیری میں گر خدا ملتا — گوش چیاں (دکنی) کوئی نہ واصل تھا

عشق کا رموز نیارا ہے
جز مرد دلیر کے نہ چارا ہے[1]

"مولنا شیخ فرید شکر گنج" کے نام سے ایک چار صفحے کی نظم مولوی عبدالحق کو دستیاب ہوئی ہے۔ انہوں نے اس کے دو شعر بھی بطور نمونہ دیئے ہیں۔

سگن ذکر جلی

جلی یاد کی کرنا ہر گھڑی یک تل حضور سوں ٹلنا نہیں
اٹھ بیٹھ میں یاد سوں شاد رہنا گواہ دار کو چھوڑ کے چلنا نہیں
پاک رکھ توں دل کو غیر ستی آج سائیں فرید کا آوتا ہے
قدیم قدمی کے آوتے سیں لازوال دولت کوں پاوتا ہے[2]

یہ اشعار بابا فرید گنج شکر کے بجائے بابا فرید معاصر گرو نانک کے معلوم ہوتے ہیں۔ شکر گنج اور بابا فرید کے ناموں کے یکساں

[1] "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" از عبدالحق صلہ
[2] " " " " " " " صلہ

ہونے کے باعث یہ اشعار شکر گنج سے منسوب کر دیئے گئے ہیں؎

شطرنج بازی کنتہ سو جو کھالوں انل
یک من یک جہت ہوے کر شد رخ جوڑوں
جب شہ آیا مات کوں ہوں رخ گہوں موڑوں
بازی میری کنتہ کی نت قائم لوڑوں
جب شہ فرضی بند کرا دے گھر تیرے
توں بھی شہ کو بند کر ......
بند گھری میں کئی کرامات دکھائی
بازی میری مات ہے کس آنکھوں مائی
آسا تھا محمد برد کا یہ کھیل دل جانی؟
سر دد کا ساشاہ بترا ہن سد حیرانی!
زد کا کھیل نہ کھیل توں شہ اپنی سیتی
اے منوبہ کھیل تے ہار نہیں کیتی !!
گھوڑا فیل بسات کوں سب سات جلادوں
پاؤں پیالے ہوں پھر دل جو شہ زحیاؤں
بازی جائے فرید کی کس آنکھوں ساکے
صدقے نبی رسول کے جن قائم راکھے؎

؎ "قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض" از سخاوت مرزا اردو اکتوبر ۱۹۵۰ء
؎ اورینٹل کالج میگزین مضمون پروفیسر لبھ سنگھ فروری ۱۹۲۱ء

شیخ باجن (متوفی ۹۱۲ھ) نے بابا فرید کے کچھ قول،
نقل کئے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔[1]

(۱) راول دیول بیچ نہ جلئے چاٹا پہنہ روکھا کھائے
ہم درویشنہ رہے ریت پالی نورین اودھیت

(۲) جس کا سائیں جاگنا سو کیوں سوئے داس

(۳) دوہرہ ۱۔

آدو لد ہوے تھ والین یچہ کریں
مول سنبھالیں اپنا باچھیں لاہالیتھ

مخدوم علاء الدین احمد صابر کلیری

حضرت مخدوم علاء الدین احمد صابر کلیری بابا شیخ فرید شکر
گنج کے بھانجے اور داماد تھے۔ سلسلۂ صابریہ انہیں سے
جاری ہوا۔ ۶۶۴ھ / ۱۲۶۵ء میں وفات پائی۔ مزار پیران کلیر شریف
میں ہے۔ بڑے پایہ کے صوفی بزرگ تھے۔ کبھی کبھی شعر
بھی کہتے تھے۔ ہندی میں صابر اور فارسی میں احمد تخلص
کرتے تھے۔ مصنف "سیر الاقطاب" نے آپ سے منسوب
کر کے جو ہندی شعر لکھا ہے۔ وہ درج ذیل ہے۔

---

[1] خزانۂ رحمت۔ مصنفہ شیخ بہاء الدین باجن

اس طرح اس میں ڈوب لے صابر
کہ بجز ہو کر غیر ہو نہ رہے

اس شعر کی زبان اس عہد کی مروجہ زبان سے میل نہیں کھاتی اس لیے اس شعر کا حضرت مخدوم سے انتساب مشتبہ ہے۔

حمیدالدین ناگوری

شیخ حمیدالدین ناگوری مشہور و معروف بزرگ ہیں۔ ۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء میں وفات پائی۔ ایک واقعہ خود ان کی زبانی سرور الصدور میں اس طرح بیان کیا گیا ہے

"بشیخ بزرگ (شیخ حمیدالدین ناگوری) فرمودند اگرچہ جدۂ شما سبب بیان می کند۔ ولیکن ہمہ از کرامت است۔ وقتے پیش ایشان می گرشتم خورد بودم و ایشاں بر کھٹ بودند ہیں کہ نزدیک ایشاں رفتم دست بگرفتند و بزبان ہندی گفتند می دانی جدّ تو کیست۔ گفتم بی بی۔ چگونہ گفت از جدّ تو ہیچ کس بجز پیغمبرش بزرگ نیست" [۱]

ان ہی بزرگ کا ایک دوسرا واقعہ "خزانۂ رحمت" میں اس

---

[۱] سرور الصدور ق۲۲۱ [۲] بزم صوفیہ میں لطائف اشرفی کے حوالے سے سالِ وفات ۶۴۱ھ درج ہے۔

طرح قلم بند کیا گیا ہے کہ فقر و فاقہ سے تنگ آکر اپنی ماں سے فراخیٔ معاش کی دعا کرنے کو کہا۔ ماں نے انھیں باپ کے پاس بھیج دیا۔ انہوں نے باپ سے بھی وہی بات دہرائی یعنی فراخیٔ معاش کے واسطے دعا کرنے کی گذارش کی۔

والد نے جواب میں کہا۔

"ہاں بابا کچھ کچھ"

آپ نے یہ واقعہ والدہ کو جا سنایا۔ انہوں نے بتایا اتنی دولت آئے گی کہ سمیٹے نہ بنے گی۔ اس واقعہ کے کچھ دن بعد سلطانِ وقت نے صاحبزادہ سے اپنی بیٹی کی شادی کرنے کی اجازت مانگی۔ جو مل گئی۔ اور عقد کے بعد دلہن اپنے ساتھ بیشمار مال و زر اور ساز و سامان لائی۔ اس پر والدہ نے کہا۔

اچھا ہوا کچھ کچھ کہا تھا۔ اگر کچھ زیادہ کہا ہوتا تو خدا معلوم کیا کچھ ہوتا —— !

نظام الدین اولیا

حضرت نظام الدین اولیاء (۶۳۶ھ / ۱۲۳۸ء تا ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء) حضرت بابا فرید گنج شکر کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ کے مرید حضرت امیر خسرو تھے آپ سے ہندی کا کوئی قول منقول نہیں ہے۔ لیکن ایک مرتبہ آپ نے فرمایا تھا۔

"کلام حق را در روز میثاق با ہنگ پوربی شنیدم"[1]

بو علی شاہ قلندر

حضرت شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی ۶۰۵ھ میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے[2] سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے کے مشہور صوفی بزرگ ہیں۔ ایک دفعہ امیر خسرو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور گانا سنایا۔ اس پر خوش ہو کر شاہ صاحب نے امیر خسرو کو اپنا کلام سنایا۔ کلام سن کر آپ آبدیدہ ہوئے۔ حضرت نے فرمایا۔

"ترکا کچھ سمجھ دار ہے۔"

امیر خسرو نے کہا۔

"اس لئے تو روتا ہوں کہ کچھ نہیں سمجھتا۔"

مبارز خاں جس سے شاہ صاحب کو تعلق خاطر تھا۔ اور جو شاہ صاحب کا معتقد اور مرید تھا۔ اس کے ارادۂ سفر پر شاہ صاحب نے یہ دوہا پڑھا ؎

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نا ہوئے

---

[1] "بزم صوفیہ" مولفہ صباح الدین عبد الرحمٰن ص۲۳۵ [2] رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۱ء
بحوالہ "داستان تاریخ اردو" حامد حسن قادری ص۱۳

آپ نے اس مضمون کو فارسی میں اس طرح ادا کیا۔

من شنیدم یار من فردا رود والہ شتاب!
یا الٰہی تا قیامت برنیاید آفتاب

طویل عرصہ تک رشد و ہدایت کی خدمات انجام دینے کے بعد مورخہ ۱۲ رمضان المبارک ۷۲۴ھ/۱۳۲۴ء میں وصال ہوا۔ "یا شرف الدین ابدال" سے تاریخ نکلتی ہے۔

امیر خسروؒ

حضرت امیر[۱] خسرو ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء میں بمقام پٹیالی ضلع ایٹہ پیدا ہوئے ان کے والد امیر سیف الدین محمود بلخ سے ہندوستان آئے اور ضلع ایٹہ میں پٹیالی کے مقام پر آباد ہوئے۔ وہیں ایک نومسلم راوت کی بیٹی سے شادی کی۔ جس کے بطن سے خسرو پیدا ہوئے۔ بچپن میں والد کا انتقال ہو گیا۔ نانا کے ہمراہ دہلی گئے۔ اور وہیں علوم متداولہ کی تعلیم حاصل کی۔ خسرو کے نانا عماد الملک راوت[۲] عرض کا شمار اس عہد کے امراء میں کیا جاتا ہے۔

خسرو نے سلطان غیاث الدین بلبن سے لے کر سلطان محمد بن تغلق

۱؎ خسرو کا پورا نام بعض تذکرہ نویسوں نے ابوالحسن یمین الدین خسرو لکھا ہے۔ بحوالہ امیر خسرو: ڈاکٹر وحید مرزا۔ ص ۳ ۲؎ ۔۔ امیر خسرو۔ ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۲۱

تک گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ اور سات بادشاہوں کی ملازمت کی۔
زیادہ تر قیام دہلی میں رہا۔ لیکن ملازمت کے سلسلہ میں ملتان اور
بنگال بھی جاتے رہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ اور
اپنے پیر سے خاص تعلق خاطر رکھتے تھے۔ سلطان المشائخ کے انتقال
کے وقت خسرو سلطان غیاث الدین تغلق کے ہمراہ بنگال گئے ہوئے
تھے۔ واپسی پر یہ خبر سنکر رنج وغم سے وارفتہ ہوگئے۔ اس کے بعد
زیادہ زندہ نہ رہے چنانچہ ۱۸ [1] شوال ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء کو انتقال فرمایا۔ اور
اپنے مرشد کے پاس دفن ہوئے۔ تاریخ وفات "طوطیٔ شکر مقال"
سے نکلتی ہے۔ (۷۲۵ھ)

خسرو فارسی نظم ونثر میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے۔ عربی بھی
جانتے تھے۔ اور سنسکرت اور بھاشا سے بھی واقف تھے۔ انھیں موسیقی
میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ اسی مہارت کی بناء پر انھیں نائک
کا لقب ملا۔ اور گویئے انہیں آٹھواں نائک یعنی اس فن کا امام'

---

[1] لوح پر جو کتبہ ہے وہ اسی عہد کے ایک شاعر شہاب معمائی کا کہا ہوا قطعہ ہے۔ اس کتبہ کی رو
سے خسرو کا انتقال ۷۲۵ھ میں ہوا۔ اور اس کی تصدیق اور بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن تاریخ اور
مہینہ میں اختلاف ہے۔ یعنی فرشتہ نے تاریخ وفات ۱۷ ذیقعد ۷۲۵ھ لکھی ہے۔ لیکن سفینۃ الاولیاء
(دارا شکوہ) میں ۱۸ شوال ۷۲۵ھ دی گئی ہے۔ اور غالباً یہ روایت زیادہ صحیح ہے کیونکہ خسرو کا عرس
اسی تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ بحوالہ "امیر خسرو" ڈاکٹر وحید مرزا صفحہ ۱۸۷، ۱۸۸
(اردو ایڈیشن)

مانتے ہیں۔

ہندی اور ایرانی موسیقی کی از سرِ نو تدوین کرکے اس کو بہت نئی ایجادوں سے مالا مال کیا۔ ان کی تصانیف نظم و نثر کی تعداد مختلف لوگوں نے مختلف بتائی ہے۔[1] مورخ برنی اور مصنف سیرالاولیا کی تحریروں کے مطابق خسرو کی تصانیف سے ایک کتب خانہ بن سکتا تھا۔ جامی نے ۹۹ اور ابن رازی نے ۱۹۹ لکھی ہے۔ لیکن نواب محمد اسحاق خاں کی کوششوں سے ۴۵ تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ جس میں سے ڈاکٹر وحید مرزا صاحب کے خیال میں صرف اکیس[!] تصانیف رہ جاتی ہیں۔ جو خسرو سے منسوب کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ غرض کسی آخری تعداد کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ خسرو کثرت سے لکھنے والے بزرگ تھے ان کے اشعار کی تعداد بھی دولت شاہ کے نزدیک چار پانچ لاکھ کے درمیان ہے۔ لیکن دولت شاہ نے خسرو کے جس بیان کا حوالہ دیا ہے وہ خسرو کے محققین کو نہ مل سکا۔ البتہ نظم میں خسرو کے پانچ دیوان نو مثنویاں۔ جن میں خمسہ بھی شامل ہے۔ اور غزلیات کے متفرق مجموعے موجود ہیں۔

فارسی کے علاوہ ہندی کلام بھی ان سے منسوب ہے۔ لیکن خود بقول خسرو انہوں نے اس کو جمع کرنے کا کبھی خیال نہیں کیا۔ اور اس طرح

---

[1] بحوالۂ وحید مرزا صد ۱۹۲ تا ۱۹۲

ہم اس سے محروم رہ گئے۔

خسرو نے "غرۃ الکمال" کے دیباچہ میں اپنے ہندی کلام کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"جزوے چند نظم ہندوی نیز نثر دوستاں کردہ شدہ است اینجا هم بدیگرے بس کردم و نظر برنداشت کہ لفظ ہندوی در پارسی لطیف آوردن چنداں لطفے ندارد۔ مگر بضرورت آنجا کہ ضرورت بود دست آوردہ شد"

بعض نثری تصانیف بھی ہیں۔ جیسے "اعجازِ خسروی"۔ "خزائن الفتوح" اور "افضل الفوائد"

شاہانِ اودھ کے کتب خانوں میں جو "موتی محل" اور "توپخانے" میں تھے۔ امیر خسرو کے دو سو چیستاں موجود تھے۔ اور اس کے علاوہ ایک مجموعے میں ان کا متفرق کلام جمع تھا۔ جس میں فارسی آمیز غزلیں اور مکرنیاں وغیرہ تھیں [1]

ڈاکٹر اشپرنگر نے اس مجموعے کے متعلق ۱۸۵۷ء میں ایک مضمون بھی سپردِ قلم کیا تھا۔ اس میں سے ذیل کے چیستان نقل ہیں۔

سب کوئی اس کو جانتے ہے   پر ایک نہیں پہچانتے ہے

آٹھہ دھڑی میں لیکھا ہے   فکر کیا اُن دیکھا ہے

(احمد الٰہی)

---

[1] فہرست کتب خانۂ شاہانِ اودھ" مرتبہ اشپرنگر ـــــ

دس ناری کا ایک ہی نر ! بستی باہر وا کا گھر
پیٹ سخت اور پیٹ نرم منھ میٹھا تاثیر گرم

بال نچا جب سب کو بھایا بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں بوجھ نہیں تو چھوڑ دکھاؤں

اندر چلمن باہر چلمن بیچ کلیجہ دھڑکے امیر خسرو یوں کہے وہ دو دو انگل سرکے

جل کر بنے جل میں رہے آنکھوں میں دیکھا خسرو کہے

ایک الاکھا گرہ بنایا ! اوپر نیو نیچے گھر چھایا
بانس نہ بلی بندھن گھنیچے کہو خسرو گھر کیسے بنے

ذیل کی غزلیں بھی امیر خسرو سے منسوب ہیں۔

زحال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں !
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سنا دے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چوں شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ہمیشہ گریاں بعشق آں مہ
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آئیں نہ بھیجیں پتیاں

بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو !!
سپیت من کے درائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

خوار شدم زار شدم لٹ گیا — در غم ہجر تو کمر ٹوٹہ ہے[1]

یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من — بے گنہ ہم ساتھ عجب روٹھہ ہے

روئے تو رونق شکن آفتاب — سرو بہ پیش تو قد بوٹہ ہے

گاہ ز خسرو تو نگفتہ کہ بیٹھ — دہ چہ کند بھاگ مرا پھوٹہ ہے

وہ گئے بالم وہ گئے ندیا کنار — آپ پار اتر گئے ہم تو رہے اروار

بھائی رے ملاح ہم کوں پار اتار — ہاتھ کا دیوں گی مندری گل کا دیوں ہار

دیکھ میں اپنے حال کو روؤں زار و زار — وے گن وتا بہت ہیا ہم ہیں اوگنہار

بابا سیجی میں دیکھ کوں تانڈا کو بھول — ہر چھاد کچھ دیا جیا نالا یا مول !

ملکو اچکوی دو جئے انکوں ماروں کو — اودھ مارے کرتار کے رین بچھوڑی ہو

سیج دہیتی دیکھ کر روؤں مندہ بین — پیا کرتی پھروں پل بھر سکھ نہ چین

سب ناریں سو سکھ سیں کنتاں کوں گل لا — ہم دکھیاری جنم کی دکھی گئی بیار

تازی گھوڑا دیس میں قصبے بھڑی بگار — دروازے بیٹے رہ گئے نکس گئے اسوار

اس نظم کو بھی امیر خسرو کی تصنیف ماننے میں تکلف ہوتا ہے۔ حالانکہ پروفیسر شیرانی[2] جیسے محقق نے اس کو بغیر تبصرہ خسرو سے منسوب کیا ہے۔ محمود شیرانی نے اپنی تصنیف "پنجاب میں اردو" میں تیرہویں صدی ہجری کی نوشتہ ایک بیاض سے خسرو کی ایک اور غزل نقل کی ہے۔

---

[1] یہ ریختہ شیخ جمالی کے نام سے بھی منسوب ہے جو بابر اور شیر شاہ کے زمانے میں تھے۔ بحوالہ پنجاب میں اردو" محمود شیرانی ص ۱۳۲

مگر وہ اُسے حقیقتاً اس کی تصنیف ماننے پر تیار نہیں ہیں۔

جب یار دیکھا نین بھر، دل کی گئی چنتا اُتر
ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اسے سمجھائے کر

جب آنکھ سے اوجھل بھیا تڑپن لگا میرا جیا
حقا الٰہی کیا کیا آنسو چلے بھر لائے کر

توں تو ہمارا یار ہے تجھ پر ہمارا پیار ہے
تجھ دوستی بسیار ہے، یک شب ملو تم آئے کر

جاناں طلب تیری کروں، دیگر طلب کس کی کروں
تیری جو چنتا دل دھروں اک دن ملو تم آئے کر

میرا جو من تم نے لیا تم نے اٹھا غم کوں دیا!
غم نے مجھے ایسا کیا جیسے پتنگا آگ پر

خسرو کہے باتاں غضب دل میں نہ لاوے کچھ عجب
قدرت خدا کی ہے عجب جب جیو دیا گل لائے کر [1]

خسرو کے بعض اشعار کو ہندی فارسی دونوں میں پڑھا جا سکتا ہے ؎

آری آری ہمہ بسیاری آری، ماری ماری بر کہ ماری آری [2]

ایک اور صنف کی ایجاد بھی خسرو سے منسوب ہے جسے شہر آشوب کہا

---

[1] بیاض مملوکہ پروفیسر سراج الدین احمد اسلامیہ کالج لاہور بحوالہ "پنجاب میں اردو" ص ۱۱۵

[2] از دیباچہ "غرۃ الکمال" بحوالہ "امیر خسرو" از ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۳۳

جاتا ہے۔ ان میں پیشہ وروں کا قطعات کی شکل میں ذکر ہوتا ہے۔[1]
ہم ذیل میں شہر آشوب کے کچھ نمونے درج کرتے ہیں۔

تبنی پسرے کہ میفروشد تیلے — از دست و زبان چرب او دادِ بیلے
خالے بہ لبش دیدم و گفتم کہ تل است — گفتا کہ بر و نیست درین تل تیلے

گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی — آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی
از ہر دو لبت قند و شکر میریزد — ہر گاہ بگوئی کہ "دہی لیہو دہی"

زرگر پسرے چو ماہ پارا! — کچھ گھڑیئے سواریئے پکارا
لقد دل من گرفت و بشکست — پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سوارا

رفتم بہ تماشہ بکنار جوئے — دیدم بلب آب زن ہندوئے
گفتم صنما چیست بہائے مویت — فریاد بر آورد کہ "دُر دُر موئے"

ہندو بچہ بیں کہ عجب حسن دھرت ہے — ہر وقت سخن گفتن گلہ پھول جھرت ہے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم — گفتا کہ ارے رام ترک کا ہیں کرت ہے[2]

"جواہر خسروی" میں خسرو کے دو ہندی دوہے بھی نقل کئے گئے ہیں:

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ — تن میرو من پیر کو دو دبھئے اک رنگ
گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس — چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چو ہندیس

"خالق باری" وہ تصنیف ہے جسے تمام تذکرہ نگاروں نے بالاتفاق

---

[1] مولانا محمد امین چریا کوٹی۔ "جواہر خسروی" علیگڈھ ۱۹۱۸ء
[2] "فرہنگ آصفیہ" میں امیر خسرو کے نام پر درج ہے۔

خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ مگر پروفیسر محمود شیرانی نے ایک مضمون لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ دراصل امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے[1] نہ ان کے عہد کے لگ بھگ کی تصنیف ہے ۔ بلکہ یہ ان سے بہت بعد کسی دوسرے خسرو تخلص کے شاعر نے تصنیف کی ہے ۔ اس میں ۲۱۵[2] اشعار ہیں اور عربی فارسی الفاظ کے ہندی مرادفات ابیات کی صورت میں بتائے گئے ہیں ، ؎

خالق باری سرجن ہار ! واحد ایک بدا کرتار

بادہ شراب دراوق صہبا مے است دمد

گر جرعہ زاں خوری تو کشی کار نیک و بد

زر بود سونا سیم جیتل نقرہ روپا جامہ کپڑا ٹاٹ سترڈبہ کوپا

عقرب بتیا نزی بچھو کژدم بنج ملک بشمر تو سر دش و فرشتہ ملک

بیا برادر آ دے بھائی ! بہ نشیں مادر بیٹھ ری مائی

---

[1] ڈاکٹر وحید مرزا صاحب جنہوں نے امیر خسرو پر محققانہ مقالہ لکھا ہے پروفیسر صاحب موصوف کے بیان سے اختلاف کرتے ہیں ۔ ان کا فیصلہ ہے کہ "خالق باری" یا اس کا زیادہ تر حصہ امیر خسرو کی تصنیف ضرور ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ امتدادِ زمانہ سے اس میں تصرف اور تحریف ہوتا رہا ہو اور بعض ہندی الفاظ کی شکل بدل گئی ہو ۔ " امیر خسرو " صفحہ ۳۲۹

[2] "خالق باری" مرتبہ مولوی محمد امین چریا کوٹی ۔

شیخ سراج الدین عثمان

شیخ سراج الدین عثمان شیخ نظام الدین اولیار کے مرید تھے۔ آپ کو اخی سراج کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ آپ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کے خلیفہ تھے ــــــ انتقال ۷۵۸ھ؍۱۳۵۷ء میں ہوا[1]

۷۲۵ھ میں جب شیخ نظام الدین اولیار کی وفات ہوئی تو آپ بنگال سے دہلی آئے۔ اور خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ خواجہ نصیر الدین نے آپ کو بنگال جانے کہا۔ مگر آپ نے عرض کیا کہ وہاں پہلے ہی سے ایک دوسرے مشہور صوفی شیخ علاؤ الدین قبل موجود اور مرجع خاص و عام ہیں۔ میرا جانا چنداں سود مند نہیں۔ اس پر خواجہ نصیر الدین چراغ نے فرمایا:۔

"تم اوپر دے تل" [2]

اس فقرہ کو کچھ اصحاب نے "تم اوپر دے تلے بھی" لکھا ہے[3]

---

[1] خزینۃ الاصفیا جلد اول ص ۳۵۸

[2] تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۲۹۱

[3] تاریخ زبان اردوئے قدیم۔ مصنف حکیم سید شمس اللہ قادری ص ۲۳

آپ فوراً بنگالہ روانہ ہو گئے۔

شیخ لطیف الدین دریا نوش

شیخ لطیف الدین دریا نوش حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ تھے ایک روز یہ سنکر کہ حضرت نے ہفت اقلیم اپنے شاگردوں میں تقسیم فرمادی ہے۔ آپ نے بھی حضرت نظام الدین اولیاء کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ اور والدہ سے اجازت طلب کی۔ ان کی اس سعادت مندی سے والدہ بہت خوش ہوئیں۔ اور دوپٹہ اُتار کر بیٹے کے سر پر لپیٹ دیا۔ اور دعا دی کہ سُرخ رو ہو گے۔ اور جو مانگو گے سو پاؤ گے۔

شیخ لطیف الدین حضرت نظام الدین اولیاء کے آستانہ پر حاضر ہوئے۔ حضرت اُس وقت وضو فرما رہے تھے۔ اور تمام خلفاء تخت کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔

شیخ لطیف الدین نے سر زمین پر رکھ کر اظہارِ اطاعت و سعادت مندی کیا۔ حضرت نظام الدین اولیاء نے پذیرائی کی۔ اور فرمایا کہ

" اچھے وقت آئے میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ جو مانگنا چاہتے ہو مانگو۔ "

اس جملہ کو تین بار دہرایا۔

شیخ لطیف الدین نے سر بسجود ہو کر عرض کیا۔

"گنجے دفیقری"

حضرت نظام الدین اولیاء بہت خوش ہوئے۔ اور طشت میں جو وضو کا پانی تھا شیخ لطیف الدین کو عنایت فرمایا۔ اور دونوں کان پکڑ کر کہا کہ

"لطیف الدین دریا نوش۔ تو نے کیا عمل کیا تھا جس کے سبب یہ توفیق پائی ــــ؟"

آپ نے عرض کیا کہ

"میں نے عمل تو کوئی نہیں کیا۔ البتہ والدہ سے اجازت ضرور طلب کی تھی۔ کہ آپ خوش ہیں۔ اور بخشش فرما رہے ہیں۔ میں بھی حضرت کی خدمت حاضر ہو جاؤں۔ اور سرخروئی حاصل کروں۔ والدہ نے خوشی سے اپنا دوپٹہ میرے سر سے لپیٹ دیا۔ اور دعا کی کہ "جا بابا سُرخ رو ہو گا۔ اور حسبِ طلب پائے گا۔"

حضرت شیخ نظام الدین اولیاء نے فوراً وہ دوپٹہ طلب کیا آپ نے سر سے اتار کر حضرت کو پیش کر دیا۔

حضرت نے اپنے خادم کو بلا کر ہدایت کی۔ کہ رحلت کے بعد میرے کفن میں یہ دوپٹہ ضرور رکھا جائے [۱]

---

[۱] خزانۂ رحمت" مصنفہ حضرت رحمت اللہ

حضرت شیخ لطیف الدین کا گھر سرکی کا بنا ہوا تھا۔ سرما۔ گرما برسات، ہر موسم اس ٹٹی کے بنے ہوئے گھر میں گذارتے۔ اور پرانی ہو جانے پر نئی سرکی لاکر اس سے دوبارہ گھر بناتے تھے۔ لوگوں نے مستقل گھر بنانے کا مشورہ دینے پر کہتے۔

ارے ارے بابا ہیے بنجارے
کیا گھر کرتے ہیں بنجارے"

شیخ شرف الدین یحیٰ منیری مشہور و معروف صوفی بزرگ ہیں۔ بہار کے قصبے منیر سے منسوب ہونے کے باعث منیری کہلاتے ہیں۔ ۶۶۲ھ/۱۲۶۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۷۲۵ھ میں شیخ نظام الدین اولیاء کے مُرید ہونے کی غرض سے دہلی آئے۔ مگر ان کی وفات ہو چکی تھی۔ اس لیے شیخ نجیب الدین فردوسی کے مُرید ہو گئے۔

ایک مضمون نگار "فرشتہ" کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ کہ وہ شیخ نظام الدین اولیاء سے ملے۔ اور انہوں نے شیخ نجیب الدین فردوسی کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ

"تم لوگ خانوادۂ فردوسیہ" میں داخل ہو۔[1]

صوبہ بہار میں راجگیر کے مقام پر کافی عرصہ تک ریاضت اور عبادت میں مشغول رہے۔ ۷۸۲ھ/۱۳۸۰ء میں وفات پائی۔

---

[1] شیخ الاسلام قطب عالم حضرت مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری بہاری اور علم و ادب۔ از سید عبداللطیف اورنگ آبادی معارف اعظم گڑھ دسمبر ۵۹ء ص

آپ کے ملفوظات و مکتوبات معدن المعانی، کتاب الارشاد السالکین اور شرح آداب المریدین "مشہور ہیں۔ خاص کر مکتوبات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

آپ پوربی اور بھاشا میں شاعری بھی کرتے تھے۔ آپ کے ایک گنج منده[1] سے دو دوہرے درج ہیں۔

کالا ہنسا نرملا بسے سمندر تیر — پنکھ پسارے بکھ ہرے نرمل کرے شریر
شرف صرف پا لاگیو درد کچھو نہ بسائے — گرد چھوئیں دربار کی سو درد دور ہو جائے
درد رہے نہ پیر[2]

سید محمد جونپوری

حضرت سید محمد جونپوری ۸۴۷ھ/۱۴۴۳ء کو پیدا ہوئے تھے۔

حضرت سید محمد جونپوری کو ان کے مرید "مہدی آخرالزماں" مانتے ہیں۔ بہت بڑے بزرگ اور صوفی گذرے ہیں۔ عمر کا زیادہ تر حصہ سیر و سیاحت میں گذرا۔ باوجود زبردست علم و فضل کے اکثر ہندی یا گجراتی زبان میں خطاب کرتے تھے۔ ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں بمقام فراح بلوچستان وفات پائی۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔

---

[1] گنج منده نثر و حصہ میں شامل ہے بحوالہ پنجاب میں اردو، حافظ محمود شیرانی ص ۱۱۲

[2] از بیانِ مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور

ایک مرتبہ شیخ احمد کھٹو کی نسبت آپ نے فرمایا۔

"رو پیٹنے خدا کوں پہنچے۔"

(یعنی بہ گریہ وزاری بہ خدا رسید) [1]

سفر خراسان کے دوران سلطان حسین والیٔ خراسان کی فوج نے آپ کے ساتھیوں اور مریدوں کو تکلیف دی۔ مگر جب یہ خبر سلطان کو پہنچی تو اُس نے معذرت طلب کی۔

آپ نے سلطان کے سفیر سے یہ جملہ کہا۔

"شر کی چوٹ شکر کی پوٹ۔"

سفر حج کے زمانے میں یہ دوہرا کہا [2]

ہوں بلہاری سجنا ہوں بلہار   ہوں سر جن صہرا ساجن مجھ گل ہار

رحلت سے کچھ دیر قبل یہ دوہرا پڑھا

ہیرو نت پکھال توں کال پر دھوے لاکھوے

ادجبل بہو دیں بچھوت سی سکھ تدری نا ہوئے

یہی دوہرہ آپ نے قاضی علاء الدین بیدری کو مخاطب کر کے پڑھا تھا [3]

---

[1] تاریخ سلیمانی جلد اول بحوالہ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام از ڈاکٹر عبدالحق صا۲
[2] از شواہد الولایت " " " " " " "
[3] " " " " " " " " " صـ۳۰

مولوی عبدالحق کو دو دوہرے اسرار عشق مصنفہ عبدالمومن مومن

۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء کے ایک قدیم نسخے میں جس کے سرورق پر ذیل کی عبارت

درج ہے۔ ملے ہیں۔

• این کتاب مسمی با اسرار عشق من ابتدا تا انتہا شرح نقل مقدس

سید محمد مہدی موعود است و سوائے این حرف نیست۔ نقل اینست

کہ مہدی علیہ السلام فرمود "تمام عالم مصطفیٰ کے ولایت کا صفت

کرنے بیچ ہوا۔ ہمارے ملانے دو گو جری دعیان میں مصطفیٰ

کی ولایت کی صفت کیئے۔

دوہرہ ۱۔ چندر کہے تراین کوں سورج دیکھو آئے

ایسا بھگونت جو بیٹھے بیٹ پاپ جھڑ جائے

دوہو دیگر تو روپ دیکھو جگ موہیا چند تراین بھان

اکنیں روپ بہن ہووں کو رہی نہ ہوئے آن

این تمام کتاب شرح و تفسیر ہمیں دو دوہرہا است [1]

کبیرداس

بنارس کے رہنے والے تھے۔ ان کی ذات اور مذہب کے بارے

---

[1] "اسرار عشق" مصنفہ عبدالمومن مومن بحوالہ "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" از ڈاکٹر مولوی عبدالحق صـ ۳۰

میں اختلاف ہے۔ ہندو انھیں ایک بیوہ برہمنی کا بچہ بتاتے ہیں۔ جسے ایک مسلمان یا ہندو نے پرورش کیا۔ اور مسلمان کہتے ہیں کہ وہ پیدائشی مسلمان تھے۔ دونوں قوموں میں ہر دلعزیز تھے۔ ہندو کبیر داس اور مسلمان شاہ کبیر کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ ان کے لڑکے کا نام کمال اور لڑکی کا نام کمالی تھا۔

کبیر کے عہد کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ ابوالفضل اور صاحب دبستان مذاہب انہیں سلطان سکندر لودھی کے عہد کا مانتے ہیں۔ اس طرح ان کی وفات دسویں صدی ہجری کے ابتدائی سالوں میں ہونی چاہیے۔

مولانا حامد حسن قادری ان کا زمانہ سنہ ۱۴۴۰ء / ۸۴۳ھ تا سنہ ۱۵۱۸ء / ۹۲۴ھ بتاتے ہیں۔ مگر ماخذ درج نہیں کیا۔[1]

یحییٰ خاں نے کبیر کا روضہ موضع مگھر ضلع بستی میں سنہ ۱۴۵۰ء / ۸۵۴ھ میں تیار کرایا۔ اور سنہ ۹۷۶ھ میں فدائی خاں نے اکبر اعظم کے اس عہد میں اس کی مرمت کرائی۔[2]

حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ کبیر مسلمان صوفی تھے۔ عشق الٰہی۔ فنائیت۔ محویت۔ ترک و تجرید۔ حیرانی۔ موت

---

[1] "داستانِ تاریخ اردو" مصنفہ حامد حسن قادری ص ۲

[2] آرکیالوجیکل رپورٹ اثریات قدیمہ و محفوظات صوبۂ شمال و مغربی و اودھ ص ۲۲۴

کی یاد۔ دنیا کی بے ثباتی۔ اور ہمہ اوست۔ وغیرہ مضامین کی۔ ان کے یہاں اکثریت ہے۔ اور ان کے اکثر اشعار مسلمان شعراء کی یاد دلاتے ہیں۔

کبیرؔ کے نام پر بہت سا الحاقی کلام ان کے کلام میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اور اس میں مسلمانوں اور اسلامی معاشرہ رسم ورواج کے خلاف خوب زہر اُگلا گیا ہے۔ مثلاً

کانکر پاتھر جوڑ کے مسجد لیئی بنائے
تا چڑھ ملا بانگ دے کیا بہرا ہوا خدائے

مسلمانوں کے پیر اولیا مرگا مرگی کھائی
خالہ کی ری بیٹی بیاہیں گھر میں کریں سگائی

کبیرؔ کے کلام میں تصرف اور الحاق ہونے کا پتہ بعض ایسی چیزوں کے ناموں سے چلتا ہے۔ جو کبیرؔ کے عہد میں رائج نہیں تھیں اور ان سے بہت بعد استعمال میں آئیں۔ مثلاً تماکو دوربین وغیرہ۔ دوربین ہندوستان میں انگریزوں کے عہد میں آئی۔ اور تمباکو اکبر اعظم کے عہد میں۔ بندوق اگرچہ دکن میں کافی عرصہ سے رائج تھی۔ مگر شمالی ہندوستان میں وہ بابر کے ساتھ آئی[1]

کب تارو بندوق چلایا   داس ولیو کب نبب بجایا[2]

---

[1] "پنجاب میں اردو" مصنفہ محمود شیرانی ص۱۹۷ تا ص۲۰۶

[2] "کبیر بجناولی" ص۱۶۹

ع۔ جھنگ تب کو سفا گا نجا سو کہا کبوب ادڑا یا رے [۱]

ع۔ بترے دوارے دور بن لگاوے اترے بوجل بار [۲]

پروفیسر محمود شیرانی نے صاحب مخزن الاصفیا کی رائے کبیر کے متعلق نقل کی ہے۔

"مرید و خلیفہ شیخ تقی است از اولیاء اللہ و مشاہیر عہد خود است و جمال ولایت را در طریق ولایت مستور داشتے و در موحدان وقت خود ممتاز بود و او را در زبان ہندی کلام بسیار عالی است کہ بر علو درجات او دال است و اگر در کلام او تفحص و تجسس کردہ آید نوعے از قسم وصال یافتہ مے شود و فراق را در صفت و صنعت او اصلا عیب نیست۔ و اول کسے کہ بزبان ہندی حقایق و معارف بیان فرمودہ او ست۔ و انواع اشعار ہندی دارد لیکن اکثرے از جنس بشن پد و ساکھی از روئے منقول است و اگر بنظر انصاف بہ بینی جواہر دقایق و لآلی حقایق بمیزان سنجیدہ است کہ مثل آن در کلام دیگرے یافتہ نمی شود . . . . .

. . . و از قوت باطنی او آنکہ اہل اسلام و ہنود ہر دو فریق بر و اعتقاد کامل دارند و از خود شمارند۔ چنانچہ در اہل اسلام پیر

---

[۱] "کبیر بچنادلی" صفحہ ۱۲۵

[۲] " " ۱۰۳

کبیرؔ در ہنود بہ جگت کبیر اشتہار دارد ۔ "

ایک دوسرے مشہور معروف عالم اپنے دادا شیخ سعد اللہ متوفی ۹۲۸ھ کی رائے کبیرؔ کی بابت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

" عمی می فرمودند روزے از ایشان پرسیدم ایں کبیرؔ مشہور کہ بشن پدہائے دے میخوانند مسلمان بود یا کافر؟
فرمودند موحد بود عرضہ کردم کہ موحد مگر غیر کافر و مسلمان است! فرمودند فہم ایں معنی دشوار است خواہید فہمید" [1]

کبیرؔ کے متعلق یہ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ گرو رامانند کے چیلے ہو گئے تھے۔ اور پھر انہوں نے اپنا مذہب کبیر پنتھی نکالا۔ جس میں مذہب کی کوئی قید نہیں۔ کبیرؔ کے مذہب نے بت پرستی کی بیخ کنی۔ اور توحید کی آواز کی نشر و اشاعت میں زبر دست حصّہ لیا۔

داؤ د پنتھیوں۔ سنتامیوں۔ اور نانک سنتھیوں پر ان کا گہرا اثر ہے۔ وہ سچے صوفی نظر آتے ہیں۔ وہ ظاہر داری اور ریاکاری کے زبردست دشمن ہیں۔ اور شیخ و برہمن دونوں کو ان کی ظاہر پرستی اور ریاکاری پر لتاڑتے ہیں۔ کڑوی سے کڑوی بات کے کہنے میں ان کو باک نہیں ہے۔ کسی کی مروّت نہیں کرتے۔ اور ہندو مسلمان دونوں کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ ؞

---

[1] اخبار الاخیار از شاہ عبدالحق محدث دہلوی ص۳۱۳

ان کے کلام میں سادگی، شیرینی، اثر، جدت اور درد ہے۔ اعلیٰ مضامین کو اپنی سادہ اور روزمرہ کی زبان، معمولی، اور عام تشبیہوں استعاروں کے ساتھ ادا کر دیتے ہیں۔ کلام دل پر اثر کرتا ہے۔

کبیرؔ کی بولی پوربی ہے۔ جیسا کہ خود انہوں نے کہا ہے ؎

میری بولی پوربی تاہی نہ چینھے کوئی
میری بولی سو لکھے جو پورب کا ہوئے

مگر یہ ایسی پوربی بولی نہیں جس کو سمجھنے کے لئے شرح کی ضرورت ہو۔ یہ وہ بولی ہے جو دسویں صدی ہجری میں تمام شمالی ہندوستان میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ یہیں سے اردو (ہندوستانی) کی بنیاد پڑتی ہے۔ ان کے کلام میں عربی، فارسی، کے الفاظ بلا تکلف استعمال ہوتے ہیں۔

نمونۂ کلام درج ذیل ہے ؎

رہنا نہیں دیس بیگانا ہے — یہ سنسار کاگد کی پڑیا ہے
بوند پڑے گھل جانا ہے

بہت دن بچھڑے ہری پائے — بھاگ بڑے گھر بیٹھے آئے
جاگ پیاری کاہے سووے — رین گئی دن کاہے کھووے
مرے تو مر جایئے چھوٹ پڑے جنجار — ایسا مرنا کو مرے دن میں سو سو بار

کبیرؔ یہ گھر پریم کا کھالا کا گھر ناہیں
سیس اتارے ہاتھ سے سو بیٹھے گھر ماہیں

ایسا کوئی نہ ملے جا سوں رہے لاگ　　سب جگ جلتا دیکھئے اپنی اپنی آگ
میرا مجھ میں کچھ نہیں جو کچھ ہے سو تیرا　　تیرا تجھ کو سونپتے کیا لاگے میرا

کبیر سکھ کو جائے تھا آگے آیا دکھ
جلی سکھ گھر اپنے ہم جائیں اور دکھ

کبیر نوبت آپنی دس دن لیہو بجائے　　یہ پور پٹن یہ گلی بہر نہ دیکھو آئے
بادشاہا کہاں سد عوکری بھانت بھانت کی بیچ　　دعویٰ کس کا ہی نہیں بنا ولایت راج
کبیر اس سنسار کو سمجھاؤں کے بار　　پونچھ تو پکڑے بھیڑ کی اترا چاہے پار
کبیر ایک نہ جانیا تو بہو جانیا کیا ہوئے　　ایک ہی تیں سب ہوت ہے سب تیں ایک نہ ہوئے
ہاڑ جلے جوں لاکڑی کیس جلے جوں گھاس　　سب تن جلتا دیکھ کر بھیا کبیرا اداس
کبیر حد کے جیو سوں ہت کر مکھوں نہ بول　　جے لاگے بے حد موں تن سوں انتر کھول
کبیر ناؤ ہے جرجری کوڑے کھیون ہار　　ہلکے ہلکے تر گئے بوڑے جن سر بھار
سکھیا سب سنسار ہے کھائے اور سووے　　دکھیا داس کبیر ہے جاگے اور رووے
چلو چلو سب کوئی کہے موہی اندیسہ اور　　صاحب سوں پرچا نہیں جائیں گے کس ٹھور

کبیر بھاٹی کلال کی بہت اک بیٹھے آدے
سر سونپے سوئی پئے نہیں تو پیا نہ جائے

کبیر ستر سر لئے ہے کیوں سوئے سکھ چین　　کوچ نقارا سانس کا باجت ہے دن رین
راجہ دکھیا پرجا دکھیا جوگی کو دکھ دو ندی　　کہے کبیر سنو بھئی سادھو کوئی مند نہیں بندی
ماٹی کہے کمہار کوں تو کیا روندے موہیں　　ایک دن ایسا ہوئے گا میں روندوں گی توہیں
دین گنوایو سنگ دنی دنی نہ چالی ساتھ　　پاؤں کلہاڑی ماریا مورکھ اپنے ہاتھ

ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا — رہیں آزاد یا جگ میں ہمن دنیا سے یاری کیا
کبیرا عشق کا ماتا دوئی کو دور کر دل سے — تو چلنا راہ نازک ہے ہمن کو بوجھ بھاری کیا[1]

خلق سب رین کا سپنا، سمجھ من کوئی نہیں اپنا
کٹھن یہ موہ کی دھارا، بہا سب جات سنسارا
گھڑا جو نیر کا پھوٹا، پتا جو ڈار سے ٹوٹا
آس نر جات جند گانی ابھوں لگ ابگ نانی
بھولت دیکھ تن گورا جگت میں جیونا تھورا
تجو بد نو یہ چترائی رہو نہ سنگ جگ مائیں
نکس جب پران جاویں گے کوئی نہیں کام آویں گے
جسے یہ پار سُت دارا اسی دن ہو ہیں گے نیارا
آرس نر جان یہ دیہا لگا لے نام سے نیہا
کٹے جم جال کی پھانسی کہے کبیرا بناسی ست[2]
ستا نہیں دھن کی خبراں حد باجا باجتا
رمند مندر گاجتا باہر سنّے تو کیا ہوگا
گانجا افیم و پوستا بھنگ اور شرابیں پیتا
اک پریم رس چاکھا نہیں املی ہوا تو کیا ہوا

---

[1] اس غزل کا کبیر سے انتساب مشکوک ہے۔

[2] کبیر بچناولی۔ ص ۱۸۳

کاسی گیا اور دوار کا تیرتھ شکل بھرمت پھرے
گانٹھی نہ کھولی کپٹ کی تیرتھ گیا تو کیا ہوا
پوتھی کتابیں بانچنا اوروں کو نت سمجھاوتا
نہ کوئی محل کھوجے نہیں بک بک مرا تو کیا ہوا
قاضی کتابیں کھوجتا کرتا نصیحت اور کو
محرم نہیں اس حال سے قاضی ہوا تو کیا ہوا
شطرنج چوپڑ گنجفہ اک نرد ہے بدرنگ کی
بازی نہ لائی پریم کی کھیلا جوا تو کیا ہوا
جوگی دگمبر سے بڑا کپڑا رنگے رنگ لال سے
واقف نہیں اس رنگ سے کپڑا رنگا تو کیا ہوا
مندر جھروکے راوٹی گل چمن میں رہتے سدا
کہتے کبیرا ہیں سبھی گھٹ گھٹ میں صاحب رم رہا [1]

گرو نانک

گرونانک سکھ مذہب کے بانی کہے جاتے ہیں۔ آپ کبیر کے ہم عصر تھے۔ اور ان کی تعلیم اور خیالات سے کافی متاثر ہوئے تھے آپ سنہ ۱۴۶۹ء (۸۷۴ھ) میں پیدا ہوئے۔ اور سنہ ۱۵۳۸ء (۹۴۵ھ) میں انتقال

---

[1] کبیر گرنتھاولی۔

ہوا۔ اس طرح تقریباً ۷۰ برس تک وہ اپنے پیغام سے اہلِ پنجاب کے
دلوں کو گرماتے رہے۔ ان کی مذہبی تصنیفات میں عربی۔ فارسی
کے الفاظ کی آمیزش بڑی حد تک صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان کے
دوہے اور اشعار اردو کی رفتار ترقی اور مقبولیت کا پتہ دیتے ہیں؎

سانس ماس سب جیو تمہارا — تو ہے اکھڑا پیارا
نانکؔ شاعر یو کہت ہے — سچے پروردگارا

بابر سلطنت مغلیہ کا بانی ہے سنہ ۱۴۸۳ء / ۸۸۸ھ میں پیدا ہوا۔ اور
سنہ ۱۵۳۰ء / ۹۳۷ھ میں وفات پائی۔ سنہ ۱۵۱۹ء / ۹۲۵ھ میں سندھ پر اور سنہ ۱۵۲۶ء / ۹۳۲ھ
کے تیسرے حملے میں دلّی کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ ابراہیم لودی
جنگ میں مارا گیا۔ اور جب اس کا سر کاٹ کر بابر کے سامنے لایا
گیا۔ تو کسی نے فوراً یہ شعر پڑھا؎

نو سے اوپر تھا بتیسا — پانی پت میں بھارت دلیسا
اٹھیں رجب سکر وارا — بابرؔ جیتا براہیم ہارا

(یعنی ۸ رجب ۹۳۲ھ بروز جمعہ)

"یہ واقعہ تاریخ داؤدی میں درج ہے۔ اصل فارسی عبارت
یہ ہے"

"بعضے گویند کہ سلطان ابراہیم را در ویرانہ شناختہ جمعے از
نزدیکانش ہلاک شدہ یافتند سرش بریدہ بہ بابر شاہ آوردند۔
شخصے کہ در آں معرکہ حاضر بود ایں شعر بزبانِ ہندی کہ تمام

واقع آن جنگ بودہ شعر نمودہ است۔ [1]

بابر خود ترکی، اور فارسی زبانوں کا شاعر تھا۔ ترکی زبان میں اپنی سوانح عمری "تزک بابری" مرتب کی۔ قیام ہندوستان میں اردو سے مناسبت اور واقفیت پیدا ہوئی۔ تزک میں کثرت سے اردو الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مثلاً

ہاتھی، پان، پنکھا، جامن، کمرک، کیوڑا، کروندا، چرونجی گلہری، مور، دوپہر، وغیرہ [2]

اس کے علاوہ اس نے ایک ترکی شعر میں اردو الفاظ اور فعل استعمال کیا ہے ۔ [3]

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک موتی　　فقرا ہلیغہ بس بولغوسیدور پانی و روٹی

"مجھے یاقوت اور موتی کی ہوس نہیں۔ فقیروں کے لئے ایک ٹکڑا روٹی اور تھوڑا سا پانی بہت ہے۔"

---

[1] تاریخ داؤدی نسخہ قلمی بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو۔" از ڈاکٹر مسعود حسین خان صـ ۲۶۹

[2] داستان تاریخ اردو" از حامد حسن قادری صـ ۲۲

[3] بابر کا یہ شعر ایک ترکی رسالہ عروض کے مخطوطہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ اور اس کا عکس ۱۹۱۰ء کے جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں چھپ چکا ہے۔

قطبن

اصلی نام نامعلوم ہے۔ بھاشا کا سربرآوردہ شاعر کہا جاتا ہے۔ اس کا سرپرست حسین شاہ والیٔ بنگال تھا۔ جس نے ۸۹۹ھ سے ۹۲۵ھ تک حکومت کی ہے۔ یہ ہندی اور بنگالی ادبیات کا سرگرم سرپرست تھا۔"

اس کی مشہور تصنیف "مرگاوتی" ہے۔ یہ ایک عشقیہ قصہ ہے جسے شیام سندر داس سیکریٹری ناگری پرچارنی سبھا نے شائع کیا

قطبن کے پیر شاہ بڈھن تھے سے

شیخ بڈھن جگ ساچا پیر	نام لیت سدھ ہودے مریرد
قطبن نام لئے پا دیرے	مر بر دی ددھ جگ نہ مرے
پا چہلے پاپ دھوے سب گئے	تھریں پرانے اور سب نئے
نکے بھیا آج اونارا	سب سوں بڑھوں پیر ہمارا
جیہ کو باٹ دکھائی ہووے	پہنچے ایک نمک میں سوے

دوہرا سے

گرو پنتھو دکھاے دین ہے جو چل جائے کوے
نمک ایک میں پہنچے جو ست بجاوے سو ہوے

قطبن حسین شاہ کی تعریف میں کہتے ہیں سے

شاہ حسین آہے بڑا راجا	چھتر سنگا سن ان کو چھاجا

پنڈت او بدھو دنت سیانا پڑھے پوراں ادکو سب جانا
دھرم ود دیشٹی ان کو چھاجا ہم سر چھاجیو جگ راجا
دان دے ادگنت نہ آوے بلی ادکرن نہ سریدیاد ے

راتے جہاں جوں گندے رہ ہیں
سیوا کرہیں یا سب تجو ہیں

شیخ عبدالقدوس گنگوہی ۸۶۰ھ؁ ۱۴۵۵ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام اسمٰعیل تھا۔ آپ شیخ محمد بن شیخ عارف بن شیخ احمد عبدالحق چشتی صابری کے مُرید اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۹۴۵ھ؁ ۱۵۳۸ء میں وفات پائی۔ مکتوبات مولانا خضربدھین بن رکن جونپوری نے جمع کئے ہیں۔ بھاشا کے شاعر تھے۔ اور الکھ داس تخلص تھا۔

رسالہ قدسیہ۔ رسالہ نورالہدیٰ۔ رسالہ قرۃ العین۔ انوارالعیون آپ کی چند کتابیں ہیں۔

آپ کی ایک تصنیف "رشدنامہ" ہے جس میں تصوف کے اسرار و رموز اور وحدت الوجود کے نکات بیان کئے ہیں۔ اسی میں جگہ جگہ اپنے ہندی دوہرے بھی نقل کئے ہیں۔

دوہرا

یہ جگ ناہیں باج پی بوجھو برہم گیان
سو پانی سو بلبلا سوئی مرور جان

ایکی ادا ہو ایکی ماس ایکی مرد ایکی بانس
گرکھ بوجھ برہم گیان تیں ترلوک ایک کے جان

دھن کارن پی آپ سوارا | بن دھن سکھی کنت کنھارا
نہ کھیلے دھن ماہنیں ایان | باس پھول جہنؑ اچھے حیران
کیوں نہ کھیلوں تج سنگ میتا | تج کارن تیں ایا کیتا
الکھ داس آکھے سُن سوئی | سوئی پاک الکھ ہن سوئی

جدھر دیکھوں سکھی دیکھوں ہور نہ کوئے
دیکھا بوجھ بچار میں سبھی آپیں سوئے

ایک اکیلا آپ سو جس میں یہ سنسار
آتھ نیا تھ تھول سوں سبھی ایک انکار

سیدہ ایک بھیں ہم اننت کھیلی آپی آپ بیاہی
سبھجنہ ہبجنہ کینا سنجو برانا آیام سسراجنزائی

عقدہ سہ الکھ داس الکھے سن لوے | دوئی دوئی کہو مت کہائی کوئی
جل تھل مہیسر سرب تر نتر | گو رکھ ناتھ اکیلا سوئی !
سبد سہ کھیلے نہ کھوے آوے نجاے | کالسی کا سبد کالسی ہی سمائے
جل سیتی ایا بلبلا جل ہی یا تھ جلائے | تیسا یہ سنسار سبھ مولہو جائے سمائے

لہ منبہ سلہ حیران سلہ سوئی سلہ ارتھ | پنجاب میں اردو ص۲۱۴
ھہ سوئی ںلہ ادد لکوئی شہ منہ

بدہ چھاڈ پا کہہ کیواں جانوں ۔۔۔ جنجھ رجانوں تنھ قوراتھا لوں
باہر بھیتر کہا نجا ئے ۔۔۔ سرب ترنتر ایکی کا ئے
الکھ داس آکھے مورکنت ۔۔۔ دلنہ جگ سکھی رات لسبنت

دوہرہ ۔ آپ گنوائیں پی ملے پی کھوے سب جائے
اکتھ کتھا ہے پرم کی جے کوئی بوجھے مائے

سبد ۔ جان اجان سب کھیلنہ لوئی ۔۔۔ بن پی کھیلے نہ کھیلا ہوئی
جان اجان جگ کھیلے سے ۔۔۔ ہو ہو ہو لی ر سے
سب کھیلنہ سکھی مہ جان ۔۔۔ سرب ترنتر پی پردان
جان اجان جگ کھیلے بھاگ ۔۔۔ کنت بلیا لیوں ہر دے لاگ

الکھ داس اکھے سن تانہاں
ہم تم کھیلینہ دی کل ناہاں

شلوک ۔ اپانا شت پرانا شت کنجت حکبرا
بدھ باچا منو ناشت تتر دیوی الکل تبا

ایک شعر رختینہ کے نام سے بھی لکھا ہے۔

صدق رہبر صبر توشہ دشت منزل دل رفیق
ست نگری دھرم راجا جوگ مارگ [1]

---

[1] پہلے مصرع کا مطلب صاف ہے۔ دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے۔
کہ سچائی شہر دھرم حاکم اور ترک دنیا راستہ ہے۔

شاہ محمد غوث گوالیاری

حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری بہت بڑے صوفی اور بزرگ گزرے ہیں۔ شیخ وجیہہ الدین جو خود بھی پایہ کے بزرگ اور عالم تھے۔ ان سے ارادت اور عقیدت رکھتے تھے۔ شاہ صاحب کا انتقال ۹۷۰ھ ۱۵۶۲ء میں آگرے میں ہوا۔ اور گوالیار میں دفن ہوئے۔ وفات کے وقت عمر ۸۰ سال کی تھی [1]

شیخ وجیہہ الدین شاہ قاضن کے مرید تھے۔ مگر فیضِ باطنی انہوں نے شاہ محمد غوث سے حاصل کیا تھا۔ سید ہاشم علوی نے جو شاہ وجیہہ الدین کے بھتیجے تھے۔ لکھا ہے کہ شاہ محمد غوث نے شیخ وجیہہ الدین کی روحانی تربیت کی۔ اور انھیں علم حقایق سکھایا۔ شیخ وجیہہ الدین بائیس سال کی عمر میں ایک سو بیس علوم کی تحصیل کے باوجود فرماتے تھے کہ اگر میں شاہ محمد غوث سے نہ ملا ہوتا۔ تو مسلمان نہ ہوتا۔ اور عرفانِ الٰہی اور حقایقِ باطنی جو تمام عمر میں حاصل نہ ہوتے۔ ایک شب میں مل گئے [2]

سید ہاشم علوی نے شاہ صاحب کا ایک ہندی قول نقل کیا ہے۔

"بھکی بچہ خدا کو نہ میلے" یعنی سھکاری کو خدا نہیں ملتا [3]

---

[1] عبدالقادر بدایونی بحوالہ "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام"

[2] مقصود المراد ملفوظات سید ہاشم علوی

[3] " " " "

مولوی عبدالحق صاحب کا کہنا ہے کہ اُن کے اس کے علاوہ بھی اشعار و اقوال بزبان ہندی ان کی نظر سے گذرے ہیں۔[۱]

گدائی

ہمایوں کے دربار میں کچھ ایسے فارسی شاعروں کی موجودگی ثابت ہو گئی ہے۔ جو ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان میں شیخ گدائی دہلوی کا نام مشہور ہے۔ مگر اب تک ان کی کوئی چیز دستیاب نہیں ہوئی ہے

ہمایوں ہی کے زمانے میں مشہور ہندی شاعر جیتم گذرا ہے۔ اُس کے یہاں بھی عربی۔ فارسی الفاظ ملتے ہیں۔ مگر اُس کی زبان پر اپ بھرنش کا گہرا اثر ہے[۲]

اکبر اعظم

اکبر اعظم ۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بھی زبان ہندی میں کبھی کبھی شعر کہا کرتے تھے۔

جب جہانگیر کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے ہوئی اور

---

[۱] شیو سنگھ سروج مرتبہ شیو سنگھ سنگر ص ۱۰۲ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۶ء

بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو از ڈاکٹر مسعود حسین خاں ص ۱۰۱

[۲] اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام از ڈاکٹر عبدالحق ص ۲۵

جہانگیر و اکبر دلہن کی پالکی اپنے کندھے پر اٹھا کر آگے بڑھے۔ تو راجہ نے کہا

تہاری بیٹی تہمارے محلوں کی چیری　　ہم تو باند گلدم رے

اس پر اکبرؔ نے برجستہ جواب دیا ؂

تہاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی　　تم صاحب سردار در رے [۱]

شیو سنگھ سینگر نے اپنی کتاب "شیو سنگھ سروج"۔ نولکشور پریس لکھنؤ مطبوعہ ۱۹۲۶ء میں اکبرؔ کے بہت سے دوہے اور گیت ہندی، بھاشا کے نقل کئے ہیں۔ جو اس سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

جاکو جس ہے جگت میں جگت سراہے جاہی
تاکو جنم سپھل، کہت اکبر ساہی [۲]

(دنیا میں جس کو شہرت حاصل ہے۔ اور جسے دنیا سراہتی ہے اکبر بادشاہ کے بقول اسی کا جنم کامیاب ہے۔)

پیتھا لاسوں مجلس گئی تان سین سوں راگ
ہانسی بو، رمی بو، بولی بوگیو بیربل ساتھ [۳]

---

[۱] تاریخ ادب فارسی در عہد سلاطین مغلیہ جلد سوم" از شمس العلماء محمد عبدالغنی و داستان تحرود از نواب نصیر حسین خیال۔

[۲] کویتا کومدی (حصہ اول) از رام نریش ترپاٹھی ص ۲۴

[۳] انڈو ایرین اور ہندی از ڈاکٹر سینتی کمار چٹرجی ص ۱۵۱

اکبر اپنے بڑھاپے میں مرحوم ساتھیوں کو یاد کرکے کہتا ہے ؎

(پیتھالا (بیکانیر کا پرتھوی راج) کے ساتھ مجلس گئی۔ اور تان سین
کے ساتھ راگ۔ ہنسی۔ دلچسپی اور کلام کا لطف بیربل کے ساتھ ہی
چلا گیا۔")

اکبر سے ایک اردو رباعی بھی منسوب ہے۔ جس کے بارے میں
کہا جاتا ہے کہ "جب جہانگیر نے ابوالفضل کو مروا ڈالا.....
اکبر کو بہت صدمہ ہوا۔ بعد چندے جب باپ بیٹے میں لوگوں
نے صلح کرادی۔ اور اکبر نے بلوایا تو جہانگیر نے بھی لکھ بھیجا کہ
نجومیوں سے کوئی ساعت سعید دکھلوا کر بھیجئے۔ کہ میں اس وقت
قدم بوسی کو حاضر ہوں۔"

اس پر اکبر نے خط لکھا۔ اور یہ رباعی لکھی ؎

بیتی جو گھڑی مجھ سے براہ عادت!
تو وصل کی ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہوجاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت
ساعت کا بہانہ نہیں خوش ہر ساعت

یہ دراصل فارسی رباعی کا ترجمہ ہے۔ "تزک جہانگیری" کا اردو
ترجمہ سید احمد علی رامپوری نے کیا۔ اور اشعار کا ترجمہ تو

---

[1] جلوۂ خضر جلد اول صفیر بلگرامی ص۱۰ "مغل اور اردو" از نصیر حسین خیال ص۸

اردو اشعار میں کیفیا حذف کر دیا۔ فارسی رباعی بھی اکبر کی تصنیف نہیں۔ بلکہ یہ جعفر بیگ خاں آصف کی ہے جیسا کہ "تزک جہانگیری" کے مقدمہ نگار محمد ہادی نے صراحتہ لکھا ہے[1]

" این رباعی کہ از واردات طبع جعفر بیگ آصف خاں است دراں مشہور سعادت تلمی نمودند۔"

اے جبہ زماں برسم عادت ساعت
ادراک وصال راچہ حاجت ساعت
از وصل کند کسب سعادت ساعت
ساعت چہ کنی بہانہ ساعت ساعت[2]

عبدالرحیم خانخاناں!

خانخاناں، بیرم خاں کی میواتی بیوی کے بطن سے ۹۶۴ھ میں پیدا ہوا[3] انتہائی خوبصورت جوان تھا۔ اپنے دور کے بہترین علماء وفضلائے سے استفادہ کیا۔ عربی۔ فارسی۔ اور ترکی زبانوں پر عبور حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی

---

[1] "آوارہ گرد اشعار" از قاضی عبدالودود "معاصر" پٹنہ حصہ اول ص۲
[2] "تزک جہانگیری" ص۱۰ "
[3] "تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت" از سید ہاشمی فرید آبادی جلد اول ص۴۹۲

اور سنسکرت پر بھی نظر رکھتا تھا۔ اپنے دور کے امراء میں داد و دہش کے لحاظ سے وہ سب سے آگے تھا۔ نظیری اور عرفی اس کی سرپرستی میں جو کچھ حاصل کیا۔ وہ شاہی درباروں میں بھی نہیں مل سکا۔ خانخاناں نے ہفت ہزاری منصب حاصل کیا۔ وہ سنہ ۱۰۳۶ھ مطابق ۱۶۲۶ء میں وفات پائی۔ اور دہلی کے قریب دفن ہوئے۔ ان کا شمار اکبر کے نورتنوں میں کیا جاتا ہے۔ فارسی کے علاوہ برج بھاشا میں بھی شاعری کرتے تھے۔

ہندی کے تمام مشہور و معروف نقادوں نے ان کے کلام کی تعریف کی ہے۔ ہندی زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی ــــــ ان کے متعلق جہانگیر اپنی "تزک" میں لکھتا ہے۔

"زبان عربی و ترکی و فارسی می دانست و از اقسام دانش عقلی و نقلی حتیٰ علوم ہندی بہرہ وافی داشت ... و بزبان فارسی و ہندی شعر نیکو گفتی"

نوری

ملا نوری سنہ ۱۵۵۶ء / ۹۶۳ھ [1] اعظم پور کے باشندے

---

[1] "داستان تاریخ اردو" از حامد حسن قادری ص۱۲۲

تھے۔ عہد اکبری کے مشہور شاعر فیضی سے دوستانہ اتحاد تھا ایک شعر اردو کا مشہور ہے ؎

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد
بیچارۂ لوزی نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

سعدی کاکوروی

اردو کے قدیم شعراء میں ایک بزرگ شیخ سعدی کے نام سے مشہور ہیں۔ بعض تذکرہ نگار اِن کو شیخ سعدی شیرازی سمجھتے ہیں ؎

"اتفاق بعضے از مورخین ہماں است کہ چوں حضرت شیخ سعدی شیرازی قدس اللہ روحہ در ہنگام سیر و سیاحت بطرف گجرات تشریف آوردند و مجاورت سومنات چنانچہ در نسخہ بوستان خودش ایمائے برآں فرمودہ اندکردند دلچسپ برزبان ایں دیار وقوف یافتہ یک دو بیت ریختہ کہ بعد ازیں مرقوم خواہد شد بر سبیل تفنن بقید نظم در آوردہ بعد ازاں حضرت امیر خسرو برہاں بار طرح دلنوازہائے بسیار بکار بردند ہر چند سلیقۂ سخن سنجی آں وقت دور از فصاحت ریختہ گویان حال است و از عبارات غیر مانوس مالامال لیکن بپاس طبیعت مشتاقاں بر جنس سخن دو سہ چہار بیت ازاں ابیات تبرکاً د

تیمناً درین مقام قلمی میگرد دو از آثار و احوال این هر دو بزرگ وارچہ نویسد کہ مورخان سلف در کتب تاریخ متداولہ ضبط نمودہ اند و اظہر من الشمس و ابین من الامس است"[1]

دیگر لوگ انھیں سعدی شیرازی کے بجائے سعدی دکھنی بتاتے ہیں۔

"آنچہ بعض این را شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ گمان بردہ اند خطا ست"[2]

"سعدی دکھنی از شعرائے قرار دادہ دکن است و آنکہ بعضے آخرہ را بہ سبب اتحاد تخلص مغالطہ افتادہ ریختہ ہائے سعدی دکھنی را از عدم اعتنا و قلت تتبع بنام سعدی شیرازی مرقوم ساختہ اند ناشی از جہل و تسعہ است"[3]

مگر دراصل یہ دونوں خیال صحت سے قریب نہیں۔ یہ سعدی نہ تو شیرازی ہیں۔ اور نہ ہی دکھنی بلکہ شمالی ہند کے باشندے ہیں۔ اکبر کے زمانے میں گزرے ہیں۔ ۱۰۰۴ھ ۱۵۹۶ء میں انتقال ہوا۔ پورا نام شیخ کمال الدین مخدوم سعدی تھا۔[4]

---

[1] "مخزن نکات" از محمد قیام الدین قائم چاندپوری۔

[2] "نکات الشعرا" از میر تقی ص۱۰۳

[3] "تذکرہ ریختہ گویاں" از میر فتح علی حسینی گردیزی۔

[4] "داستان تاریخ اردو" از حامد حسن قادری ص۲۱

کاکوری کے رہنے والے تھے۔ اس لئے کاکوردی کہلاتے ہیں[1]

بختاور خاں نے لکھا ہے۔

"طبع موزوں داشتہ بزبان فارسی و ہندی شعر نیکو گفتے۔"[2]

عہد اکبری کے مشہور مورخ عبد القادر بدایونی نے ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"از مشایخ عظام است خلافت از پدر بزرگ وار خویش شیخ محمد مرحوم داشت و شیخ محمد شرح فارسی بر شاطبیہ نوشتہ قریب بہ ہفتاد جزو۔ و خلف صدقش شیخ سعدی صاحب وجد و حال قوی بود و ظاہر و باطن مصفا داشت . . . .

. . . وفاتش در ۱۰۰۲ھ اثنی والف بود۔"[3]

ان کے ابیات درج ذیل ہیں ؎

قشقہ چو دیدم بر رخش گفتم کہ یہ کیا ریت

گفتا درائے با ذرے اس ملک کی یہ ریت ہے

اے مردماں شہر شما کتنی بری یہ ریت ہے

---

[1] ملا نظام الدین احمد" بحوالہ تاریخ زبان اردوئے قدیم از حکیم سید شمس اللہ قادری صـ ۱۷

[2] تاریخ زبان اردوئے قدیم از سید شمس اللہ قادری صـ ۱۷

[3] "منتخب التواریخ" از مولانا عبد القادر بدایونی صـ ۲۸۹

ہم نامَن کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے
دو نین کی کہتہ کہوں رو رو دخون دل کروں!
بیٹھیں سنگ کر پیت دھر دل بیاسانہ جائے میت ہے
سعدی طرح انگیختہ شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ در ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

محمد افضل جھنجانوی یا پانی پتی

محمد افضل کے حالات کے متعلق ہم تاریکی میں ہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ میرٹھ کے قریب جھنجانہ یا جھنجنہ نام کی بستی میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک دوازدہ ماہہ (بارہ ماسہ) یا بکٹ کہانی کے مصنف ہیں میر حسن ان کے متعلق لکھتے ہیں:-

"محمد افضل افضل تخلص از قدیم است کدام ہندو بچہ گوپال نام بود کہ برو عاشق شدہ حسب حال خود بارہ ماسہ عرف بکٹ کہانی گفتہ کہ اکثر کھتریاں و گائنیاں مشتاق اند می باشند لفظے فارسی و لفظے ہندی دارد لیکن قبولیت دادِ الٰہی است بر دلہا اثر میکند از وست

بڑی ہے گل میں میرے بیم پھانسی مرن اپنا ہے اور لوگوں کی ہانسی

مسافرے جنہوں نے دل لگایا ؛ انہوں نے سب جنم روتے گنوایا[1]

ان کے زمانے کے متعلق اشپرنگر نے اپنی فہرست میں قایم چاند پوری کے تذکرہ "مخزن نکات" کے حوالے سے لکھا ہے :۔

"افضل عبداللہ قطب شاہ سے جو ۱۰۲۰ھ میں تخت نشین ہوا پہلے بیشتر گذرا ہے۔ اس کی تعلیم معمولی حیثیت کی تھی۔ صوفیانہ شعر کہتا تھا اور ایک بکٹ کہانی لکھی ہے۔ جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔"[2]

ڈاکٹر اشپرنگر نے قایم کے حوالے سے افضل کا جو زمانہ دیا ہے اس میں ایک غلطی یہ ہے کہ عبداللہ قطب شاہ ۱۰۳۵ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ ۱۰۲۰ھ میں نہیں ۱۰۲۰ھ میں محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا تھا۔ یا تو قایم نے محمد قطب شاہ کے بجائے عبداللہ قطب شاہ لکھ دیا۔ یا ۱۰۳۵ھ کی جگہ ۱۰۲۰ھ لکھ دیا۔[3] بہرحال اس انتقال ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء میں ہوا[4] مذکورہ بالا دونوں بیانات سے بالکل مختلف حال فارسی کے مشہور تذکرہ نگار والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ "ریاض الشعراء"

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو " مصنفہ میر حسن ص۱۶

[2] یادگار شعرا " ترجمہ اشپرنگر ، اردو کیٹیلاگ محمد طفیل ہندستانی اکیڈمی ص۱۳

[3] پنجاب میں اردو " مصنفہ محمود شیرانی ص۲۰۱

[4] داستان تاریخ اردو ، مولانا حامد حسن قادری ص۲۵

میں سپردِ قلم کیا ہے۔

والہ کے بقول محمد افضل پانی پت کے باشندے ہیں۔ اور فضائل و کمالات ظاہر و باطن سے آراستہ اور عشق و فقر کی چاشنی سے واقف تھے۔ درس و تدریس مشغلہ تھا۔ سیکڑوں طلبا ء حلقۂ درس میں شامل تھے۔ ہندی اور فارسی میں اعلیٰ درجے کے شاعر اور نثر نویسی میں مقبولِ زمانہ تھے۔

ادھیڑ عمر میں کسی ہندو عورت پر عاشق ہوئے اور زہد و عبادت تقویٰ اور معلمی کے پیشے کو خیرباد کہہ دیا۔ اور مسجد و مدرسہ کے بجائے کوچۂ محبوب کے چکر لگانا شروع کر دیئے۔ اس عاشقانہ دور میں مولانا نے کثرت سے عشقیہ غزلیں لکھیں۔

ایک فارسی غزل کا مطلع درجِ ذیل ہے ؎

عالم خراب حسن قیامت نشان کیست
دررہ کدام فتنہ گراست و زمان کیست

عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ یہ خبر اُس عورت کے رشتہ داروں تک پہنچی۔ بدنامی ہوئی۔ بیچاری گھر میں مقید ہو کر رہ گئی۔ تہواروں تک پر باہر نکلنا بند کر دیا۔ مولانا بھی سچے عاشق کی طرح کوچۂ یار میں دھرنا دے کر بیٹھ رہے۔ آخر تنگ آکر اس عورت کے اعزا نے اسے متھرا بھیج دیا۔

مولانا کو خبر لگی تو یہ بھی متھرا جا پہنچے۔ اور محبوب کی تلاش

میں سرگرم کار ہو گئے۔

ایک دن اتفاق سے وہ عورت اپنی سہیلیوں کے ساتھ ٹہلتی ہوئی نظر آئی۔ آپ نے فوراً یہ شعر پڑھا۔

خوشا رسوائی کہ دھال بتا ہے ۔۔۔۔ سر راہے وآے دنگا ہے

عورت بہت جھنجھلائی اور غصے میں مولانا کو سخت جھاڑ بتائی کہ منہ پر سفید داڑھی لگا کر جوان عورت کی محبت کا دم بھرتے ہو۔"

مولانا نے اب دوسری چال چلی۔ اور پری کو شیشے میں اُتارنے کے لئے داڑھی منڈوا۔ گلے میں زنار ڈال برہمن کا بھیس بدل کر ایک پجاری کے چیلے بن گئے۔ دن۔ رات اپنے اُستاد کی خدمت کرتے۔ اور علوم مذہبی کی تحصیل میں لگے رہتے۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان کی حیرت انگیز قابلیت اور خدمت سے متاثر ہو کر برہمن نے ان کو مندر میں اپنا نائب مقرر کر لیا۔ برہمن کے انتقال پر یہ اُس کے جانشین مقرر ہو گئے۔ سب لوگ ان کے گن گانے لگے۔ مندر کے سالانہ میلے میں عورتیں نذر و نیاز لے کر حاضر ہوئیں۔ باری باری برہمن کے پاؤں چومتیں اور نذر پیش کرتیں۔

مولانا کی مطلوبہ بھی آئی۔ اور اُن کے پاؤں چومنے بڑھی۔ تو مولانا نے اُس سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ

"ہمیں پہچانتی ہو۔۔۔؟"

وہ عورت اُنھیں پہچان کر سخت حیران ہوئی۔ اور اُن کی

قربانی اور مشقت سے متاثر ہو کر اُس نے ان سے شادی کرلی۔ اور مسلمان ہو گئی۔ ۱۰۳۵ھ میں مولانا کا انتقال ہوا[1]

مولانا محمود شیرانی والہ داغستانی کے اس بیان کو میر حسن کے بیان پر فوقیت دیتے ہیں۔ جس کا ایک سبب تو والہ کا تقدم زمانی ہے۔ دوسرے محمد افضل نے بکٹ کہانی کے خاتمہ میں یہ شعر لکھا ہے ؎

بیا دل ربا خوش حال می باش
گہے افضل گہے گوپال می باش

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا گوپال کو اپنا نام بتاتے ہیں۔ جب وہ مندر میں برہمن کی زندگی گذار رہے تھے۔ گوپال کسی ہندو بچہ کا نام نہیں ہے۔ جیسا کہ میر حسن کا خیال ہے۔ والہ داغستانی کے اس بیان سے کہ افضل ۱۰۳۵ھ میں انتقال کرتے ہیں۔ قایم کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ جس نے لکھا ہے کہ وہ عبداللہ قطب کے دور سے پہلے کے آدمی ہیں۔

محمد افضل کی بکٹ کہانی دراصل ایک بارہ ماسہ (دوازدہ ماہہ) ہے۔ جس میں ایک ہجر زدہ عورت اپنے پیا کی جدائی میں اپنے درد

---

[1] تذکرہ "ریاض الشعراء" علی قلی خاں والہ داغستانی۔ بحوالہ "پنجاب میں اردو" مصنفہ محمود شیرانی ص ۲۱۲ تا ص ۲۱۳

والم اور بیتابی کا حال اپنی سکھیوں کو سنا رہی ہے۔

ہندی شاعری کی روایت کے مطابق یہ اظہار رنج وغم عورت کی جانب سے ہے۔ اور ہر ماہ کے عنوان کے ذیل میں ہجر کی کیفیات کا اظہار دلگداز پیرایے میں کیا گیا ہے۔

ایک مصرع کی بندش آدھی ہندی میں ہے۔ آدھی فارسی میں بعض مثالیں درج ذیل ہیں ؎

چہ سازم چوں کنم کس کن پکاروں ‌ جتن کیا عشق کے غم کا بچاروں
جنوں در ملک جاں جھنڈا گڑایا ‌ سمجھ اور بوجھ کا تھانا اُٹھایا
چو شد مدت پیا کے سنگ رہتے ‌ مرم با یکدگر کہتے و سنتے
چہ می بینم کہ منگل گاوتی ہیں ‌ مرے گھر ناریاں سب آوتی ہیں

ع نہیں جز وصل کا سوکھا نہالم
ع کہوں کیا اب مکانش باگھ لیتا
ع ملے آکر مجھے جانم جلد سوں

ہندی لفظ "دھوم" میں "ش" کا اضافہ فارسی قاعدے سے کر کے حاصل بالمصدر "دھومش" بنا لیا ہے ؎

اٹھا کر گھرنے دھومش مچائی ‌ متاع صبر و تسکیں دل لٹائی

بکٹ کہانی جذبات کے لحاظ سے ہندی نظم ہے۔ اس میں ہندوانہ زندگی ہندو تہواروں۔ ہولی۔ دیوالی۔ دسہرہ۔ کا ذکر ہے۔ ہولی کے گیت رنگ کی پچکاریاں۔ دف۔ اور مردنگ۔ سر منڈل۔ گلال۔ الخ

عبیر کا جگہ جگہ ذکر ہے۔
کاگا (کوا) قاصد ہے۔ کوئل کوک کر ہجر کا اظہار کرتی ہے۔
اور پپیہا پی۔ پی پکارتا ہے۔
نمونہ درجِ ذیل ہے۔

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی
جبی ہوں عشق کے غم سوں دوانی

نہ مجھ کو سوکھ دن نہ نیند راتا
برہوں کی آگ سیں سینہ جراتا

تمام لوگ مجھ کو بوری کہیں ری
خرد گم کردہ دمجنوں کہیں سی

نہیں اس درد کا دارو کسی کن
کہتے حیراں سبھی حکما، ذوفن

اری جس شخص کو یہ دیو لاگا
سیاناں دیکھ اوس کوں دور بھاگا

اری یہ ناگ جس کوں ڈنگ لاوے
پیا وے کا درد جیو لا کو آوے

اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے
کہ جس کی آگ میں سب جگ جلا ہے

کہ جس کے بیچ یہ آتش پری رے
وہی دن رات سلگت ہے بربرے

وہی جانے کہ جس کے تن لگی ہے
برہوں کی آگ تن من میں دگی ہے

بوائیکی کی نہیں جس شخص کوں بیر
چہ داند درد دیگر را ارے بیر

کبھی بوری برہوں بیراگ سہتی
جلے جیو را مرا نت آگ سینی

چہ سازم چوں کنم کس کن پوکاروں
جتن کیا عشق کے غم کا بچاروں

نہیں یکدم مجھے دن رین میں چین
اندھیری ہو چلی رو رو مری نین

جنوں در ملک جاں جھنڈا گڈا یا
سمجھ اور بوجھ کا تھانا اٹھایا

ادتہا کر میں دھومش مچاہی — متاعِ صبر تسکین دل لوٹتا ہی

کیا مجھ دستگیران شاد بیداد — چہ سازم چوں کنم فریاد فریاد

پیالا حسن کی مئے کا پلایا — کیا بے خود مجھے مجھ سوں بھولایا

گدا ہو کر پھروں گھر گھر و بازار — کبھو ہوسے کہ پاؤں پھیکھ دیدار

پیارے کو بچھڑ کر سوں لگا ہی — تمامی آگ تن من کی بجھائی

چو شد مدت پیا کے سنگ رہتی — مرم یا یکدگر سنتی د کہتی

چہ حیلہ عشق نے برمن اوٹھایا — فلک دشمن مری پیچھے لگایا

مرا سکھ دیکھ اس کوں حسرت آہی — نہادہ بردلم داغ جدائی

بکٹ قصہ ہنت مشکل کہانی — دِوانی کی سکھی سنو سکھیو کہانی

ملن پاچی بچھڑنا بھی کٹھن ہے — کہو اب زندگی کا کیا جتن ہے

"ساون"

جرا ساون بجا مارو نکارا — سجن بن کون ہے سکتی ہمارا

کہتا کاری او بدچھاتی سوں آہی — برہ کی فوج نے کیتی چڑاہی

پپیہا پیہہ پیہہ نس دن پکارا — بہ کارت داود جھینکر جھنکارا

اری جب کوک کوکل میں ہوتا ہی — تمامی تن بدن میں آگ لاہی

اندھیری رین جگنو جگ مگاتا — اری جلتی اوپر بتین کیا جلاتا

سوں جب مور کی آواز بن سوں — شکیب از دل شدہ آرام تن سوں

بھی جل تھل بھیا سرسبز عالم — بنی جز وصل کا سو کھا نہالم

ہنڈولی جھولتی سب نار پیہ سنگ — حسد کی آگ نے جارا مرا انگ
ہیلا ساون وگر ساجن نہ آہی — اری کن سوکنی تو نے جلا ہی

"بھادوں"

سکھی بھادوں تپت بھوتی پر پری — تمام تن بدن میرا جری ری
سیہ بادل چہاردوں اودنچا یئی — لیا مجھ گھیر پیہہ اجھوں بنا یئی
بھورن برنی لگی اور داعد گرجا — تمامی تن بدن جیو جان لرجا
کھتا کاری کی اندر بیچ چمکی — جری جیہورا اگن سوں ولیہ لرجی
اکیلی دیکھ لس کاری درادی — تمامی رین دن برہوں ستادی
پیا پردیس جا ہم کو لکھ بسارا — نجانوں کیا گنہ دیکھا ہمارا
کتھا غم کی اودھ چھاتی سے دن آہی — اری دو دین میں برکھا لگا ہی
اری نس دن بتاو دیکھو جہ ہاری — خبر پیہہ کی نپا ہی ہائے ہاری
جھڑی بدھتی بھمن سبہ مرگئے لے — بھئی کب کاک اور وتھک ہی ری
کہو پیہہ کی خبر بوجھے سکھے جائی — لکھوں پتیاں کسی دیکھوں ہائے ری ہائی
خدارا ای صبا ہیں حال میرا — پیا کوں کہو کری تک ایک بیرا
دہل رحلت کا بجا دوں نے بجایا — اجھوں لگ ساودا پردیس چھایا

"اسوج"

سنوں سکھیو کہ رت آسوج آہی — پیاری کی خبر اب لگ نیا ہی

لکھو کیسی جیویں پیو باجھ ناری ... جنہی رو رو کٹتی ہی عمر ساری
مکھوں پتیاں ادے لے کاک لے جا ... سلونی سانوری سندر پیا پا
کہا کت جب پیارا پیو آدی ... تو جہی دیکھی ہمر کر کی تولادی
سلام از طرف این غم خوار کیجو ... پکن کوں پرتن پاتی ناتھ دیجو
اری یہ کاک باتیں سو کھ نمانی ... مرم دل دردمندوں کا نجانی
پیا بن سیج ری ناگن بھئی ری ... ہمن کھیلن نا سب بردہ بودہ کئی ری
دسہرا پوجہی گھر گھر سکھی ری ... کرم میری بخالوں کیا بری ری
اری سبزک پیا کے باغ جا کر ... ایسکوں بیو ذا سپتی لوکا کر
کہواری سنگ دل تب مکھ دکھاوں ... تیری مکھ سے اگر اک قول پاوں
کہ گھر جا برہنی کوں کل نکادو ... پکڑ بہیاں پلنگ اوپر بتھادو
کہ تیری برہ سیں دن رین رووے ... بغم سے جوبنا تجھ باجھ کھووے
تم اوران سیں پیاری سوکھ کرتے ہیں ... ہمن برہنا سو دکھ بھرتے ہیں
دیا پردیس جا سوکن سیتی راج ... کیوں لایا کرہنیں تجھ نیں ہی لاج
تو جہی اے سنگدل کیسی پری چین ... جری جت آہ سوں جل تھل دراویں
اری ظالم نداری خوف رب کا ... قیامت ہی کبری کر فکر تب کا
ذرا کر توں نہ آہ دردمنداں ... کہ می سوزد ز آہش سنگ سنداں
سکھی اس سوچ میں سب عمر جاتی ... سمجھو نیں غم بچاری کا سناتی
کرہو وے جا کے تو کو ہی اس سخن سوں ... سنی دل ہوں کبھی دیکھی ہمن سوں
سکھی آسونح رت جلتی رہی ری ... پیا بن برہنی جلتی رہی ری

شیخ بہاءالدین برناوی خاتم التارکین

آپ مخدوم شیخ فریدالدین برناوی مہاجر مکہ (متوفی ۹۸۷ھ) کے پوتے اور جانشین تھے۔ ۱۱۳۰ھ میں انتقال ہوا۔ [1]

فن موسیقی میں یگانہ روزگار سمجھے جاتے ہیں۔ حالات زیادہ تر گوشۂ گمنامی میں ہیں۔ "راگ درپن" مصنفہ فقیراللہ میں بھی ان کا ذکر ہے۔ مخدوم علاءالدین ثانی نے "چشتیہ" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ذیل کے حالات اس سے ماخوذ ہیں۔

"قاضی عارف برناوی نے حرف شناسی اور ہجا خوانی کرائی، ملا انور رہتکی سے کتابی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں شیخ الہداد پانی پتی آپ کے معلم بنے۔ میراں سید عبدالشکور سے تیمناً شرح عقاید پڑھی۔ اس زمانے میں ایک عربی قصیدہ لکھ کر استاد کی خدمت میں پیش کیا۔ تحصیل علم کے بعد ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے نماز سحر کے بعد شکار کے بہانہ سے جنگلوں میں نکل جاتے۔ اور بیس تیس کوس جنگلوں میں پھر لیتے۔ ابتدا میں تیر سے شکار کھیلتے رہے بعد میں بندوق اختیار کر لی۔ ان نواح میں آپ ہی پہلے شخص ہیں۔ جس نے بندوق سے شکار کھیلنا اختیار کیا۔ شکار بکارہ بے حد پسند تھا

---

[1] "پنجاب میں اردو" حافظ محمود شیرانی صہ ۳۲

جد امجد کے مکہ معظمہ جانے کے بعد تمام دنیاوی اشیاء مثلاً جاگیرد قریات۔ انعامات، و وظائف۔ اثاث البیت۔ اجناس و متاع ہتھیار۔ مویشی۔ گھوڑے۔ وغیرہ کو ترک کر دیا۔ اسی بنار پر آپ خاتم التارکین کہلائے۔

سیر و سفر کے بے حد شایق تھے۔ دکن۔ گجرات۔ جونپور۔ اور کھنبایت۔ پٹنہ۔ بہار۔ پنڈوہ۔ سرہند۔ لاہور۔ پٹن۔ اجودھن۔ ہانسی۔ وحصار۔ وغیرہ کی سیاحت کی۔ ہند کے بڑے شہروں میں ان کے دوست احباب موجود تھے۔ اکبری و جہانگیری امراء سے رسم و راہ تھی ان دونوں سلاطین سے ملاقات کی ہے۔ موسیقی سے ان کا تعلق عشق کی حد تک تھا۔ جکری۔ خیال۔ اور چٹکلہ۔ قول و ترانہ۔ سادرہ دھرپد بشن پد وغیرہ میں انہوں نے اشعار لکھے ہیں۔ یوں تو تینوں زبانوں میں شعر لکھتے تھے۔ لیکن ہندی میں اکثر شعر لکھتے تھے۔ یہاں خیال و ساز کنڑس کے موجد ہیں۔ انہوں نے گمنام رہنا پسند کیا۔ اسی لئے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا۔ چنانچہ ان کا کلام دوسروں کے نام سے مشہور ہو گیا۔"[1]

نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

ہوں تجھ دیکھوں توں مجھ دیکھ   ان نینن کا یہی بسیکھ

---

[1] "پنجاب میں اردو" مصنفہ محمود شیرانی ص ۲۳۵ — ۲۳۶

خیال برائے شفا ؎

ٹھاکر گرد کچھو جیت نہ دہری   جنہیں اپنر ادھا پرادہی کرے

جہا جیں ردگی کی تیری پانی جاہیتی کہن ہی ہرے

یہ سادہ جہانگیر اور خرم کی جنگ کے وقت کہا ؎

اے رے بھائی جیتا مقاشاہن سرتاج

جس رکی تو ملا نت نت راج

برائے بارش ؎

کلھ اے بدرانان برست کاہے نہیں، ناہیں گرجت کلہے ناجبر لادت!

کاہے سی برکھارت تیوت برس من، چوت کاہے تی ناں گھور گھوستادت

جتر دسا تیر دہے اتا ہو داتا میکھ کہاوت

گر بن بنا کو تا جم گٹ بھیں اول بدل لے آوت

خواجہ خضر کے لئے ؎

دائم حیات کائم کرامات ملاکات نعمت پاؤ ہم!

ندی تیر درم بھاری بھیر بیرت رہت ہو تہیاں تیاری رم برم

حم کیجے کرپا بھیں دیجے کاکھوں زادری سم

تم کھواجہ کھدر فے جیتر الیاس رہ دود ہاس یا جگت میں اگم

برائے طلب بقائے سلطان الاولیاء ؎

کاری کاج تماری ہوں تو تھکت بھو کر ھیتر د
آج بھاگ جاگ پڑے ہمارے پرسن درسن پاوت تیرد
انندے انند بھا ہو دکو سیہ موش گیو سو ہرد
تربت بھئی نیت سب ناسی اولیا چرنن لکا بانتھو پیرد

بارش بند کرنے کیلئے ؎
آب من مانیوری بدرا نیکی بھانت جُرجُر آیو
نبکی مین گھٹا لی آو نبکیس گرج سنایو !
نیکمیں نیکمیں ین تو رہس رہس جھڑ لالو

خیال ؎
کبیں کی سمرن کروں توہ من جنچل تو کہوں کھو ڈولی
اور، نیک یک باد کرت ہے بلجے کاج بنولی
آنکھ ملاری بکھی توتیئی لیک کا نھڈ کو کھولی
جے استر کنہے بدھنا تن کی سدا کلولی

شیخ عثمان

شیخ عثمان غازی پور کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام شیخ حسن تھا۔ جہانگیر کے عہد میں تھے۔ "چترادلی" نام کا ایک عشقیہ قصہ بزبان ہندی لکھا ہے۔ جس میں دوہے اور چوپائیاں شامل ہیں۔ چترادلی کے علاوہ ان کی دوسری تصانیف بھی ہیں۔

چتراولی ایک زبردست عشقیہ قصہ ہے۔ اور اس کی بنیاد پر ان کی شہرت ہے۔ چتراولی کے وہ حصے جو شیخ عثمان نے چتراولی کے حسن و جمال۔ اس کے محل اور بارہ ماسہ پر لکھے ہیں اپنی خوبیوں کے باعث نہایت زور دار ہیں۔

جن پچھوں دس کند بیانا | بھلیں گا سو دیس ملتانا
دیکھے سی جنگی لوگ سیایئں | نیرادن سب سوہں بیایئں
ہیرے سی ٹھٹہ نگر سویادا | بنیگ ہرن سیرین گنجادا
کابل ہیری مو گل کر دیا | جہاں یو ہم پتی ہوئی رلیا
دیکھے سی مکہ وہ ہی استھانا | ہیٔ اندھ تیں باہن جانا
دیکھے سی روم سکندر کیرا | سیام رہا ہو تی شکل اندھیرا
حاجی سنگ مل کیہو مدینہ | کا بجا کیے جو جات نہ سینہ
گا بغداد پھر کے پترا ! | جیہی نیچے تیہی سنگ پھیرا
استنبول، مصر، یونی، ہیرا | کالداخ ہو کہو سی پھیرا
دکھن دیس کو جے لگو دھارا | چلاتا کی سو لنک پھارا
بھیلے ہی گے ہیرس گجراتا | سندر دھنی لوگ سو کھوراتا
گیو جام جھن کچھی ہوتی ! | لگ سر دیپ بوکھی سب کوتی
ملہ بیپ دیکھا انگریزا | جہاں جائیے ہیں کٹھن کریجا

اوچ نیچ دہن سینت ہیرا
مدبراہ بھوجن مین کیرا

جہاں جاؤں ادھر چندر سا جا
لگا سنگ چڑھی گیو جہاجا سلہ

برہمن

پنڈت چندر بھان برہمن شاہجہاں کے زمانے میں گذرے ہیں
شاہجہاں کے عہد میں معزز عہدے پر فائز تھے۔ پھر شہزادہ دارا شکوہ
کے پاس میر منشی رہے۔
وطن کے بارے میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگ لاہور وطن بتاتے ہیں؛
مگر زیادہ تر لوگ اکبرآباد (آگرہ) کا باشندہ بتاتے ہیں ۲
لسلسلۂ ملازمت لاہور رہے۔ گورنر لاہور کے دفتر میں معزز
عہدے پر فائز تھے ۳
اپنی تصنیف "انشائے چہار چمن" میں لکھتے ہیں۔
"ایں نیاز مند بہ دارالسلطنت لاہور بہ مقتضائے لطافت
آب و ہوا و اقسام خوبیہائے کہ دم حالات بہ تمت اتحادے می زند رسیدہ" ۴

---

۱ "پنجاب میں اردو" مصنفہ محمود شیرانی ص ۲۳۴
۲ "زمانہ" کانپور مئی و جون ۱۹۳۱ء خان بہادر مرزا سلطان احمد
۳ اردوئے معلیٰ - حسرت موہانی اگست ۱۹۰۳ء و خمخانۂ جاوید لالہ سری رام
۴ "زمانہ" کانپور مئی و جون ۱۹۳۱ء خان بہادر مرزا سلطان احمد

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا وطن لاہور نہیں تھا۔ ۱۰۶۶ھ
میں سعداللہ خاں وزیر سلطنت شاہجہانی کے انتقال کے بعد شاہجہاں
نے قلمدانِ وزارت ان کے سپرد کیا۔ اور "رائے رایان" خطاب بخشا۔
بعض کتابوں میں داراشکوہ کے قتل کے بعد ان کے تارک الدنیا
ہوکر بنارس چلے جانے پر کافی زور دیا گیا ہے۔ مگر مولانا حسرت موہانی
رقم طراز ہیں۔

" اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ان پر نوازشات شاہی
مبذول ہوتی رہیں۔ اور ان کا تقرر خدمات نمایاں پر ہوتا رہا۔ آخر
عمر میں نوکری سے استعفیٰ دے کر شہر بنارس میں سکونت اختیار کی۔
اور ۱۰۷۲ھ میں انتقال کیا۔ "[1]

نمونۂ کلام درج ذیل ہے ؎

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

خوباں کے باغ میں رونق ہوئے تو کس طرح یاراں
نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے

پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کس سیں
نہ تسبی ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے

---

[1] "اردوئے معلیٰ" حسرت موہانی اگست ۱۹۰۳ء

پیا کے نام عاشق کوں قتل یا عجب دیکھے
نہ برچھی ہے نہ کرچھے ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے

برہن واسطے اشنان کے پھر لیے پگیاسیں
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

منشی ولی رام

منشی ولی رام شاہجہاں کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ عربی فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ولی تخلص تھا۔ شاہجہاں کے لڑکے شہزادہ داراشکوہ کے مصاحبوں میں داخل تھے۔ ان کی مثنوی "ششش وزن" مطبع نادر العلوم سے چھپ چکی ہے۔ ۱۰۹۰ھ میں عمر طبعی کو پہنچ کر انتقال ہوا[1]

غزل ذیل نمونہ کے طور پر درج ہے ؎

چہ دل داری دریں دنیا کہ دنیا سے چلانا ہے
چہ دل بندی دریں عالم کہ سر پر چھوڑ جانا ہے

چہ ہنگام اجل آید بکار ت کچھ نہ لکھ آید
بجھائی کاہ کی تیری وہی تیرا بچھانا ہے

قبا چہرۂ رنگیں ہمہ از تن تو بکشا بند

---

[1] اورینٹل کالج میگزین۔

دھنیگے کفن کی چادر جو تیرا خاص بانا ہے

ہزاروں کھانا گرداری پراز حلوا بتار رنگیں

دلوں میں دو شت ارادا جو تیرا خاص کھانا ہے

بمادر پدر فرزندان برادرہا کرمی نازی

وہی تجھ کو جلا ٹھگ گے جہاں پر بیت ٹھانا ہے

تو مہمان آمدی این جا شدی خود خانہ خاوند

تو اپنے آپ کو بھولا کسی کونا پچھانا ہے!

شراب سُرخ می نوشی اجل کردی نرانوشی

مرن کو دور مت سمجھو عجب یہ ٹک بہانا ہے

طبیب بیدار مید ارم کہ زیدا دل شفا عنہا

لبارد مت ولی زما کر آخر رام راملے ہے[1]

شاہ برکت اللہ پیمی مارہروی

شاہ سید برکت اللہ پیمی مارہروی عہد عالمگیر کے ایک مشہور و معروف صوفی بزرگ ہیں۔ انھیں عربی، اور فارسی پر کامل عبور تھا۔ شاہ صاحب ان ہزاروں میں سے ہیں جو دو بڑے تمدنوں کے ٹکراسنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے تصوف کے انسانیت سے لبریز پیغام

---

[1] "خزینۃ العلوم" از درگا پرشاد نادر مطبوعہ مطبع مفید عام ۱۸۷۹ء

کو عوام تک دوہروں اور کبتوں کے ذریعہ پہنچایا۔ ان کے ہندی کلام کا مجموعہ "پیم پرکاش" (۱۶۹۸ء) پنڈت لچھمی دھر نے حال میں ہی شائع کیا ہے۔ ان کے ریختے اس عہد کی زبان کے نمونے پیش کرتے ہیں ؎

گھر تج کے جا جنگل میں پری تب سجھ پری
تن من میں پیم کی آگ بری تب سجھ پری

موجوں کے پھیر کوں جو دل عزیز بوجھتا!
جب سندھو کے بھنور میں پری تب سجھ پری

تکیہ جو مخملی دو گر سیج چھوڑ کے
جب اینٹ زیر سیس دھری تب سجھ پری

جب تت پھرے سے من کو تسلی نہ کچھ بھئی
جب دل کی کیل مانجھ اری تب سجھ پری

کنج خفی بیں وصل ہوئی فکر و غم نہ تھا
جب ہیہ میں لگائی چھری تب سجھ پری

بوجھا نہ عشق باز خرد۔ راہ پیم کا
جب عشق سدھ بدھ ہری تب سجھ پری [1]

ناصر علی سرہندی

فارسی کا مشہور و معروف شاعر ہے۔ عہد عالمگیر سے تعلق رکھتا ہے۔

---

[1] پیم پرکاش۔ از مولانا شاہ سید برکت اللہ پیمی مارہروی مرتبہ۔ پنڈت لچھمی دھر

ولی اورنگ آبادی نے ایک بار شاعرانہ تعلّی کے طور پر ناصر علی کو،
مخاطب کر کے کہا تھا ؎

اچھل کر جا پڑے جوں مصرعِ برق　　　　اگر مصرع لکھوں ناصر علی کون!

اس پر ناصر نے جواب دیا ؎

با عجازِ سخن گر اڑ چلے وہ　　　　ولی ہرگز نہ پہنچے گا علی کوں [۱]

مگر یہ شعر عزیز دکنی کے دیوان میں موجود ہے جس سے اندازہ ہوتا
ہے کہ عزیز نے یہ شعر ناصر علی کی حمایت میں کہا اور اسی کے نام سے مشہور
ہو گیا۔ ناصر علی کی غزلیں پنجاب میں بہت مقبول و مشہور رہی ہیں۔
اس کے اردو کلام کا نمونہ درج ذیل ہے ؎

چندر سے مکھ پر یہ خال مشکیں نپٹ لبوں خی لٹک رہا ہے
عجب ہے یاراں کہ ایک زنگی بہ ملک رومی اٹک رہا ہے

بت فرنگی تقبل ہمار کھے جو پر جبیں جبیں دما دم!
ہوا ہے جیونا جگت میں مشکل کہ تیغ ابرو سرک رہا ہے

علی تفقر! مقام جس کوں ہوا ہے حاصل ز وصل جاناں
چو چشم نرگس ہوا ہے حیراں بوصل دلدار چمک رہا ہے [۲]

---

[۱] آب حیات، از محمد حسین آزاد ص ۹۳

[۲] از بیاض پرتاب سنگھ نوشتہ سنہ ۹ جلوس محمد شاہی بحوالہ "پنجاب
میں اردو" محمود شیرانی ص ۲۲

سجن کے حسن کا قرآں پڑھا ہے میں نظر کر کہ
نہیں پائی غلط اس بھی دیکھا زیر و زبر کر کر
ترے غم کا مجھے سرجن ہوا ہے کافیہ کافی
شرح ملاں ودرس میں سوں ستی ہے لبس بدکر کر
معانی اور بیان بہتیر بدیع اس کو سمجھتا ہوں
پڑھی ہے حسن تیرے کی مطول جیوں فکر کر کر
کلام العشق ہما کوں سنا حکمت سوں منطق تھوں
دگر نہ اس مطول کو رکھا تھا مختصر کر کر
اصول اور ہندسہ کب لگ پھر دن تکمیل آیا راں
ہدایہ عشق کا غالب ہوا مجھ پر اثر کر کر
بگر دی ساجن کے ہوا پیدا خط مشکیں
لیا ملک سلیمانی مگر موراں نکر کر کر
جرس بچھ کارواں کا علی ان شوخ بے پروا
کیا ہے بار ہستی کا دے عزم سفر کر کر ! [1]
نین کے ساغر تن کے بھیترا جیوں لبالب سوں ہل پڑے گا
ہو دیگی نرگس خجل جمن نین گلوں کی انکھیاں میں گل پڑیگا
دو نین کاری تیں کی جانی حیران کرتی لوگن کے تائیں

---

[1] از بیاض نوشتۂ محمد شاہ سلطان ؟ بحوالہ پنجاب میں اردو، محمود شیرانی ص ۲۱۳

خراب ہوگا تمام عالم جب ان نین موں کجل پڑے گا
تمن کے ابرو کمان دستی پلک ہے مانند جو تیر ناوک
نظر غضب کی نہ دیکھو ساجن کوئی بچارا او قتل پڑیگا
علی ملاحت ترے سجن کی اگر زلیخا سنے گی کبھوں
مصر میں سوداگر ہو دیگا درم نہ یوسف کامل پڑیگا [1]

عبدی

مولانا عبدی عالمگیر کے زمانے میں گذرے ہیں۔ ان کی تصنیف ایک کتاب "فقہ ہندی" ہے۔ جسے اشپرنگر محبوب عالم عرف شیخ جیون کی تصنیف بتاتا ہے [2] مگر پروفیسر شیرانی کا خیال ہے کہ یہ عبدی وہی ہیں جو پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ داخلی شہادتیں بھی "عبدی" کی تصنیف ہی ظاہر کرتی ہیں [3] کتاب میں اسلام کے بنیادی مسائل اور ارکان بتائے گئے ہیں۔ فقہ ہندی کا سال تصنیف ۱۰۷۷ھ ہے۔ جیسا کہ خود مصنف نے لکھا ہے

سنہ ہزار چہ ستر پہ ماہ رمضان تمام
اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

---

[1] از بیاض پنجاب سنگھ نوشتہ سنہ ۹ جلوس محمد شاہی بحوالہ پنجاب میں اردو۔ محمود شیرانی ص ۳۱
[2] فہرست کتب خانہ شاہان اودھ "مرتبہ ڈاکٹر اشپرنگر
[3] پنجاب میں اردو" از حافظ محمود شیرانی ص ۳۰۸ و ۳۰۹

مصنف کا نام عبدی خود نظم مذکور میں آیا ہے۔ مگر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے نسخہ میں کاتب نے عبدی کے آگے حاشیہ میں عبداللہ امین پنجابی لکھ رکھا ہے ؎

کیتے مسئلہ دیں کے عبدی، کہے امین — فقہ ہندی زبان پر بوجھو کر دیقین

نمونہ درج ذیل ہے ؎

حمد ثنا سب رب کوں خالق کل جہان — لائق حمد ثنا کے اور نہ کوئی جان[1]
علم شریعت نال کے بھیجا پاک رسول — جو کچھ بھیجا رب نیں سب ہم کیا قبول
یا رب اپنے فضل سوں بے حد بھیج درود — نبی محمد مصطفےٰ اتجھ سوں ہو خوشنود
بھیجوں آسکی آل پر اور اصحاب تمام — لس بھیجوں احباب پر بہت درود و سلام
کیتے مسئلہ دیں کے عبدی کہے امین — فقہ ہندی زبان پر بوجھ کر دیقین
مطلب مسئلہ بوجھنا فرض عین کر جان — عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان
علم شریعت بوجھنا فرض عین کر جان — بالغ عورت مرد کوں جو ہووے مسلمان!
چار علم سب فرض ہے بوجھو کر دو قیاس — علم توحید نماز ہے روزہ حیض نفاس
لس کہے پیچھے مومنا بہتر فرقہ جان — بہتر فرقہ دوزخی سو لعینہ شیطان
رافضی خارجی جبریہ مرجیہ بھی جان — جبریہ قدریہ ہر یکے سو بارہ فرقان
فرقہ بہشتی مصطفےٰ اور اصحاب تمام — یہ فرقہ اسلام کا سنت جماعت نام
لس یہ چار امام ہے چار رکن اسلام — ابو حنیفہ شافعی مالک احمد نام

---

[1] "فقہ ہندی منظوم" ڈاکٹر مصطفےٰ خاں اردو اکتوبر ۵۹ء ۱۹ء صفحہ

ستی ہو دس چیز سوں یہ مسئلہ کر یاد ۔ تفضیل دید و شیخ کوں دوستی دو داماد

دو لا امام پیچھے نماز کر دو قبلہ کو جان ۔ دو جنازہ پر نماز کر مسیح دو موزہ آن!

دونوں عید نماز کر اطاعت دو سلطان ۔ راضی ہو تقدیر پر دو گواہی جان

گناہ کبیر بوجھنا لازم کرکے جان ۔ اشتراک باللہ اور مارنا ناحق مسلمان

سحر کرنا اور بھاگنا بیچ غلبہ کفار ۔ عاق کرنا ماباپ کا جو ہیں مسلم ہندار

کھانا مال یتیم کا بیاج کھانا جان ۔ تو ہیں کبیرا متفق اور زنا خمر پچھان

دو ہاتھ نکالے ہاتھ سوں جب آکھے تکبیر ۔ سر نہ جھکائی رفع کر لے صاحب تدبیر

چار انگلی کے فرق سوں جدی دھرے دو پاؤں ۔ جو توں کھولا نماز میں دیکھو سجدہ کی ٹھاں

دیکھو رکوع میں پاؤں کو سجدہ ناک تمام ۔ تعذیب کند کو کاندھا وقت سلام

حی علی الفلاح تھاڈا ہو دے امام ۔ قد قامت الصلوٰۃ شروع کرے امام

طرف قبلہ کر انگلیاں سجدہ کر نہ بیچ ہاتھ ۔ موند ابر بیٹھ کے رکھ رکوع کے ساتھ

گھٹنہ دھر کر بھی ہاتھ سر سجدہ کوں لیاؤ ۔ سر اٹھاؤ بھی ہاتھ کوں تب پچھوں گھٹنہ اٹھا!

شیخ ابوالفرج محمد فاضل الدین

شیخ ابوالفرج محمد فاضل الدین بٹالوی، شیخ ابوالحسن علی بغدادی

ل محمود شیرانی کے متن فقہ ہندی جو ۲۳۲ مکتوبہ مخطوطہ پر مشتمل ہے اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے شائع کردہ مکمل متن فقہ ہندی (اردو اکتوبر ۶۹ء) ۱۲۹۶ کے مکتوبہ مخطوطہ کے مطابق ہے۔ میں بہت زیادہ اصلاحات ہیں۔

معروف بہ بدیع الدین شہید حسینی جیلانی کی اولاد میں سے تھے بیس سال کی عمر میں تلاش معاش میں نکلے۔ بٹالہ پہنچنے پر وہیں رک گئے اور تلاش معاش کا ارادہ ترک کر کے تصوف کی طرف متوجہ ہوئے۔ عربی فارسی علوم کی تحصیل مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی سے کی تھی۔ چالیس کتابیں اور رسالے تصنیف کیے[1]

دوسری روایت کے مطابق تصنیفات کی تعداد (۱۰۰) ایک سو سے زائد ہے[2] جن میں سے قصیدہ خمریہ حضرت غوث الثقلین پر آپ کی عربی فارسی، شرحیں اور ترجمۂ مواعظ الرحمٰن کے نام اب معلوم ہیں۔

۷ ذلحجہ ۱۱۵۱ھ میں، بہتر برس کی عمر میں انتقال کیا۔ تاریخ وفات "غم عام" ۱۱۵۱ھ سے نکالی گئی ہے۔

حضرت محمد فاضل اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ ولی اورنگ آبادی ان کے ہم عصر ہوں گے۔ ایک عربی اردو مناجات بطور نمونہ درج ہے

تاہیں مراجھٹ تم کوئی الغوث یا نبی
ہے رین دن غفلت بڑی الغوث یا نبی
اس فضل سوں رکھو مجھ من غزل درجات الصفا
فریاد کرتا ہر گھڑی الغوث یا نبی
میں ہوں خرابی میں پڑا لطفل سو الحق حیف

---

[1] تذکرۃ الابرار غلام محی الدین بن عبدالکریم قادری پشاوری بحوالہ پنجاب میں اردو۔

[2] سید محی الدین صاحب کا خط (بحوالہ شرائف عوثیہ) از درگاہ فاضلیہ بٹالہ (بحوالہ پنجاب میں اردو)

اس غم سنی چھاتی سڑی انظر بحالی یا نبیؐ

اس شرم سوں مجھ مکھ نہیں حتیٰ اری ضوء الصنا
ہے مرگ بھی سر پر کھڑی انظر بحالی یا نبیؐ

برتوٖ شریعت سوں رکھو حتیٰ اکوں بنور کم
اس عشق سوں کر کھیل جھوڑی انظر بحالی یا نبیؐ

رو رو دکھوں رو رو بھروں قضاً بقضاء عیا
ازواج عیاں سوں جھوڑی انظر بحالی یا نبیؐ

راکھو نہیں راکھو تہیں لی ایہ عبرک یا ملاذ
ناہیں مرا چھٹ تم ستی انظر بحالی یا نبیؐ

بھولا ہوں میں بخشو تمہیں لاتا خزولی بالوزر
حب محی دین بخشش کری انظر بحالی یا نبیؐ

فاضل پکارے رین دن اشفع شفیع المذنبین
فریاد کرتا ہر گھڑی انظر بحالی یا نبی[1]

محبوب عالم عرف شیخ جیون

شیخ کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ گیارہویں (۱۱) صدی ہجری میں جھجر پیدا ہوئے تھے اور سید میران بھیک چشتی صابری کے مرید اور

---

[1] از بیاض مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر اسلامیہ کالج لاہور (مجلہ المپنجاب پیلارڈ)

اور خلیفہ تھے جن کا انتقال ۱۱۳۱ھ میں ہوا۔ سید میراں بھیک چشتی کے خلفاء کی فہرست میں شیخ جیون کا نام بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر اشپرنگر نے شیخ جیون کی مندرجہ ذیل کتابوں کے نام دیئے ہیں۔

(۱) نقہ ہندی (۲) محشر نامہ (۳) دردو نامہ (۴) خواب نامہ پیغمبر (۵) رہبر نامہ بی بی فاطمہ خاتون ¹

نقہ ہندی کے متعلق محمود شیرانی کا خیال ہے کہ یہ شیخ جیون کی تصنیف نہیں بلکہ اس کے مصنف عبدی ہیں گے ²

دردو نامہ ایک خاصی طویل کتاب ہے جس میں پونے تین ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ یہ زبان موجودہ اردو سے کافی مختلف نظر آتی ہے۔ مگر اُس عہد کی نئی اور مقبول ترین طرز یہی ہوگا۔

فارسی عربی کے الفاظ کو مصنف نے مقامی لہجہ کے مطابق لکھا ہے مثلاً فاطمہ کو ذاطماں اور طاق کو تاک۔ صبح کو صبی اور گرز کو گرج لکھتا ہے۔ اشعار میں خاصی چستی اور روانی ہے۔

"دردو نامہ نامہ" کی ابتدا ذیل کے اشعار سے ہوتی ہے

جیوں میں پھیل نام رحمٰن کا	جیوں گیاں میں دھیان سبحان کا
صبی ایک کرتار وہ پاک ہے	کھڑا جس کی قدرت ست افلاک ہے

---

¹ فہرست کتب خانۂ شاہان اودھ مرتبہ ڈاکٹر اشپرنگر

² پنجاب میں اردو مصنفہ محمود شیرانی صفحہ ۲۵۳

وہی ہے جو کرتار عالم خدا | نرنجن نرنکار سب سے جدا
جنے اک پلک میں کیا یہ جہاں | وہی توڑ دے پھر خودی اور گماں
کیا جن تکبّر وہی پاک سے | پڑا عاقبت خاک پر تاک سے
تکبّر سے شیطان راناگیا | فرشتے سے وہ دیو داناگیا
تکبّر خودی کی تھی نمرود نیں | براہیم نبی سے جو مردود نیں
دیا مغز پیچ ڈانس جب کیا نہی | لگی لاکھ پاپوش سر پر گھنی
بنایا ارم بہشت شداد نیں | لگائے بہت دام بیراد نیں

چلا بہشت کوں وہ بنا کر ندان
غضب کے فرشتے نیں کھینچے پران

واقعہ اُحد کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں

ہوئے پھر مقابل قریشوں کے تب | نبی اور اصحاب ایک بار سب
عکاسہ طرف داہنی کوں کھڑا | ابو سلمہ بانویں طرف کو پڑا
کیا سعد وقاص عبیداہ رول | کیا اور مقداد کوں جب چنڈول
ہوئے آپ درمیان کی فوج میں | نبی خاص مقبول رحمان ہیں
کھڑی فوج کفار کی بھی تیار | کرے داہنی خالد آ کر پکار
ہوا طرف بانوے کے جب عکرمان | کھڑا تیر تر داد سے اکڑمان
مقابل ہوا امر سفیان شتاب | چلا اور بنیا ربیعہ خراب
ہوئی صف جو دونوں طرف سے تیار | پکارے چھپیوں طرف سے مار مار
ترنگوں کی پھر تنگ کھینچی لگام | بجی دنگ اس جنگ کی دھوم دھام

دھماندم گھما گم ہوئی پھیر کر — لیا ایک نے ایک کوں گھیر کر
کہیں برچھیاں ترچھیاں ہاتھ میں — ہوئے مرد کی مرد جب گھات میں
کرے سیل کی دیل اوت کھیل کر — لیا مرد نیں مرد کوں پیل کر
شتاشپ چلے تیر پے تیر زدر — کھپ کھپ ہوئی پار سنجوہ پھوڑ
لگے گرج بھاری گرج شور کر — گرز توڑ ڈالی منٹ زور کر
بنی دھار تلوار اُدت آب دار — جیسے پار صابن ہوئے لوہ تار
لڑائی تھی اک قیامت اٹھی — قیامت کی اس بات چھاتی پھٹی
کہیں مست لہو میں صحابی کھڑے — کہیں گم دکھلائے قریشی پڑے
مسلمان اصحاب مین تیر کر — لیا مار کفار کوں چیر کر

گئے بھاگ کافر چلے کھائے ڈر
ادھٹی دکنا) گیت جب ناریاں گا یکر

رسول اللہ صلعم کی وفات پر مصنف نے حضرت عائشہ حضرت فاطمہ اور شیخین کی جانب سے مرثیے لکھے ہیں جو غزل کی شکل میں ہیں مگر مصنف نے انہیں دوہرہ کہا ہے۔ حضرت عائشہ اور حضرت عمر کے دوہرے درج کیے جاتے ہیں۔

سکھ سپنیے کے گھر سودتی لاگا کلیجے تیر اب — دکھ نین بھر بھر رودتی بھاری پڑی ہے پیڑ اب
رد رد کروں ہوں زاریاں کس کو سناؤں حال یہ — کیا سی لگی اب مرم کی دیہی گئی ہے چیر اب
جانی بنا کو مل بھئی جرجر سبھی جوں کویلا — تن مال لگی ہے لوکٹی دل کا گیا دلگیر اب
نسدن پوکار وں ایکلی پیویں سیجی تن ہے کی — آنسو بھراں ناری بھراں نیند بانہ نیر اب
میری ہوئی ہیں نین کٹ بنتی لگی ہے چھانچگ — تم بھوں پڑی بیکل کری کیسے دہروں میں دھیر اب

پیو چاہ چاہے جیو یہ پیو جب نہیں کچھ جیونا بی کوں تجوں جی کوں لیوں سانچی لگی ہے پیر لب

پک پلک پڑی تھک تھک گری ٹوٹا تنک ناہیں رہا
محبوب عالم نیہہ کی پاؤں پڑی زنجیر اب

محمدؐ یاد نا چپ کیوں پڑا دن رین کرلاؤں گھڑا فریاد ان کوکوں محمدؐ سا کہاں پاؤں

محمدؐ نیہہ کی پھانسی گئی گرمانہ سے ہانسی گئی ہے ٹوٹ کر پھانسی کسے یہ حال دکھلاؤں

لگن لاگی نپٹ گاڑھی محمدؐ پیت میں باڑھی یہی ہے جیو ماں ٹھاڈی محمدؐ نا لوٹ کاؤں

محمدؐ کہہ محمدؐ کہہ پکار دل میں سدا اللہ پھروں گھر گھر یہی کہہ کہہ محمدؐ نا کوں پہنچاؤں

کہ دل باندھی محمدؐ بن تمہوں پھاہا پڑا انس دن گئے سب چین ہر دم میں کسے دکھ بات بتلاؤں

نہ سکی ہے کوسا کتی چھٹی اس درد ماں چھاتی چھٹی تن کی سبھی تاتی محمدؐ با مجھ من پاؤں

عجب محبوب عالم تھا نہایت خوب بالم تھا
مرات پرت بالم تھا رہے بیٹھ کس ٹھاؤں

شیخ محمد نور

شیخ محمد فاضل کے پیر بھائی شیخ محمد نور کے حالات نامعلوم ہیں وہ شیخ محمد فاضل کے مرید تھے۔ بطور نمونہ ان کی اردو مناجات درج ذیل ہے ؎

بہر خدا تو اے صبا بغداد جا فریاد کر دربار میراں شاہ کے کہہ منتی مجھ سر بسر

ڈوبا میں غم کے بحر ہوں کر فضل مجھ بہر خدا تم بن میرا کوئی نہیں ہے دست عاصی کا پکڑ

رہتا ہیں اپنے حال سوں غفلت سنی حیراں ہوا زحمت ہو مجھے مضطر کیا دیو دشا خود کرم کر

تیرے مرید تو خاص ہیں ان کے سگاں کا ہوں میں سگ بہر خدا اور مصطفےٰ کر لطف کی مجھ پہ نظر

حق نے تجھے سرور کیا دلبراں میں تم سر تاج ہو
ہویا نہ کوئی تا ہووے تیرے جیسا تا دن حشر

صد حیف مجھ عاصی تائیں تم سا ہووے میرا سائیں
دل کی سیاہی نہ اد ہٹے عالم کے تم ہو راہبر

مجنوں کے جس مارے ہوئے وہ بار تھکے آکے
مجھ اس لئے تجھ نام کی ہے ورد دل میں جان پر

تم ساز کا جس پیر ہوا اس کوں نہیں پرواہ کچھ
پاوے دو جگ میں عافیت تیری نظر سوں سنگ دزد

چاہو اگر مردے تائیں زندہ کرو اک پل منے
تم کی صفت میں کیا کروں تم سا نہیں کوئی دگر

خواری کے مہ گرداب موں فکراں ستی مجنوں ہوا
مرنے میں کچھ باقی نہیں جیتا ہیں تم کی آس پر

قوت گئی مجھ صبر کی ہے بیقراری روز و شب
تم سیں طلب آرام کی ہر دم مجھ کے نزد گر

تم کی محبت دل مرا لیتا ہے اپنے دام سوں
حق سوں رجا واثق مجھے پاؤں میں دنیا دیں میں فر

دیوے خدا توفیق گر تم کا اسم ہر دم پڑھوں
تجھ اسم اعظم اسم ہے مشہور ہے عالم بہتر

پوچھے ہے گر تحقیق میں ولی تری درجات ہے
صدقہ علی حسنین کا آفرت مجھ سے قدم دھر

دامن لگے گی تجھ سن عاجزی مجھ کی شہا
محفوظ کر دل جان سوں دو جگ کو میرے خطر

یارو مبارک لب ستی مجھ کا کہو خود فیض سوں
دل کی قساوت سب گوا روشن کرو سینہ جگر

عصیاں سوں میں غرقاب ہوں نیکی نہیں مجھ سے ہوئی
تجھ بارگی میں گرا ہوں ناتواں بے بال و پر

کر کر تصدق نانو کے باطن مرے کی لے خبر
رکھ شاد دنیا دیں منے ہو نفس شیطاں کا نہ ڈر

حق کی حضوری بخش مجھ مجلس محمد مصطفےٰ
وہ قرب انبیا کر مجھے دو جگ میاں میں شاد تر

بن دیکھنے تجھ اے شہا زندگی میری برباد ہے
چہرہ مبارک مجھ دکھا تجھ پوں فدا دل جان دھر

غم کی تباہی سے چھڑا کر دے فرح مجھ سیں ہر بلا
تو بادشاہ دو سرا مشکل مری آسان کر

افضل سائیں نائب ترے میرے پڑے نے دست جی
برکت او نہوں کے نام کی مجھ سیں گوا ہر شیدہ و شر

میں تو عاجز رات دن ہے ورد تیری مدح کا
واصل خدا کر تو مجھے رنج بے محنت ضرر

میر جعفر زٹل

میر جعفر کے والد کا نام سید عباس تھا جو نارنول میں دکانداری کرتے تھے
جس سال اورنگ زیب تخت نشین ہوا اسی سال میر جعفر پیدا ہوئے[1]
حامد حسن قادری نے تاریخ پیدائش شاہجہاں کے عہد میں یعنی
۱۶۵۹ء تا ۱۰۶۹ھ بتائی ہے[2] مگر اورنگ زیب کی تخت نشینی کا سال بھی یہی ہے۔ میر جعفر سے قبل دو بہنیں پیدا ہو چکی تھیں۔ والد کا انتقال ان کی کم سنی کے زمانے میں ہو گیا۔ میر سرور نے جو میر جعفر کے سگے چچا تھے۔ سرپرستی کی۔ مکتب کی تعلیم پوری کرنے کے بعد روزگار کی تلاش میں باہر نکلے اور شہزادہ کام بخش کی فوج میں سوار کی حیثیت سے ملازم ہو گئے شہزادہ کام بخش کے ساتھ ان کا زیادہ تر زمانہ دکن میں گذرا

محمود شیرانی کو ان کی تاریخ وفات معلوم نہیں مگر حامد حسن قادری نے ۱۷۱۳ء تا ۱۱۲۵ھ دی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب فرخ سیر جانشین ہوا اور اس کے سکہ پر یہ شعر کندہ کیا گیا ؎

---

[1] پنجاب میں اردو مصنفہ محمود شیرانی صفحہ ۲۵۸

[2] داستان تاریخ اردو مصنفہ حامد حسن قادری صفحہ ۲۷

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر
بادشاہ بحر و بر فرخ سیر
تو میر جعفر زٹلی نے بھی فوراً اپنے انداز میں اس سکہ کو اس طرح پیش کیا؟
سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ پشہ کش فرخ سیر

جب فرخ سیر نے یہ سکّہ سنا تو اس نے انہیں قتل کرادیا۔ ان کے کلیات مطبوعہ لکھنؤ کے صفحہ ۴۸ پر ایک عنوان سے بھی پتہ چلتاہے کہ فرخ سیر کے حکم سے قتل ہوئے۔

فارسی میں عبید زاکانی ہجو اور ہزل گوئی کے لیے مشہور ہے اردو میں میر جعفر کی وہی حیثیت ہے۔ عالم گیر کے عہد میں دو مشہور ہزال نظر آتے ہیں نظم میں زٹلی اور نثر میں نعمت خاں عالی۔ جعفر زٹلی کی ہزل گوئی کچھ تو خود ان کی فطری افتاد طبع اور کچھ اس دور کے اخلاقی اور سیاسی زوال کے باعث وجود میں آئی۔ انہوں نے ہجویں اگرچہ کم لکھی ہیں اور جو لکھی بھی ہیں تو نثر درثًا مگر ان کی زباں درازی اور بیباکی مسلّم ہے بادشاہ سے لے کر فقیر تک کوئی ان کے بیباک قلم کی زد سے نہیں بچ سکا۔ وہ نہ بادشاہوں سے خائف تھے نہ امرا سے۔ جس نے انہیں ذرا بھی چھیڑا منہ کی کھائی۔ کلام کو خداداد مقبولیت حاصل تھی۔

قمرالنساء بیگم نے میر صاحب کو تیس روپے انعام دیئے جانے کا حکم دیا مگر بیگم کے دیوان فتح علی خاں نے صرف پانچ روپے دے کر ٹالنا چاہا اس پر

بگڑ کر میر صاحب نے دیوان کی ہجو لکھی اور روپیہ پورا وصول کیا۔

ایک امیر نے ان کو پانچ اشرفیاں بطور انعام دیئے جانے کا حکم دیا مگر ان کے دیوان خدا یار بیگ نے دبالیں۔ جب میر کو اس کا علم ہوا تو خدا یار کی ہجو لکھی۔ ہجو کے آخر میں کہتے ہیں ؎

جو کوئی مجھ اوپر شفقت کرے — جگت بیچ اس کی خداپت رکھے

نہ ایں ہجو از راہ حرص و ہواست — دل آزار را ہجو کردن رواست

بیا جعفرا کنوں شکایت مکن — ز موذی و ماضی حکایت مکن

میر تقی لکھتے ہیں کہ ایک روز میر جعفر مرزا بیدل کے یہاں گئے اور صلہ کی امید میں یہ مصرعہ پڑھا ؏

چہ عرفی چہ فیضی بہ پیش تو پُشش

مرزا بیدل بہت برہم ہوئے اور کچھ دے دلا کر پیچھا چھڑایا[1]

میر حسن بیان کرتے ہیں کہ میر جعفر ایک دن مرزا بیدل کے پاس گئے تو اُن کو فکر شعر میں مشغول دیکھا۔ پوچھا وہ کونسا مصرع ہے جس کے دوسرے مصرع کی تلاش میں اس قدر مشغولیت اور محویت ہے۔ بیدل نے مصرع پڑھا ؏

لالہ در باغ داغ چوں دارد

سنتے ہی میر جعفر نے فوراً دوسرا مصرع پیش کیا ؏

چو بجے سبز زیر ..... دارد

---

[1] نکات الشعراء از میر تقی صفحہ ۳۰-۳۱

بیدل خفا ہوئے اور کچھ دے کر ٹالا نہ

میر نے عالمگیر کے فرزندوں میں سے کسی کو بھی نہ بخشا۔ ان شہزادوں کی آپسی رقابت اور رنجشوں نے دکن کی مہم کو مزید پیچیدہ اور کٹھن بنا دیا تھا۔

محمد معظم کے متعلق کہتے ہیں ؎

نخستیں کلاں ترکہ بر کمنڈ کرد	ہمہ کار و بار پدر بھنڈ کرد
چناں لوٹ شد بستیٔ جگ نگر	نہ خند ما ضو ماند نہ ماکدر
چہ ملکے بدست خود آوردہ داد	مگر از بہشتش اساسے نہاد
جہاں ہوے ایسا کلچھن کپوت	لگے خلق کے منہ کو کالک بھبوت

محمد اعظم شاہ کے بارے میں کہا ؎

دگر شاہ اعظم ہمہ کندور	برسوائی انداخت کار پدر
بخو شد امن زخسپوردہ ساختہ	بہ للو تچو کار در باختہ
فرستندامیاں بہ شب پان پھول	ملا کر کیا کام سب خاک دھول
ازیں اختلافش کہ گیرد خراج	کہ دھنگ بھنگ گشت است للو کا لاج

محمد اکبر کے بارے میں فرمایا ؎[1]

چہارم پسر ڈومنی کا جنا

میر جعفر نے تو خود شہزادہ کام بخش کو بھی نہ بخشا جس کے یہاں ملازم تھے۔ نتیجہ میں برطرف کر دیئے گئے۔ میر نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا ہے اور اس پر

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو از میر حسن۔ دہلوی

پشیمان بھی ہیں ؎

تنہا شدی اندر سفر کہ جعفراب کیسی بنی
افتادی اندر بحر و بر کہ جعفراب کیسی بنی

در بے کسی تا بودہٗ با درد و غم آلودہٗ
مفلس شدی و در بدر کہ جعفراب کیسی بنی

از ہجو آں سلطان خود کردی پریشان جان خود
درماندہٗ بے بال و پر کہ جعفراب کیسی بنی

دشہ تیں بیری کی سر کی خدا نے خیر کی
تا حال ہم داری حذر کہ جعفراب کیسی بنی

وہ ذوق ہر دم کا کہاں وہ عطر بیگم کا کہاں
در خاک شد آں کرّ و فر کہ جعفراب کیسی بنی

اسباب غم برداشتی تخم فلاکت کاستی
اکنوں کجا آں سیم و زر کہ جعفراب کیسی بنی

زٹلی نے اگرچہ اپنے دور کے کسی شخص کو بخشا نہیں مگر عالمگیر کے متعلق انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ وہ اس کے علم و فضل اور انتظام کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس کی زندگی تو زندگی موت کے بعد بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کے مرنے سے ہندوستان میں جو عام افراتفری اور انتشار کا دور دورہ ہوا اس کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ ... مکمل اکمل و کامل دل آگاہ

بکت کے آنسوؤں جگ روؤتا ہے — نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے
صدائے توپ دبندوق است ہر سو — بسرا اسباب دبندوق است ہر سو
دوادو ہر طرف بھاگڑ مچی ہے — بچہ در گود سر کھٹیا دھری ہے
کٹاکٹ و لٹالٹ ہست ہر سو — جھٹا جھٹ دپٹا پٹ ہست ہر سو
ہر سو مار مار و دھاڑ دھاڑ است — ادھل چال دتبر خنجر کٹار است
ازاں اعظم وزیں سوئے معظم — جھڑا جھڑ و دھڑا دھڑ ہر دو باہم[1]
بہ بینم تا خدا از کیست راضی — بخواند خطبہ بہ نام کہ قاضی

بیا جعفر زباں کو مختصر کر
زدور مختلف دل میں فدا کر

محمد معظم کے دور میں میر جعفر نے ایک رسالہ در بارِ معلیٰ کے نام سے لکھا جس میں دربار کے فرضی وقائع اور شاہی احکام اکثر ضرب الامثال کی زبان میں ادا کئے ہیں ان سے اس عہد کے ضرب الامثال سے واقف ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اکثر وہی ہیں جو آج کل استعمال ہوتے ہیں۔

چرم چھاڑا بھاری پتھرا۔ تجھے پرائی کیا پڑی تو اپنی آپ نبیڑ۔ کھالا بنیا چنیری تو لے۔ ماں پر پوت پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا ترت دان مہاپن۔ اوکھلی میں سر دینا دھمکیوں سے کیا ڈرنا۔ کھادیں پیویں محمود کے اور آویں مسعود کے۔ پاسا پڑے سو داؤ راجا

---

[1] ع "زمیں کے واسطے لڑتے ہیں باہم" داستان تاریخ اردو حامد حسن قادری ص ۲۶

کرے سو نیاؤ۔ چار دن کا چاندنا اور پھر اندھیری رات۔
جیسا بووے ویسا لوے۔ خارشی کتا مخمل کی گدی اور اس پر بانات جھول
آم کھٹرا اور بوچا سٹکا۔ باندر کے ہاتھ ناریل۔ اندھے کی جورو کا خدا رکھوارا
دُم جو بکری کی بھیڑ کی وارا ہو نہ پارا۔
بارا حاکم ضامن چاہے۔ باسی رہے نہ کتا کھائے۔ گدھوں کھایا کھیت
پاپ نہ پن۔ دانا کی ناؤ پہاڑ چڑھے۔ مارے منہ طباخ سے
آگے دھرا انکھلائے۔ ذلی بلی چوہے پاس کان کترا دے۔
اس رسالے میں کچھ چیزیں الحاقی بھی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ اس میں عالمگیر
ثانی متوفی ۱۱۷۳ھ اور شاہ عالم ثانی متوفی ۱۲۲۱ھ کے عہد کے واقعات یعنی
احمد شاہ درانی کا حملہ۔ سورج مل جاٹ اور مرہٹوں کی دہلی میں لوٹ مار وغیرہ
کے حالات بھی شامل ہیں جبکہ میر جعفر فرخ سیر کے عہد میں قتل ہو چکے تھے۔
جب زٹل شہزادہ کام بخش کی ملازمت سے نکالے گئے تو ان کا ملازم
تمام اندوختہ لے کر بھاگ گیا۔ میر نے اپنے دل کا بخار اس طرح نکالا۔
"درعین وقت بیکاری و حینیں ناداری غنی ازلی و منتفنی و ھنیہ و
چہ عزیز چگونہ نفرے بے پدرے راچہ شرے فرصت وقت را یافتہ
متاع کثیر و قلیل را گرفتہ بگوشہ خزید . . . .
. . . . شد ہوے پہ سو درے۔ مثل جیسے کوڑہ میں کھاج
شد بلکہ بے خرچی آ گیلا۔ بیا جعفر مجوش و مخروش لشنبدہ کہ گفتہ اند
. . . ."

میر جعفر اپنے کلام نظم و نثر میں ہندی الفاظ کو عربی بندش دیدیتے ہیں:
"چوں گھڑگھڑاہٹ الرعد فی الغمام و کڑکڑاہٹ البرق فی الہنگام
بر سر است و ہنگام گھٹا گھور صبح و شام شور دادر و مور
بہ دوام و آوازِ لرزہ السماوات و گڑبڑۃ السمندرات و
ڈٹ اچھیر دالبو چھڑ فی المنظر است و ذلل و سعت منزل
علی الفیچ پچ و الکیچ کیچ کہ چہاتے جیسی اگیں اکراہ میورند"
سامان چوری ہونے پر غصہ کے عالم میں ذیل کی نظم لکھی ؎

دلا و ر مفلسی سب سے اکڑ رہ　　بہ عالم بے کسی سب سے اکڑ رہ
چکن اور زر کا چیرہ پشم کر بوجھ　　بیٹھی بگ باندھ کر سب سے اکڑ رہ
اگر شور بن شند کس کو غم ہے　　لنگوٹا باندھ کر سب سے اکڑ رہ
نہ کر خواہش تو جامہ بافتی کا　　کہیں دگلہ پہن سب سے اکڑ رہ
جو کچھ بھی ہاتھ لاگا چھپ چھپا کر　　خوشی ہو ڈنڈ کر سب سے اکڑ رہ

اگر یہ بھی میسر جو نہ ہووے
اکیلا جوں الف سب سے اکڑ رہ

نمونۂ کلام

نہ سو سکہ سیج راحت میں سدا رہ زرد طاعت میں
اجل بھی ہے گی ساعت میں کہ آخر خاک ہو جانا
جنہوں کے لاکھ تھے گھوڑے سدا زربفت کے جوڑے
انہوں کو موت نے توڑے کہ آخر خاک ہو جانا

جنھوں گھر جھومتے ہاتھی ہزاراں رین دن ساتھی
تنھوں کو خاک اب کھاتی کہ آخر خاک ہو جانا

کر جب موڑ کر چلتے عطر سب دیہہ پہ ملتے
دیکھو اب خاک میں رُلتے کہ آخر خاک ہو جانا

جنھوں کے لال تھے ہیرے سدا منکھ پان کے بیڑے
تنھوں کو کھا گئے کیڑے کہ آخر خاک ہو جانا

سدا جو پہنتے ململ محل ہیں باندھتے صندل
گئے وہ خاک میں رُل مل کہ آخر خاک ہو جانا

لشکتی باندھتے پاگاں محل میں رنگ اور راگاں
وہاں ہیں بیٹھتے کاگاں کہ آخر خاک ہو جانا

لذت کا کھاوتے کھانا پہرتے ریشمی بانا
انہوں کو موت نے بھانا کہ آخر خاک ہو جانا

ہزاراں شہر کے راجا جنھوں کو چاندسے لاجا
نقارا موت کا باجا کہ آخر خاک ہو جانا

بشنو بیان نوکری جب گا نٹھ ہووے کھوکھری

جب بھول جاوے چوکڑی یہ نوکری کا خط ہے
ہر روز اٹھ مجرا کریں درکار یک صد گر پڑیں
بے شرم آپس میں لڑیں یہ نوکری کا خط ہے

ہر صبح ڈھونڈیں نوکری کوئی نہ پوچھے بات ری
سب قوم ڈھوئیں لاکڑی یہ نوکری کا خط ہے
چوکی لکھیں اور عاجزی کہا دن پنادیں باجری
تسپر چلادے ناظری یہ نوکری کا خط ہے
راکھے سیاہی کمات کو چوکی دلادیں رات کو
کوئی نہ پوچھے ذات کو یہ نوکری کا خط ہے
صاحب عجب بیداد ہے محنت ہمہ برباد ہے
اے دوستاں فریاد ہے یہ نوکری کا خط ہے
دس بیں مجرے میں گئے دس بیں منشی نے لئے
دس بیں میں جھگڑے کئے یہ نوکری کا خط ہے
ہم نام کو اسوار ہیں روزگار سے بیزار ہیں
یارو ہمیشہ خوار ہیں یہ نوکری کا خط ہے
یک تیر بے پیکاں تگر دادے نہ سوفار و نہ پر
فوطہ نماند در کمر یہ نوکری کا خط ہے
دربار دیکھا خان کا بیڑا بنایا پان کا
زر کا تو پھر امکان کیا یہ نوکری کا خط ہے

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے

نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھاؤں میں وفاداری
محبت اُٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے

نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹھ میں کھوئی
اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے

خوشامد سب کریں زر کی چہ بیگانہ چہ زن گھر کی
ملاوے بات سب ہر کی عجب یہ دور آیا ہے

نفر کی جب طلب ہووے نفر باہر کھڑا اڑ دے
میاں گھر میں پڑا سووے عجب یہ دور آیا ہے

زہے شاہ اورنگ دھانک بلی — کہ زد ملک دشمن پڑی کھلبلی
برآورد عسکر بصد دھوم دھام — کہ بجلی پڑی بر سر روم و شام
دریں پیر سالی و ضعف بدن — مچائی دھما چوکڑی در دکن
زہے شاہ شاہاں کہ وقت وغا — نہ ہلڈ نہ ٹمڈ نہ جیدر جا

کمر بستہ ہشیار میدان پر
شب و روز تیار گھمسان پر

سید اٹل نارنولی

کلیات جعفر زٹلی مطبوعہ لکھنؤ میں ایک رقعہ سید اٹل نارنولی کی رف سے جعفر زٹلی کو لکھا ہوا موجود ہے۔ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ یہ ماحب میر جعفر زٹلی کے سگے بھائی نہیں تو رشتے کے بھائی ضرور ہیں۔

دونوں کا مذاق تقریباً ایک سا ہے [1] مولانا حامد حسن قادری ان کا نام سید عبدالجلیل اٹل بتلاتے ہیں [2] سید اٹل کا رقعہ درج ذیل ہے۔

"رقعہ سید اٹل کہ از نارنول نوشتہ بمیر جعفر در دکن فرستادہ بود"

"دینپاہ بڑائی وچوڑائی میر جعفر زٹلی بڑے بھائی ہر روز ازیاد حق سکھی باشد از سید اٹل بعد دھک جہار بسیار اور منوہار بے شمار اوجھل دمخفی نماند کہ پیر پریت ہموطن وادمنگ ملاقات داشتیاق آں ازحد پرگھٹ نرپٹ بیروں وازجہت اندیشہ نہایت افزوں لیک بموجب آں کہ کل امر رہون باوقار بھا حوالہ نمودہ ۔ دا۔ فیچر ی نگار دکہ بعضے بدبختاں کافر کٹھ دلی بوجہ مزید غتہ درجوی خودی چول نمودک ازندی ٹرٹری کردند اکھاڑ پیچھاڑ کردہ در نارنول ٹھیکا تشاہ بودم و بعضے ٹرٹوں وچرچوں از برائے ایں نپٹ مہرباں ازدہاں ...... نشاں .... چوں.....

بچہ ٹچہ بر بر زبان می آورند۔ نظم

اٹل تیری جعفر جہانگیر شد	زٹل گفتن اندر توئی پیر شد

امید کہ خود دریں پیشہ ہادی بودہ از خط وکتابت بھول جانا ندارد! باشد۔ بیت ؎

نام حق روز و شب پکارا کر	خط کتابت کو بھی بچار کرہ [3]

---

[1] پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی صفحہ ۲۶۸

[2] داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری صفحہ ۲۸

[3] کلیات جعفر زٹلی مطبوعہ لکھنو ۱۲۷۱ھ

میر جعفر زٹل نے اس خط کا منظوم جواب لکھا ہے ؎

سنو اے سخنداں برادر عزیز	اٹل نار نولی تو ئی باتمیز

نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

رخسار پر بہار سجن رونق چمن	یا گل گلاب کا کہوں یا لالہ یا سمن
یا حقۂ جواہر دیا درج در کہوں	یا غنچۂ گلاب کہوں یا کہوں دہن
گیسوئے تابدار ہیں یا ناگ ہے بھونک	یا زلف مشک رنگ ہے یا نافہ ختن
با قد خوش خرام چلے جب لٹک لٹک	شمشاد اور صنوبر خم کھاویں در چمن
جوں ماہتاب روشنی اد کرتا ہے جھجک جھجک	یا آفتاب گشتہ درخشندہ در گگن
بیداد گر ستمگر ظالم عجب عجب	گہ مہربان و گاہ غضبناک و خندہ زن

بر توسن کرشمہ سوار است نازنین
سید اٹل زبادۂ دیدار او مگن [1]

شیخ جنید

شیخ جنید گیارہویں صدی ہجری کے ربع اول سے تعلق رکھتے ہیں جماعت صوفیہ سے متعلق کیے جاتے ہیں۔ حالات زندگی نامعلوم ہیں۔ ان کی نظم ذیل بطور نمونہ درج ہے ؎

---

[1] از بیاض پرتاپ سنگھ موضع آدر علا پرگنہ راہون۔ دوآبہ سب جالندھر بست دہم شہر جمادی الاول سنہ ۹ جلوس والا نے محمد شاہ بادشاہ غازی بحوالہ پنجاب میں اردو۔ محمود شیرانی صفحہ ۲۶۹

دلا غافل چہ می خسپی کر رہی میح ہتیں ڈریئے
چو روز مرگ در پیش است اتنی نیند کیوں کریئے

چو دُزدا اندر مکیں باشد کرے جو نیند بنجارا
بناشد سود یک جیتل گوا دے مول بھی سارا

بدیں دنیائے دہ روزی بڑائی کائی کیوں کریئے
اگر صد سال عمرت شد بنہایت ایک دن مریئے

چہ مغروری دریں دنیا سدا اس جگ نہیں رہنا
ہمیں راہے کہ در پیش است سبھی اس پنتھ سے چلنا

کجا رفتند آں شاہاں کہ جن کی بار تھی ہستی
گرفتند جائے در صحرا گئے سب چھوڑ کر بستی

کجا رفتند آں مرداں کہ بانکاں ٹوپیاں دہردے
ہمہ در خاک خسپیدند جنہاں تھیں سبھی ہتیں ڈردے

کجا رفتند آں یاراں جنہاں ہتیں جیو نی تیرا
چناں رفتند ایں عالم کہ کلھونا کیا پھر تیرا

کجا رفتند آں حوراں جنہاں کے نین تھے بانکے
چناں بگذاشتند خانہ نہ پھر گھر بار دھر جھانکے

کجا آں ماہرد خوباں جو مود کنند ادتے پاتے
نہ نام و نے نشاں ماندہ سبھی گل گل ہے ملتے

کجا سوداگراں منعم جنہاں کے بار تھے تانڈے

کلالاں خاک شاں بُرد ند کھڑے بکھ پارتس بھانے

دراں دقتیکہ تو میری نہ دنیا کام تجھ آوے
کسی کو دانہ دو بخشیدہ دہی کچھ ساتھ بھی جاوے

نہ ایں جا خویش کس باشد نہ کرسی یار کو یاری
نہ کسی مونس بود دیگر نہ بھائی باپ متھاری

ترا در گور بسپارند پھر کر لوگ گھر آوے
بیفتد یا خدا کارت نہ کوئی آوے جھیر کاوے

دراں درگاہ بے رشوت بخانوں کیوں رہے پردا
جنید آمرد آں باشد کہ اس سیسار تھیں ٹُردا [1]

شیخ عثمان جالندھری

شیخ عثمان جالندھری حضرت مجدد الف ثانی سرہندی علیہ الرحمۃ متوفی ۱۰۳۴ھ کے پیر بھائی ہیں۔ خزینۃ الاصفیا مصنفہ مفتی غلام سرور لاہوری میں ان کا ذکر ضمناً آجاتا ہے۔ زیادہ حالات لاعلمی میں ہیں۔ سنہ وفات نامعلوم ہے ذیل کی غزل ریختہ ان کی تصنیف ہے اس میں صرف ردیف اردو کی ہے بقیہ شعر فارسی کا ہے ؎

عاشق دیوانہ ام آؤ پیارے حبیب　　از ہمہ بیگانہ ام آؤ پیارے حبیب

---

[1] پنجاب میں اردو۔ محمود شیرانی صفحہ ۳۰۵

ے نظرت آفتاب بر من مسکین بتاب　　جان و جگر شد کباب آ ؤ پیارے حبیب

ے دل و دین جان من درد تو درمان من　　ذکر تو سامان من آ ؤ پیارے حبیب

ں لب شیریں شکر بارد و درد گہر　　سازمرا بہرہ ور آ ؤ پیارے حبیب

یشی کشتہ را عاشق آشفتہ را　　بے دلم و بے نوا آ ؤ پیارے حبیب

بدم انتظار یک نظرم و اشکبار　　عاشقم و خستہ دار آ ؤ پیارے حبیب

ے تو کس بیکساں مونس بیچارگاں　　غمخور آوارگاں آ ؤ پیارے حبیب

تر ا بندہ ام نزد تو شرمندہ ام　　زار و سر افگندہ ام آ ؤ پیارے حبیب

ت شبم گذشت کار بیامد ز دست　　پشت زغم با شکست آ ؤ پیارے حبیب

بہ رو کو بکو نعرہ زنمال شو بشو　　دیدن تست آرزو آ ؤ پیارے حبیب

ز و شبم انتظار دم بدمم بے قرار　　دیدہ چو ابر بہار آ ؤ پیارے حبیب

بر دل عثمان غریب رحمت خود کن قریب

زانکہ تو ہستی مجیب آ ؤ پیارے حبیب [۱]

جس انداز کی غزل ریختہ شیخ عثمان کے حالات کے تحت درج کی گئی ہے، اسی طرز

یک اور غزل ریختہ ملتی ہے مگر اس کے مصنف کا پتہ نہیں۔

منم مشتاق دیدارت اری ٹک دور کن گھونگٹ

بجان و دل خریدارت اری ٹک دور کن گھونگٹ

---

۱ بوساطت "مولانا عبداللہ صاحب" پنجاب میں اردو حافظ محمود شیرانی

صفحہ ۳۰۳ - ۳۰۴

نہ نینی نیند مجھ آوے نہ تجھ بن بات مجھ بھاوے
ترفداں رات دن جاوے اری ٹک دور کن گھونگٹ
اگر تو یوسف ثانی دگر تو ماہ تابانی
اگر تو شاہ خوبانی اری ٹک دور کن گھونگٹ
عجب رفتار تو داری عجب گفتار تو داری
چہ حسنت نادرے داری اری ٹک دور کن گھونگٹ [1]

فطرت

میرزا معز الدین محمد موسوی خاں فطرت فارسی کے مشہور شعرائے عہد میں سے ہیں ان کا وطن مشہد مقدس تھا۔ ۱۰۸۲ھ ۱۶۷۱ء میں ایران سے ہندوستان تشریف لائے اور دربار عالمگیر میں اعزاز حاصل کیا۔ عالمگیر کے مشہور امرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ۱۱۰۱ھ میں انتقال ہوا۔ فارسی شاعر تھے ــــــــ کبھی کبھی اردو میں شعر کہتے تھے۔ تذکروں میں ایک شعر محفوظ ہے جس میں اردو فارسی مخلوط ہے ۔

از زلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے [2]
در گلشن آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے [3]

---

[1] پنجاب میں اردو۔ محمود شیرانی صفحہ ۳۰۴

[2] دھوم پڑی [3] جھوم پڑی

اس شعر کو بعض تذکرہ نگاروں نے مرزا قزلباش خاں امید سے منسوب کیا ہے اور اس طرح لکھا ہے [1]

از زلف سیاہ تو بدل دوم پری ہے
در خانۂ آئینہ گنا جوم پری ہے

سودا اسے خان آرزو کا بیان کرتے ہیں اور اس طرح لکھتے ہیں [2]

بیدل

مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت ...لی میں ہوئی۔ عالمگیر کے لڑکے شہزادہ محمد اعظم سے منسلک ہو گئے۔ کسی نے ...زادہ سے ان کی شاعری کی تعریف کی تو اس نے قصیدہ کہہ کر لانے کو کہا تاکہ استعداد ...یہ کر منصب و تقرب میں اضافہ کیا جاتے جب مرزا کو یہ بات معلوم ہوئی تو فوراً ...ری سے علیحدگی اختیار کی۔ دوستوں کے اصرار کے باوجود قصیدہ مدحیہ ...یں لکھا۔ گوشۂ فقر اختیار کیا اور تمام عمر توکل و استغنا میں گذار دی ۱۱۳۳ھ ...طابق ۱۷۲۱ء میں انتقال کیا۔ فارسی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اردو کے دو شعر ...ے منسوب ہیں جو درج ذیل ہیں ؎

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

---

[1] دریائے لطافت از انشاء اللہ خان انشاء

[2] تذکرہ سودا بحوالہ آب حیات از محمد حسین آزاد صفحہ ۱۲۲

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

بعض متاخر تذکروں میں یہ شعر بھی ان سے منسوب کیا جاتا ہے؎

شہرۂ حسن سے از بسکہ وہ محجوب ہوا
اپنے چہرے سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

مگر اس شعر کا بیدل سے انتساب صحیح نہیں کیونکہ یہ شعر میر سوز معاصر میر کا ہے[1]

عبدالجلیل بلگرامی

میر عبدالجلیل بلگرام کے مردم خیز خطۂ زمین سے تعلق رکھتے ہیں سنہ ۱۶۶۰ء مطابق سنہ ۱۰۷۱ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۷۲۵ء / ۱۱۳۸ھ میں وفات پائی۔
آپ فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ آپ نے سنہ ۱۷۲۲ء / ۱۱۳۴ھ میں فرخ سیر کے وزیر نظام الملک آصف جاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ فارسی زبان میں لکھا۔ اس میں انہوں نے عربی فارسی، اردو تینوں زبانوں میں تاریخیں کہہ کر شامل کی ہیں۔ اردو کی تاریخ کا شعر درج ذیل ہے۔

اسیں دیکھے کہی ہندی موں یوں نسبت
رہے جگت موں اچل یاس یہ وزیر سدا[2]
۱۱۳۴ھ

---

[1] سب رس ستمبر ۱۹۵۰ء صفحہ ۳۰ مکتوب محی الدین احمد آرزو
[2] داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری صفحہ ۲۸

مرزا عبدالغنی قبولؔ

مرزا عبدالغنی قبولؔ کشمیری مرزا جویاؔ کے شاگرد تھے۔ دہلی میں سکونت اختیار کی۔ ۱۷۲۶ء مطابق ۱۱۳۹ھ میں انتقال ہوا۔ فارسی کے مشہور شاعر ہیں۔ ایک اردو شعر ان سے یادگار ہے[1] ؎

دل یوں خیالِ زلف میں پھرتا ہے نعرہ زن
تاریک شب میں جیسے کوئی پاسباں پھرے[2]

مرزا گرامی

مرزا عبدالغنی بیگ قبولؔ کشمیری کے فرزند تھے۔ فارسی میں شعر کہا کرتے تھے مگر ریختہ کی گرم بازاری دیکھ کر اردو میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے۔ میرؔ کا کہنا ہے کہ ان کا حال خان آرزو کے تذکرہ میں درج ہے۔

"نقل احوال او در تذکرہ خان صاحب مرقوم است"[3]

یاں مزے بن محل نہیں کھاتا   بھاگی مجھے بیز منعم کا

---

[1] تذکرہ سرو آزاد از میر غلام علی آزاد بلگرامی صفحہ ۱۹۷

[2] رسالہ در تحقیق زبان ریختہ از عبدالغفور خاں نساخ بحوالہ اردوئے قدیم شمس اللہ قادری

[3] نکات الشعراء از میر تقی میرؔ

انند رام مخلص

رائے انند رام مخلص کا شمار مشہور فارسی گو شعرائے ہنود میں کیا جاتا ہے۔ یہ قوم کے کھتری تھے اور نواب قمرالدین خاں اعتمادالدولہ وزیرالممالک کے وکیل تھے۔ تمام تذکرہ نگاروں نے ان کی فارسی شاعری کی مہارت کا ذکر کیا ہے اور اردو شعر گوئی کی شہادت دی ہے۔ ابتداً مرزا بیدل سے اصلاح لیتے تھے آخر عمر میں سراج الدین علی خاں سے مشورہ سخن کرنے لگے۔

"شاعری مقرری فارسی در عنفوان جوانی مشق سخن بہ خدمت مرزا بیدل می کرد دریں ایام اشعار خود را از نظر خانصاحب سراج الدین علی خاں می گذارند"[1]

"...... چوں ہنگامہ ریختہ بسیار دید خودش سہ چار بیت ازیں قبیل موزوں کرد"[2]

"...... گاہے گاہے بہ ندرت شعر ریختہ نیز می گفت"[3]

تذکرہ نگاروں نے مخلص کے دو چار شعر سے زیادہ نقل نہیں کیے۔ کتب خانۂ رام پور میں مخلص کے کلیات نظم فارسی کے مخطوطہ کے آخر میں مخلص نے اپنے تمام اردو اشعار بھی نقل کر دیے ہیں۔ یہ مخطوطہ خود مخلص کا مملوکہ تھا جس میں اردو اشعار

---

[1] نکات الشعراء میر تقی میر صفحہ ۸

[2] مخزن نکات۔ قائم چاند پوری صفحہ ۲۰

[3] تذکرہ شعرائے اردو۔ میر حسن صفحہ ۱۴۵

عنوانِ ذیل کے تحت درج ہیں۔

"اشعارِ ریختہ کہ گاہے بنا بر تفریحِ طبع گفتہ می شود" [1]

اردو اشعار کی کل تعداد ۳۲ ہے۔ ایک اردو شعر اس کے خود کردہ انتخاب اشعار اردو فارسی میں ایسا ہے جو کلیات کے مخطوطہ والے اشعار میں شامل نہیں ہے اس طرح کل ۳۳ اشعار ہوتے ہیں [2]

نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

کریں گے فصلِ گل سے دھوم آشنا ہے باغباں اپنا
قدیمی صاحب اپنا مشفق اپنا مہرباں اپنا

خدا سے ٹک تو ڈر، شیریں خبر لے اس بچارے کی
کیا فرہاد نے تیشہ سے سر لوہولہاں اپنا

ہوا کی کچھ طرح ہے اور گل نے رنگ بدلا ہے
اٹھالے اس چمن سیں عندلیب اب آشیاں اپنا

بھرا ہے دردمندی کا دھواں اس کے دماغ اندر
دکھایا چاہیئے لالہ کوں داغ خوں چکاں اپنا

غزالاں بجھ جو چاہے تری مژگان و ابرو کا
ہمیں بھی ٹک دکھا یو اے میاں ترکش کماں اپنا

---

[1] معاصر پٹنہ حصہ ۱ صفحہ ۵۲۔

[2] آنند رام مخلص کے اردو شعر۔ امتیاز علی خاں عرشی معاصر پٹنہ حصہ ۱ صفحہ ۵۶

مرے اشک ہیں کوچۂ یار میں — رہے کھل کے یا پھول گلزار میں

جنوں پیدا کرا ہے دل عقل اگر ہے — بہار آئی دوانے کچھ خبر ہے

کیا اس گل نے خط سیں پشتِ لب پر — چمن میں آج یہ خضری خبر ہے

دھوم آنے کی کس کے گلشن نے پڑی ہے — ہاتھ ارگجے کا پیالہ نرگس لے کھڑی ہے

مشک کا دل ختن میں ڈولا ہے — پیچ زلفاں کا کس نے کھولا ہے

ہے ہوا میں پتنگ اس گل کا — یا پری کا اُڑن کھٹولا ہے

خوش نگاہوں سے کیا ملے نسبت — آنکھ نرگس کے بیچ پھولا ہے

حنا تری کے رنگا رنگ نقشوں پر نظارا ہے
چمن میں کھل رہی گویا کہ گل مہدی ہزارا ہے

کیا کیا خوب ٹک آنکھیں دکھائی یار نے اس کوں
غزال اپنے تئیں خوش چشم کیوں جانے بچارا ہے

صبا یوں عرض کر ان لاڈلی زلفوں کی خدمت میں
بھلا ہے یا بُرا ہے دل دوانہ پیر تمہارا ہے

چھپا مت آتی ہے توں صبا اس گل کے کوچے میں
بیاں بارے تو کر کس حال سیں مخلص ہمارا ہے

قزلباش خاں امیدؔ

مرزا محمد رضا قزلباش خاں امیدؔ۔ ہمدان (ایران) کے باشندے تھے عالمگیر کے عہد میں ہندوستان آئے۔ پہلے سید حسین علی "بادشاہ گر" کے دور

سیادت میں برہان پور اور کرناٹک وغیرہ میں بسلسلۂ ملازمت مقیم رہے۔ شاہ عالم نے منصب یک ہزاری اور قزلباش خاں کا خطاب عطا کیا۔ آخر عمر میں دہلی میں اقامت گزیں ہوئے اور ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں انتقال کیا۔ فارسی کے شاعر تھے مگر اردو میں بھی اظہار کمال کیا ہے۔

ہندوستان آنے کے شروع زمانے کا یادگار شعر جس میں فارسیت غالب ہے یہ ہے ؎

بامن کی بیٹی آج مری آنکھ میں پڑی
غصہ کیا وگالی دیا اور دگر لڑی

دہلی میں رہ کر سادگی اور صفائی آئی۔ اس دور کے یادگار شعر یہ ہیں ؎

در و دیوار سے اب صحبت ہے	یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں	الحفیظ الحفیظ کرتا ہوں

نمونہ کلام درج ذیل ہے ؎

بانزد و حسن ملک، جلوۂ پری	بامن کی بیٹی ایک مری آنکھ میں گڑی
رفتم بہ پیش و گفتم "جانم فدائے تست"	غصہ کیا و گالی دیا اور دگر لڑی
ایسی نہ سیتا اور بھوانی نہ رادھکا	کرتار نے نہ ایسی کوئی دوسری گھڑی
گفتم کہ "تیرے پانو پڑوں اور بلا لیوں"	گفتا کہ "داڑھی جار مغل تجھ کو کیا پڑی"

گفتم "امید وصل میں ہم تیرے جیتا ہوں"
گفتا کہ "چل پرے دی مارے تجھے رڑی"

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے	در و دیوار سے اب صحبت ہے

دل ہمارا اسے کرتا ہے رات   غیر سے جو سر شب صحبت ہے
درد دل اس سے جو ہم نے نہ کہا   ایسی حاصل ہوئی کب صحبت ہے
دہر میں نقش وفا لازم ہے   شیشہ و سنگ یہ سب صحبت ہے

دست اغیار ہے زیر سر یار
آج امید کو ڈھب صحبت ہے

دل دیتا ہے ہنس کے باتوں میں   رو کے کہتا ہوں جب میں اپنا حال
یار گھر جاتا ہے یار کیا کردں   ہائے گھر جاتا ہے یار کیا کردں

خواجہ عطاء اللہ عطا

عہد عالمگیر کے ہزال شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں فارسی ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ عالمگیر نے کسی خطا پر قید کر دیا تھا۔ ایک دن اس نے ایک مصرع موزوں کیا مگر اس پر دوسرا مصرع اچھا نہ لگتا تھا۔ بہت سے شعراء نے طبع آزمائی کی مگر کوئی بھی مصرع عالمگیر کے معیار پر پورا نہ اترا۔ خواجہ عطا کو بھی اس واقعہ کی خبر ہوئی۔ انہوں نے بادشاہ سے کہلا بھیجا کہ اگر مصرع لگا دینے پر مجھے چھوڑ دیا جائے تو میں مکمل کر دوں۔ بادشاہ نے بلا بھیجا اور مصرع پڑھا۔

ع   بسترم خاک و خشت بالیں است

عطا نے فوراً مصرع لگایا ع

یکے از سرگذشت من ایں است

عالمگیر کو مصرع پسند آیا اور اس نے فوراً رہا کر دیا۔ اپنی موزونی طبع کے باوجود سنجیدگی سے کوسوں دور تھے۔ مسخرگی کے طور پر اس انداز کے شعر کہتے تھے ؎

اے دز بزد حسن تو کشتہ بچار چشم
زیر مژہ نہفتہ چو آہو بچارہ چشم [1]

امشب بہ کوئے دوست عطا پھر بہار ہے
تو بھی کھسر بسر کہیں در پہ کھار چشم

برفلک شب نمی چڑا انجم	دار ستم ز بہم می دھڑکڈ
دست و پای زند و درزن	ہم چو پدڑی کہ در قفس پھڑکڈ

فائزؔ دہلوی

ان کا نام صدرالدین محمد خان تھا اور زبردست خاں بن ابراہیم خاں کے لڑکے تھے جو عہد عالمگیر کے مشہور امرا میں سے تھے۔ عالمگیر کے جلوس کے بیالیسویں سال ناظم اودھ مقرر ہوئے اور پھر پنجاب اور اجمیر کے صوبے دار بھی رہے۔

فائزؔ کا وطن دہلی ہی ہے جس کا ذکر وہ بڑی محبت اور عقیدت سے

---

[1] نکات الشعراء میر تقی میر صفحہ ۲۹

کرتے ہیں۔ فائز نے اپنا کلیات پہلی بار ۱۱۲۶ھ میں ترتیب دیا، جس میں اردو دیوان بھی شامل تھا۔ ۱۱۴۲ھ میں انہوں نے اس پر نظرِ ثانی کی اس وقت ان کی عمر پینتالیس پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔[1]

قاضی عبدالودود نے تاریخ محمدی نسخۂ رام پور کی مدد سے ان کی تاریخ وفات متعین کی ہے۔ تاریخِ محمدی میں ۱۱۵۱ھ کے تحت درج ہے۔

"صدرالدین محمد خاں بن زبردست خاں بن ابراہیم خان بن علی مردان خاں کرد زیک از امرائے ہند در ماہ صفر در شاہ جہاں آباد فوت شد عمرش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"[2]

فائز اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں نثر و نظم دونوں شامل ہیں۔ ان کے کلیات میں ۲۸ کتابیں شامل ہیں۔

فائز کی شعر گوئی کا آغاز دلی کی آمد دہلی سے قبل ہو چکا تھا یا اس سے لگ بھگ ہوا ہو مگر یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ ۱۱۲۶ھ تک اردو دیوان کے مالک تھے۔

فائز کا اردو دیوان زیادہ ضخیم نہیں ہے اس میں صرف بتیس (۳۲) غزلیں ہیں مگر نظموں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو زیادہ تر مثنوی کی شکل میں

---

[1] دیوان فائز مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی۔ انجمن ترقی اردو ہند (دہلی)

[2] تاریخ محمدی نسخہ رام پور۔ معاصرہ حصہ ۱ قاضی عبدالودود صفحہ ۱۷۸

ہیں۔ ان کی چھ مثنویاں، پنگھٹ۔ جوگن۔ مالن۔ گوجری۔ بھنگوں اور رُت
کے بارے میں بہت مشہور ہیں۔ [۱]

فائز کے کلام میں غور و فکر کے عنصر نہیں ہیں بلکہ سیدھے سادے
اور سچّے جذبات کو شعری صورت دی گئی ہے۔ ایہام کم ہے۔ ان کی شاعری
کا موضوع ظاہری حسن یا مجازی عشق ہے۔ محبوب کی اداؤں اور عاشق کی
محبت کا بیان سادہ انداز میں کیا گیا ہے۔

فائز کی زبان میں مقامی عناصر بڑی حد تک غالب ہیں اور برج بھاشا
کا کافی اثر ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں :-

دھوپ سایہ کنول ناری ہے — کرن سورج کی وہ کناری ہے
اے جان شب ہجراں [۲] تری سخت کڑی ہے — ہر پل مگر اس تن کی برہ [۳] کی گھڑی ہے
چھیڑی ہیں اس کی اوبسی رسبھا دھرا دھکا — پر بھیونے کچھ برائی نہیں ویسی دوسری
زندہ ہے اس کی جگ میں چھیر — ننھ تڑائی سوں سب کو دیتی اُتر [۵]

شاہ مبارک آبرو

ان کا نام شاہ نجم الدین، لقب شاہ مبارک، اور تخلص آبرو تھا زیادہ تر

---

[۱] طبقات الشعرا منشی کریم الدین بحوالہ معاصر حصہ ا

[۲] رات [۳] فراق۔ ہجر [۴] غلام [۵] مناقشہ جواب

شاہ مبارک آبرو کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں سے ہیں جن کا ہم گذشتہ صفحات میں ذکر کر چکے ہیں تاریخ ولادت نامعلوم ہے گوالیار میں پیدا ہوئے تھے لیکن بچپن میں ہی دلی چلے آئے اور ابتدائی تعلیم و تربیت یہیں حاصل کی۔

سراج الدین علی خان آرزو کے رشتہ دار تھے[1] انہیں سے مشورۂ سخن بھی کرتے تھے اگرچہ عمر میں ان سے بہت بڑے تھے۔ کچھ عرصہ نارنول میں بھی قیام رہا تھا۔ خلیق اور متواضع تھے ایک آنکھ سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ ۱۱۶۵ھ[2] مطابق ۱۷۵۰ء میں وفات پائی۔

اپنے زمانے کے مسلم الثبوت ریختہ گو تھے۔ ان کی اور مرزا مظہر جانِ جاناں کی شاعرانہ چوٹیں چلا کرتی تھیں۔ مرزا مظہر نے شعر کہا ؎

آبرو کی آنکھ میں ایک گانٹھ ہے — آبرو سب شاعروں کی۔۔۔۔ ہے

آبرو نے جواب دیا ؎

کیا کروں حق کے کئے کو کور میری چشم ہے

آبرو جگ میں رہے تو جانِ جاناں پشم ہے

شاہ کمال بخاری کے لڑکے پیر مکھن پاکباز سے دلی تعلق رکھتے تھے

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر اعجاز حسین صفحہ ۶۴

[2] ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے ۱۱۹۰ھ لکھی ہے مگر ماخذ نہیں دیا۔ ثقافتی اردو۔ نیا دور ۲۱-۲۲ صفحہ ۳۶۱

اکثر شعروں میں ان کی جانب اشارہ ہوتا ہے۔ ان کا سچ کہا ہے۔ ع

عالم ہمہ دروغ است دغم نکھین [1]

آبرو کے کلام میں ایہام اور رعایت لفظی کا زور ہے الفاظ سادے اور ملائم ہیں مگر متروکات کی بھی کثرت ہے۔ محاورے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے استعارات کا خوب استعمال کرتے ہیں۔ کلام میں کہیں کہیں ابتذال، ورر کاکت پیدا ہوگئی ہے۔

نمونۂ کلام درج ذیل ہے:۔

افسوس ہے کہ مجکوں وہ یار بھول جاوے
وہ شوق وہ محبت وہ پیار بھول جاوے

رستم تیری انکھوں کے ہووے اگر مقابل
انکھیوں کو دیکھ تیری تلوار بھول جاوے

کیا شیخ و کیا برہمن جب عاشقی میں آویں
تسبی کرے فراموش زنار بھول جاوے

عارض کے آئینہ پر تمنا کا سبز خط ہے
طوطی اگر جو دیکھے گلزار بھول جاوے

یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتاں
جب تیرے آگے آوے گفتار بھول جاوے

---

[1] آبحیات محمد حسین آزاد صفحہ ۹۰

آیا ہے صبح نیند سے اٹھ رسمسا ہوا
جامہ بدن میں رات کا پھولوں لبا ہوا

کم مت گنو یہ بخت سیاہوں کا رنگ زرد
سونا وہ ہے کہ ہووے کسوٹی کسا ہوا

انداز سیں زیادہ نپٹ ناز خوش نہیں
جو خال اپنے حد سے بڑھا سو مسا ہوا

قامت کا سب جگت منیں بالا ہوا ہے نام
قد اس قدر بلند تمہارا رسا ہوا

دل یوں ڈرے ہے زلف کا مارا جھونک سیں
رسی سیں اژدہا کا ڈرے جوں ڈسا ہوا

اے آبرو! دل تو سمجھ بیچ عشق کا
پھر زلف سے نکل نہ سکے دل پھنسا ہوا

نین سے نین جب ملائے گیا	دل کے اندر مرے سمائے گیا
نگہ گرم سیں مرے دل میں	خوش نین آگ سی لگائے گیا
ترے چلنے کی سن خبر عاشق	یہی کہتا ہوا کہ ہائے گیا
سہو کر بولتا تھا مجھ سیتی	بوجھ کر بات کو چھپائے گیا

آبرو ہجر بیچ مرتا تھا
مکھ دکھا کر اسے جلائے گیا

یہ رسم ظالمی کی دستور ہے کہاں کا	دل چھین کر ہمارا دشمن ہوا ہے جاں کا

ہریک نگہ میں ہم سے کرنے لگے ہو نوکیں
کچھ یو تری آنکھوں نے سیکھا ہے طور بانکا

تجھ راہ میں ہوا ہے اب تو رقیب کتّا
لو پانے کر ہماری آ باندھتا ہے ناں کا

خندوں کے طور گویا دیوار قہقہہ ہے
ٹھہر کر پھرے نہ لڑکا جو اس طرف کو جھانکا

رستم دُل کے دل میں ڈلے رخنہ جو پانی
دیکھے اگر بھوؤں کی تلوار کا جھما کا

فاسق کے دل پہ ڈالی جب نفس بد نے بُرکی
[illegible] کی گلی تب جا کر غبار پھانکا

سب عاشقوں میں ہم کوں مژدہ ہے آبرو کا
ہے قصد گر تمہارے دل بیچ امتحاں کا

کنجی اس کی زبان شیریں ہے
دل مرا قفل ہے بتاشے کا

اب دین ہوا زمانہ سازی
آفاق تمام دہریہ ہے

سجا ہے نرگسی بوٹے کا جامہ
کرے کیونکر نہ مجھ سے چشم پوشی

آبرو کے خون کو حاضر ہوئے کس کر کمر
خون کرنے کو چلے عاشق کا تہبند باندھ کر

دو بھوؤں سے لگے ہیں جس کے نین
وہ کہاتا ہے حاجی الحرمین

شیخ شرف الدین مضمون

شرف الدین نام اور مضمون تخلص تھا۔ شیخ فرید الدین گنج شکر کی اولاد میں سے تھے۔ اکبر آباد (آگرہ) کے قریب علاقہ جاجمؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ جوان ہو کر دلی آ رہے اور زینت المساجد میں قیام کیا آخر وہیں انتقال ہوا سپاہی پیشہ تھے مگر تباہی سلطنت دہلی سے دل برداشتہ ہو کر ہتھیار

کھول ڈالے اور بقول آزاد "مضمون باندھنے پر قناعت کی"[1] بابا گنج شکر سے نسبت کی طرف خود مضمون نے اشارے کئے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

کریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید | کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید

مضمون خوش مزاج۔ بااخلاق اور یار باش آدمی تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو سے مشورہ سخن کرتے تھے اگرچہ عمر میں آرزو ان سے بہت چھوٹے تھے۔ جوانی میں ہی دانت تنزلے سے ٹوٹ گئے تھے اس لئے آرزو ان کو شاعر بیدانہ کہتے تھے ۱۷۴۵ء میں انتقال ہوا۔ مضمون کے انتقال پر سودا جیسے باکمال نے ان کے کمال کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ؎

بنائیں اٹھ گئیں یارو غزل کے خوب کہنے کی | گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سو مستانہ

مضمون کے کلام میں بھی اس دور کے دیگر شاعروں کی طرح رعایت لفظی کا اہتمام ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی کلام پاکیزہ اور پر لطف ہے۔ دو سو اشعار کا دیوان یادگار چھوڑا ہے۔

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا
صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا[2]

ہنسی تیری پیارے پھلجھڑی ہے | یہی غنچے کے دل میں آ کھڑی ہے
تیر مژگاں برستے ہیں مجھ پہ | آب پیکاں کا اس طرف ہے ڈھال

---

[1] آبحیات از محمد حسین آزاد صفحہ ۱۰۱

[2] در فراق تو چہا ہے بت محبوب کنم | صبر ایوب کنم گریۂ یعقوب کنم۔ مخلص کاشی

میکدہ میں گر سراپا فعل نامعقول ہے مدرسہ دیکھا تو واں بھی فاعل و مفعول ہے[1]

کرے ہے دار کو وہ مل بھی سر تاج ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج

خط آگیا ہے ان کے، مری ہے سفید ریش کرتا ہے اب تلک بھی وہ مسّے میں صبح و شام

نہیں ہیں ہونٹھ تیرے پان سے سُرخ ہوا ہے خون میرا آ کے لبریز

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں ایک تو گل بے وفا اور اس پہ جور باغباں

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے

یہ اشک آنکھوں میں قاصد کسطرح یکدم نہیں تھمتا

دل لیے آپ کا شاید لیے مکتوب جاتا ہے

مرے آئینہ دل سے ترا نقش جو دیکھا تو کسی صورت نہ جائے

نظر آتا نہیں وہ ماہ یارو گزرتا ہے مجھے یہ چاند خالی

حوال پیش دلبر کچھ مت کہو ہمارا آتا ہے نام میرا سن کر لے پسینہ

شرم سے ہو جائیں پانی سب رقیب جو مرا یوسف ملے آیا ہے

منوس مار جھٹ پٹ دل کو رکھے ہیں اٹکا

کس ساحروں سے سیکھا زلفوں نے تیری لٹکا

خوبوں کو جانتا تھا گرمی کریں گے دل میں

دل سرد ہو گیا ہے جب سے پڑا ہے پالا

---

[1] قائم چاندپوری نے یہ شعر مصطفیٰ خاں یکرنگ سے منسوب کیا ہے۔ دوسرے تذکرہ نگاروں نے اسے مضمون سے ہی منسوب کیا ہے جو میر کی تقلید معلوم ہوتی ہے۔

نہیں ہے زاہد دل کو مئے سے کام
لکھا ہے ان کی پیشانی میں سرکا

کوچے میں بے وفا کے مارے گئے ہیں عاشق
نکلا ہے ایک مضمون بھاگوں ستے اپنے بھیا

کیا ہوا جو خط مرا پڑھتا نہیں
جانتا ہے خوب وہ مضمون کو

اس دہاں بیچ سخن رکھتا ہوں
مجھ پہ اس بات کو اثبات کرو

جب سے چاہا ہے تیرا چاہ ذقن
آب چشموں سے میرے جاری ہے

تجھ بن زبس کہ پانی جاری کئے ہیں رو کر
چشموں سے اب میں اپنے بیٹھا ہوں ہاتھ دھو کر

جس طرح رہے ہے مال کے اوپر کالا
یوں رہے زلف ترے منہ کے اوپر مالکے بیچ

محمد شاکر ناجی

آپ کا نام سید محمد شاکر تھا، ناجی تخلص کرتے تھے۔ محمد شاہی کے عہد کے مشہور درباری امیر اور رکن اعظم عمدۃ الملک امیر خاں سے متوسل تھے یعنی ان کے نعمت خانہ کے داروغہ تھے جس کی طرف آبرو نے ان کے کمال سخن کے اعتراف کے ساتھ اشارہ کیا ہے ؎

سخن سنجاں میں ہے گا آبرو آج
نہیں شیریں زبان شاکر سریکا

جس وقت نادر شاہ نے ہندوستان پر چڑھائی کی اس وقت (۱۷۳۹ء میں) انہوں نے بھی جنگ میں حصہ لیا اور محمد شاہی لشکر اور رعایا کی تباہی کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ شرفا کی خواری، ہندوستانیوں کی آرام طلبی اور بدمعاشوں کی گرم بازاری کا حال ایک طویل مخمس کی صورت میں لکھا ہے جو اس عہد کے سیاسی اور معاشی انتشار کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ دو بند بطور نمونہ پیش ہیں ؎

لڑے ہوئے تو برس بیس ان کو بیتے تھے
دعا کے زور سے دائی دوا کے جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے
گلے میں ہنسلیاں بازو اوپر طلائی کے نال

قضا سے بچ گئے مرنا نہیں تو ٹھانا تھا
کریں نشان کے ہاتھی اوپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا
ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ ظرف و مطبخ و دکاں نہ غلہ نہ بقال

ناجی کا انتقال ۱۱۶۵ھ میں ہوا۔ ناجی فطرتاً شوخ طبع تھے چنانچہ یہ رنگ ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ میر تقی کے کہنے کے مطابق طبیعت کا رجحان ہزل کی طرف زیادہ تھا۔[1] مزاج میں بلا کی تیزی تھی اور بقول

[1] نکات الشعرا: از میر تقی میر صفحہ ۲۳

آزاد " راہ چلتے سے الجھتے تھے اور جس کے گرد ہوتے تھے اس کا پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔"[1]

مضمون کی زبان سلیس اور سادہ ہے اور خیالات میں نزاکت کا پہلو نمایاں ہے۔ اشعار میں اس عہد کی روایت کے مطابق ایہام اور استعارات کی کثرت ہے۔

نمونۂ کلام درج ذیل ہے ؎

دیکھ موہن تری کمر کی طرف   پھر گیا مانی اپنے گھر کی طرف

جن نے دیکھے ترے لب شیریں   نظر ان کی نہیں شکر کی طرف

ہے محال ان کا دام میں آنا   دل ہے ان سب بتاں کا زر کی طرف

تیرے رخسار کی صفائی دیکھ   چشم دانا نہیں ہنر کی طرف

حشر میں پاک باز ہے ناجی
بد عمل جائیں گے سقر کی طرف

رکھے اس لالچی لڑکے کو کب تلک بہلا
چلی جاتی ہے فرمائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا

کفن ہے سبز ترے گیسوؤں کے ماروں کا
مکاں غم ہے ترے در کے بیقراروں کا

---

[1] آبحیات از محمد حسین آزاد صفحہ ۱۰۳

موزوں قد اس کا چشم کی میزاں میں جب تلا
طوبیٰ تب اوس سے ایک قدم اد کسا ہوا

اے صبا کہہ بہار کی باتیں
اُس بت گلعذار کی باتیں

چھوڑتے کب ہیں نقد دل کو صنم
جب یہ کرتے ہیں پیار کی باتیں

کس پہ چھوڑے نگاہ کا شہباز
کیا کرے ہے شکار کی باتیں

محمد احسن احسنؔ

محمد احسن نام اور احسنؔ تخلص تھا۔ آبروؔ اور مضمونؔ کے ہم عصر تھے۔ ان کے کلام کے بارے میں میرؔ کی رائے ہے "طبعش بسیار بہ ایہام بود، ازیں جہت شعرا دبے رتبہ ماند" [1] بطور نمونہ تین شعر اور ایک غزل درج ہے

نازک بدن پہ اپنے کرتے ہو تم جو غرّہ
موسیٰ کمر نے تجھ کو فرعون سا بنایا

یہی مضمون خط ہے احسن اللہ
کہ حسن خوبرویاں عارضی ہے

لام نستعلیق کا ہے اس بت خوش خط کی زلف
ہم تو کافر ہوں اگر بندہ نہ ہوں اسلام کے

صبا کہیو اگر جاوے ہے تو اس شوخ دلبر سوں
کہ کہہ کر قول پرسوں کا گیا برسوں ہوئے پرسوں

---

[1] نکات الشعرا میر تقی میر صفحہ ،

عجب نئیں ابر گر جلتوں کو تو جل سو جلا دے گا
گیا ہے یار میرے بر سوں کہتا ہے کریں برسوں
تُو قاصد وعدہ کرتا ہے جو پرسوں کا کہ پھر آوے
کبو تو پھر نہیں آتا گلی اس کی سیتی برسوں
ترس تجھ کو نہیں اے شوخ اتنی کیا ہے ترسائی
ترے دیدار کو میں دیدۂ ترسوں لکڑا ترسوں
ترے تل سوں مجھے نت میتھ کا سودا ہے اے ظالم
عجب نئیں ہے اگر تیل نکسا دے مرے سر سوں
زلف تیری معطر ہے عطر فتنے سینی ظالم
الہٰی آبرو در کھیو پڑا ہے کام ابتر سوں
غزل اس طرح سے کبھی بھی احسن تجھ سوں بن آوے
جواب اب آبرو کب کہہ سکے مضمون بہتر سوں

مصطفیٰ خاں یک رنگ

غلام مصطفیٰ خاں نام تھا بعض لوگ مصطفیٰ قلی خاں بتلاتے ہیں [1]
یک رنگ تخلص کرتے تھے۔ ان کا شمار محمد شاہی عہد کے اُمراء میں کیا جاتا ہے۔
اپنے زمانے میں بڑی عزت اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ انتقال

---

[1] تاریخ زبان اردوئے قدیم از حکیم شمس اللہ قادری صفحہ ۱۱۴

دہلی میں ہوا۔ سال وفات نامعلوم ہے۔ خوش مزاج آدمی تھے مرزا مظہر جانجاناں سے اصلاح لیتے تھے اور فن شعر میں انہیں اپنا استاد سمجھتے تھے۔ کلام میں مجاز و حقیقت دونوں کی رنگ آمیزی ہے۔ رعایت لفظی کا استعمال دیگر معاصرین کی طرح کرتے ہیں۔

نمونۂ کلام درج ذیل ہے ؎

اس کو مت جانو میاں اوروں کی طرح — مصطفےٰ خاں آشنا یک رنگ ہے

جدائی سے تری اے صندلی رنگ — مجھے یہ زندگانی دردسر ہے

جو کوئی توڑتا ہے غنچۂ گل — دل بلبل شکستہ کرتا ہے

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے — دل سے صبر و قرار جاتا ہے

پارسائی اور جوانی کیونکہ ہو — ایک جا آگ پانی کیونکہ ہو

گر خبر لینی ہو تو لے صیاد — ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے

جس کے درد دل میں کچھ تاثیر ہے — گر جواں بھی ہے تو میرا پیر ہے

لگے ہیں خوب کانوں میں بتوں کے — سخن یک رنگ کے گویا گہر ہیں

زبان شکوہ ہے ہندی کا ہر بات — کہ خوباں نے لگائے ہیں مجھے بات

یک رنگ پاس اور سخن کچھ نہیں بساط — رکھتا ہوں میں دو شین کہو تو نذر کروں

اس زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال
یک رنگ کے سخن میں خلاف ایک مُو نہیں

انجام

امیر خاں نام تھا اور عمدۃ الملک خطاب۔ انجام تخلص کرتے تھے۔ سلسلۂ نسب شاہان صفویہ سے ملتا ہے۔ ان کے باپ کا شمار عالمگیر کے مشہور امراء میں ہوتا تھا۔ وہ عالمگیر کی طرف سے صوبۂ کابل کے حکمراں تھے۔ انجام خود محمد شاہ کے عہد میں الہ آباد کے صوبہ دار تھے۔ منصب ہفت ہزاری تھا۔ طبیعت میں بذلہ سنجی اور مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ محمد شاہ سے انتہائی قربت رکھتے تھے۔ بادشاہ کو ان کے بنا چین نہ آتا تھا۔ ہندوستانی سنگیت پر زبردست قدرت حاصل تھی بڑے بڑے موسیقار ان کی فنکاری کے قائل تھے۔ ۱۱۵۹ھ میں ایک شخص نے ان کو کٹار مار کر قتل کر دیا[1] کہا جاتا ہے کہ قتل میں محمد شاہ کا ہاتھ تھا۔

نصیر حسین خیال نے لکھا ہے کہ انجام نے دہلی میں ایک ادبی اکیڈمی زبان کی تحقیق کے واسطے قائم کی تھی جو فرینچ اکیڈمی کے طور پر اردو زبان میں مستعمل الفاظ کے متعلق تحقیق کا کام کرتی تھی اور اس کام میں اس عہد کے بڑے بڑے عالم اور فاضل شریک ہو کر بحث و مباحثہ کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچتے تھے۔ طے شدہ محاوروں اور الفاظ کو ایک جگہ درج کر لیا جاتا تھا اور اس کی نقلیں ہندوستان کے دیگر بڑے بڑے امرار کے پاس بھیجدی

---

[1] تذکرہ گلزار ابراہیم مصنفہ نواب ابراہیم خاں

جاتی تھیں[۱] مگر خیال کے اس نظریہ کی تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کہتے ہیں کہ اس دور میں اس طرح کی کسی انجمن کے وجود کا پتہ باوجود تحقیق کے نہ چل سکا[۲]

انجام نہ صرف عربی فارسی پر عبور رکھتے تھے بلکہ وہ بھاشا کے بھی اُستاد سمجھے جاتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے مکرنیاں اور پہیلیاں بھی کہتے تھے۔

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم ۔۔۔ پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم

کیوں نہیں لیتا ہماری تو خبر اے بے خبر ۔۔۔ کیا ترے عاشق ہوئے تھے درد و غم کھانے کو ہم

ٹک تو فرصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایے میں تھے آباد ہم
منھ ترا تکتے ہیں سب اقلیم حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم
دل تو ہے داغ غلامی میں تری طاؤس وار
سامنے قمری کے ہیں گو سرو ساں آزاد ہم

اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا ۔۔۔ عمر مانند شرر جب کر چکے برباد ہم

---

[۱] داستان اردو از نواب نصیر حسین خیال

[۲] دلی کا دبستان شاعری از ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صفحہ ۱۱۵

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاس تمکنت
شکر ہے تڑپے نہ زیر خنجر جلّاد ہم

اب یہی احسان ہے تیرا جو ہوں آزاد ہم
پھر چمن میں جائیں کیا منہ لے کے اے صیاد ہم

کیوں بلایا بھیڑ میں کیا مجھ سے نادانی ہوئی
دختر رز بزم میں، آ کے شرم سے پانی ہوئی
کیا محیط عشق کے صدموں سے پائی تھی نجات
کشتیٔ دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی
ہر پری تمثال جوں آئینہ رکھتا تھا عزیز
ٹوٹتے ہی دل کے مجھ کو سخت حیرانی ہوئی
نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے
کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی
کیا کہوں انجام میں اس عشق کے آغاز کو
دوست داروں کی محبت دشمن جانی ہوئی
چاک کو تقدیر کے ہرگز نہیں ممکن رفو
سوزن تدبیر بھی گر سو برس سیتی رہے

دسواں باب

اردو نثر شمالی ہند میں

قدیم اردو کا بالکل ابتدائی نمونہ بارھویں صدی عیسوی کا ایک پروانہ ہے جو پرتھوی راج نے اچاریہ رشی کیش دھن دنتری کو دیا تھا۔ یہ پروانہ دوسرے پروانوں کے ساتھ ناگری پرچارنی سبھا نے شائع کیا ہے۔ اس پروانے کی زبان کھڑی بولی کی قدیم شکل ہے۔

"شری شری دیس مہاراجم دھیراجم، ہندوستھانم راجم دھانم سمبھری نریس۔ پورب دلی تخت شری شری مہاراجم دھیراجم

شری پرتھوی راج سو سامنتم آچارج اشی کیش دھنم تری اپن تم
نے کا کاجی تم کے دوا کی آرام چٹو جیتی کے ریچ میں راکٹر روپیہ ۵۰۰۰
تمرے آبائی گوراے کا برچہ سیوا ئے آدیں گے. کھجا تم سے ۱ تم.
کو کوئی معاف کریں گے۔ جین کو نیر کے اندھکاری ہو دیں گے.
سنی ددسبے حکم ہڈمنت رامنت ۱۱۴۵ اور تے آساڑھ مری ۱۳۔"

اس فرمان میں دوا۔ خسزانہ۔ برچہ۔ حکم۔ آرام دغیرہ عربی فارسی
الفاظ شامل ہیں اور لیوسے گا۔ دلیوے گا۔ لایا جائے گا۔ کرے گا۔
ہووین گے دغیرہ افعال کھڑی بولی کے ہیں ان پروانوں کی زبان
کے بنا ہونے کے باعث پنڈت ادجھا ان کو جعلی قرار دیتے ہیں۔

فرمان کا ترجمہ یہ ہے۔ "شری شری مہاراج دھیراج پرتھوی
راج جی (حکمران ہندوستان دلی۔ پوربی ہندوستان کے مہاراج
دھیراج سنجری راجاؤں کی راجدھانی نے اچاریہ رشی کیش دھن نتری
کو (دیا) تم نے کاکاجی کی دوا کر کے انہیں اچھا کیا ہے جس کے سبب
۵۰۰۰ نقد اور ہاتھی گھوڑے کا خرچہ تمہیں شاہی خزانہ سے بھیجا
جائے گا اس حکم کے پورا نہ ہونے میں جو کوئی رکاوٹ کریں گے وہ
دوزخ میں جائینگے ہنومنت کے ذریعہ یہ حکم ہوا سمت ۱۱۴۵ اساڑھ سدی ۳

لے ہندی بھاشا اور اس کے ساہتیہ کا وکاس۔ ایودھیا سنگھ ہری اودھ اور مشر بندھو
حصہ اول صفحہ ۱۲۶۔ ۱۲۰ بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو مصنفہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صفحات ۱۲۲۔ ۱۲۳

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ایک مشہور بزرگ اور کامل صوفی کی حیثیت سے مشہور ہیں [1]

صوبہ بہار کے قصبہ منیر میں ۶۶۲ھ مطابق ۱۲۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۷۲۵ھ میں شیخ نظام الدین اولیا کے مرید ہونے کے واسطے دہلی آئے مگر ان کی وفات ہوچکی تھی اس لئے شیخ نجیب الدین فردوسی کے مرید ہوگئے۔ صوبہ بہار میں راج گیر کے مقام پر کافی عرصہ تک ریاضت میں مصروف رہے۔

۱۳۷۰ء مطابق ۷۸۲ھ میں وفات پائی۔ آپ پوربی اور بھاشا میں شاعری بھی کرتے تھے شرف تخلص تھا آپ کے ملفوظات و مکتوبات معدن المعانی، کتاب الارشاد السالکین اور شرح آداب المریدین مشہور ہیں۔ ذیل میں آپ کا ایک کنج مندرہ درج ہے جو انواع امراض کے لئے مفید بتایا جاتا ہے۔ یہ کنج مندرہ اس عہد کی اردو نثر کا ابتدائی نمونہ ہے۔

کنج مندرہ از شاہ شرف الدین احمد یحییٰ منیری بر جمیع امراض کردرین ذکر می شود از علف خشک جھاڑا بکند۔

---

[1] شیخ موصوف پر ایک مقالہ معارف دسمبر ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا ہے جس میں ان کے خطوط کی مدد سے ان کے مرتبہ تصوف اور علم و ادب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللھمہ صلی علی محمد وال محمد صاحب التاج والمعراج والبراق اسمہ جسمہ مطہر
منور مولیٰ لثقلین صاحب العلم والحکم ودافع البلاء والوباء ابوالقاسم
محمد بن عبداللہ صاحب العرب والعجم۔ یا یہا المشتاقون الذین امنو بنور
جمالہ صلوا علیہ وآلہ وسلموا تسلیماً کثیراً کثیراً برحمتک یا ارحم الراحمین۔
بسم اللہ شافی بسم اللہ المعافی بسم اللہ الکافی بسم اللہ خیر الاسماء بسم اللہ الذی
لا یضر مع اسمہ شیئ فی الارض ولا فی السماء وھوا سمیع العلیم ؛۔

اُدٗ انکار ادشتا کرتا بیدن برتادھی ایک سرجن باردوبک
تین تلوک۔ چار بید پانچ پنڈ وچھ نادک سات سمندر آٹھ۔
لبس نوگرہ دس راون۔ اگیارہ ردر بارہ ماس۔ تیرہ
تمبول چودہ بھون پندرہ تتھہ سولک لا۔ چار کہاں چار بان پاج
بھوت آٹ مان نوے ناتھ چوراسی سدّو باپ سٹھ جوگنی اشت
کُنڈی ناک تی تیس کوڑی دیوتا چوراسی۔ سجن سرجیو جنت اکاس پاتال
مرت منڈل رات دن گہری ڈنڈی ڈنڈ پل پیپلا جوک مہورت میں
تمہیں سالگی دہرت ہوں جو کچھ فرانے کے پنڈ پران میں بھُوئی زاد
کا بانٹ کا کوتے کا پوکہر کا اندھیاری کا اجیالی کا چوت کا پھیت کا
کنے کا کراتے کا بھیجے کا بجھاتے کا لا لکھے کا اُلکھیں کا دیو دانو بھوت
پلیت راکس بھوکس ڈائن ڈاکن عکس کہن چوڑیل میل ملان جان
بھوان ڈیٹھ موٹھ تپ تجاری جاڑا جوڑی اُٹھوری بھکوڑی کلہ
کھنیلا مردت آدو نیلی کرکری آدھا سیسی آذ بریسی نہرڈ اڈہر

واکل سوا کچھ دی پیی اٹھارہ کوڑھ اٹھارہ پرمیہ ہوک سوک جلندر کش دہر دلیں، میں کوڑھ دشت آوں ڈھو بلغم پی چشن مرکی کبھی کبا کلشی پیری بادکولا، سرخ باد سبز باد سپید باد زرد باد ہفتاد دو باد ہر بادے کو باشد درد جو دفال جن آسیا ردمیں سے دبائی سلیمان بن داؤد پیغمبر کی جل بھسمنت ہو بیک بلا جائے بیک بلا جائے تا تر سوا لاکھ پیغمبر کا معجزہ ٹھاپ توے ناتہ چوراسی سید بھا کا سراپ جی جی کرت تی تی مرنت دہائی شاہ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی حق حق و بحق لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد و ننزل من القرآن ما ھو شفاء و رحمۃ للمؤمنین ولا یزید الظالمین الا خسارا

کالا بستا زملا بے ممند ریتر   نکہ پیار سکہ بے زمل کرے مرے

درد سے نہ پییر

بحق لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ این دو ہرہ راسہ بار بخواند

شرف صرف اہل کہیں درد کچھ نہ لباسے

گرد جھویں دربار کی سو درد دور ہو جائے [1]

حضرت شاہ اشرف جہانگیر سمنانی

حضرت خواجہ اشرف جہانگیر سمنانی آٹھویں صدی ہجری کے ان مشہور

---

[1] از بیاض مملوکہ مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور بحوالہ پنجاب میں اردو حافظ محمود شیرانی صفحہ ۱۹۶

بزرگوں میں ہیں جن کے فیض و برکات کا شہرہ ہندوستان کے طول وعرض کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی ہے۔ آپ ۶۸۸ ہجری مطابق ۱۲۸۹ء میں سمنان میں پیدا ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ سمنان کے شاہی خاندان سے تھے۔

جوانی ہی میں مرشد کی تلاش میں ہندوستان تشریف لائے اور حضرت علاؤ الدین قطب بنگال کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے خلیفہ ہوئے کچھوچھہ شریف (روح آباد) پر مستقل مقیم رہے مگر اس دوران میں کئی بار اسلامی ملکوں کی سیاحت کی اور فریضۂ حج کی ادائیگی کی سعادت بھی حاصل کی۔ سیر و سیاحت کا یہ دور کم و بیش تیس سال پر محیط ہے اس سفر کے دوران آپ کی ملاقات حافظ شیرازی سے بھی ہوئی جس نے بے تکلفانہ تعلقات کی صورت اختیار کر لی، آپ کی تحریروں میں حافظ شیرازی کا اکثر مقامات پر ذکر آیا ہے آپ کی یادگار "لطائف اشرفی" اور "مکتوبات اشرفی" ہیں۔ حافظ کے متعلق دلچسپ معلومات درج ہیں۔ آپ کا انتقال ۸۰۸ھ مطابق ۱۴۰۵ء میں ہوا۔ مزار شریف کچھوچھہ (ضلع فیض آباد یوپی) میں ہے اور زیارت گہ خلائق ہے[1]

آپ نے اردو میں ایک رسالہ اخلاق و تصوف کے متعلق تصنیف

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ "حافظ شیرازی کے دو قدیم ترین ماخذ" از ڈاکٹر نذیر احمد۔ فکر و نظر علی گڑھ جنوری ۱۹۶۰ء

کیا جس کا سال تصنیف ۸۰۰ / ۱۳۰۶ء مطابق ۸۰۷ ھجری ہے [1]

"آپ نے اپنے سلسلہ کے ایک بزرگ مولانا وجیہہ الدین کے ارشادات کو اردو زبان میں (جس کو اس زمانے میں زبان ہندی کہا کرتے تھے) خود جمع کیا ہے۔ میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب دو سو سات (۲۰۷) صفحہ کی ہے اس کے صفحہ ۱۱۸ کی ایک عبارت کا ٹکڑا یہ ہے۔" [2]

"اے طالب آسمان وزمین سب خدا نہیں ہے، ہوا سب میں خدا ہے جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات۔"

اردو کے عام رواج اور بول چال میں استعمال ہونے کا ثبوت عہد ہمایونی کے ایک واقعہ سے ملتا ہے۔

۱۵۳۵ء میں ہمایوں نے بہادر شاہ والئی گجرات و مالوہ پر حملہ کیا۔ بہادر شاہ کا سپہ سالار (میر آتش) رومی خاں ہمایوں سے خفیہ طور پر مل گیا جس کے نتیجہ میں بہادر شاہ کو شکست ہوئی۔

مال غنیمت میں ہمایوں کو بہادر شاہ کا پالتو طوطا بھی ہاتھ لگا جو انسانوں کی طرح باتیں کرتا تھا۔ فتح کے بعد جب دربار ہوا تو رومی خاں

---

[1] داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری صفحہ ۱۷

[2] میر نذر علی درد کاکوروی۔ نگار دسمبر ۱۹۲۵ء بحوالہ داستان تاریخ اردو

بھی حاضر ہوا۔ طوطے کا پنجرہ دربار میں ہی رکھا تھا۔ طوطا رومی خان کو دیکھتے ہی چلانے لگا۔

"پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام۔ پھٹ پاپی نمک حرام۔"

ہمایوں نے کہا۔ "رومی خاں چہ کنم جانور است ورنہ زبانش می بریدم" [۱]

اکبر اعظم ۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء کے سامنے کسی اشتعال انگیز بات پر ادہم خاں نے خاں اتکہ کو قتل کر دیا۔ اس پر اکبر نے ادہم خاں پر اس طرح اظہار ناراضگی کیا:۔

"اے ملیچھ گاذدی تو کیوں اتکہ مارا از جان بیجان کردی"۔[۲]

گنگ کوی

اکبر کے عہد میں گنگ کوی نے سنہ ۱۵[illegible]ء میں "چند چھند برنن کی مہما" کے نام سے ایک کتاب ہندی بھاشا میں ترتیب دی جو اس عہد کی کھڑی بولی کا نمونہ ہے۔ عربی فارسی کا کثرت استعمال اور افعال و ضمائر کا طریقہ استعمال اسے اردو سے بہت قریب لے آتا ہے۔

---

[۱] آب حیات از مولانا محمد حسین آزاد صفحہ ۱۶

[۲] تاریخ ہمایونی بحوالہ تاریخ ادب فارسی در عہد سلاطین مغلیہ جلد سوم از شمس العلماء محمد عبد الغنی ناگپور یونیورسٹی۔

اس کتاب سے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

"اکبر ساہ جی عام کھاس (خاص) تکھت (تخت) اوپر ود اجمان ہو رہے ہیں اور عام کھاس بھرنے لگا ہے جس میں تمام امراؤ آئے آئے کورنش بجائے جہار کر کے اپنی اپنی بیٹھک پر بیٹھ جایا کریں اپنی اپنی مِسُل سے۔ جن کی بیٹھک نہیں سو رسیم کے رسے میں ریسیم کی ڈومیں پکڑ پکڑ کے کھڑے تاجیم (تعظیم) میں رہے۔"

"اتنا سنکے پات ساہی جی سری اکبر صاحب جی آدسیر سونا نرہر داس چارن کو دیا۔ ان کے ڈیڑھ سیر سونا ہو گیا۔ راس بنچا پورن بھیا عام کھاس برکھاس (برخاست) ہوا۔"[1]

جعفر زٹل

میر جعفر زٹل جن کا تفصیلی تذکرہ نظم کے ذیل میں کیا جا چکا ہے عہد عالمگیر کے مشہور و معروف شخص گذرے ہیں۔ ان کے کلیات میں نثری حصہ بہت کافی مقدار میں موجود ہے جن میں ذیل کے عنوانات کے تحت اردو فارسی آمیز کھچڑی زبان میں مزاحیہ انداز سے گلکاریاں کی گئی ہیں۔ گفتگو نامۂ نثر۔ رقعات نثر۔ عدالتی تحریریں۔ شرارت نامہ۔

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتہاس صفحہ ۳۳۶ تا ۳۳۷ از پنڈت رام چند رشکل بحوالہ مقدمہ تاریخ زبان اردو از ڈاکٹر مسعود حسین خاں صفحہ ۱۷۴

مصطلحات زمانہ وغیرہ۔

جب زٹل شہزادہ کام بخش کی ملازمت سے نکالے گئے تو ان کا ملازم تمام اندوختہ لے کر فرار ہو گیا۔ انہوں نے اپنے دل کا بخار اس طرح نکالا۔

"درعین وقت بیکاری وچنیں ناداری غنی ازلی و متقنّی دہیہ وچرغینہ چگونہ نفرے بے پدرے راچہ خرے فرصت وقت را یافتہ۔ متاع کثیر وقلیل را گرفتہ بگوشۂ خزید...... مثلاً مہرے پر سو درے۔ مثلاً جیسے کوڑھ میں کھاج... مثلاً بلکہ بے خرچی میں آٹا گیلا۔" [1]

---

[1] کلیات جعفر زٹلی مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۷۱ھ